وَ مَنْ یُّؤتَ الحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْراً کَثِیراً

البقرة (۲٦۹)

جسے حکمت و دانائی عطا ہوئی اسے بہت بڑی بھلائی مل گئی

تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند

دوسری جلد

عربی ادب

(۷۱۲ء - ۱۹۷۲ء)

مدیرانِ خصوصی — سید فیاض محمود و پروفیسر عبدالقیوم

معاون — ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

پنجاب یونیورسٹی، لاہور

طبع اول : فروری ۱۹۷۲ء
تعداد : ایک ہزار
طابع : پنجاب یونیورسٹی
ناشر : گروپ کیپٹن سید فیاض محمود
مطبع : مطبعہ المکتبہ العلمیہ لیک روڈ ۔ لاہور

پاکستان و ہند

کی

اِسلامی تہذیب

کے

نام

تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند

(دوسری جلد) عربی ادب (۷۱۲ء - ۱۹۷۰ء)

فہرستِ مضامین

پیش لفظ

تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ان فکری عوامل اور شعائرِ زندگی کی نشاندہی کی جائے جس سے اس برِ صغیر کے مسلمانوں کی ثقافتی زندگی اور معاشرتی اقدار کی تعمیر ہوئی۔ ادب سے مُراد یہاں ان خیالات و جذباتِ عالیہ کا مؤثر اظہار ہے جن سے قلب و نظر کی جِلا ہوتی ہے اور جن سے انسانی زندگی بامعنی بنتی ہے۔ ایسے خیالات و تصوّرات جہاں ہمیں ادراک کی منتہیات کا راستہ دکھاتے ہیں وہاں رُوحانی تسکین کا باعث بھی ہوتے ہیں۔ ان سے ہمارے ایّام بھی روشن ہوتے ہیں اور ہمارے لمحات بامُراد۔ ادب میں مذہب، تصوّف، فلسفہ، اخلاقیات، تاریخ، لسانیات، شاعری، افسانے، انشائیات، مکتوبات، ہر چیز شامل ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ جس جس زبان میں برِ صغیر کے مسلمانوں نے اپنے رنج و مسرّت، اپنی فکر و نظر، اپنی اُمنگوں اور عزائم کو متجسّم کیا ہے، ان کے شاہپاروں اور ان کے مصنّفین سے اپنے ہم وطنوں اور باہر کی دُنیا کو رُوشناس کرایا جائے۔ تاکہ ہم پہچان سکیں کہ ہماری زندگی کس قسم کی تہذیب و ثقافت پر اُستوار ہے اور ہمیں اس بات کا مستقل احساس ہو جائے کہ مسلمانانِ پاکستان و ہند خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، شمال میں ہوں یا جنوب میں، ایک ہی ثقافتی رشتہ میں منسلک ہیں اور ایک ہی تہذیبی روایت کے علمبردار ہیں۔

محمد علاء الدین صدیقی

(پروفیسر علاء الدین صدیقی مدیرِ اعلیٰ)

۷۸۶

تعارف

مسلمانوں کو اس برِصغیر میں آئے ہوئے سوا تیرہ سو سال ہو چکے ہیں یہ اس لئے درست ہے کہ مکران ۶۴۳ء میں فتح ہو گیا تھا۔ اس طویل عرصے کو ہم چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ دور جو سلطان محمود غزنوی کی فتوحات پر ختم ہوا۔ یہ کوئی پونے چار سو سال کی مدت ہے۔ اس عرصے میں برِصغیر کے شمال مغربی علاقوں پر عربی زبان و ادب اور عربی تہذیب و تمدن کا تسلط رہا۔ دوسرا دور کوئی پانچ سو سال کا ہے، جو غزنوی عہد اور 'عہدِ سلاطین' پر مشتمل ہے۔ اس دور میں برِصغیر "دار السلام" کہلایا اور تہذیبی طور پر ملّتِ اسلامیہ کی عالمی وحدت کا رکن رہا۔ پانچ سو سالوں کے اس دور میں، جس کا آغاز محمود غزنوی کے ورود سے ہوتا ہے، فارسی ادب کا رواج ہوا اور فارسی زبان اظہار کا ذریعہ رہی۔ ویسے مغربی پاکستان کی سرزمین میں فارسی زبان اس عہد سے بھی پہلے پہنچ چکی تھی۔ بلکہ ملتان کے علاقے میں عام تکلمی زبان کی حیثیت[۱] حاصل کر چکی تھی۔ پھر تیسرا دور مغلیہ عہد ہے، جو ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک کی مدت پر محیط ہے۔ اس میں ملّتِ اسلامیانِ پاکستان و ہند نئے تہذیبی اثرات سے روشناس ہوئی اور معاشرے میں فکری مد و جزر کارفرما رہا۔ اس دور میں افکار اور خیالات میں وسعت پیدا ہوئی، اور اگرچہ اعتقادات میں ایک حد تک تزلزل کے آثار نمایاں ہونے لگے، لیکن تخریب اور انتشار کے ساتھ ساتھ تعمیر کا عمل بھی جاری رہا۔ اس پوری مدت میں فارسی

---

[۱] دیکھئے، چوتھی صدی ہجری کے ابن صاعد اندلسی کی تالیف "طبقات الاسلام"

کی ادبی اقدار ہماری تہذیبی زندگی کا محرک اور غالب عنصر تھیں۔ اس کے بعد مغربی تہذیب، اس کے اصول زندگی اور اس کے معاشی، سماجی اور معاشرتی افکار کی اشاعت ہوئی۔ چونکہ یہ دور نشر و اشاعت کا دور ہے، اور اس میں بعض وسائل فراہم ہونے سے تعلیم عوام تک پھیل گئی، اس لیے خیالات میں انقلاب پیدا ہونے لگا۔ اس ذہنی انقلاب نے کئی نئی صورتیں اختیار کیں اور اس کے نتائج آجکل ہماری خانگی، اجتماعی، سیاسی اور مذہبی زندگی میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ گذشتہ تین چار سو سال کی مدت میں اردو، بنگلہ اور دیگر زبانوں اور بولیوں کا علاقائی ادب بھی فنی پختگی کے ساتھ ساتھ حسنِ اظہار کا وصف پیدا کر چکا ہے۔

ادب میں معاشرتی اور تعلیمی عوامل منعکس ہوتے ہیں۔ زندگی کے تقاضے اظہار، احتجاج، طنز، شکایت، دعا یا الحاح کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس تاریخ ادبیات کا مقصد یہ ہے کہ ادب کو معاشرے کے ایک تقاضے کے طور پر پیش کیا جائے، تاکہ زندگی کے ہر رخ، قلبِ انسانی کی ہر کیفیت، روحِ کائنات کے ہر پرتو میں ہم آہنگی نظر آئے اور مسلمانانِ برِصغیر کی پوری زندگی اور ان کی تہذیب کا جامع عکس، ملی وحدت کا مکمل ثبوت، ہر اس زبان اور اس کے ادب میں یقین آفریں انداز میں پیش ہو، جو یہاں بولی جاتی رہی ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ہم جس تہذیبی ورثے کے مالک ہیں، وہ کتنا پائدار ہے اور اس میں کتنی توانائی اور استقامت موجود ہے۔

اس تاریخ کی تدوین میں دو تین باتیں خاص طور پر ملحوظِ خاطر رکھی گئی ہیں۔ اوّل یہ کہ کسی قوم کی تہذیبی اور ادبی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک اس قوم کی لسانی، ادبی اور معاشرتی سرگرمیوں کا پوری طرح اور ہمدردانہ انداز سے محاسبہ نہ کیا جائے۔ اس لئے ہم نے کوشش کی ہے کہ عربی، فارسی، ترکی، اردو، بنگلہ، پشتو، پنجابی، سندھی، کشمیری، بلتی، شینا، بروشسکی، کھوار، ہندکو، سرائیکی، بلوچی اور براہوی، غرض ہر اس زبان کے معاشرتی اور فکری پس منظر کی نشاندہی کی جائے، جو پاکستان میں بولی گئی ہے یا بولی جاتی ہے، اور جو ادبی تخلیقات اس ماحول سے ابھرتی ہیں، خواہ وہ ضرب الامثال ہوں یا لوک کہانیاں، گیت ہوں یا لوریاں، ان میں رزم، تصوف، فکر اور عمیق جذبات کی ترجمانی ہو یا محض

تفنن طبع کا سامان ، سبھی کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ سے کر اپنی قوم کی ادبی تاریخ مرتب کی جائے ۔ چنانچہ ہم نے زندگی کے ہر پہلو ، زبان کے ہر انداز اور فکر کی ہر جہت کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے اس طرح یہ تاریخ کامل طور پر اور صحیح معنوں میں ہماری ثقافت کی آئینہ دار ہو جاتی ہے ۔

علاقائی ادبیات میں خاص طور پر لوک ادب کا مقام بہت بلند ہے ۔ اور ہم نے اسے ادب عالیہ کا ایک رکن تصور کیا ہے ، اس لئے کہ ہر قوم کی ادبی تاریخ میں ، لوک ادب ایک معنی خیز کردار ادا کرتا ہے ۔ اکثر لوگوں کی زندگیاں اسی ادب کی اقدار سے متاثر ہوتی ہیں ، اور اسی کے کردار علامت بن کر اُن کے محرک بنتے ہیں اور ان کے استعمال کا جواز پیش کرتے ہیں ۔ اس لئے ادبی تاریخ میں اس کا ذکر ضروری ہے ۔

یہی حال ان مصنفین کا ہے ، جو عام طور پر دوسرے درجے کے ، یا بالفاظ دیگر چھوٹے مصنف شمار ہوتے ہیں ۔ یہ تو ظاہر ہی امر ہے کہ کسی قوم کی رفعت فکر اور اسکی جذباتی بلندی صرف انہی مصنفین کے کلام یا تصانیف میں نظر آئے گی ، جن کی نگاہ وسعت ، بلندی اور گہرائی کے لحاظ سے روزمرہ کے تجربات کے حدود میں مقید نہ ہو ، اس لئے کہ چھوٹے شاعر یا افسانہ نگار یا ناول نویس یا نثر لکھنے والے اپنے اپنے تجربے اور فنی کوشش کے دائرے میں محدود اور محصور ہوتے ہیں ۔ مگر یہاں یہ بات نظر انداز نہیں ہونی چاہیئے کہ اس دائرے سے اچھی طرح واقف ہونے کے باعث وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو ، جن سے عام لوگوں کی زندگی عبارت ہوتی ہے ، زیادہ توجہ سے قلم بند کرتے ہیں ۔ ان کی نظر وسیع نہیں ہوتی مگر وہ روزمرہ کے تقاضوں اور زندگی کے عام مشاغل اور قلبی واردات کے سطحی تاثرات کو صاف طور پر بیان کر دیتے ہیں ۔ چنانچہ ان کے ہاں عام زندگی کی عکاسی عظیم شعراء یا مصنفین کی نسبت بہتر طریقے سے ہوتی ہے ۔ اس لئے کسی قوم کی تہذیبی تاریخ مرتب کرتے وقت ان چھوٹے اہل قلم کی تخلیقات کا جائزہ لینا بھی اسی قدر ضروری ہوتا ہے جتنا ادبی عظماء کا ۔ چنانچہ اس تاریخ میں یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ۔ اس طرح ہمارا خیال ہے کہ یہ تاریخ مسلمانان پاکستان و ہند کی پوری ادبی زندگی کی ترجمان بن گئی ہے ۔

مذکورہ مطالب کے حصول کے لئے ہر ادب کا ذکر کرنے سے پہلے اس کے سیاسی اور معاشرتی پس منظر کو سامنے لایا گیا ہے، تاکہ قارئین کو معلوم ہوسکے کہ جن لوگوں کے تاثرات اور خیالات غالباً کی ہم عکاسی کر رہے ہیں، وہ اپنی اجتماعی زندگی کن ضوابط، کن پابندیوں اور کن اصولوں کے تحت بسر کرتے تھے۔ اس بنا پر اس تاریخ ادبیات کو در اصل ملّتِ اسلامیانِ پاکستان و ہند کی تہذیبی تاریخ تصوّر کرنا چاہیئے۔

سید فیاض محمود

گروپ کیپٹن سیّد فیّاض محمود
مدیر عمومی

پہلا باب

مقدمہ

تاریخ کی صبح کے دھندلکے میں سواحلِ ہند و سندھ اور جزیرۂ عرب ایک دوسرے سے متعارف اور مربوط نظر آتے ہیں[1]۔ طلوعِ اسلام تک یہ روابط محض تجارتی رہے۔ ان روابط کے طبعی اثرات آج بھی عربی زبان میں نمایاں ہیں۔ ایسی قدرتی پیداوار جو ہند و سندھ کے ساتھ مخصوص تھی، یا ایسی مصنوعات جن میں ہند و سندھ کو فوقیّت اور شہرت حاصل تھی، عرب ان کو ان کے ناموں سمیت لے جاتے تھے اور ہندی الاصل ناموں کی اپنے نطق کے مطابق 'تعریب' کر لیتے تھے۔ یہ مُتعرّب الفاظ خاصی تعداد میں دورِ جاہلیت ہی سے عربی زبان کا جزو بنے ہوئے ہیں[2]۔ چند ہندی الاصل مُتعرّب الفاظ کا قرآن میں پایا جانا بھی محقّق ہے[3]۔ اس قدیم عہد میں سواحلِ ہند و سندھ کی مقامی بولیوں پر عرب تاجروں کی آمدورفت اور ان کے ساتھ لین دین سے کیا اثرات مترتّب ہوئے، یہ نقطہ تحقیق طلب ہے۔ صرف اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح یہاں کے باشندوں کی نظریں عربوں سے مانوس تھیں، اسی طرح ان کے کان بھی عربی زبان سے آشنا تھے[4]۔ اس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ ہندی زبانوں کے اصل رسم الخط، یعنی براہمی کا رشتہ فینیقی تاجروں کے واسطہ سے عربی رسم الخط سے جا ملتا ہے[5]۔

---

1. A. H. L. Heeren : Historical Researches into the Politics, Intercourse and Trade of the Principal Nations of Antiquity, Oxford, 1833, Vol. 1.
   H. J, Rawlinson : Intercourse Between India and the Western World, Cambridge, 1926.

۲ - میرا مقالہ ''علاقات العرب التجارة بالہند''۔مجلة کلیة الآداب ، جامعة فواد الاول ، القاہرة ، مایو ۱۹۵۳ء -

3. Jaffery : Foreign Vocabulary of the Quran, Baroda, 1938.

۴ - سید سلیمان ندوی (عرب و ہند کے تعلقات ، الہ آباد ، ۱۹۳۰ء ص ۱۰ - ۱۱) 'ستیارتھ پرکاش' مصنفہ سوامی دیانند جی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ کورو اور پانڈو کی لڑائی میں عربی زبان خفیہ بات چیت کا ذریعہ تھی -

5. Cambridge History of India, 1, 140-142; Ency. Brit. "Sanskrit".
دوسرا رسم الخط - خروشتی ، جو شمال مغربی علاقہ میں رائج تھا اس کی اصل بھی سامی آرامی بتائی جاتی ہے -

۷۱۱ء / ۹۲ھ میں محمد بن قاسم دیبل پر حملہ آور ہوا تو تاریخ میں پہلی مرتبہ عرب و ہند کے سیاسی تعلقات کا آغاز ہوا۔ دیبل سے لیکر ملتان کے اوپر تک کے سارے علاقہ پر عرب مسلمانوں کی حکومت مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم ہوگئی اور یہ حصہ نہ صرف سیاسی لحاظ سے بلکہ ثقافتی اور تمدنی لحاظ سے برِ صغیر سے کٹ کر خلافتِ اسلامیہ کا جزو بن گیا ۔ سندھ پر عربوں کی حکمرانی کچھ اوپر ڈھائی سو سال رہی ۔ جیسا کہ ابھی اشارہ ہوا ، اس دور کی اسلامی فتوحات کی نمایاں خصوصیت سیاسی اقتدار کی حیرت انگیز ، تیز رفتار ، غیر متزلزل توسیع نہیں بلکہ سیاسی اقتدار کے جلو میں دینِ اسلام ، عربی زبان و ادب اور اسلامی علوم و فنون کی دلربائی اور کار فرمائی ہے ۔ عرب پہلے ہی اپنی زبان پر کیا کم نازاں تھے[1] ۔ اسلام نے "لسانِ عربی مبین" کو وہ شرف اور توانائی بخشی کہ اس کی برتری تمام مسلمانوں کے لیے ایک حقیقت بن گئی ۔ عام دستور کے مطابق سندھ میں عرب فاتح عربی زبان اور دینِ اسلام کا سرمایہ لائے ۔ یہ یاد رہے کہ تقریباً دوسری صدی ہجری یعنی آٹھویں صدی عیسوی کے وسط تک عربی میں باقاعدہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع نہ ہوا تھا ۔ قرآن ، احادیث ، آثار ، اخبار اور عربی شعر کا سرمایہ تھا جو حفظ ، نقل ، روایت اور املاء کے ذریعہ باقی اور نمو پذیر تھا ۔ کتابت پر بھروسہ نہ تھا ، تحریر مقصود بالذّات نہ ہوتی تھی ، بلکہ اس سے صرف حفظ میں مدد لی جاتی تھی[2]۔ منقول کا یہ سرمایہ تعلیم و ثقافت اور تشریع و حکومت کی تمام ضروریات کا کفیل تھا ، عقل اور فہم (فقہ) اسی سرمایہ کی 'تفریع' اور افزائش میں لگی رہتی تھی اور بڑھتے ہوئے تمدن و تعمیر کے نت نئے تقاضے پورے کرتی رہتی تھی ۔ آگے چل کر یہ حقیقت اوجھل نہ ہو جائے کہ علم و فن کا دائرہ برابر پھیلتا گیا اور اس کا محیط بڑھتا گیا ، لیکن منقول کا یہ سرمایہ مرکزی نقطہ کی حیثیت سے اپنی جگہ رہا ۔ اس سرمایہ کے حاملین ، قراء و حفاظ و محدثین ، بڑے اہتمام کے ساتھ فوجی قائدین اور عمالِ حکومت کے ساتھ نئے مفتوحہ ممالک میں بھیجے جاتے تھے ۔ بہتیرے نشرِ دین کے جذبہ سے سرشار خود بھی چلے آتے تھے اور کبھی نو مسلم قرآن و سنت کے حامل علم و طبل لیے ہوئے غازیوں کی صف میں شامل ہوتے تھے[3]۔ چنانچہ ایک درخشندہ مثال خواجہ حسن بصریؒ کے شاگرد ابو حفصؒ (ابوبکر) ربیع بن صبیح کی ہے جو تبع تابعی ہیں اور روایت حدیث میں بلند پایہ رکھتے تھے ۔ حاجی خلیفہ کے قول کے مطابق مسلمانوں میں انہوں نے سب سے پہلے 'تصنیف و تبویب' کی ۔ غزوہ میں شریک ہو کر سندھ آئے اور وہیں ۷۷۶ء/

---

۱ ۔ قرآن ۲۶/۱۹۵ ۔

۲ ۔ الجاحظ الحیوان ۱/۶۱ (فیئس مستودع العلم القراطیس) ۔

۳ ۔ اسحاق ، مطالعہ حدیث میں ہندوستان کا حصہ ، ص ۲۳ ۔

۱۶۰ھ میں وفات پائی[1] - دوسری مثال محمد بن یعقوب الثقفی کی ہے جو محمد بن قاسم کی معیّت میں آئے اور الرّور کے قاضی مقرر ہوئے - ان جیسے اور کتنے ہی عالم باعمل ہونگے[2]، جنھوں نے مساجد کی تعمیر کے فوراً بعد کھمبوں کے سہارے بیٹھ کر اپنے گرد درس کے حلقے قائم کیے، جن میں چراغ سے چراغ جلتے رہے اور تعلیم و تربیت کے سلسلے آگے بڑھتے اور پھیلتے رہے - موسی بن یعقوب الثقفی، جن کا ذکر ابھی گزرا ہے ان کا خانوادہ ساتویں صدی ہجری یعنی تیرھویں صدی عیسوی میں بھی الرّور کی مسند قضاء و خطابت پر متمکّن نظر آتا ہے[3]- منصورہ میں بھی المقدسی ۹۸۶ء/۳۷۵ھ سے کچھ پہلے ایک نمایاں علمی شخصیت محمد[4] (ابو العباس) احمد بن محمد بن صالح التمیمی کا پتہ چلتا ہے جو وہاں کے قاضی تھے اور درس دیتے تھے - داؤد اصفہانی (م- ۸۸۳ء/۲۷۰ھ) کے متبع ظہری المذہب[3] تھے، عراق و فارس سے علمی روابط رکھتے تھے، صاحب تصانیف مشہور تھے - ان کی تین کتابوں کے نام ہی نام ملتے ہیں[5] - الرّور اور منصورہ کے علاوہ دیبل اور دوسرے درجہ میں ملتان اور قصدار کی بابت بھی یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں[6] عربیۃ اور منقول کے درس و تدریس کے قدیم ترین مراکز ہیں -

سندھ خلافت اسلامیہ کا ایک دور افتادہ مشرقی سرحدی صوبہ تھا - اس غربت کی فضا میں عربیۃ اور منقول کا پودا لگانا بجائے خود ایک بڑا کارنامہ ہے اور یہ بات بیحد قابل تعریف ہے کہ یہ پودا ہمیشہ کے لیے اس سرزمین میں جڑ پکڑ گیا اور مقامی لوگ اس کے سایہ میں آرام سے رہتے رہے اور اس کے پھل کھاتے رہے - البتہ اگر یہاں کی پیداوار اس قابل نہ ہوئی کہ سیاسی اور علمی مراکز کی توجہ کا باعث ہوتی تو کوئی تعجب کی بات نہیں - کہنا یہ ہے کہ اس دور کے مقامی علماء کے تذکروں کا پتہ نہیں چلتا - علمی کارنامے اگر کچھ رہے ہوں تو ان کا ضائع ہو جانا بھی بعید از قیاس نہیں - لیکن اس کے ساتھ یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ اگر یہاں ایسی علمی شخصیتیں اور بلند پایہ تصانیف ہوتیں جو باہر کے حلقوں میں جاذب توجہ ہوتیں تو ان کا کچھ نہ کچھ ذکر ضرور

---

۱ - اسحاق، مطالعہ حدیث میں ہندوستان کا حصہ، (انگریزی) ۲۷ - ۲۸ -

۲ - ایک نمایاں نام ابوموسی اسرائیل بن موسی البصری 'نزیل الہند'، م - تقریباً ۷۷۱ء/۱۵۵ھ کا ہے - ثقافۃ، ۱۳۵ اور اسحاق ۲۵ - ۲۶ میں اور بہت سے نام ملیں گے -

۳ - لحظ ح ۱۵ لحق -

۴ - المقدسی، احسن التقاسیم، لائڈن، ۱۹۰۶ء، ص ۴۸۱ - اہل منصور کو 'اصحاب الحدیث' بتاتا ہے -

۵ - اسحاق، مطالعہ حدیث میں ہندوستان کا حصہ (انگریزی)، ص ۳۸ -

۶ - اصطلاح ہے، جس کا اطلاق عربی کے تمام علوم لسانیہ پر ہوتا ہے -

ملتا ، جس طرح کہ قاضی منصوری اور ان کی مصانیف کے نام ملتے ہیں ۔ ہاں ایک موضوع ضرور ایسا تھا کہ نئی بستیاں آباد کرنے والے اس کا خاص اہتمام کرتے تھے اور وہ تھا سندھ کی تاریخ ۔ فتح سے قبل اور فتح کے بعد اس موضوع پر ساتویں صدی ہجری یعنی تیرھویں صدی عیسوی میں الرّور کے مشہور خاندان قضاۃ کے سربراہ، قاضی اسماعیل بن علی الثقفی ، کے پاس ایک مجموعہ تھا ، جو ان کے آبا و اجداد کی کاوشوں کا ثمرہ تھا اور خاندانی ورثہ کے طور پر نسلاً بعد نسلاً ان تک پہنچا تھا ۔ علی بن حامد بن بکر الکوفی الاوسی نے اسی اصل سے ترجمہ کرکے 'چچ نامہ' مرتّب کیا[1] ۔ عربی اصل ضائع ہوگئی اور اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس سلسلہ کی کچھ اور تالیفات بھی رہی ہوں گی جو فنا ہوگئیں ۔

ہندوستان کے قدیم علوم مثلاً ریاضی ، نجوم ، طب ، فلسفہ ، بلاغت ، کے ماہرین جب نئے حکمرانوں سے ستائش اور صلہ کے طالب ہوتے تو وہ بھی سندھ کو چھوڑ کر بغداد کا رخ کرتے[2] ۔ اس میں شک نہیں کہ بغداد میں ان علوم کی ویسی ہی قدر ہوئی اور ان سے ویسا ہی استفادہ کیا گیا ، جیسا کہ چاہیے تھا ۔ البتہ اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ سندھ میں مقامی طور پر اعلیٰ علمی و تخلیقی کام کے مواقع میسّر نہ تھے ۔ اسی دور میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ عراق و شام کی علمی دنیا میں سندھیوں نے تعداد اور مرتبہ ہر دو لحاظ سے بڑا نام پیدا کیا ۔ ان میں وہ موالی بھی تھے جو جنگی قیدیوں کی حیثیت سے لے جائے گئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عرب معاشرہ میں ضم ہوگئے اور وہ رہ نوردِ شوق بھی تھے جو طلبِ علم کی خاطر گھر سے نکلے اور کبھی گھر نہ لوٹے ۔ سازگار فضا ملتے ہی ان میں بلند پایہ شاعر ، مثل ابوعطاء السندھی[3] وابوالضلع السندھی اور جلیل القدر راوی اور محدّث ، مثل ابو جعفر الدیبلی[4] پیدا ہوئے ۔ مرزبوم ان کی فطری صلاحیتوں پر فخر کرنے کا حقدار ہے ، جس طرح کہ خود ان کو اپنے آبائی وطن پر ناز تھا[5] ۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ عیاں ہے کہ سندھ میں زیادہ سے زیادہ اس درجہ کی تعلیم میسّر تھی ، جو اعلیٰ تعلیم کا شوق دلا دے ۔

---

۱ ۔ علی بن حامد بن بکرالکوفی ، چچ نامہ ، ص ۸ ۔

۲ ۔ الیعقوبی ۲/۳۳۴ ۔ البیان والتبیین (تحقیق عبدالسلام ہارون) ۹۲/۱ ۔ البیرونی ، (کتاب الہند زخاو) ، ص ۲۰۸ ۔

۳ ۔ نتف من شعر ابی عطاء السندھی ، تحقیق الدکتور نبی بخش بلوچ ، حیدر آباد ، ۱۹۶۱ء ۔

۴ ۔ م ۔ ۹۳۴ء/۳۲۲ھ ۔ اسحاق ، مطالعہ حدیث میں ہندوستان کا حصہ (انگریزی) ص ۳۱ ۔ خلف بن محمد الدیبلی (م تقریباً ۲۶۰ کا نام بھی اہم ہے ۔ ان کے متعلق تصریح سے مذکور ہے کہ دیبل میں علی بن موسی الدیبلی کے حلقہ سے فارغ ہو کر باہر گئے تھے ۔ منہ ۔ ۳۴

۵ ۔ مثلاً ابوالضلع (یا 'ابوالاصلع') کا قصیدہ ۔ القزوینی ۔ الآثار ، ص ۸۵ والحیوان ۷ ۔ ۵۰ ۔

یہ تو ظاہر ہی ہے کہ عربوں کے عہدِ حکومت میں عربی سرکاری درباری زبان تھی ۔ تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) کے عربی کتبے جو بھمبور سے برآمد ہوئے ہیں اس سے اس کی شہادت بھی مل گئی ہے ۔ عام دستور کے مطابق عرب والیانِ سندھ بھی وقت کے مشہور شعراء سے روابط رکھتے تھے ۔ مطیع بن ایاس ، ہشام التغلبی کے دربار میں حاضری دینے سندھ آیا ۔ اس نے اپنی محبوبہ 'روق' کے نام جو ابیات لکھی ہیں ان میں یہاں کے خوفناک درندوں اور عجیب حیوانات کا ذکر کیا ہے[1] ۔ حکمران طبقہ کی زبان ہونے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ ابنِ حوقل اور مقدسی کی شہادت کے بموجب چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں منصورہ ، ملتان اور دیبل کے بازاروں میں عربی اور سندھی دونوں زبانیں بولی جاتی تھیں[2] ۔ ان حالات میں جو کہ سندھ میں تھے ، جہاں کہیں بھی دو زبانیں بولی جاتی ہیں وہاں ایک مخلوط بول چال کی بھی داغ بیل پڑتی ہے ۔ اگر شہادت مل سکے تو کوئی تعجب نہیں کہ یہ قیاس صحیح ثابت ہو ۔

چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کے نصف آخر میں سندھ کے سیاسی خلفشار نے انقلاب کی شکل اختیار کی ۔ ملتان اور منصورہ میں اسماعیلی برسرِ اقتدار آئے ، پھر انہیں کے ہم مشرب سومرہ نے زمامِ حکومت سنبھالی ۔ الغرض آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) کے وسط تک 'سنّت' کے چمن میں خزاں ہی خزاں رہی ۔ اس طویل عرصہ میں شاذ و نادر ہی کوئی 'سندھی' نسبت رکھنے والا ملے گا جس نے باہر کی علمی دنیا میں نام پیدا کیا ہو ۔ سندھ سے طلبِ علم کے لیے رحلت کا سلسلہ یکایک بند ہو جانا بھی یہ بتاتا ہے کہ اس میں مقامی علمی فضا کو بڑا دخل تھا[3] ۔

چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کے ربع آخر میں غزنویوں نے شمال مغرب سے خروج کیا ۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں اسلامی عربی ثقافت و معیارِ فضیلت اور اس کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کی درآمد اور ترویج کا ایک نیا راستہ کھلا ۔ اس راستہ سے علم و ثقافت کی جو نہر تعمیر ہوئی اور جس نے مسلسل آئندہ کئی صدیوں تک ہندوستان کے کونے کونے کو سیراب کیا ، اس کا منبع خراسان و ماوراء النہر تھا ۔ وسط ایشیا کا یہ علاقہ اسلام کا اہم علمی و ثقافتی مرکز بن چکا تھا اور عراق و شام کی وراثت اور ہمسری اس کو زیب دیتی تھی ۔ عربیة اور منقول پر یہاں بھی تعلیم کی

---

۱ ۔ الجاحظ ، الحیوان (تحقیق عبدالسلام ہارون) ، ۷/۱۷۰ تا ۱۷۱ پہلا اور دوسرا کتبہ علامہ عبدالعزیز میمن کی مدد سے پڑھا گیا ہے ۔

۲ ۔ ابن حوقل (لائڈن ۱۹۳۸ء) ، ص ۳۲۵ ۔ المقدسی ، ص ۴۷۹ ۔

۳ ۔ اسحاق ، مطالعہ حدیث میں ہندوستان کا حصہ ، (انگریزی) ص ۴۳ ۔

اساس تھی ۔ البتہ مقامی ضروریات کے مطابق عربیۃ میں کچھ تغیّرات شامل ہوگئے تھے۔ اسی طرح زمانے کی رفتار کے ساتھ منقول کے عام ارتقائی مدارج نے یہاں فروغ پایا تھا ۔ عربیۃ کو نصابِ تعلیم میں جو مقام شروع میں حاصل تھا وہ اب بھی بدستور تھا ۔ صرف اتنا تھا کہ روزمرّہ بول چال میں خالص عربی اپنی جگہ چھوڑ چکی تھی ۔ اس کے نتیجہ میں پہلوی اور عربی کی آمیزش سے جو جدید فارسی وجود میں آئی تھی وہ شعر و انشا میں اپنی جگہ بنا رہی تھی ۔ لیکن ایک طرف نو جدید فارسی وزن ، بحر ، قافیہ، اصناف سخن ، صنائع بدائع میں عربی کی تابع تھی اور عربی کو اپنے لیے قوت و شوکت اور جمال و زینت کا سرمایہ مانتی تھی ، دوسری طرف مجلسی ادب سے ماورا بلند پایہ علمی تصنیف کے میدان میں عربی کی فوقیت مسلّم تھی ۔ نظامی عروضی سمرقندی اپنے وقت کے دبیر کے لیے مندرجہ ذیل نصاب تجویز کرتا ہے :

"پس عادت باید کرد خواندن کلام رب‌العزة و اخبار مصطفیؐ و آثار صحابہؓ و امثال عرب و کلمات عجم و مطالعہ کتب سلف و مناظرہ صحف خلف چون ترسل صاحب و صابی و قابوس و الفاظ و امامی و قدامۃ بن جعفر و مقامات بدیع و حریری و حمید و توقیعات بلعمی و احمد حسن و ابو نصر کندری و نامہ ہای محمد عبدہ و عبدالحمید و سید الرؤساء و مجالس محمد منصور و ابن عبادی و ابن النسابۃ العلمی ، و از دواوین عرب دیوان متنبی و ابیوردی و غزی و از شعر عجم اشعار رودکی ، مثنوی فردوسی و مدائح عنصری[1] "۔

اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ماہرینِ علوم کا تو ذکر ہی کیا ، فارسی کے ادیبوں اور دبیروں کے لیے عربیۃ کا کیا مقام تھا اور عربیۃ کے تناور درخت پر فارسیۃ کی جو بیل چڑھ رہی تھی وہ کس حد تک اس سہارے کی محتاج تھی ۔ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ 'احمد حسن' جن کا نام اوپر کے اقتباس میں گزرا ، یہ وہی احمد بن الحسن المیمندی ، وزیر سلطان محمود غزنوی و سلطان مسعود ہیں جنھوں نے حکم دیا تھا کہ سرکاری تحریروں کی زبان عربی ہو نہ کہ فارسی ، جس کے رواج کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا ، نہ صرف یہ بلکہ وہ فارسی کے استعمال کو صراحتاً جہل سے نسبت دیتے ہیں[2]۔ جہاں تک علمی تصنیف کا تعلق ہے ابو ریحان البیرونی کے مندرجہ ذیل الفاظ قولِ فیصل کا حکم رکھتے ہیں :

"ہر قوم کو اپنی زبان شیریں معلوم ہوتی ہے ، اسی سے وہ مانوس ہوتی ہے ، اسی کی عادی ہوتی ہے اور اسی کو اپنی ضروریات کے لیے استعمال

---

۱ - چہار مقالہ ، بکوشش دکتر محمد معین ، چاپ سوم ، تہران ۱۳۳ ، ص - ۲۲ -

۲ - عتبی ، تاریخ یمینی ، (قاہرہ) ، ص - ۱۴۰ - چہار مقالہ ، تعلیقات ، ص ۲۵ -

کرتی ہے . . . . . . میرا اپنا یہ حال ہے کہ پیدائش کی رو سے جو زبان میرے حصہ میں آئی (خوارزمی زبان مراد ہے) وہ ایسی ہے کہ اگر اس میں کسی علم کو محفوظ کیا جائے تو ایسا ہی عجیب معلوم ہوگا جیسے اونٹ نالی کے منہ میں یا زرافہ پیالے میں ۔ چنانچہ میں نے اسے چھوڑ کر عربی اور فارسی کو اختیار کیا ۔ میں ان دونوں زبانوں میں دخل رکھتا ہوں اور دونوں کو شعوری طور پر برتتا ہوں ۔ عربی میں ہجو مجھے زیادہ پسند ہے بہ نسبت فارسی میں مدح کے ۔ میرے قول کی سچائی ہر وہ شخص جان لے گا جو کسی علمی کتاب کے فارسی ترجمہ کو غور سے دیکھے گا کہ اس کی رونق اڑ جاتی ہے ، اس کی روح بڑ مردہ ہو جاتی ہے اور اس کا منہ کالا ہو جاتا ہے ۔ غرض اس کا کوئی فائدہ باقی نہیں رہتا اس لیے کہ یہ (فارسی) زبان بادشاہوں کے اخبار اور بزم شبانہ کی خوش گپیوں کے علاوہ کسی مصرف کی نہیں[1] "۔

جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے ، صدیوں علمی تصنیف و تدریس میں عربی کا یہی مقام رہا اور فارسی کا استعمال اور اس کی ترقی مجلسی ادب اور تاریخ نویسی تک محدود رہی ۔

منقول کی بابت یہ ہے کہ کتاب و سنت اور آثار صحابہؓ کے تحقیقی مطالعہ اور ان سے استنباط احکام کا عمل بالآخر فقہ کی تدوین اور مذاہب اربعہ کے استقرار پر ختم ہوا۔ یہ فطری ارتقاء کی ایک شکل تھی جو کم و بیش سارے عالم اسلام میں عام ہوئی ۔ اس کے بعد قضاۃ کی ضرورتوں کے پیش نظر فقہ پر زیادہ زور دیا جانے لگا ، گو تفسیر و حدیث اور فقہ کے مآخذ کی حیثیت سے کسی نہ کسی حد تک بدستور نصاب کا جزو رہے ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ محمد عوفی بھی ثقافت عامہ کے لازمہ کے طور پر حدیث کی سند حاصل کرتا ہے[2] ۔

عربیۃ اور منقول کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے افق وسیع ہوتا گیا اور تمدن آگے بڑھتا گیا ، مسلمان اجنبی علوم کے ذخیرے سمیٹتے گئے تا آنکہ 'معقول' (منطق، فلسفۃ ، ریاضی ، ہیئت) نے بھی نصاب تعلیم میں اپنی جگہ بنا لی ۔ بعض مسلم اقوام نے ان میں امتیاز حاصل کیا، چنانچہ وسط ایشیا کے علمی مراکز اس سلسلہ میں خاصے نمایاں ہوئے ۔

الغرض (الف) عربیۃ جس کے ساتھ فارسیۃ ضمنی طور پر وابستہ تھی ۔ (ب) منقول، جس میں فقہ مقصود بالذات بن چکی تھی اور (ج) معقول ، جس کا نیا نیا چرچا تھا ، ان

---

۱ ۔ احمد امین ، ظہر الاسلام ، ۱ ۔ ۲۸۹ منقول از 'کتاب الجماہر فی معرفۃ الجواہر' البیرونی ۔

۲ ۔ لباب الالباب ، بکوشش سعید نفیسی ، ترجمہ منصف ۔

تین عناصر پر مشتمل نصابِ تعلیم اور معیارِ ثقافت و فضیلت لیےہوئے غزنوی شاہ و سپاہ لاہور پہنچی، جہاں پہلے ہی شیخ محمد اسمٰعیل لاہوری (م - ۱۰۵۶ع/۴۴۸ھ) درسِ تفسیر و حدیث کی بناء ڈال چکے تھے[1] - اسی کو لے کر غوری اجمیر اور دہلی گئے اور وہاں سے اسی کا سلسلہ مختلف صوبوں کے علمی مراکز تک دراز ہوا - دہلی کے مدرسہ معزّیہ و مدرسہ ناصریہ سے باقاعدہ سرکاری مدارس (جو نجی حلقہ ہائے درس سے ضبط و نظم میں ممتاز تھے) کی جو روایات آگے چلیں وہ اتنی تیزی سے پھلی پھولیں کہ تغلقوں کے دور میں ایک ہزار مدرسے صرف دہلی میں موجود تھے - ان مدرسوں کا تعلق خراسان و ماوراء النہر کے علمی مراکز سے تھا اور انہیں کے نمونہ پر ان کی تشکیل ہوئی تھی - اکثر و بیشتر وہیں سے ان کے لیے نامور مدرسین آتے تھے اور وہیں سے نصاب کی اعلیٰ کتابیں درآمد ہوتی تھیں - ان کا نصاب نو مادہ پر مشتمل تھا جو انہی تین عنوانات (عربیۃ ، منقول اور معقول) کے ذیل میں آتے ہیں -

غیاث الدین بلبن کی سرپرستی میں جو علماء درس و تدریس میں مشغول تھے ان میں تقریباً سبھی ، 'الفقہ و الاصول و العربیۃ' کے ماہر بتائے جاتے ہیں[2] - مدارس کا نصابِ تعلیم اور علماء کا دائرۂ اختصاص دونوں پتہ دیتے ہیں کہ ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں غلبہ فقہ و اصولِ فقہ (منقول) اور عربیۃ کو حاصل تھا - معقول شاملِ نصاب تھا ، لیکن اسے چنداں اہمیت نہ دی جاتی تھی - تصوّف بھی ایک مادۂ تدریس کی حیثیت سے ملتا ہے اور شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی (م - ۱۲۶۷ع/۶۶۶) کی مثال سے ظاہر ہے کہ باقاعدہ تعلیم کے بعد ہی عملی ارشاد کی منزل تھی - تصوّف مجرد ریاضت نہ تھا بلکہ ریاضت سے پہلے ایک علم تھا اور اور اس علم کو علمِ شریعت کا ضمیمہ ، نہ کہ قسیم شمار کیا جاتا تھا -

فقہ و اصول کے ذوق و شوق کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ المرغینانی کی 'ہدایۃ' ان کے براہِ راست شاگرد برہان الدین محمود بن ابی الخیر اسعد البلخی(۱۲۷۹ع/ ۶۷۸ھ) کے ساتھ ہندوستان آئی اور ایسی رائج ہوئی کہ آج تک اسے کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلا سکا -

آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) میں محمد بن تغلق نے 'معقول' کی سرپرستی میں کچھ اور اضافہ کیا[3] - تا آنکہ نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) میں جب شیخ عبداللہ التلنبی اور شیخ عزیز اللہ نے ملتان کو خیرباد کہا

۱ - اسحاق ، مطالعہ حدیث میں ہندوستان کا حصہ (انگریزی) ، ص ۳۵ تا ۳۶ ثقافۃ ۱۱ تا ۱۲
۲ - عبدالحی ، نزہۃ الخواطر - ج ۱ ، المئۃ السابعۃ -
۳ - اسحاق ، ۵۴ تا ۵۵ - سبحۃ ، ۳۷ ، ثقافۃ - ۱۳ - ۱۴ -

اور سکندر لودھی کے دربار میں شرف و منزلت حاصل کی تو معقول کا پلہ خاصا بھاری ہوگیا[1] ۔ گو دین و دنیا دونوں کے لیے فقہ و اصول کی ضرورت و اہمیت بحال تھی اور عربیۃ کے بغیر تو علم و ثقافت کا دروازہ کھلنا ممکن ہی نہ تھا ۔

البتہ فقہ و اصول اور پھر معقول کے عروج کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ غزنوی دور سے لے کر نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) تک حدیث کا اہتمام برابر گھٹتا گیا اور آخر میں نو نصابِ تعلیم میں اس کی شمولیت برائے تبرک ہی رہ گئی[2]۔ اس تمام عرصہ میں لے دے کر ایک صاغانی (م - ۱۲۵۲ء/۶۵۰ھ) کا کارنامہ نظر کے سامنے ابھرتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ 'مشارق الانوار' خوب مقبول ہوئی ، پڑھی پڑھائی گئی ، اس پر کثرت سے حواشی لکھے گئے لیکن جس طرح عمرو بن کلثوم کے قصیدہ نے بنو تغلب کو تمام کمالات سے بے پروا بنا دیا تھا ، اسی طرح اس کتاب نے حدیث کے وسیع فن اور ذخیرہ سے توجہ ہٹائی ۔ 'مشارق الانوار' سے اگر کوئی آگے بڑھتا تھا تو ایک اور قدم چل کر بغوی کی 'مصابیح السنۃ' پر انتہا ہو جاتی تھی اور بس[3] ۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تیار شدہ فقہ پر بھروسہ اورِ تقلید کی سہل انکاری اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ فقہ اور اس کے ماخذ یعنی حدیث کے درمیان کوئی ربط باقی نہیں رہاتھا ۔ اس صورتِ حال سے ۱۳۰۰ء/۷۰۰ھ میں شیخ شمس الدین ترک محدث مصر اس قدر کبیدہ خاطر ہوئے کہ انہوں نے ہندوستان میں قیام گوارا نہ کیا اور الٹے پاؤں واپس چلے گئے۔ اس سلسلہ کا سب سے دلچسپ واقعہ وہ ہے جو حضرت نظام الدین اولیاء (م - ۱۳۲۴ء/۷۲۵ھ) اور فقہائے وقت کے درمیان پیش آیا ۔ نظام الدین اولیاء احادیث سے سماع کی حلت ثابت کرنا چاہتے تو فقہاء احادیث پر کان نہ دھرتے اور ثبوت کی زحمت کے بغیر ہی امام ابو حنیفہ کے قول کی قطعیت پر اڑے رہتے[4] ۔ اس واقعہ سے بعض لکھنے والوں کو یہ خیال ہوا کہ اس دور کے صوفیہ نے حدیث کی کوئی علمی خدمت انجام نہیں دی ، حالانکہ بنظرِ غائر دیکھا جائے تو حدیث کے ساتھ صوفیہ کی دلچسپی کی نوعیت اور اس کے محرکات و نتائج کا تجزیہ کچھ اور ہی بتاتا ہے ۔ انہوں نے احادیث میں تحقیق کے بجائے مسامحت کو تقدس کے سہارے رواج دیا ۔ نظام الدین اولیاء کی

---

۱ - عبدالحی ، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ، ص ۱۳ ۔

۲ - عبدالحی ، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۱۳ - 'علی طریقۃ البرکۃ لا للعمل بہ' ۔

۳ - نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) کے وسط تک دہلی اور جونپور جیسے علمی مرکزوں میں ان دو کتابوں اور شرح معانی اثار للطحاوی کے علاوہ کسی کتاب کا نام تک سنائی نہیں دیتا ، اسحاق ، ۵۷ تا ۷۶ ۔

۴ - عبدالحی ، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ، ص ۱۲، ۱۳ ، اسحاق ، مطالعہ حدیث میں ہندوستان کا حصہ (انگریزی) ص ص ۴۹ تا ۵۰ ، ۵۵ ۔

'فوائد الفواد' میں بہت سی ناقابل اعتماد احادیث پائی جاتی ہیں[۱] - علی الهمدانی (م - ۱۳۸۴ء/۷۸۶ھ) نے 'السبعین فی فضائل امیر المؤمنین' تالیف کی جو فردوس دیلمی کی سند سے ماخوذ ہے اور وہ ناقابل اعتماد ہے[۲] - ان کے شاگرد قاضی حسین الشیرازی نے 'احادیث رتینہ' (بابا رتن ہندی کی احادیث ، جن کی بابت کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ کی صحبت سے سرفراز ہوئے اور تیرھویں صدی عیسوی تک زندہ رہے) جمع کیں - صرف شرف الدین المنیری (۱۲۶۳ء/۶۶۱ھ - ۱۳۸۰ء/۷۸۲ھ) کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے صحیحین کے درس کو رواج دیا[۳] - لیکن مطابق 'حال' احادیث کے بارے میں مسامحت اور چیز ہے - انصاف کی بات یہ ہے کہ اس دور کے صوفیہ صاحب علم تھے ، یہی وجہ ہے کہ تصوف نصاب تعلیم کا جزو تھا ، اس سے خارج نہ تھا - یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صوفیہ کے حلقے علم سے زیادہ ظرف وادب کی تربیت گاہ تھے - چنانچہ نظام الدین اولیاءؒ نے شمس الدین خوارزمی سے باقاعدہ ادب عربی کا درس لیا اور 'مقامات حریری' حفظ کی ، پھر نظام الدین اولیاءؒ کے شاگرد شیخ نصیرالدین چراغ دہلیؒ (م - ۱۳۵۶ء/۷۵۷ھ) ، ان کے تینوں شاگرد ، احمد التهانیسری (م - شروع تیرھویں صدی عیسوی) ، سید محمد گیسو درازؒ (م - ۱۴۲۱ء/۸۲۵ھ) اور قاضی عبدالمقتدر (م - ۱۳۸۸ء/۷۹۱ھ) اور مؤخرالذکر کے شاگرد قاضی شہاب الدین دولت آبادی ہوئے اور یہ پورا سلسلہ عربی شعر و ادب کے ذوق میں ممتاز ہوا -

تاریخ میں بارہا دیکھا گیا ہے کہ بوڑھی سلطنتوں کے دور دراز کے علاقوں پر جہاں مرکز کی گرفت ڈھیلی پڑی ، چھوٹی چھوٹی نوخیز ریاستیں وجود میں آئیں - یہ عمل جسے سیاسی انحلال سے تعبیر کیا جاتا ہے ، بسا اوقات علمی و ثقافتی سرگرمیوں کے تنوّع ، تجدید اور تیز رفتاری کا موجب ہوتا ہے - چنانچہ جب آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) کے وسط میں بہمنی اور اسی صدی کے اختتام پر گجرات کی مظفر شاہی سلطنتیں ابھریں تو یوں کہنا چاہیے کہ علم کے دو نئے دروازے کھل گئے' گجرات تو خاص طور پر تقریباً دو صدی تک علماء کی آماجگاہ بنا رہا - مغربی ساحل پر ان دو ریاستوں کے قیام سے سمندر کے ذریعہ حجاز اور مصر سے مواصلات کا سلسلہ استوار اور آسان بن گیا - حجاج کی آمد و رفت اتنی بڑھی کہ گجرات 'باب مکہ' کہلانے لگا - حسن اتفاق کہ انہی دنوں مصر اور حجاز علم حدیث کے مرکز بنے ہوئے تھے اور ابن حجر اور سخاوی کے سلسلہ کا فیض عام تھا - ہندوستان کے علماء جو حجاز سے فیضیاب ہو کر

---

۱ - اسحاق ، مطالعہ حدیث میں ہندوستان کا حصہ - غلام علی آزاد بلگرامی ، سبحة المرجان ص ۳۷ -

۲ - منہ - ۴۲ -

۳ - منہ ۶۴ - ۶۸ -

لوٹے ، انہوں نے اپنے ملک میں علوم کی تجدید ، خاص طور پر علمِ حدیث کے احیاء کی مہم چلائی ، جیسے شیخ جمال الدین محمد بن طاہر پٹنی (م - ۱۵۷۸ء/۹۸۶ھ) اور یعقوب بن الحسن کشمیری (م - ۱۵۹۴ء/۱۰۰۳ھ)[۱] - گجرات ، دکن نیز مالوہ اور خاندیش کے امراء کی علم دوستی اور فیاضی کی شہرت سن کر کتنے ہی عالم و محدث مصر ، حجاز اور یمن سے ہندوستان آئے اور یہیں رہ پڑے - انہوں نے پرانے ٹمٹماتے چراغوں کی لو تیز کی اور نئے چراغ بھی روشن کیے - ان کے ممتاز نمائندے شیخ عبدالمعطی (م - ۱۵۸۱ء/ ۹۷۹ھ) ، ابن الدمامینی (م - ۱۴۲۳ء/۸۲۸ھ) ، عمر بن محمد الدمشقی 'نزیل کنبایت' ، جمال الدین احمد بحرق الحضرمی (م - ۱۵۲۲ء/۹۲۹ھ) اور آل عیدروس ہیں - اس کے ساتھ (تیرھویں چودھویں صدی عیسوی) سے پھر یکے بعد دیگرے ایسے مہاجرین کے نام ملتے ہیں جو طلب علم کے لیے نکلے ، حجاز اور دیگر ممالک میں تدریس اور افتاء کی مسند پر متمکن ہوئے اور وہیں کے ہو رہے - ان میں خاص طور پر قابلِ ذکر ابوحفص سراج الدین عمر بن اسحاق الہندی (م - ۱۳۷۱ء/۳۳۷ھ) ، شیخ صفی الدین محمد بن عبدالرحیم الہندی (م - ۱۳۱۵ء/ ۷۱۵ھ) اور علی متقی برہانپوری (م - ۱۵۶۷ء/۹۷۵ھ) اور ان کے تلامذہ ہیں - دریا سے گہر کی جدائی کا یہ سلسلہ تیرھویں صدی ہجری (انیسوی صدی عیسوی) کے آخر تک ٹوٹتا دکھائی نہیں دیتا - ابوالحسن (نورالدین محمد عبدالہادی) السندھی (م - ۱۷۲۵ء/ ۱۱۳۸ھ) ، محمد حیات السندی (م - ۱۷۴۹ء/۱۱۶۳ھ) ، محمد عابد السندھی (م - ۱۸۴۱ء/۱۲۵۷ھ) اور سید محمد مرتضٰی زبیدی ، صاحبِ تاج العروس (م - ۱۷۹۰ء/ ۱۲۰۵ھ) اس اس سلسلہ میں گوہرِ شاہوار کی طرح چمکتے ہیں -

مظفر شاہی اور بہمنی ریاستوں کے قیام سے احیاء و تجدید علوم کی جو تحریک شروع ہوئی وہ بعد کے سیاسی تغیّرات سے متاثر ہوئے بغیر برابر آگے بڑھتی رہی - وجہ یہ تھی کہ حجاز اور مصر سے مواصلات اور علمی روابط بڑھتے ہی گئے - ہمارے نقطۂ نظر سے سیاسی تبدیلیوں کا یہ اثر ہوا کہ احمد آباد ، کنبایۃ ، مہایم ، سورت ، نہر والہ کے علاوہ علمی مراکز میں بیجا پور ، گولکنڈہ ، احمد نگر ، شادی آباد ، مانڈو ، نارنول اور ناگور[۲] کا اضافہ ہو گیا - مغل سلطنت کے استحکام اور ہندوستان کے طول

---

۱ - عبدالحیؒ التقافۃ الاسلامیہ فی الہند ، ص ص ۱۳۶ تا ۱۳۷ -

۲ - محمود خلجی نے امام محمد بن حسن شیبانی صاحب ابی حنیفۃ الامام کے خاندان کے ایک بزرگ تاج الافاضل کو بلا کر اجمیر کا قاضی بنایا تھا - ان کے بیٹے مجدالدین شیبانی اور ان کے بیٹے شیخ احمد مجد شیبانی کی بدولت نارنول ، ناگور اور اجمیر میں عربیۃ اور منقول کا خوب چرچا ہوا - بالخصوص شیخ احمد مجد کو عربی زبان پر بڑی دسترس حاصل تھی (مناظر احسن گیلانی ، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت - ج : ۱/۱۱۶) -

و عرض میں اس کے حدود کی توسیع سے یوں کہنا چاہیے کہ اس نئی تحریک کے اندرونِ ملک پھیلنے کے اسباب فراہم ہو گئے اور شمالی ہند بالخصوص آگرہ اور دہلی علم کے دو دھاروں کا سنگم بن گئے ۔ ایک طرف تو مصر ، حجاز ، یمن ، حضرموت سے سمندر کے راستہ عربیت اور حدیث آ رہی تھی ، دوسری طرف ایران سے اسلامی دینی ثقافت ، عقلی علوم اور تجربی و تطبیقی فنون کا وہ مرکب آ رہا تھا جس کے بہترین نمائندہ میر فتح اللہ شیرازی (م - ۱۵۸۸ء/۹۹۷ھ) تھے ۔ ایران کے راستہ علم و فن کی درآمد قدیم سے تھی اور اس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا تھا ۔ رفیع‌الدین شیرازی جنہیں سکندر لودھی کے دربار میں منزلت حاصل ہوئی، معقول میں جلال‌الدین (محمد بن سعد اللہ) روانی (م - ۱۵۰۱ء/۹۰۷ھ) کے شاگرد ہونے کے ساتھ ساتھ سخاوی کے بھی شاگرد تھے ۔ ان کے شاگردوں میں شیخ ابوالفتح تھانیسری کی بابت کہا جاتا ہے کہ پہلے شخص ہیں جو ہندوستان میں محدّث کے لقب سے ممتاز ہوئے ۔ مثلاً بدایونی انہی ابوالفتح کے نامور شاگرد ہیں ۔ احمد شاہ والیٔ گجرات کے دربار میں نورالدین احمد شیرازی نے ، جو صفویوں کے تعصّب سے بھاگ کر ادھر آئے تھے ، محدّث کی حیثیت سے عروج پایا ۔ ان دونوں نے علمِ حدیث کی ترویج میں بڑا حصہ لیا ۔ البتہ روانی کے دوسرے شاگرد جیسے الخطیب ابوالفضل گازرونی (م - ۱۵۶۱ء/۹۶۹ھ) جو شیخ مبارک کے استاد ہوئے ، انہوں نے ہندوستان میں منطق و فلسفہ کا بھاؤ بڑھا دیا ۔ فتح اللہ شیرازی تفسیر ، کلام ، حدیث ، حکمت ، ہیئت ، ہندسہ ، نجوم و رمل اور حساب میں بلند پایہ رکھتے تھے ۔ البتہ ان کا دائرۂ اختصاص معقول اور فلکیات و ریاضیات ہی تھا ۔ وہ ایک ممتاز صنّاع اور صاحبِ ایجاد تھے ۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ ان کی ایجادات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نظام‌الدین احمد انہیں ماہرِ طلسم و نیرنگ (ماہرِ نیزنجات و طلسمات) بتاتے ہیں[1] ۔ فلکیات اور ریاضیات کے رواج کی پہلے ہی داغ بیل پڑ چکی تھی ۔ ہمایوں کی توجہ کا مرکز یہی علوم تھے ۔ وہ غربت اور پریشانی میں بھی علامہ الیاس اردبیلی اور شیخ ابوالقاسم جرجانی سے قطب شیرازی کی 'درۃ التاج' کا درس لینا نہ بھولتا تھا[2] ۔ بیجاپور اور احمدنگر کے درباروں میں تشیع کی فضا پیدا ہوئی تو ایران سے روابط اور بڑھے ۔ قاضی نوراللہ شوستری (م - ۱۶۱۰ء/۱۰۱۹ھ) کا واقعہ بتاتا ہے کہ اس علمی لین دین کے پیچھے مذہبی و سیاسی محرکات بھی کارفرما تھے ۔ الغرض عہدِ اکبری تک ایران سے علمی روابط کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ نصابِ تعلیم میں معقول ، فلکیات اور ریاضیات کا پلہ بھاری ہو گیا اور دنیا کے کاروبار میں ان کی افادیت مسلّم ہو گئی ۔

---

۱ - سید صباح‌الدین عبدالرحمٰن ، بزم تیموریہ ، اعظم گڑھ ۱۹۴۸ء ، ص ۹۲ - ۔

۲ - سید صباح الدین عبدالرحمٰن بزم تیموریہ ، ص ۴۵ -

عام طور پر عالم اسلام میں سبھی جگہ نصاب تعلیم میں علوم دخیلہ کے لیے گنجائش نکالی گئی تھی ۔ مقامی فضا اور قومی مزاج کی مناسبت سے بعض علمی مراکز جیسے ایران میں ان کا زیادہ اہتمام کیا گیا ۔ یہ گویا صنّاعی اور کاریگری میں مفید تجربی علوم کی نظری تعلیم تھی جسے ثقافت عامہ کا اہم جزو بنا کر نصاب تعلیم میں شامل کیا گیا ۔ کہیں کہیں علم طب کے ساتھ بھی یہی معاملہ رہا ۔ رہی صنّاعی اور کاریگری کی عملی تعلیم تو اسلامی تمدن کی روایت کے مطابق اس کی ذمہ دار عام درسگاہیں نہیں، بلکہ کارخانہ جات اور نقابات عمل (Guilds) تھیں[1] ۔ ہمارے نقطۂ نظر سے یہ بات قابل لحاظ ہے کہ عربیۃ اور منقول کی اہمیت چاہے کتنی ہی کم ہوگئی ہو وہ بدستور جزو نصاب رہے اور ہر مسلمان کی تعلیم کا نقطۂ آغاز یہی دو علوم ہوتے تھے ۔ منقول ، فلکیات اور ریاضیات کی علمی زبان بھی عربی ہی تھی ۔

جیسا کہ اوپر گزرا ، فارسی ابتداء میں بول چال اور مجلسی ادب میں استعمال ہوتی تھی ۔ رفتہ رفتہ حکومت کے کاروبار میں بھی استعمال ہونے لگی ۔ قصیدہ و شعر سے آگے بڑھی تو تاریخ نویسی اور کچھ عربی سے تراجم کے لیے استعمال ہوئی ۔ مکتب کے بچوں کی آسانی کے لیے ابتدائی عربی قواعد اور چند فقہ کی درسی کتابیں بھی عربی میں لکھی گئیں ، لیکن عربیۃ کی علمی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا ۔ بابر کے ساتھ ساتھ ترکی زبان بھی ہندوستان میں چل پڑی ، تاہم بیشتر مغل شہزادوں اور شہزادیوں کی تعلیم میں عربی کو پہلا اور فارسی کو دوسرا مقام حاصل رہا[2] ۔ اکبر کے عہد میں سنسکرت اور ہندو فلسفہ کا دریچہ کھلا ، لیکن جو علماء اس نئی پونجی کو بازار علم میں لائے وہ خود عربی کے سرمایہ دار تھے ۔ شروع ہی سے جب بھی موقع ہوا سنسکرت کا مقابلہ عربی سے ہی کیا گیا ۔ امیر خسرو کہتے ہیں[3] :

زبان ہند ہم تازی مثال است
کہ آمیزش در آنجا کم مجال است
گر آئین عرب نحو ست و گر صرف
ازان آئین دریں کم نیست یک حرف

ابوالفیض فیضی کا اس دور میں بے نقطہ تفسیر 'سواطع الالہام' لکھ کر عربی کو اکھاڑے میں لانا طرفگی سے خالی نہیں[4] ۔ فیضی کا شعوری طور پر یہ مقصد رہا

---

۱ ۔ صوفی ، المنہاج ، ص ۔ ۸۶ ۸۸ ۔

2. N. N. Law : Promotion of Learing in India during Muhammadan Rule, London, 1961, Passim.

۳ ۔ امیر خسرو، دولرانی خضر خان ۔

۴ ۔ مناظر احسن گیلانی (سبق) ج ۔ ۲/۲۸۵ و ما بعد ۔

ہو یا نہ رہا ہو ، لیکن اتنا تو واقعہ ہے کہ سنسکرت کے مقابلہ میں آنے سے عربی کی شخصیت اور زیادہ ابھری اور اسے پہلوانی کرتب دکھا کر اپنی قوت و ثروت کی نمائش کا موقع ملا ۔

سنسکرت تو تھوڑے عرصہ درشن دے کر رخصت ہوئی ، لیکن معقول ، فلکیات اور ریاضیات مستقل طور پر براجمان ہوگئیں اور ان کی قدر برابر بڑھتی ہی گئی اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس دور کے حیرت انگیز تمدنی و فنی کارنامے ، مثلاً فنِ تعمیر اور آب رسانی کے کمالات اسی ہندسہ و ریاضیات کے کرشمے ہیں ، جس کے ذکر کے ساتھ معاً لطف اللہ مہندس اور ان کے بیٹے امام الدین (م - ۱۷۳۳ء/۱۱۴۶ھ) کے نام ذہن میں آتے ہیں ۔ باپ بیٹا دونوں فارسی میں شاعری کرتے تھے اور 'خلاصۃ الحساب' اور 'تشریح الافلاک' کی شرحیں عربی میں لکھتے تھے[1] ۔ جہاں تک تدبیرِ مملکت کا تعلق ہے قضاء اور انشاء کو چھوڑ کر مدنی خدمات کے مختلف شعبوں میں ان علوم کی افادیت ظاہر ہے ۔ چنانچہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی اگر (آج کل کی سائنس کی طرح) یہ علم اپنے مادی فوائد کی وجہ سے شرعی ، اخلاقی اور ادبی علوم پر چھا جاتے ۔ ابوالفضل نے سرکاری مدارس کا جو نیا نصاب دیا ہے وہ اکبری دور کے اسی رجحان کا غماز ہے ۔

"اخلاق ، حساب ، سیاق ، فلاحت ، ہندسہ ، نجوم رمل ، تدبیر منزل ، سیاست مدن ، طب ، منطق ، طبیعی ، ریاضی ، الٰہی ، تاریخ مرتبہ مرتبہ اندوزد واز ہندی علوم بیا کرن ، نیای ، بیدانت ، پاتنجل بخوانند و ہرکس را از یا یست وقت در نگذارند ، ازیں طرز آگہی مکتب ہا رونق دیگر گرفت مدرسہا فروغ تازہ یافت[2] ۔"

لیکن خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا اور اس کے دو سبب ہیں ۔ ایک تو یہ کہ حجاز کی سمت سے آنے والے عربیت اور معقول کے دھارے نے بروقت ایرانی اثرات کا تدارک کیا ۔ شیخ عبدالحق محدث اور شاہ ولی اللہ کے خاندانوں کی علمی و اصلاحی خدمات کو اسی پس منظر میں رکھنا چاہیے[3] ۔ دوسرے یہ کہ دین کے صراطِ مستقیم سے انحراف کی نشانیوں نے شیخ احمد سرہندی جیسی ہستیوں کو چونکایا ، جنہوں نے عقل اور دل دونوں کو صحیح راستہ پر لگایا ۔ دارا شکوہ کی

---

۱ - زبید احمد ، عربی ادب میں ہندوستان کا حصہ ، (انگریزی) ص ، ۲۸۰ ۔

۲ - ابوالفضل ، آئین اکبری ، الشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ، ص ۲۰۲ ۔

Yousf Husain Khan: Glimpses of Mediaeval Indian Culture, Bombay, 1957, pp. 76 - 77.

۳ - معارف ، ج - ۲۲ ، ص - ۲۶۲ ۔

علمی کاوشیں اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ اس دور میں اسلامی عقائد و تصوّرات کو سب سے زیادہ خطرہ تصوّف کے محاذ پر تھا ۔ شیخ احمد سرہندی نے اس محاذ کو ان عناصر سے پاک کیا جن کی وفاداری مشتبہ یا دو رخی تھی ۔ شاہ ولی اللہ نے معقول سے ڈرنے کے بجائے عقل کو علم اسرار الشریعہ کی طرف لگا کر ایمان و یقین کو نئی کمک پہنچائی ۔ الغرض شیخ عبدالحق محدّث کے دور سے عربیۃ ، منقول اور معقول میں امتزاج و توازن کی راہ ہموار ہوئی تاآنکہ نظام‌الدین سہالوی (م ۔ ۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ) نے ایک مقبولِ عام نصابِ تعلیم کو آخری شکل دی جو انہیں کے نام پر 'درس نظامی' کہلایا ۔ 'درسِ نظامی' گیارہ مادۂ تدریس پر مشتمل تھا : (۱) صرف و نحو ۔ (۲) بلاغت ۔ (۳) تفسیر ۔ (۴) حدیث ۔ (۵) فقہ ۔ (۶) اصولِ فقہ ۔ (۷) منطق ۔ (۸) حکمت ۔ (۹) ریاضی و ہیئت ۔ (۱۰) کلام اور (۱۱) مناظرہ ۔ فارسی کی حیثیت اس میں ایک ابتدائی ضمنی مضمون سے زیادہ نہ تھی اور کسی دوسری مقامی یا اجنبی زبان کے لیے بحیثیت مادۂ تدریس کوئی جگہ نہ تھی[1] ۔

اوپر کے بیان سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ دورِ غزنوی سے لے کر سلطنتِ مغلیہ کے اختتام تک عربی کی کیا حیثیت رہی ۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس طویل عرصہ میں جو بھی سیاسی اور اجتماعی تغیّرات ہوئے اور جو بھی علمی اثرات باہر سے آئے یا مقامی فضا میں ابھرے ان سے عربیۃ کی مسلّمہ حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا ۔ عربیۃ ہر دور میں بدستور علم ، ثقافت اور فضیلت کی کلید بنی رہی ۔ اتنا تو ہوا کہ مختلف ادوار میں مختلف علوم پروان چڑھے لیکن ہر دور میں ہر علم کے حصول کے لیے عربیۃ بنیادی شرط تھی ۔ جہاں علوم دینیہ ہوں گے وہاں عربیۃ سے استغناء غیر متصوّر ہے ۔ دونوں کا تعلق عضوی ہے ۔ تفسیر ، حدیث ، فقہ و اصول کے بارے میں تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں البتہ تصوّف سے متعلق ایک وہم کا ازالہ ضروری ہے ۔ جس طرح ایک فقیہ اپنے جاہل یا کم علم مستفتی سے ان کی اپنی زبان میں 'علیٰ قدر عقلہ' بات کرتا ہے ، لیکن خود فقہ کا علم عربیۃ کے واسطہ سے حاصل کرتا ہے ، بالکل اسی طرح ایک صوفی اپنے جاہل یا کم علم مریدوں کے جمِّ غفیر کو ان کی اپنی زبان میں آدابِ طریقت سکھاتا ہے ، لیکن خود اس پر اور اس کے ذی علم خواص پر علمِ تصوّف کے دروازے عربیۃ ہی کی کلید سے کھلتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو صوفیہ کے 'تبلیغی منشور' علمی ضرورت کے لحاظ سے ہر مقامی بولی میں ملتے ہیں ، دوسری طرف ان کے اپنے سلسلہ کی

---

۱ ۔ ابوالحسنات ندوی ، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں ، اعظم گڑھ ، ۱۹۳۶ء ، ص ۱۱۸ و ما بعد ، الثقافۃ ۱۵ ۔ ۱۹

'تعلیمی کتب' اور بلند پایہ علمی تصانیف عربی میں ہیں[۱] ۔ درسِ نظامی میں تو تصوّف ایک مادہ ٔ درس کی حیثیت سے نہیں پایا جاتا، لیکن اس سے قبل علمِ تصوّف جب تک عام نصابِ تعلیم کا جزو رہا ، اس وقت تک 'الرسالة القشیرية' ، 'عوارف المعارف' اور 'فصوص الحِکم' کا کوئی بدل نہ تھا ۔ اس وقت تک صوفیہ اپنے علم و ثقافت کے لحاظ سے علماء و فقہاء کے ہم پلّہ ہوتے تھے ۔ بعد کو طریقت نے اپنی راہ جدا نکالی اور شاید یہی وجہ ہو کہ تصوّف عام نصابِ تعلیم سے خارج ہوگیا ۔ کچھ عرصہ صوفیہ نے اپنے مخصوص حلقوں میں علم کی روایت برقرار رکھی ، لیکن بالآخر[۲] جہل غالب آ گیا اور طریقت کے کھوکھلے رسوم رہ گئے ۔

دوسری بات یہ ہے کہ صدیوں کے اس طویل عرصہ میں کوئی وقت بھی ایسا نہ تھا جب ایک مسلمان کو جو عربیة اور منقول سے بہرہ ور نہ ہو ، کسی لحاظ سے بھی عالم فاضل یا مثقّف اور تعلیم یافتہ ہی کہا جا سکے ۔ فتح اللہ شیرازی جیسے معقول کے ماہر بھی عربیة اور منقول میں کچھ بہت پیچھے نہ تھے ۔ مہندس اور طبیب کا بھی یہی حال تھا ۔ فارسی کے شاعر ادیب بھی عربیة اور منقول کے مایہ دار تھے ۔ ایسی صورت میں عربی کا واحد ذریعہ ٔ علم ہونا تحصیلِ کمال اور سہولتِ تحصیل ہر دو لحاظ سے قرینِ مصلحت تھا ۔ ہر عالم عربی کے متعلق وہی عقیدہ رکھتا تھا جو البیرونی کا تھا ۔ مادری زبان جو انسان محض سلیقہ کی بناء پر محدود ضرورتوں کے لیے استعمال کرتا ہے ، تحصیل علم کے لیے آسان نہیں ہوتی تاوقتیکہ صدیوں کی کاوش سے اس میں علمی بیان کی مسلسل روایت اور علوم کی ترقی کا ساتھ دینے کی صلاحیّت پیدا نہ کی جائے ۔ بنے بنائے قصر کی کلید (یعنی عربیة) ہاتھ میں ہوتے ہوئے نئے مکان کی تعمیر دین اور عقل دونوں کے تقاضوں کے منافی تھی ۔ یہ حقیقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شعوبیہ تحریک سے لے کر بعد کے زمانے تک مختلف مسلم اقوام میں عربوں کے خلاف جذبہ رقابت تو ابھرا ، لیکن اس نے کبھی عربی زبان کے خلاف تعصّب کی شکل اختیار نہیں کی[۳] ۔ غرض یہ کہ ایران و ماوراءالنہر کی طرح برِ صغیر پاک و ہند میں بھی عربی اعلیٰ تعلیم اور بلند پایہ علمی

---

۱ ۔ مثلاً سید محمد گیسو دراز کی متعدد عربی شروح و تصانیف ہیں ۔ نیز محمد بن فضل اللہ کی 'التحفة المرسلة الی النبی' ، جمال الدین ہانسوی کی 'الملہمات' زبدة المحدثین کی 'زاد الصلحاء' سے ہمارے دعوی کا ثبوت ملتا ہے ۔ ثقافة ، ۱۹۳ ۔

۲ ۔ خلیق احمد نظامی کی تاریخِ مشائخِ چشت کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے ربع اول تک چشتی بزرگ جہاں پابند شریعت ہوتے تھے وہاں علم و فضل کے اعتبار سے بھی بلند پایہ رکھتے تھے ۔ مدیر ۔

۳ ۔ جدید دور میں اس قسم کی تحریکیں مغربی نظریہ قومیت کا شاخسانہ ہیں ۔ اس سے پہلے زیادہ دبے ہوئے عارضی انفرادی رجحانات کا سراغ ملتا ہے ۔ مقالہ نگار ۔

تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنی رہی۔ یہ ذریعہ اکتساب کی مشقّت تو ضرور چاہتا تھا لیکن استفادہ کے لیے دوسرے ذرائع کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ آسان اور موزوں تھا۔

تیسری بات یہ ہے کہ عربی اعلیٰ تدریس اور علمی تصنیف کا ذریعہ تو ضرور تھی لیکن عربی ادب مقصود بالذّات نہ تھا۔ عربی تخلیقی ادب۔شعر و انشاء۔کے لیے فارسی ترکی دربار کی فضا ناسازگار تھی، بلکہ ہوتا یہ تھا کہ عربی ادب سے جو گہر رولتے تھے وہ فارسی پر نثار کر دیتے تھے۔ حجاز و مصر سے علمی روابط استوار ہوئے تو حدیث کے ساتھ ساتھ عربی شعر و ادب میں بھی حرکت آئی۔ پھر بھی عربی شعر و ادب میں بھلے اُبھرے جو کام ہوئے وہ یوں کہنا چاہیے کہ ناموافق حالات میں انفرادی ذوق کی اپچ ہے۔

انگریزوں کی آمد تک درسِ نظامی تھوڑی بہت مقامی ترمیموں کے ساتھ سارے ملک میں رائج رہا۔ اس کے دو پہلو خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں صرف و نحو پر بہت زور دیا جاتا تھا اور بہت وقت صرف کیا جاتا تھا اور عربی ادب بہت ہی کم تھا۔ دوسرے یہ کہ تفسیر، حدیث بہت کم تھی اور معقول (کلام، منطق، حکمت اور ریاضی) کا حصہ بہت زیادہ تھا۔ جہاں تک عربیۃ کا تعلق ہے، مولانا عبدالاول جونپوری نے درس نظامی پر بڑی بالغ نظری سے تنقید کی ہے[1]۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے یہاں صرف و نحو کی ساری کتابیں چاٹنے کے بعد لسانی علوم چھوڑ کر معقول و فقہ کی کتابوں میں لگ جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ادب سے کورے رہ جاتے ہیں اور عربی زبان میں تحریر و تقریر کے ذریعہ اظہار مافی الضّمیر پر قادر نہیں ہوتے۔ چنانچہ جب کوئی عیسائی عالم آ کر عربی میں بات کرتا ہے تو ہمارے علماء و مدرسین جواب دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف انگریزی کی تعلیم اس طریقہ پر دی جاتی ہے کہ پہلے مفردات و مرکبات یاد کرائے جاتے ہیں پھر قواعد بتائے جاتے ہیں، جس کی بدولت بہت جلد انگریزی کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بات بھی بڑی شرمناک ہے کہ ہم تو غافل ہیں اور عیسائی حکام ملک میں ادب کی تعلیم و ترویج کے لیے کوشاں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وارن ہیسٹنگر نے مسلمانوں کی تعلیمی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے سنہ ۱۷۸۱ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ قائم کیا، جہاں نسبتاً عربی ادب پر زیادہ زور دیا گیا اور پرانی کتابوں کے ساتھ کچھ نئی درسی کتابیں بھی بر وقت تالیف کرا کے شامل نصاب کی گئیں۔ رفتہ رفتہ درس نظامی میں حدیث کے نصاب کو وسعت دی گئی۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام سے حدیث کا اہتمام بڑھا۔ انیسویں صدی

---

۱ - تمرین الادب فی توقین العرب، ملحق بہ شرح جامی، مطبع آسی، لکھنؤ۔

عیسوی کے آخر میں عربی ادب کے ساتھ مزید اعتناء کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی ۔ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ندوۃ العلماء لکھنؤ کا قیام عمل میں آیا ۔ جہاں عصری تقاضوں کے مطابق نصابِ تعلیم میں ترمیم و اصلاح کی گئی اور اس میں انگریزی کے لیے بھی جگہ نکالی گئی ۔

لیکن اس عرصہ میں وہ اہم واقعہ رونما ہوا ، جس سے ہندوستانی مسلمانوں میں ایک کے بجائے دو مختلف الاصل ، مختلف النّوع ، مختلف الغرض ، متباین اور متوازی نظامِ تعلیم رائج ہوگئے ۔

وارن ہیسٹنگز کے مدرسہ عالیہ سے لے کر فورٹ ولیم کالج تک انگریزوں کی حکمتِ علمی نے جو پلٹے کھائے ، انہیں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی یوں بیان کرتے ہیں :

> ''ابتداءً جب کمپنی نے شاہ عالم سے دیوانی کے اختیارات حاصل کیے تو علمی و عدالتی زبان عربی تھی ، عدالتی اس لحاظ سے کہ فیصلوں کا مدار عربی فقہ کی کتابوں پر تھا ۔ اس ضرورت سے اوّل کمپنی نے عربی کی خدمت کی ۔ ایک مدرسہ کلکتہ میں دوسرا مدراس میں قائم ہوا ، قاضی القضاۃ ، صدر الصّدور ، مصنف و مفتی بڑے بڑے علمائے وقت ہوتے تھے ۔ مفتی صدر الدین خان ، مولانا فضل امام ، قاضی القضاۃ ارتضا علی خان کے نام مثالاً پیش کیے جا سکتے ہیں ۔ اس کے بعد عربی کی جگہ فارسی نے لی ۔ 'ہدایہ' وغیرہ فقہ کی مستند کتابوں کا ترجمہ فارسی میں ہوا ۔ تعزیرات فارسی میں مدوّن ہوئیں . . . . اس دور کے بعد اردو کا دور تھا[۱]'' ۔

سنہ ۱۸۳۶ء میں لارڈ مکالے نے حکومت کی سرپرستی اور ترغیب و ترہیب کے ذرائع کام میں لا کر انگریزی نظامِ تعلیم نافذ کروایا ۔ نئے نظام کی دو خصوصیتیں انگریزی زبان اور سائنس ، ردّ و قدح کا موضوع بنیں ، لیکن در حقیقت اسلامی تمدّن کا مزاج ایسا ہے کہ معقول اور علومِ دخیلہ کے بارے میں احتیاط پسندیدہ سہی ، احتراز و اجتناب تا دیر قائم نہیں رہ سکتا ۔ پرانے فرسودہ علوم دخیلہ کی جگہ نئے ترقی یافتہ علومِ دخیلہ کی ترویج کوئی بنیادی تبدیلی نہ تھی ۔ اجنبی زبانیں مسلمانوں نے شروع سے رسول اللہؐ کی ہدایت پر اپنی ضرورت کے مطابق (نہ کہ دوسروں کی خدمت گزاری کے لیے) سیکھیں ۔ انگریزی یا کسی اور زبان کے خلاف تعصّب کی کوئی وجہ جواز نہ تھی ۔ عین اس وقت جب کہ انگریزی نظامِ تعلیم کی مخالفت ہو رہی تھی ، علماء اللہ کی خوشنودی کی

---

۱ ۔ خطبۂ صدارت ، شعبہ اردو آل انڈیا اورینٹل کانفرنس ، لاہور ۔ معارف ، ۲۲ (سن ۱۹۲۸ء) نمبر ۔ ٦ ۔

خاطر عیسائی مبلغوں سے مناظرہ کرنے کے لیے بڑی محنت سے انگریزی سیکھ رہے تھے ۔ افسوس کہ اس غلط مبحث میں دونوں تعلیمی نظاموں کا جوہری فرق بالکل ہی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا ۔ جوہری فرق یہ ہے کہ انگریزی نظام میں عربیۃ اور منقول کا مرکزی نقطہ غائب ہے ۔ اس کی بدولت مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ ممکن ہوا کہ ایک مسلمان مثقّف اور اعلی تعلیم یافتہ کہلائے اور عربیۃ اور منقول سے عاری ہو ۔ انگریزی نظامِ تعلیم میں عربی زبان و ادب بحیثیت ایک مادۂ تدریس شامل ہے ، لیکن سارا نظام کچھ ایسا افرنگ زدہ ہے کہ عربی زبان و ادب میں مہارت نہ تو مقصود بالذّات ہوتی ہے اور نہ ہی باستثناء چند ، عملاً حاصل ہوتی ہے ۔ البتہ اس کے زیرِ اثر بحث و تحقیق کے نئے طریقے ضرور علمی کاوشوں میں معاون ہوتے ہیں ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن اور چند دیگر یونیورسٹیوں میں منقول[1] کو بحیثیت ایک مادۂ درس جگہ دی گئی لیکن اس کی قدروقیمت محض ایک پیوند کی رہی ۔ سیاسی آزادی کے بعد نظامِ تعلیم کی اصلاح کی جو کوششیں ہوئیں ان میں قومیت کے فوری تقاضے توجہ کا مرکز بنے اور عربیۃ اور منقول کی ضرورت کا احساس بالکل ہی نیچے دب گیا ۔ تعلیم کی ثنویت اب بھی موجبِ تشویش ہے لیکن دور دور کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ ثقافت عامہ میں عربیۃ اور منقول کو پھر وہی حیثیت حاصل ہو جو شروع سے لے کر انگریزوں کی آمد تک حاصل تھی ۔

آخر میں ہمیں عربی تصانیف پر اجمالی تبصرہ کرنا ہے ۔ سب سے پہلے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ پاک و ہند میں تصنیف و تألیف کے لیے حالات سازگار ہوئے تو بیشتر علوم و فنون کی تنقیح و تہذیب ہو چکی تھی ، بالخصوص منقول میں ترقی و اضافہ کی گنجائش باقی نہ تھی ، صرف جمع و ترتیب اور بیان تشریح میں قابلیت کے جوہر دکھائے جا سکتے تھے ، جیسے صاغانی نے ابتدائی الفاظ سے اور علی متقی نے ابواب فقیہۃ کے لحاظ سے احادیث کے مجموعے (علی الترتیب 'مشارق الانوار ، اور 'کنز العمال') ترتیب دیے اور شیخ عبدالحق دہلوی نے 'مشکواۃ' کی اور شاہ ولی اللہ نے 'موطأ' کی شرحیں لکھیں ۔ کچھ مزید گنجائش احادیث کی صحت و سقم کی بابِ تحقیق کو آشکارا کرنے کی باقی تھی چنانچہ صاغانی اور محمد بن طاہر پٹنی نے موضوعِ احادیث پر رسالے لکھے ۔ فقہ میں مذاہب کے استقرار کے بعد قضاء اور حکومت کی کارروائی کے لیے مجموعہ فتاوٰی کی تدوین کا مرحلہ باقی رہ گیا تھا ۔ اس سلسلہ میں ہندوستان میں چار نہایت قابل قدر کوششیں ہوئیں: 'الفتاوی التاتارخانیہ' ، 'الفتاوی الحمآدیہ' ، 'ابراہیم شاہیۃ' ، 'الفتاوی

---

۱ ۔ منقول سے مراد وہی علوم دینیہ ہیں جن کے ساتھ عربیۃ لازم و ملزوم ہے ۔

العالمگیریہ' ۔ منقول میں ہندوستان کے یہ کارنامے سارے عالمِ اسلام میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے اور آج تک متداول ہیں ۔ متاخر زمانہ میں جب حالات نے نقد و نظر کا تقاضا کیا نو اسرار الشریعہ ، اجتہاد و تقلید اور احیاء و تجدید کی نئی راہیں نکالنے میں ہندوستان دوسرے اسلامی ممالک سے پیچھے نہیں رہا ۔ آج جہاں بھی اس کا ذکر ہو شاہ ولی اللہ کی تصانیف بالخصوص 'حجۃ اللہ البالغہ' کا نام لیا جائے گا ۔

دوسرے یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ نظامِ تعلیم میں کتبِ درسیہ کو غیر معمولی اہمیت و مرکزیت حاصل تھی ۔ کتبِ درسیہ کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ حد درجہ جامع اور مختصر ہوں ۔ اختصار کی غرض یہ تھی کہ طالبِ علم کے لیے ان کا حفظ کرنا آسان ہو ، یا اگر حفظ نہ کرے توکم از کم رمزیہ عبارتوں سے لمبی لمبی بحثیں اور مسئلے ہر دم مستحضر رکھ سکے ۔ دریا کو کوزہ میں بھرنے کا ایک فائدہ یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ اس طالبِ علم میں قوتِ مطالعہ اور دقتِ نظر کا ملکہ پیدا ہوتا ہے ۔ ہر فن کی ایسی ایک دو کتابیں جو اس معیار پر پوری اترتی تھیں ، انہیں شہرتِ عام و بقائے دوام حاصل ہوتا تھا ۔ ان میں سے بہت سی کتابیں صدیاں گزرنے پر آج بھی سارے عالمِ اسلام میں پڑھی پڑھائی جاتی ہیں ۔ استاد کو ایسی کتابیں پڑھاتے وقت بڑی شرح و بسط سے تقریر کرنی ہوتی تھی اسی کی بدولت شروح مرتب ہو جاتی تھیں ۔ پھر جب مختلف شرحیں منظرِ عام پر آجاتی تھیں تو حلقۂ درس میں ناگزیر ہو جاتا تھا کہ ان سے تعرض کیا جائے اور ان کی تنقید و تعقیب کی جائے ۔ چنانچہ حاشیہ اور شرح علی الشرح کا سلسلہ بڑھتا جاتا تھا ۔

پاکستان و ہند میں جس طرح علماء باہر سے آتے تھے اور مقامی علماء باہر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آتے تھے اسی طرح کتبِ درسیہ بھی باہر سے آتی تھیں ۔ یہاں تقریباً ہر فن کی سبھی اعلیٰ درسی کتابوں پر شروح و حواشی لکھے گئے ۔ ان میں سے بعض شروح باہر کے ملکوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی گئیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تعلیم کا معیار خاصا بلند تھا ۔ اکّا دکّا درسی کتابیں یہاں بھی تصنیف ہوئیں ، لیکن جو تصنیف ہوئیں ، مثلاً محب‌اللہ بہاری کی 'مسلم الثبوت' (اصول فقہ) اور 'مسلم العلوم' (منطق) اور ملا محمود جونپوری کی 'الحکمۃ البالغہ' اور اس کی شرح 'الشمس البازغہ' (حکمت) ان کا معیار ایران و خراسان کی تصنیف شدہ درسی کتابوں سے کسی طرح کم نہ تھا اور وہ آج بھی پڑھی جاتی ہیں ۔ ان کتابوں پر جو بے شمار شرحیں اور حاشیے لکھے گئے ان کے لیے ہر کتاب کے عنوان کے تحت 'ثقافۃ الہند' سے رجوع کیا جا سکتا ہے ۔

لیکن تعلیم و تدریس سے متعلق جو کام ہوئے ان سے قطع نظر جمع و ترتیب اور بحث و تدقیق کے میدان میں جو خالص علمی تصانیف ملتی ہیں وہ بھی کچھ کم نہیں۔ چند تو ان میں ایسی ہیں کہ ان کی شہرت اور افادیت ہندوستان کے اندر محدود نہ رہی۔ افسوس یہ ہے کہ جب طباعت کی سہولتیں پیدا ہوئیں تو انگریزوں کی حکمت اور انگریزی نظامِ تعلیم کے رواج کے باعث ہندوستان میں عربی علوم سیاسی ابتری اور کس مپرسی کا شکار ہو گئے۔ ایک نواب صدیق حسن کی سرپرستی کی بدولت حجاز و قسطنطنیہ میں ہمارے علمی کارناموں کا چرچا ہونے لگا۔ اگر اندرونِ ملک ایسی ہی سرپرستی عام ہوتی تو ہمارے آباء کی کتابیں معلوم و نامعلوم کتب خانوں میں گوشہ نشینی کے بجائے اہلِ نظر کے ہاتھوں میں ہوتیں۔ تب صحیح صحیح ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا ممکن ہوتا۔ صاغانی اور زبیدی جیسے ہندی نژاد علماء نے بیرونِ ملک جو کارنامے انجام دیے ان کے معیار کی بلندی اور شہرت کی وسعت دونوں ان سہولتوں کی مرہون ہیں جن سے اندرونِ ملک کے علماء اپنے زمانہ میں محروم رہے اور ان کی تصانیف آج تک محروم چلی آتی ہیں۔ تاہم اگر ان ہندوستانی علماء کی بابت سوال کیا جائے جو ہندوستان میں رہتے ہوئے باہر کی علمی دنیا میں جانے پہچانے گئے تو بلاتأمل علاءالدین بن احمد المہائمی، محمد بن طاہر پٹنی، شاہ ولی اللہ، محمد بن فضل اللہ (تصوف میں ان کی تصنیف 'التحفۃ المرسلۃ الی النبی' اتنی اہم سمجھی گئی کہ شیخ ابراہیم کردی نے اس کی شرح لکھی)، شہاب الدین دولت آبادی ابن الدما مینی، محی الدین بن عبدالقادر عیدروس، ابن معصوم، حاجی دبیر ('ظفر الوالہ بمظفر و آلہ')، مفتی سعد اللہ، محمد علاءالتھانوی ('کشاف اصطلاحات الفنون')، نواب صدیق حسن اور موجودہ زمانے میں علامہ عبدالعزیز میمن کے نام ذہن میں آتے ہیں۔ یہ چند نام صرف بطور مثال ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ ایسے علماء کی کمی نہیں، جنھوں نے ہزار موانع کے باوجود عالمی ادب عربی میں مقام حاصل کیا۔ تلاش سے ایسے بھی ملتے ہیں جو اس مقام کے مستحق ہیں لیکن ان کی تصانیف گھر ہی میں پڑی رہ گئیں۔

شعر و ادب بے شک تفنّن اور جدّت طرازی کا میدان ہے لیکن اس میں فارسی کا دور دورہ رہا۔ عربی ہر دربار اور مجلس میں موجود رہی، لیکن اپنی سج دھج دکھانے کے بجائے فارسی کی مشّاطگی میں حصہ لیتی رہی جہاں تک عربی نثر کا تعلق ہے، سارے عالمِ اسلام کی طرح ہمارے یہاں بھی مقامات کی مثالی نمونہ قرار دے کر اسی پر طبع آزمائی ہوئی۔ اس قسم کی صرف دو کوششیں قابلِ ذکر ہیں۔ سید ابوبکر بن محسن البعبودی العلوی کی 'المقامات الہندیہ' (تصنیف ۱۷۱۶ء/۱۱۲۸ھ) اور شیخ محمد باقر بن مرتضیٰ المدراسی (م۔ ۱۸۰۵ء/۱۲۲۰ھ) کے لکھے ہوئے چند مقامات۔ یہ دونوں

کوششیں بہت معمولی درجہ کی ہیں، انہیں خود ہندوستان میں کوئی مقام حاصل نہ ہوسکا۔ فنی نثر کی بہ نسبت شعر کا سرمایہ اور قدرو قیمت دونوں میں کہیں زیادہ ہے ۔ قاضی عبدالمقتدر کا قصیدہ 'لامیہ' ، احمد التھانیسری کا قصیدہ 'دالیہ' ، عبدالرحیم کا قصیدہ جو بو علی سینا کے قصیدہ 'الروح' کے معارضہ میں ہے اور شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے بعض قصائد جو نعت میں ہیں ، ہندوستانی عربی شاعری کے انتخاب میں جگہ پانے کے لائق ہیں ۔ صاحبِ دیوان شعراء میں سب سے پہلے مسعود سعد مسلمان اور عطاء بن یعقوب غزنوی (م - ۱۰۹۵ء/ ۴۹۱ھ) کا نام آتا ہے ۔ لیکن دونوں کے عربی دیوان مفقود ہیں[۱] ۔ ان کے بعد غلام علی آزاد بلگرامی (م- ۱۷۸۶ء/ ۱۲۰۰ھ) ہیں ، جو فی الواقع صاحبِ دیوان (عربی) ہی نہیں بلکہ صاحب دواوین ہیں ۔ محمد باقر مدراسی، فیض الحسن سہارنپوری اور فضل حق خیر آبادی جیسے اور بھی صاحبِ دیوان ہوئے ہیں لیکن اوّلیت اور آوّلیت دونوں غلام علی آزاد بلگرامی کا حق ہیں ۔ تاہم اتنی شہرت کا مدار جودت کی بہ نسبت کثرت ہی پر ہے ۔

مجموعی طور پر یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستانی شعراء اگرچہ وہ شعر کا فطری ملکہ رکھتے ہوں ، تاہم عربی میں انہیں ایک شعوری کوشش درکار ہوتی تھی ۔ دربار کا فارسی اور عام ملک کا ہندی ماحول آمد کے لیے ناسازگار تھا ۔ عربیۃ کا ذوق و شوق رکھنے والے مدرسی فضا میں مدرسی تعلیم کے زور پر آورد سے کام لیتے تھے ۔ ان کی انتہائی کوشش یہی ہوتی تھی کہ کلاسیکی نمونوں کا تتبّع کریں ، جس طرح قاضی عبدالمقتدر نے طغرائی کے 'لامیہ العجم' میں بوعلی سینا کے قصیدہ کا تتّبع کیا ہے ۔ کم و بیش ہندوستان کی ساری عربی شاعری کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ معنی اور صیاغت (الفاظ اور ترکیب الفاظ) دونوں میں کلاسیکی شاعری کے تتّبع کی کوشش ہے ۔ صنائع بدائع کی بھرمار ہے ۔ اس پر عجمی تخّیل کی بلند پروازی اور علو پسندی مستزاد ہے ۔ ہندوستانی شعراء نے کلاسیکی عربی روایت کے خلاف فارسی اوزان اور اصنافِ سخن کو بھی عربی میں استعمال کیا ہے ۔ صیاغت میں کلاسیکی شاعری کے تتّبع اور لغت دانی کی جا و بیجا نمود کا یہ نتیجہ ہے کہ مستعار اعلیٰ بندشوں اور غیر مانوس وحشی الفاظ کا ایسی معمولی زبان میں پیوند لگا ملتا ہے جو عربی محاورہ کی بہ نسبت مقامی (ہندی) طرز ادا سے قریب تر ہے ۔ شبلی نے رودکی کے تتّبع میں جو فارسی قصیدہ کہا ہے اس پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر معین نے بالکل یہی بات کہی ہے[۲] ۔ اگر کوئی اہلِ زبان ہندوستانی عربی شعراء کے کلام پر تنقید کرے تو یہی کہے گا کہ

---

۱ - عبدالحیؒ ، نـزہۃ الخواطر ، حیدر آباد ، ۱۹۴۷ء ؛ ۸۳ - ۸۶ -
۱ - چہار مقالہ (سبق) تعلیقات ص - ۱۸۱

جواہر ریزے سنگ ریزوں کے ساتھ پروئے ہوئے ہیں ۔ ہمواری، سلاست ، بیساختگی جسے عربی 'سلیقہ' کہتے ہیں محض کتابی علم سے نہیں پیدا ہوتی ۔ اس کے لیے پورا ماحول درکار ہوتا ہے ، جس میں کتابی علم اور قیاس سے زیادہ سماع پر دارومدار ہوتا ہے ۔ یہ ہندوستان میں کہاں میسر تھا؟ تعجب کی بات یہ ہے کہ اکا دکا کم گو شاعر جو اپنی شاعری کے لیے نسبتاً کم پہچانے جاتے ہیں ان کے کلام کے جو نمونے ملتے ہیں وہ سلاست سے ممتاز ہیں ۔ مثلاً مولوی نذیر احمد جن کے چند ابیات ابوالعتاہیہ کے رنگ میں ہیں ، میں نے مولوی صاحب کے شاگرد اور اپنے استاد علامہ عبدالعزیز میمن کی زبانی سنے[1] ۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ 'آثار الصّنادید' میں چند ابیات مفتی صدرالدین کی طرف منسوب ہیں ۔ اس کی بابت میرے استاد محترم بھی حیران تھے کہ یہ ابیات کیونکر اس دور کے کسی ہندوستانی کے ہو سکتے ہیں ۔ بالآخر جب یہ مقالہ تبیض کے مرحلہ میں تھا ایک روز اتفاقاً انہوں نے وہی ابیات الخفاجی کی 'ریحانة الالبّاء' (مطبوعہ عامرہ ، استانبول ، سنہ ۱۸۶۶ء/۱۲۷۳ھ ، ص - ۲۲) میں مشہور ادیب و شاعر حسن البیرونی(م - ۱۶۱۵ء/۱۰۲۴ھ) کی طرف منسوب پائے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صدرالدین نے یہ ابیات کسی کو سنائے اور اس نے یہ سمجھا کہ خود انہیں کے ہیں ۔ اس طرح 'آثار الصّنادید'[2] میں ان کے نام پر منقول ہوئے ۔

یہ عذر لنگ ہے کہ ہندوستانی شعراء کا عربی کلام عرب دنیا تک پہنچنے میں کوئی دشواری تھی ۔ اگر 'حجة اللہ البالغہ' اور 'القول المانوس' (اس کی بابت احمد آفندی کہتے ہیں کہ اگر مجھے پہلے مل جاتی تو پوری کی پوری اپنی کتاب 'الجاسوس علی القاموس' میں شامل کر دیتا)[3]، عرب دنیا میں مقبول ہو سکتی تھیں تو شاہ ولی اللہ

---

۱ - ابو العتاہیہ / نذیر احمد

لایذھبن بك الامل	حتی تقصر فی العمل
اللہ قدر فی الازل	ان لا نجاة بلا عمل
النصح لیس بنافع	والسیف قد سبق العذل
والمرء لیس بخالد	والعیش أمر محتمل
کن حیث شئت من السہول	و فی البروج و فی القلل
یدرکك موت فی الزما	ن ولا یزیدك فی الاجل
لذات دنیا کلھا	سم مشوب بالعسل
العمر فانٍ فالنجا	والموت آتٍ فالعمل
حتی م تقلید الہوی	والی م تجدید الحیل
المبتلی بعلائق الدنیا	حمارٌ فی الوحل

۲ - وہی ابیات الثقافتة الاسلامیہ فی الہند کے صفحہ ۴۸ میں درج ہیں -

۳ - الجاسوس ، الجوائب ، ۱۲۹۹ ، ص ۷۱ -

اور مفتی سعد اللہ کے عربی قصائد کے لیے بھی راستہ کھلا ہوا تھا ۔ عبدالحی کتانی کی 'ثبت الاثبات' دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے علماء کی اسناد حدیث کہاں کہاں مراکش تک اس آخری زمانے میں پھیلی ہوئی نہیں ۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عربی کے جتنے بھی ہندوستانی شاعر ہیں سب کے سب شاہ ولی اللہ اور مفتی سعداللہ کی طرح علماء کی فہرست میں داخل ہیں ۔ نتیجہ یہ کہ مدرسی فضا میں جو شعر کی تخلیق ہوئی وہ علمی تحقیق و تصنیف کے درجہ کی نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی ۔

کہا جاتا ہے کہ مدینہ والوں تک غلام علی آزاد کا کلام پہنچا اور اتنا پسند کیا گیا کہ روضۂ مبارک میں لٹکایا گیا[1] ۔ نعمیہ کلام کے بارے میں عموماً کچھ مسامحت سے کام لیا جاتا ہے ۔ اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کا کلام اہلِ زبان کے لیے ناقابلِ التفات نہ تھا ۔ ویسے وہ سات (سبعہ سیارہ) سے زیادہ دیوانوں کے باوجود عربی ادب کی وسیع دنیا میں کوئی مقام نہ حاصل کر سکے ۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے جدت طرازی کا راستہ دریافت کر لیا تھا ، انہوں نے ہندی سے معانی و صنائع بدائع اخذ کرکے عربی میں روشناس کرائے ۔ یہ آزاد کی امتیازی شان ہے ۔ لیکن ضروری نہیں کہ دوسروں کے لیے بھی یہ بات دلچسپی کا باعث ہو ۔ اکبری عہد میں سنسکرت کے خزانوں کی جو نمائش ہوئی ، ان سے خود ہماری دلچسپی کتنے عرصہ باقی رہی؟ آزاد کی ایک نظم 'مرآۃ الجمال' ہے ، جس میں محبوب کے تمام اعضاء جسمانی کا وصف سلسلہ وار بیان ہوا ہے ۔ نواب صدیق حسن کا کہنا ہے کہ آزاد سے پہلے کسی عربی شاعر نے تمام اعضاء کا وصف ایک نظم میں جمع نہیں کیا ۔ یہ اپنی جگہ صحیح ہے لیکن کیا حسن کے لیے صرف اعضاء کا یکجا ہونا کافی ہے؟

ہندوستان میں عربی علوم کی جیسی کچھ بھی خدمت انجام پائی وہ باہر کی دنیا پر پوری طرح عیاں نہ ہوئی ۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے خود اپنی قدر آپ نہ کی جیسی کہ کرنی چاہیے ۔ ہمارے بعض کارنامے اتنے روشن تھے کہ باہر والوں پر مخفی نہ رہے لیکن ہم نے کبھی اپنی خدمات کا مکمل جائزہ دوسروں کے سامنے نہیں رکھا ۔ غلام علی آزاد ('سبحۃ المرجان') اور مولانا عبدالحئی ('نزہۃ الخواطر' اور 'ثقافۃ الہند') نے کہنا چاہیے ، کہ ملت کی طرف سے ایک قرض ادا کیا ، لیکن انہوں نے جو کچھ کیا وہ قرض کی ادائیگی کی پہلی قسط تھی ۔ اس کے بعد سے جدید اصول تحقیق کے مطابق دو کام ہوئے ، ایک ڈاکٹر زبید احمد کی کتاب ، دوسری ڈاکٹر اسحاق کی کتاب ۔ ان کے علاوہ کچھ متفرق مضامین بھی وقتاً فوقتاً علمی رسالوں

---

۱ ۔ زبید احمد ، عربی ادب میں ہندوستان کا حصہ (انگریزی) ، ص ۔ ۲۱۳ ۔

میں شائع ہوئے ۔ پاکستان و ہند کی جامعات نے بھی اب اپنی شخصیت کو پہچاننے اور پہچوانے کی کوششیں تیز تر کر دی ہیں ۔ ڈاکٹر عبدالمعید نے 'Arabic Poets of Golcunda' پر تحقیقی لیکچر دیئے ہیں جو بمبئی یونیورسٹی نے ۱۹۶۳ء میں شائع کیے ۔ لکھنؤ یونیورسٹی نے تحقیقی مقالے 'Arabic Poets of India' اور 'Arabic Lexicographers of India' پر شائع کیے ہیں[1] ۔ کراچی یونیورسٹی میں 'صوبہ یو ۔ پی میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کی عربی تصانیف پر ریسرچ جاری ہے ۔ اب وقت تھا کہ مسلمانان پاکستان و ہند کی علمی و ثقافتی تاریخ مرتب ہو اور ان کی ادبی خدمات کا مکمل جائزہ پیش کیا جائے ۔ پنجاب یونیورسٹی نے اس اہم کام کا بیڑا اٹھایا ہے ۔ عربی ادب سے متعلق یہ جلد اسی وسیع اور جامع منصوبہ کا ایک حصہ ہے ۔ ادب ایک قوم کے دل اور اس کی عقل دونوں کا آئینہ ہوتا ہے اور عقل و دل باہم پوری زندگی کے ساتھ تفاعل تاثیر و تاثر کی آویزش رکھتے ہیں ۔ یہ تاریخ صرف عہد بہ عہد کے مصنفین اور ان کی تصانیف کی فہرست نہیں ہے ، اس میں ادب اور زندگی کے خدو خال دکھانے کی کوشش کی گئی ہے ۔ فکر کے انداز ، نظر کے زاویے ، دربار کے رنگ ، مجلسوں کے ڈھنگ ، سبھی اس میں بیان کیے گئے ہیں ، تاکہ وہ پورا سیاسی اور اجتماعی ماحول سامنے رہے ، جس میں علمی تصانیف نے جنم لیا ۔ اس وقت تک تحقیق سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں اور جو متفرق مطبوعات میں بکھرے ہوئے ہیں انہیں ایک جامع اور مربوط جائزہ میں سمویا گیا ہے اور اس کام کے دوران جو گوشے تاریک معلوم ہوئے ان پر تھوڑے سے وقت میں جہاں تک ممکن ہوا نئی تحقیق سے روشنی ڈالی گئی ہے ۔ تحقیق کی انتہاء تو کبھی کہیں نہیں ہوتی پھر ہمارے موضوع میں تو کہنا چاہیے، تحقیق کی ابتداء ابھی ہوئی ہے ۔ اس لیے ہماری توقع صرف اس قدر ہے کہ اس کوشش سے مسلمانان پاکستان و ہند کی علمی و ادبی شخصیت ابھر کر روشنی کے نقطۂ ارتکاز پر آ جائے اور بعد میں آنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ کونسی منزلیں طے ہو چکی ہیں اور کہاں سے انہیں آگے اپنے سفر کا آغاز کرنا ہے ۔

***

1. Oriental Studies in India, Now Delli, 1946. p. 58.

مراجع

اسحاق	=	Dr. Mohd. Ishaq : India's Contribution to the study of Hadith Literature, Dacca, 1955.
ثقافة	=	عبدالحئی الحسنی ، الثقافة الاسلامیة فی الهند ، دمشق ، ۱۹۵۸ء
زبید احمد	=	Dr. M. G. Zubaid Ahmad : Contribution of India to Arabic Literature, Jullunder, n d., Lahore.
سبحة	=	آزاد، بلگرامی غلام علی ، سبحة المرجان ، بمبئی ، ۱۳۰۳ھ
منہاج	=	G. M. D. Sufi : Al-Minhaj, Lahore 1941
نزهة	=	عبدالحئی عبدالحسنی ، نزهة الخواطر ، حیدرآباد ، ۱۹۴۷ء

دوسرا باب

سندھ میں عربوں کا عہدِ حکومت

(عربی ادب کی نشو و نما اور ارتقاء)

(۷۱۱ء - ۱۰۲۵ء/۹۳ھ - ۴۱۶ھ)

سندھ عرب تعلقات

سندھ کے عرب دنیا سے تعلقات خصوصاً عراق ، یمن اور عمان سے ، تاریخ کی ابتدا ہی سے چلے آ رہے ہیں۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ سمیری لوگ جنہوں نے بعد میں بابل کی سامی تہذیب کی بنیاد رکھی ، وادیٔ سندھ سے ہجرت کر کے عراق میں چلے گئے تھے ۔ سندھ ، بلوچستان ، فارس اور خوزستان کے بعض علاقوں کے مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ سندھ سے لے کر فرات تک سمیریوں کی بہت بڑی سلطنت تھی ۔ انہوں نے مغربی ایشیا کو تہذیب سکھائی اور دوسری چیزوں کے علاوہ لکھنے کے فن اور خطِ کوفی سے متعارف کروایا ۔ ہل اور پہیہ جو انسانی تہذیب اور ثقافت کی بنیاد ہیں ، سب سے پہلے انہی لوگوں کی وجہ سے ان دو دریاؤں کی سرزمین میں متعارف ہوئے ۔ بابل کے کتبوں میں اسے اوانس (نصف مچھلی اور نصف آدمی) بتایا گیا ہے ، یعنی وہ عجیب الخلقت انسانی قوم جو خشکی اور سمندر کے راستے آئی اور جس نے عراق کی وحشی اور مہذب قوم کو زندگی کے طریقے سکھائے[1] ۔ سمیریوں کے ورود سے قبل دجلہ و فرات کی وادی پر سامی اقوام کا قبضہ تھا جو شکار اور اسی طرح کی دوسری خام غذا پر گزارا کرتے تھے۔ ہل اور پہیے کی ایجاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے کاشتکاری اور دستکاری کے پیشے بھی اختیار کیے اور ساری وادی میں شہر اور قصبے وجود میں آنے لگے۔ سمیری العراق کے پہلے لوگ ہیں جنہوں نے شہری ریاستوں کی بنیاد رکھی جو بعد میں چل کر بادشاہتیں بن گئیں اور بالآخر حضرت عیسیٰؑ سے پہلے تیسرے ہزار سالہ دور میں پورا مشرقِ وسطیٰ ایک واحد سلطنت بن گئی ۔ جب عکاد کے سرگانِ اول کے دور میں سامی برسرِ اقتدار آئے تو لیوگل زگیزی (Lugal Zaggizi) کی قیادت میں سمیری ایک وسیع سلطنت پر قابض تھے ، جن میں نہ صرف عراق ، بلکہ مغربی ایران ، آرمینیا ، ایشیائے کوچک کے کچھ حصے اور شام کا علاقہ شامل تھا ۔ سرگانِ اول جو سمیریوں پر فتح پانے کے بعد ایک وسیع سلطنت کا وارث بنا ، بجا طور پر اپنے آپ کو زمین کے چار طبقات کا آقا کہتا تھا[2] ۔

---

1. H. R. Hall Ancient History of the Near East : p. 174
2. H. R. Hall Ancient History of the Near East : p. 183

العراق اور وادیٔ سندھ کے بہ سدہ مقامات جہاں سے پکی اینٹیں ، مٹی کے برتن ، زیورات اور مہریں برآمد ہوئی ہیں ، اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ان دو وادیوں کے درمیان گہرے تجارتی اور ثقافتی تعلقات قائم تھے۔ العراق کی مختلف اجڑی ہوئی بستیوں میں سے سمیری عہد کی جو مہریں برآمد ہوئی ہیں وہ سندھ میں موہنجوڈارو کے سے مقامات سے برآمد ہونے والی مہروں سے بڑی مشابہت رکھتی ہیں۔ مزید برآں مکران اور خلیج فارس کے ساحلی علاقوں میں متعدد جگہوں کی موجودگی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ سندھ اور فرات کی وادیوں کے مابین ثقافتی اور تجارتی تعلقات تھے۔

دراصل سندھ اور عرب دنیا کے تجارتی اور ثقافتی تعلقات عربوں کی فتوحات سے بہت پہلے قائم تھے۔ عرب جہاز دیبل (کراچی) ، تھانہ ، کیمبے اور ہندوستان میں مالابار کی ساحلی بندرگاہوں میں آتے تھے۔ عربوں کی تجارتی سرگرمیاں انہوں اس سے بھی آگے لنکا ، کارو منڈل اور جزائر بحرِ ہند تک لے گئیں۔ عرب پاکستان و ہند کے ساحلی علاقے اور انڈونیشیا کے مجموعہ الجزائر اور چین کے ساحلی سمندر سے آشنا تھے۔ عربوں کا مستعد بحری بیڑہ منڈیوں میں ہر طرح کی اجناسِ تجارت لاتا تھا ، خاص طور پر یمن میں جو اسلام کے عروج سے قبل عرب دنیا میں تجارتی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ عرب ، مصر ، مشرقی افریقہ ، سندھ ، ہندوستانی ساحل ، لنکا اور جزائر شرق الہند کی ساری سمندری تجارت پر قابض تھے۔ عربوں نے مشرق کے علاقوں کی بحری تجارت فنیقیوں سے ورثے میں پائی ، جن کی تجارتی سرگرمیاں ان کے عراق اور بحیرۂ روم پر سیاسی غلبے کے بعد ختم ہو گئیں۔ ان کی جگہ یونانیوں اور رومیوں نے لے لی ، جو قدیم زمانوں میں وسیع سلطنتوں کے بانی تھے۔ جب بحیرۂ روم میں یونانیوں اور رومیوں کا طوطی بولتا تھا ، تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عرب بحیرۂ ہند پر چھائے ہوئے تھے۔ حجاز اور شمالی عرب کے عرب باشندے بحری تجارت پر ان بین الاقوامی کاروانی راستوں کے ذریعے قابض تھے ، جو یمن کو شام اور العراق کو مصر کے ساتھ ملاتے تھے۔ مؤثر بحری تجارت کو برقرار رکھنے کے لیے عربوں نے مالابار کے ساحل پر اور لنکا کے جزیرے میں نوآبادیاں اور تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سندھ اور گجرات کے حکمران عربوں کے بارے میں اچھا خیال نہیں رکھتے تھے۔ اسی لیے سندھ کے ساحلی علاقوں میں ان کی آبادکاری کی کوئی شہادت نہیں ملتی مگر گجرات میں مسلمانوں کی بستیاں پہلی صدی ہجری میں قائم ہو چکی تھیں۔ یہ کہ عربوں کی فتحِ سندھ سے پہلے عرب خاندان لنکا میں آباد ہو چکے تھے ، اس کا ثبوت ہمیں اس بات سے ملتا ہے کہ عرب بیوہ عورتیں اور بچے لنکا سے ہجرت کر کے عراق آئے تھے۔ ان خاندانوں کو جہازوں میں سوار کر کے لایا گیا تھا جن کو

دیبل کی بندرگاہ[1] سے کچھ فاصلے پر سندھ کے بحری ڈاکوؤں نے لوٹ لیا تھا ۔ البلاذری کے بیان کے مطابق ان میں کچھ عورتیں لنکا میں مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئی تھیں ، لیکن ان کے باپ جو تاجر تھے اسی جزیرے[2] میں داعئی اجل کو لبیک کہہ گئے تھے ۔ لنکا کے حکمران نے خلیفہ کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے لیے ان عورتوں کو عراق کے وائسرائے حجاج کے پاس بھجوایا ۔

'عجائب الہند' کا مصنف بیان کرتا ہے کہ مشرق میں لنکا کے لوگوں کو آنحضرت ؐ کی بعثت کی خبر سب سے پہلے ملی ۔ انہوں نے اپنے ایک آدمی کو مقرر کیا کہ وہ مکہ جائے اور نبی کریم ؐ سے ملے اور ان کی تعلیمات سے واقفیت حاصل کرے ۔ چونکہ مذکورہ شخص کو طویل بحری سفر طے کرنا تھا اس لیے وہ حضرت عمر رض کے عہد حکومت میں مدینہ پہنچا ۔ وہ شخص خلیفہ وقت سے ملا اور ان سے رسول ؐ خدا اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں واقفیت حاصل کی ۔ جب وہ واپس وطن جا رہا تھا تو اس کا جہاز مکران کے ساحل سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا اور وہ خود بھی ڈوب گیا ۔ اس کا ملازم جو اس حادثے میں بچ گیا تھا ، وہ کسی نہ کسی طرح واپس وطن پہنچ گیا اور اس نے اپنے ہم وطنوں کو نئے مذہب کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں اور اس خلیفہ کے متعلق بھی بتایا جسے اس نے سادہ سے لباس[3] میں ملبوس دیکھا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ لنکا کے لوگ مسلمانوں سے محبت کرتے اور ان کے بارے میں بڑی رواداری کا ثبوت دیتے ہیں ۔

عرب نوآبادی کا دوسرا بڑا مرکز مالدیپ کا مجموعۃ الجزائر تھا جس کو عرب جزیرۃ المحل کے نام سے جانتے تھے ۔ مرور ایام کے ساتھ ان جزائر کے باشندوں نے اسلام قبول کر لیا اور ان پر عرب غالب آ گئے ۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ جس نے تقریباً ۱۳۳۳ء تا ۱۳۴۷ء تک برصغیر میں قیام کیا ، اور ان جزائر کی سیر بھی کی تھی۔ وہ بیان کرتا ہے کہ ان جزیروں پر ایک مسلمان خاتون خدیجہ حکمران تھی ۔ ان جزیروں میں اس نے اور بہت سے عربوں کو دیکھا جو کہ زیادہ تر عرب تاجروں[4] کی اولاد تھے ۔

مالابار کے ساحل کی نو آبادی کی بنیاد بھی اسی زمانے میں یا اس سے کچھ عرصہ بعد رکھی گئی ۔ اس نوآبادی کا باعث یہاں کی قیمتی پیداوار یعنی مصالحے تھے جو بڑی مقدار میں عرب اور مغرب کی طرف برآمد کیے جاتے تھے ۔ یوں نظر آتا ہے کہ ہندوستان

---

۱ - چچ نامہ ، فارسی ایڈیشن ، دہلی ۱۹۳۹ء ، ص ۸۱ -
۲ - البلاذری ، فتوح البلدان ، قاہرہ ، ۱۹۳۲ء ، ۴۴۱ -
۳ - بزرگ ابن شہریار ، عجائب الہند ، قاہرہ ۱۹۰۸ ، ص ۱۱۸ -
۴ - ابن بطوطہ ، عجائب الاسفار ، قاہرہ ، ۱۹۳۸ء ، ۲ : ۱۲۶ -

کے غیر مسلم حکمران مسلمانوں کے مذہب کے معاملے میں بڑی رواداری برتتے تھے۔ عرب آبادکاروں کو یہ رعایت ان کے تجارتی پیشے کی وجہ سے دی جاتی تھی اور کچھ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ عرب بحری ڈاکو ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں حملہ آور ہوتے رہتے تھے ۔ ان علاقوں میں عربوں کے آباد ہو جانے کی وجہ سے مزید حملے رک گئے اور اس طرح سے لوگوں کی جان و مال محفوظ ہوگئے ۔

عرب ہندوستان کے کارومنڈل ساحل سے بھی اچھی طرح واقف تھے اور وہ اس ساحل کو منڈل کہہ کر پکارتے تھے ۔ یہ علاقہ عنبر اور عُود کی وجہ سے مشہور تھا جن کو تاجر مغربی دنیا میں بڑی زیادہ قیمتوں پر فروخت کر کے بہت نفع کماتے تھے ۔ گجرات کا حاکم ولب رائے یا بلہار مسلمانوں کا دوست تھا اور اس نے ان کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ اس کی سلطنت میں نوآبادیاں قائم کریں ۔ بلہار کی رعایا اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ اس کے حکمران کی طویل العمری اس وجہ سے تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کو رعایت دے دی تھی ۔ البتہ ابن خرداذبہ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ کاٹھیاوار کا حکمران عربوں کے ساتھ معاندانہ رویہ رکھتا تھا مگر اس مخالفانہ رویے کے باوجود عربوں اور ان کے خلیفہ کی برتری تسلیم کرتا تھا[1] ۔

اسلامی عہد میں عربوں کا سندھ کے ساتھ تعلق ۶۳۶ء/۱۵ھ میں خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کے عہد میں قائم ہوا ۔ عمان کے گورنر عثمان ابن ابی العاص الثقفی نے اپنے بھائی مغیرہ کو جہاز دے کر بھیجا کہ وہ سندھ اور ہندوستان کے ساحلوں کا سیاسی اور دفاعی جائزہ لے ۔ چنانچہ دیبل بڑاچ ، تھانہ اور مغربی ساحل کے دوسرے شہروں کا جائزہ لے کر مغیرہ کا جہاز محفوظ لوٹ آیا ۔ جب حضرت عمرؓ کو اس نئی مہم کی خبر دی گئی تو وہ گورنر کے اس فعل پر سخت ناراض ہوئے ۔ سلطنت کے استحکام اور بحری مہم کے خطرات کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے اس بحری مہم کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور اپنے گورنر کو ان سادہ لیکن سخت لفظوں میں تنبیہہ کی :

يَا أَخَا ثَقِيف حَمَلْتَ دُوداً عَلَى عُود وَانّى أَحلفُ بِاللهِ انّ لَوْ أُصِيبُوا الأَخَذْتُ مِنْ قَوْمِكَ مِثْلَهُم[2] ۔

ترجمہ : اے ثقفی ! تو نے اس بحری مہم کے ذریعے بڑا خطرناک اقدام کیا اور اگر ان لوگوں میں کوئی بھی اس مہم میں کام آ جاتا تو اس کا بدلہ

---

۱ - ابن خرداذبہ ، المسالک و الممالک ، لائیڈن ۱۸۸۹ء ، ص ۵۵ ۔

۲ - البلاذری ، فتوح البلدان ، ص ۴۳۸ ، ۲۲ء لائیڈن ۔ 'چچ نامہ' ، ص ۷۴ ۔

تیرے قبیلے سے ضرور لے لیتا ۔

ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کی عائد کردہ پابندیاں سیاسی اور انتظامی وجوہ کی بنا پر تھیں ۔ عرب سلطنت کی حدود بہت وسیع ہو چکی تھیں ۔ اس وسیع سلطنت کا انتظام وانصرام ضروری تھا ۔ عرب افسر بنیادی طور پر سپاہی تھے ۔ انتظامی امور کا بندوبست بھی انہیں کے سپرد تھا اور اس کے باعث یہ لازم تھا کہ نئے علاقوں کے حصول کے بعد مزید تربیت یافتہ کارکن درکار تھے ۔ مزید برآں ایران کے لوگ عرب فاتحین کے ساتھ کلّی طور پر خوش نہ تھے اور جب کبھی موقعہ ملتا تو وہ مصیبت کھڑی کر دیتے تھے ۔ اس لیے اسلامی سلطنت کی مزید توسیع روک دی گئی اور عرب نئے مفتوحہ علاقوں کے انتظام میں لگ گئے ۔ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں عراق کے گورنر عبداللہ بن عامر کریز نے ایک شخص حکیم بن جبلة العبدیؔ کو ہند کی سرحدوں کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا ۔ اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ مکران کے ساحلی علاقے کے راستے سندھ اور ہند پر حملے کے امکان کا جائزہ لیا جائے ۔ جب ابن جبلہ کرمان واپس آیا تو گورنر نے اسے مدینہ بھیجا تا کہ وہ براہِ راست اس تحقیق کے نتائج کی خلیفہ کو اطلاع دے ۔ اس نے حضرت عثمانؓ کو بتایا :

”یا أمیرَ المُؤمنینَ ! مَاؤُهَا وَشَلٌ ، و تَمرُهَا دَقَلٌ ولِصُّهَا بَطَلٌ ۔ إنْ قَلَّ الْجَیْشُ بِهَا ضَاعُوا وإنْ کَثُرُوا جَاعُوْ“ ۔[۱]

ترجمہ : اے خلیفة المؤمنین! وہاں پانی کم یاب ہے ، ردّی قسم کی کھجور ہوتی ہے اور ڈاکو بڑے دلیر ہیں ۔ اس لیے اگر تھوڑی فوج بھیجی جائے تو وہ بھی ضائع ہو جائے گی اور اگر بڑی فوج روانہ کی گئی تو وہ بھوک سے تباہ ہو گی ۔

چنانچہ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں سندھ پر لشکر کشی نہیں کی گئی ۔ تاہم چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں سندھ کی سلطنت پر سرحدی حملوں کا سلسلہ جاری رہا ۔ حضرت علیؓ کے حکم سے حارث بن مرة العبدی نے سندھ پر حملہ کرکے قیقان تک علاقہ فتح کر لیا ۔ پھر مہلب بن ابی صفرہ اور اس کے بعد عبداللہ ابن سوّار العبدی نے امیر معاویہؓ کے عہد میں سندھ پر حملے کیے اور موجودہ بلوچستان کے علاقے قیقان تک فتوحات حاصل کیں ۔ یہ کہا جاتا ہے کہ مہلب بن ابی صفرا نے یلغار

---

۱ - 'چچ نامہ' ، ص ۷۵ ۔

کرتے ہوئے بنوں اور لاہور (بنہ اور الاہور ، بقول البلاذری یہ دونوں شہر ملتان اور قابل کے درمیان ہیں) پر قبضہ کر لیا اور مالِ غنیمت سے لدا پھندا واپس ہوا ۔ مکران کی مکمل فتح امیر معاویہؓ ابن ابی سفیان کے عہد میں سنان بن سلمہ بن المحبّق الھذلی کے ہاتھوں عمل میں آئی ۔ اس فتح کے باعث عربوں کا سندھ کی بادشاہت کے ساتھ بلاواسطہ آمنا سامنا ہوا ۔ راشد بن عمرو الحدیدی ، مندر بن جارود العبدی اور ابن حری الباہلی نے جو امیر معاویہؓ کے عہد میں یکے بعد دیگرے سرحدِ ہند کے گورنر بنے ، حملوں کو از سرِ نو شروع کیا اور نئی مقامات پر دشمنوں کو شکست دے کر اہم علاقوں پر قبضہ کر لیا ۔ امیر معاویہؓ کی موت کے بعد سندھ پر حملوں کے بارے میں کوئی قطعی تاریخی شہادت نہیں ملتی ۔ عبدالملک بن مروان نے زمامِ حکومت سنبھالنے کے بعد حجاج بن یوسف کو عراق کا وائسرائے مقرر کیا ۔ حجاج نے انتظام و انصرامِ سلطنت کے پیشِ نظر سندھ کے علاقے میں بھی نئے گورنر اور والی مقرر کیے ۔ اس کے بعد جلد ہی ولید بن عبدالملک کے عہدِ حکومت میں عربوں کی فتوحات کا دائرہ سندھ میں بڑی تیزی سے وسیع ہونے لگا ۔ اس کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ان جہازوں کو سندھ کے بحری قزاقوں نے لوٹ لیا جن میں لنکا کے حکمران کی طرف سے بھیجے ہوئے تحفوں کے علاوہ وہ عرب خواتین بھی تھیں جن کے آباء و اجداد تاجر تھے اور وہ لنکا میں وفات پا چکے تھے اور جنہیں لنکا کے حاکم نے حجاج سے خوشگوار تعلقات استوار کرنے کے لیے عراق بھیج دیا تھا ، تاکہ وہ غریب الوطنی میں اپنے کو بے یار و مددگار نہ محسوس کریں ۔ ان عورتوں کو بھی قزاقوں نے قید کر لیا ۔ ان میں سے ایک عورت قبیلۂ بنی یربوع سے تعلق رکھتی تھی ۔ اس نے دہائی دی ''اے حجاج ہماری مدد کو پہنچ'' ۔ جب وائسرائے کو اس دہائی دینے والی عورت کے بارے میں خبر دی گئی تو وہ ان عورتوں کو رہائی دلانے کے لیے لشکر کشی کرنے کے لیے تیار ہو گیا[1] ۔

حجاج نے دو فوجیں سندھ پر حملہ کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے روانہ کیں ، جن کے سپہ سالار بالترتیب عبیداللہ ابن نبہان اور بریل ابن طہفۃ البجلی تھے ۔ یہ فوجیں دیبل تک بڑھتی چلی گئیں ، لیکن ان دونوں فوجوں کو کامیابی نہ ہو سکی اور ان کے سپہ سالار مارے گئے ۔ حجّاج نے اس کے بعد تیسری فوج اچھی طرح کیل کانٹے اور سامانِ جنگ سے لیس کرکے محمد بن قاسم الثقفی کے زیرِ کمان سندھ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجی ۔ محمد بن قاسم وائسرائے کا چچا زاد بھائی تھا ۔ محمد بن قاسم شیراز سے ایک خاصی بڑی فوج کے ساتھ چلا اور مکران کے مقام پر اسے تازہ دم فوج کی کمک ملی ۔ منجنیقیں سمندر

---

۱ ۔ البلاذری ، فتوح البلدان ، ص ۴۴۲ ۔

کے راستے روانہ کی گئیں جو کہ بحری فوج کے دیبل پہنچنے کے روز ہی وہاں پہنچ گئیں۔ دیبل کا محاصرہ کر لیا گیا اور جب دیبل فتح ہو گیا تو مسلمانوں نے ہندو آبادی کو امان دی، البتہ راجہ داہر کا گورنر وہاں سے جان بچا کر بھاگ نکلا۔ اس کے بعد عرب فوجوں نے فاتحانہ پیش قدمی شروع کر دی۔ وہ بیرون (نیرون)، سہوان، سدوسان اور راور کو فتح کرتے ہوئے برہمن آباد تک پہنچ گئے اور خون ریز جنگ کے بعد برہمن آباد کو بھی فتح کر لیا گیا۔ پھر یہ فوجِ ظفر موج سندھ کے دارالحکومت الرّور کی طرف روانہ ہو گئی۔ چند ماہ کے محاصرے کے بعد اہلِ شہر نے ہتھیار ڈال کر صلح کر لی۔ اس کے بعد ملتان کی طرف پیش قدمی ہوئی۔ بڑے معرکے کے بعد کہیں جا کر ملتان فتح ہوا اور بڑا مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ ملتان سے محمد بن قاسم نے قنوج کی طرف ہراول دستے کے طور پر ایک فوج روانہ کی اور یہ فوج موجودہ راجستھان[1] کے شہر اجودھیاپور کے مضافات میں پہنچ گئی۔ اس اثناء میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا اور نئے حکمران کی سیاسی حکمتِ عملی، محمد بن قاسم کی معزولی اور اس کی عراق میں طلبی نے فتوحات کے اس دھارے کو روک دیا اور بعد کے عرب گورنروں نے مفتوحہ علاقوں میں اپنی سرگرمیوں کو محدود کر دیا۔

لیکن ۷۱۷ء میں جب عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ بنے تو انہوں نے یہاں کے راجوں، ٹھاکروں اور زمینداروں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جس کا بڑا خوشگوار اثر ہوا۔ ساتھ ہی انہوں نے دریائے راوی کے آس پاس کے علاقے اور سندھ کے شمالی علاقہ سے متصل قصبہ کچھ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد جنید بن عبدالرحمان سندھ کا گورنر بنا۔ اس نے جھالا وار، مرمد یعنی مار واڑ سے آگے گجرات تک فوج کشی کی۔ اس کے بعد بھروچ پر حملہ کر کے اسے فتح کیا۔ نیز اس کے ایک سردار حبیب ابن مرہ نے جنوبی راجپوتانہ اور مالوہ پر یورش کی اور کئی ریاستوں کو ختم کر دیا۔ جنید کے حاکمِ خراسان مقرر ہونے پر تمیم بن یزید کو گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ اگرچہ اس کی لاپرواہی سے کئی ایک علاقے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئے لیکن جب محمد بن قاسم کا بیٹا عمرو سندھ کا گورنر ہوا تو اس نے وہ تمام علاقے جو اس کے پیشرو کے زمانے میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئے تھے دوبارہ فتح کیے۔ اس نے محفوظہ اور منصورہ کے ناموں سے دو نئے شہر بھی بسائے۔ اموی خاندان کے خاتمے (۷۵۰ء) اور عباسی خاندان کے دورِ خلافت کی ابتدا سے سندھ میں گورنر دمشق کی بجائے بغداد سے مقرر ہونے لگے۔ قریباً ایک سو سال تک سندھ کا نظم و نسق دارالخلافت بغداد کے ماتحت رہا۔ ۸۷۰ء میں خلیفہ معتمد نے یعقوب بن لیث کو خراسان، سجستان اور کرمان کی امارت کے ساتھ ساتھ سندھ کی حاکمیت بھی تفویض کی۔ 'ارلی ہسٹری آف انڈیا' میں ارنسٹ۔ اے۔ سمتھ

---

۱ - چچ نامہ، ص ۲۰۱ -

لکھتا ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں نے کابل کو فتح کر لیا تھا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد مرکز کی کمزوری کی وجہ سے سندھ میں ملتان اور منصورہ کی دو خود مختار ریاستیں وجود میں آگئیں۔ عمر بن عبدالعزیز ہباری آخری (۸۸۰ء) حاکم تھا جو خلیفہ بغداد کی طرف سے مامور ہوا۔ اس کے بعد یہ خاندان خود مختار ہوگیا۔ دسویں صدی عیسوی میں فرقہ باطنیہ کی تبلیغی سرگرمیوں کےنتیجےمیں سندھ کے حکمرانوں میں اسمٰعیلیوں کا اثر پھیلا اور ۹۸۳ء میں قرامطہ نے ملتان پر قبضہ کر لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سندھ میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آگئیں۔ چنانچہ یہاں کے دربار مخلوط طرز کےہونے لگے یعنی سندھی اور عربی۔ دربار میں ایک وزیر ہوتا اور دوسرا امیرالامراء۔

محمد بن قاسم نےسندھ میں نیا انتظامی طریق کار رائج کیا تھا۔ جس کی بنیاد رواداری اور خیر سگالی پر تھی۔ نوجوان فاتح بلاشبہ ایک لائق شخص تھا۔ اس نے علاقے کے لوگوں کو خاصی آزادی دے دی اور مذہبی رواداری اور فراخ دلی سے کام لیا۔ سندھ کے لوگ عام طور پر بدھ مذہب کے پیرو تھے۔ ہندو تعداد میں کم تھے اور ان کا شمار عام طورپر معززین، ادیبوں اور سپاہیوں میں ہوتا تھا۔ سندھ کا مشہور برہمن حکمران چچ سندھ کے تخت پر متمکن ہونے سے پہلےایک منشی تھا جو ملک کی سازشوں کی وجہ سے یہاں کا حاکم بن گیا۔ عرب کے مسلمانوں نے مفتوحہ اقوام کے مذہبی اور سماجی حقوق کا احترام کیا۔ انہوں نے سندھ کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کی۔ بلکہ مقامی باشندوں کے بارے میں رواداری اور صلح جوئی کی پالیسی اختیار کی۔ سندھ کا انتظام مقامی پنچائتوں کے سپرد کر دیا گیا جن کا فرض یہ تھا کہ وہ اپنے مسائل اور معاملات کو اپنے قوانین اور رسم و رواج کی روشنی میں طے کریں۔ انہیں بڑے بڑے انتظامی عہدے بھی دیے گئے۔ کاریگروں اور کسانوں کو اپنی حالت درست کرنے کے لیے مالی امداد دی گئی۔ شکستہ مندروں کی مرمت کرائی گئی مگر جب مقامی لوگوں نے اپنا اعتماد کھو دیا تو عربوں نے شہری انتظام چلانے کے لیےاپنے آدمی مقرر کیے۔ محمد بن قاسم نے رواح ابن اسد کو الّرور کا گورنر مقرر کیا جب کہ عدلیہ کے انتظام کو اپنےایک رشتہ دار موسٰی بن یعقوب الثقفی کے سپرد کیا[1]۔ ایسے ہی دیبل، النیرون، برہمن آباد اور دیگر مضبوط و مستحکم قلع بند شہروں میں اپنے آدمی متعیّن کیے۔ شروع شروع میں پولیس کی ذمہ داریاں فوج کو سونپی گئی تھیں، لیکن بعد میں ایک محکمہ تشکیل دیا گیا جس کا نام شُرطہ رکھا گیا۔

صوبائی انتظامیہ کا سربراہ والی یا امیر ہوتا تھا جس کو خلیفہ کے خاص حکم سے مقرر کیا جاتا تھا۔ بعض اوقات عراق کا وائسرائے خلیفہ کی منظوری کے بغیر گورنر

۱۔ چچ نامہ، ص ۲۴۱۔

مقرر کر دیتا تھا ۔ ابتدا میں سندھ کے سارے صوبے کے لیے صرف ایک ہی گورنر مقرر کیا جاتا تھا ، لیکن بعد میں ملتان ، منصورہ ، قصدار ، توران ، مکران اور دوسرے خطوں کے لیے جن میں وادیٔ سندھ کو تقسیم کیا گیا تھا ، علیحدہ علیحدہ گورنر مقرر کیے گئے ۔

عربوں کے ساتھ ثقافتی تعلقات

سندھ میں عرب حکمرانوں کے زمانۂ حکومت میں فاتحین نے دمشق ، بغداد اور اسلامی علوم و ثقافت کے دوسرے مراکز کے ساتھ تعلق قائم کر لیا تھا ، جس کے نتیجے میں علوم و معارف کی روشنی یہاں پھیلی اور بالآخر اس نے پورے برّ صغیر کو منور کر دیا۔ عربوں نے سندھ کو ایک ایسے طریقِ زندگی سے متعارف کیا جو وادیٔ سندھ میں پائے جانے والے طریق سے بالکل مختلف تھا ۔ تاہم یہ نیا طریقِ زندگی بالکل سادہ تھا اور اس کو آسانی سے قبول کیا جا سکتا تھا ۔ تبلیغی سرگرمیوں کے باعث سندھ کی آبادی کے ایک بڑے حصے نے اسلام قبول کر لیا ۔ سندھ کے بہت سے قبائل اپنی مرضی اور رضا مندی سے مشرف بہ اسلام ہوگئے ۔ سندھیوں کی بڑی تعداد زیادہ تر حضرت عمرو بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوئی جنہوں نے سندھ اور ہند کے حکمرانوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوتیں بھیجی تھیں ۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ راجہ داہر کا بیٹا (جیسہ) بھی مسلمان ہوگیا تھا ، جس کے نتیجے کے طور پر اسے اپنے باپ کے علاقے کا کچھ حصہ واپس مل گیا[1]۔ سندھ میں عربوں کی حکومت سے خوشحالی اور اطمینان کا دور دورہ ہوا ۔ اس وسیع تجارت کے باعث جو عرب مشرق اور مغربی ممالک کے ساتھ کرتے تھے ، ہر چیز بکثرت اور سستے داموں ملتی تھی ۔ خوراک اور کھجوریں عام تھیں ، پھل بھی بکثرت دستیاب تھے اور عام طور پر لوگ مطمئن اور خوش و خرم تھے ۔

عربوں کے دورِ حکومت میں المنصورہ ، ملتان، دیبل ، نیرون ، الرّور ، سہوان وغیرہ سندھ کے بڑے بڑے شہر تھے۔ المنصورہ جو دارالحکومت تھا ، دریا کے وسط میں ایک جزیرے پر واقع تھا ۔ یہ شہر خوبصورت تھا اور اس میں اونچی دیواروں کا ایک مضبوط قلعہ تھا ۔ اس کے چار دروازے تھے : البحر ، باب سندان ، باب ملتان اور باب توران ۔ یہ چار دروازے ان چار راستوں کی نمائندگی کرتے تھےجن کے ذریعے المنصورہ دنیا کے دوسرے ممالک کے ساتھ روابط رکھتا تھا ۔ جیسا کہ عرب جغرافیہ دانوں نے بیان کیا ہے کہ یہ شہر بے انتہا گرم تھا لیکن اس میں کھجوریں ، آم ، لیموں اور

---

۱ ۔ البلاذری ، فتوح البلدان ، ص ۴۴۴ ، ابن الاثیر الکامل ، قاہرہ ۱۳۰۱ھ : ۴ : ۲۸۴ ۔

دوسرے پھل بکثرت پیدا ہوتے تھے[1] ۔

دیبل سندھ کی ایک بڑی بندرگاہ تھی ، جہاں چین اور جزائر الہند سے عطریات ، لوبان ، مصالحے اور دوسری چیزوں سے لدے ہوئے جہاز آتے تھے ۔ اسی طرح بغداد ، بصرہ اور عمان سے عرب دنیا کا سامان تجارت یہاں پہنچتا تھا ۔ یہ برصغیر پاک و ہند کے لیے غلہ کی منڈی تھی جس میں ہر طرح کی خرید و فروخت بڑی بصیرت اور مہارت کے ساتھ عمل میں آتی تھی ۔ چونکہ یہ شہر ساحل سمندر پر واقع تھا اس لیے مشرق اور مغرب سے آنے والے جہازوں کی گزرگاہوں پر نگاہ رکھتا تھا ۔ دو دنیاؤں کے وسط میں ہونے کے باعث اس میں مختلف اقوام کے تاجر جمع ہوتے تھے ۔ شہر کی آبادی بہت تھی لیکن اس کا عقبی علاقہ بنجر تھا ۔ المسعودی یہ بیان کرتا ہے کہ دیبل کی بندرگاہ کے گرد و نواح میں ایک سو گاؤں آباد تھے[2] ۔

نیرون کا شہر بھی گنجان آباد تھا لیکن اس شہر میں درخت کمیاب تھے ۔ ایک مضبوط قلعہ اس کی حفاظت کرتا تھا ۔ دیبل کی بندرگاہ اور دارالحکومت المنصورہ کے درمیان آمدورفت کشتیوں کے ذریعے ہوتی تھی ۔ سندھ کا پرانا دارالحکومت الرّور (آج کل کا روہڑی) ایک بڑا شہر تھا جس کا رقبہ ملتان کے برابر تھا ۔ اس کا قلعہ دوہری دیوار کا تھا ۔ اس میں بہت سے باغات اور سیر و تفریح کی بہت سی جگہیں تھیں ۔ لیکن ملتان رقبے کے اعتبار سے منصورہ سے آدھا تھا ۔ یہ شمالی عرب حکومت کا دارالحکومت تھا جس پر قریشی قابض تھے ۔ ملتان جو سورج دیوتا کے مندر کی وجہ سے مشہور تھا برصغیر کے غیرمسلم زائرین کا مرکز تھا جو کہ ہر سال قیمتی تحفوں کے ساتھ یہاں آتے تھے ۔ ملتان فرج بیت الذہب (سونے کے گھر کی سرحد) کے نام سے مشہور تھا کیونکہ سندھ کے عرب فاتح محمد بن قاسم نے اس کے مندر سے سونے کی بڑی مقدار برآمد کی تھی ۔ دوسرے شہر سہوان ، بلاری ، بسمد اور جندر وغیرہ بھی خوشحال تھے ۔ ان کے اردگرد زرخیز میدان تھے جن میں سایہ دار اور پھل دار درخت لگائے گئے تھے ۔

سندھ کے باشندوں نے وادی میں عرب حکومت کے ابتدائی مراحل میں مسلمانوں کی ثقافت کو اپنا لیا تھا ۔ انہوں نے عربوں کے رسم و رواج ، عادات ، لباس حتیٰ کہ ان کی زبان کو جو ازمنۂ وسطیٰ میں مہذب دنیا کی بین الاقوامی زبان کا درجہ اختیار کر چکی تھی ، اختیار کر لیا ۔ سندھ کے باشندوں کا لباس عراق اور دوسرے ملحقہ

---

۱ ۔ الاصطخری ، المسالک و الممالک ، لائڈن ، ۱۹۲۷ء ، ص ۱۷۳ ۔
ابن حوقل ، صورة الارض ، لائڈن ، ۱۹۳۸ء ، ص
المقدسی ، احسن التقاسیم ، لائڈن ، ۱۹۰۶ء ، ص ۴۸۰ ۔

۲ ۔ المسعودی ، مروج الذهب ، بغداد ۱۸۶۶ء ۱۲۸۳ھ ، ۱ : ۱۶۲ ۔

مسلم ممالک کے مشابہ تھا ۔ اگرچہ حکمرانوں کا لباس مختلف تھا جو ہندو راجاؤں سے مماثلت رکھتا تھا ۔ خاص طور پر لبادہ اور بال ۔ وادیٔ سندھ کے نچلے حصے میں شدت کی گرمی کے باعث یہاں کے لوگوں کا لباس ایک چغہ پر مشتمل تھا ۔ لیکن تاجر لوگ اپنے ہم پیشہ عراقیوں اور ایرانیوں کی طرح قمیض اور چغے استعمال کرتے تھے ۔ شلوار اور کرتے کا استعمال عام تھا اور بارھویں صدی عیسوی تک لوگ ان کو پہنتے رہے ۔ اس زمانے میں جب ادریسی سندھ میں آیا تو اس نے بھی لوگوں کو یہی لباس زیب تن کیے ہوئے دیکھا ۔ اس کے بیان کے مطابق عرب حکمران ہندو حاکموں کی طرح لمبے بال رکھتے تھے اور اپنے کانوں میں بالیاں پہنتے تھے ۔ منصورہ اور ملتان کے حاکموں کو مسلم رعایا امیر کہہ کر پکارتی تھی ، لیکن غیر مسلم ان کو مہاراج[1] کہہ کر مخاطب کرتے تھے ۔ اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرب حکمرانوں پر غیر مسلم ثقافت کا اثر تھا اور اس خطے میں آباد ہونے اور قومیت اختیار کر لینے کی وجہ سے انہوں نے مفتوحین کے بہت سے رسم و رواج کو اپنا لیا تھا ۔

عربی شاعری

اسلام کی پہلی صدی ادب کی ترقی اور نشوونما کے لیے زیادہ سازگار نہ تھی ۔ عرب جو فتوحات میں مصروف تھے ، بالآخر خانہ جنگی میں الجھ گئے ۔ اس کے باعث ان کی قوت اور وقت ضائع ہوا اور ادبی ترقی کے لیے مناسب ماحول نہ بن سکا ۔ اموی عہد حکومت میں جاہلی عصبیت کی روح پھر ابھرنے لگی ۔ شاعری کے ساتھ نثر نگاری نے بھی ترقی کی ۔ اموی دور کے سربرآوردہ شاعروں میں عمر ابن ابی ربیعہ غزل گو کے علاوہ الاخطل ، الفرزدق اور جریر ایسے بلند پایہ شعراء بھی تھے ، جو اپنے فن میں یکتا اور یگانہ تصور کیے جاتے تھے ۔ ان میں الفرزدق اور جریر دونوں کے درمیان سخت معاصرانہ چشمک تھی اور وہ برسر عام برسوں تک ایک دوسرے کے خلاف ہجویہ اشعار پڑھتے رہے اور ایک دوسرے کو غیر شائستہ اور گندے الفاظ سے نوازتے رہے ۔ ان تینوں میں سب سے زیادہ نامور قبیلۂ بنو تغلب کا الاخطل تھا جو مذہباً عیسائی تھا مگر اموی خلفاء کا مداح تھا ۔

فرزدق اور جریر کی ادبی مبارزت میں الاخطل کی ہمدردیاں فرزدق کے ساتھ تھیں جو قصیدہ ، ہجو اور عشقیہ شاعری میں الاخطل کی برتری کو مانتا تھا ۔ دوسرا بڑا شاعر فرزدق (ہمام ابن غالب) قبیلۂ بنو تمیم سے تعلق رکھتا تھا اور بصرہ میں پیدا ہوا تھا ۔ اس کا باپ اور دادا جود و سخاوت اور عزت و شرف کی وجہ سے بڑی شہرت

---

۱ ۔ الاصطخری ، ص ۱۷۷ ۔

رکھتے تھے ۔ لیکن یہ خوبیاں بڑی تیزی سے متروک ہو رہی تھیں ۔ اپنے باپ کی یاد اور حضرت علیؓ اور ان کے خاندان سے اس کی عقیدت ضرب المثل تھی ۔ وہ اپنے معتقدات کو اموی خلفاء سے بھی نہیں چھپاتا تھا ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ہشام ابن عبدالملک کے سامنے حضرت زین العابدینؓ کی شان میں ایک شاندار قصیدہ پڑھا ۔ عراق کے لوگوں کے جذبات کو ابھارنے کے لیے اس نے مندرجہ ذیل الفاظ میں ان کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ کربلا میں حضرت حسینؓ ابن علیؓ کی شہادت کا انتقام لیں :

فَاِن أَنتُم لَم تَثأَرُو لابنِ خَيرِكُم   فاتقوا السّلاح واغزلوا بِالْمَغَازِلِ[1]

ترجمہ : اگر تم نے سب سے بہترین انسان کے بیٹے کا انتقام نہ لیا تو بہتر ہے کہ تم اپنے ہتھیار پھینک دو اور عورتوں کی طرح چرخے کاتا کرو ۔

جریر ابن عطیہ حجاج کا درباری شاعر تھا ، اور حجاج اپنی تعریف میں اس کے مدحیہ قصیدوں کے باعث اس کی حوصلہ افزائی کیا کرتا تھا ۔ اس نے اس وقت کے خلیفہ عبدالملک کی شان میں بھی اشعار لکھے ۔ بعض ناقدین کی رائے میں وہ اس دور کا سب سے بڑا شاعر تھا ۔ شعر چار طرز کے ہوتے ہیں ۔ مبالغہ آرائی ، قصیدہ گوئی ، ہجویہ اور عشقیہ اور جریر ان تمام اصناف میں سربرآوردہ تھا[2] ۔

عربوں میں شاعری کا ذوق صرف ادبی حلقوں تک محدود نہ تھا بلکہ ساری قوم میں جاری و ساری تھا ۔ شہزادے ، سیاست داں ، سپاہی حتیٰ کہ خواتین بھی شعری ذوق سے بہرہ ور تھیں اور شاعری سے یہ محبت ہر عام و خاص میں موجود تھی ۔ سندھ میں محمد بن قاسم پہلا آدمی تھا جس نے عربی شاعری کی ترقی اور نشوونما کی ابتدا کی ۔ محمد بن قاسم کی ان نظموں کے شواہد جو وہ اپنی بہادری ، دریا دلی اور انسانی بے چارگی کے بارے میں پڑھتا تھا ، ازمنۂ وسطیٰ کے معاصرانہ تذکروں میں محفوظ ہیں ۔ محمد بن قاسم نے تین سال کے مختصر عرصے میں وادیٔ سندھ کو فتح کر لیا تھا اور اس نے قنوج کی بادشاہت پر حملہ کرنے کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں ۔ اس مقصد کے لیے اس نے ابوحکیم الشیانی کے زیر کمان ایک فوج بھی روانہ کی تھی لیکن مرکز میں خلیفہ کے بدل جانے کی وجہ سے اس کو واپس طلب کر لیا گیا اور ملزم ٹھہرا کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ۔ وہ خود ان الفاظ میں اپنے اس ذلت آمیز انجام پر آہ و بکا کرتا ہے:

---

۱ ۔ ابوالفرج الاصفہانی ، الاغانی ، قاہرہ ۱۹۲۷ء ، ۱۳ : ۱۴۸ ۔
۲ ۔ ابن خلکان ، وفیات الاعیان ، ۱ : ۲۹۴ تا ۲۹۵ ۔

أَضَاعُونِي وَأَيَّ فَتًى أَضَاعُوا ۔۔۔ لِيَوْمِ كَرِيهَةٍ وَسِدَادِ ثَغْرٍ[1]

ترجمہ : انہوں نے مجھے کھو دیا ، آہ وہ کتنے بہادر شخص سے محروم ہو گئے وہ بہادر جو جنگ اور سرحدوں کی حفاظت کے کام آیا کرتا تھا ۔

وہ واسط کے زمین دوز قید خانے میں اپنی بے بسی کا بھی حال بیان کرتا ہے۔ یہ وہ قید خانہ ہے جہاں عراق کے عامل صالح بن عبدالرحمان نے اسے قید کر دیا تھا ۔ اس غم کے تاریک لمحے میں بھی وہ اس بات کے زور دار بیان سے نہیں چوکتا کہ اس نے ایران میں بڑے بڑے بہادر سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا :

فَلَئِنْ ثَوِيتُ بِوَاسِطٍ وَبِأَرْضِهَا ۔۔۔ رَهْنَ الْحَدِيدِ مُكَبَّلًا مَغْلُولًا

فَلَرُبَّ فِتْيَةِ فَارِسٍ قَدْ رُعْتُهَا ۔۔۔ وَلَرُبَّ قِرْنٍ قَدْ تَرَكْتُ قَتِيلًا

ترجمہ :

۱ ۔ اگرچہ میں واسط کی سرزمین میں مقیّد ہوں اور مجھے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا دی گئی ہیں تو کوئی بات نہیں ۔

۲ ۔ ایک وہ وقت بھی تو تھا ، جب میں ایران کے نوجوان بہادروں سے لڑا ہوں اور بڑے بڑے دلاوروں کو میں نے تہہِ تیغ کیا ہے ۔

پھر کہتا ہے :

لَوْ كُنْتُ أَجْمَعْتُ الْقَرَارَ لَوَطِئَتْ ۔۔۔ إِنَاثٌ أُعِدَّتْ لِلْوَغَى وَذُكُورُ

وَمَا دَخَلَتْ خَيْلُ السَّكَاسِكِ أَرْضَنَا ۔۔۔ وَلَا كَانَ مِنْ عَكٍّ عَلَيَّ أَمِيرُ

وَلَا كُنْتُ لِلْعَبْدِ الْمَزُونِيِّ تَابِعًا ۔۔۔ فَيَالَكَ دَهْرٌ بِالْكِرَامِ عَثُورُ[2]

ترجمہ :

۱ ۔ اگر میں مقابلے کی ٹھان لیتا تو تمام عورتوں اور مردوں کو جو جنگ کے لیے تیار کیے گئے تھے پامال کر کے رکھ دیتا ۔

۲ ۔ سکسکی سردار کے شہسوار ہماری سر زمین میں قدم بھی نہ رکھ پاتے اور نہ عکی (کوئی) مجھ پر بالا دستی کر سکتا ۔

---

۱ ۔ البلاذری ، فتوح ، ص ۳۳۶ : ص ۱۳۳ ، طبع لائیڈن ۔ ابن الاثیر ، الکامل ۴ : ۲۸۲ ۔

۲ ۔ البلاذری ، ص ۳۳۶ ، ۱۳۳ طبع لائیڈن ۔

۳ - اور نہ ہی میں مزونی غلام کے پیچھے پیچھے ہو لیتا - اے زمانے ! تجھ پر افسوس ہے ، شرفاء اور معززین سے تو ہمیشہ بے وفائی کرتا ہے -

ان اشعار کے علاوہ المرزبانی کی 'معجم' میں بھی کچھ اشار ملتے ہیں جو اوپر کے چھ شعروں کے ساتھ شامل کیے جا سکتے ہیں :

أتنسى بنو مروان سمعي و طاعتي — و انی علی ما فاتنی لصبور

فتحت لهم ما بين سابور بالقنا — الى الهند منهم زاحف و مغير

فتحت لهم ما بين جرجان بالقنا — الى الصين القى مده و أغير[1]

ترجمہ :

۱ - کیا بنو مروان میری وفاداری کو بھول گئے ہیں ، اگرچہ میں مصائب و حوادث میں مبتلا ہوں اس کے باوصف ثابت قدم ہوں -

۲ - میں نے ان کے لیے سابور سے لے کر ہند تک کی سرزمین کو فتح کیا تھا -

۳ - اور ان کے لیے چین اور جرجان کے علاقوں پر قبضہ کیا تھا -

محمد بن قاسم کا انجام بہت ہی المناک ہوا - وہ پسندیدہ عادات اور روادارانہ نظریات کا حامل فاتح اور حکمران تھا جس سے دوست اور دشمن دونوں محبت کرتے تھے - وہ مفتوحہ اقوام سے رواداری اور حسن سلوک سے پیش آتا تھا ، یہی وجہ ہے کہ سندھ سے چلے جانے کے بعد اس کی یاد میں اس کا ایک بت بنا کر نصب کر دیا گیا - اس کے ایک ہم عصر شاعر حمزہ بن بیض الحنفی نے محمد بن قاسم کی خوبیوں کی تعریف اس انداز میں بیان کی ہے :

ان المروءة و السماحة والندى — لمحمد بن القاسم بن محمد

ساس الجيوش لسبع عشرة حجة — يا قرب ذلك سؤددا من مولد

ترجمہ :

۱ - جوانمردی اور جود و سخاوت محمد بن قاسم کی خوبیاں تھیں -

۲ - سترہ برس کی عمر میں وہ فوجوں کا سپہ سالار بنا - کتنی کم عمر میں اس نے یہ سیادت حاصل کر لی !

ایک اور شاعر کا قول ملاحظہ ہو :

---

۱ - المرزبانی : معجم الشعراء ، ص ۴۱۲ (=ص ۴۴۳ ، طبع عبدالستار احمد فراج ، ۱۹۶۰ء)

سَاسَ الْجُیُوشَ لِسَبْعِ عَشْرَةَ حِجَّةً وَلِدَاتُہُ عَنْ ذٰلِكَ فِی أَشْغَالِ

ترجمہ :

اس نے سترہ برس کی عمر میں فوجوں کی قیادت کی ، جب کہ اس کے ہم عمر لوگ کھیل کود میں مصروف تھے ۔

معاصر شاعروں نے سندھ میں عربوں کی سرگرمیوں کو اپنے تذکروں میں بیان کیا ہے اور سندھ کی فتح کو ان دو سطروں میں سمو دیا ہے :

نَحْنُ قَتَلْنَا دَاهِراً وَ دَوْهَراً وَالْخَیْلُ تَرْدِی مِنْسَراً فَمِنْسَرًا

ترجمہ :

وہ ہم ہی تو تھے جنہوں نے داہر اور دوہر کو ختم کیا ۔ ہمارے گھڑ سوار دشمن کی فوجوں کو موت کے گھاٹ اتارتے چلے جا رہے تھے ۔

محمد بن قاسم کے بعد کئی گورنر یکے بعد دیگرے مقرر ہوئے جن کے ساتھ بہت سے شاعر سندھ آئے جو بنیادی طور پر سپاہی تھے ۔ ابوالجویریہ ، جریر ، فرذوق ، حمزہ بن بیض الحنفی اور بہت سے دوسرے شاعروں نے ان لوگوں کے کارناموں کا ذکر کیا ہے ۔ اوپر کے صفحات میں حمزہ کی نظم کے نمونے کا حوالہ دیا جا چکا ہے ۔ سندھ کے گورنر جنید ابن عبدالرحمٰن المرّی کی سخاوت کے متعلق جریر یوں لکھتا ہے :

أَصْبَحَ زُوَّارُ الْجُنَیْدِ وَ صَحْبُہُ یُحَیُّونَ صَلْتَ الْوَجْہِ جَمعاً مَوَاهِبُہُ

ترجمہ : جنید کے دوست اور مہمان ایسے صاف اور نرم چہرے کو سلام کرنے لگے جس کے تحائف بے شمار تھے ۔

ابوالجویریہ ان اشعار میں ان کی تعریف اس طرح کرتا ہے :

لَوْ کَانَ یَقْعُدُ فَوْقَ الشَّمْسِ مِنْ کَرَمٍ قَوْمٌ بِأَحْسَابِهِم أَوْ مَجْدِهِمْ قَعَدُوا

مُحَسَّدُونَ عَلٰی مَا کَانَ مِنْ کَرَمٍ لَا یَنْزِعُ اللهُ مِنْهُمْ مَالَہُ حُسِدُوا

ترجمہ :

۱ ۔ اگر کوئی قوم جود و سخاوت کے باعث آفتاب سے بھی بلند مقام حاصل کر سکتی تو یہ لوگ اپنے ذاتی اوصاف و کردار اور مجد و شرافت کی

وجہ سے یہ مقامِ بلند حاصل کر لیتے ۔

۲ ۔ لوگ ان پر سخاوت کی وجہ سے حسد کرتے ہیں ۔ خدا ان کی سخاوت کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے ۔

تمیم ابنِ زید سندھ کے عرب گورنروں میں بڑا سخی دل گورنر تھا ۔ بنو یربوع کا ایک نوجوان جس کا نام خنیس تھا ، اس کے ساتھ فوج میں یہاں آیا تھا ۔ اس نوجوان کی ماں جو قبیلۂ طی سے تھی ، فرزدق کے پاس یہ درخواست لے کر گئی کہ وہ تمیم کو لکھے کہ وہ اس کے بیٹے کو واپس بھیج دے اس نے فرزدق کو اس کے باپ غالب کی قبر کا واسطہ دیا ۔ فرزدق نے تمیم کو یہ اشعار لکھے :

اَتَتْنِی فَعَاذَتْ یَا تَمِیمُ بِغَالِبٍ ۔۔۔ وَ بِالْحُفْرَةِ السَّافِی عَلَیْهَا تُرَابُهَا

فَهَبْ لِی خُنَیْساً وَ اتَّخِذْ فِیهِ مِنَّةً ۔۔۔ لِحَوْبَةِ اُمٍّ مَا یَسُوغُ شَرَابُهَا

تَمِیمَ بْنَ زَیْدٍ لَا تَکُونَنَّ حَاجَتِی ۔۔۔ بِظَهْرٍ وَلَا یَخْفَی عَلَیْكَ جَوَابُهَا

فَلَا تُکْثِرِ التَّرْدَادَ فِیهَا فَاِنَّنِی ۔۔۔ مَلُولٌ لِحَاجَاتٍ بَطِیءٌ طِلَابُهَا[1]

ترجمہ :

۱ ۔ اے تمیم ایک عورت میرے پاس آئی اور اس نے مجھے میرے باپ غالب اور اس قبر کا واسطہ دیا جس پر مٹی اڑ رہی ہے ۔

۲ ۔ مجھے خنیس واپس دے کر احسان کرو ۔ اے تمیم ابن زید ! میں تمہیں اس ماں کی محبت کا واسطہ دیتا ہوں جس کے گلے سے ایک گھونٹ بھی آسانی سے نہیں اترتا ۔

۳ ۔ تمیم ابن زید! میری درخواست کو رد نہ کر دینا اور اس کے جواب سے گریز نہ کرنا ۔

۴ ۔ جو کچھ میں نے تم سے مانگا ہے اس کے لیے دیر نہ کرنا کیونکہ جب لوگ میری خواہش کو پورا کرنے میں دیر کرتے ہیں تو میں رنجیدہ خاطر ہو جاتا ہوں ۔

سندھ کے عربوں نے نہ صرف دارالخلافت کے ساتھ بلکہ اسلامی دنیا کے دوسرے

---

۱ ۔ البلاذری ، ص ۴۳۸ ۔

شہروں کے ساتھ سیاسی ، سماجی ، تجارتی اور ثقافتی تعلقات قائم رکھے ۔ شعراء ، محدّثین ، ادباء ، دستکاروں اور سپاہیوں کے تبادلے کی وجہ سے فاتحین اور مفتوحین کے درمیان ایک گہری افہام و تفہیم عمل میں آئی جس نے ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں میں بہت مدد دی ۔ سندھی نژاد شعراء نے عرب دنیا میں اپنی قابلیت اور تخلیقی صلاحیت کا لوہا منوایا ۔ ابوعطاء السندھی اور ابودلا السندھی کے نام اپنی برجستگی اور حسنِ بیان کے باعث عربی ادب میں غیر فانی ہو گئے ہیں ۔

ابوعطاء السندھی

ابوعطاء السندھی کا اصل نام افلح بن یسار تھا ۔ ابوعطاء عراق کے علاقہ کوفہ میں پیدا ہوا اور وہیں پرورش پائی ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عطاء کا باپ یسار سندھ سے ایک غلام کی حیثیت سے آیا تھا ۔ وہ اموی دربار کا قصیدہ گو شاعر تھا اور اس خاندان کے لیے قلم اور تلوار دونوں سے لڑا ۔ اس نے اپنی آنکھوں سے امویوں کے زوال اور عباسیوں کے عروج کو دیکھا تھا ۔ عباسیوں نے کبھی بھی اس کے علم کی حوصلہ افزائی نہ کی ۔ وہ بنو اسد کا غلام تھا جس سے اس نے چار ہزار درہم کے بدلے اپنی آزادی خرید لی تھی ۔ یہ چار ہزار درہم اس کے ایک مربّی دوست الحرّ بن عبداللہ القرشی نے دیے تھے ، جس کے لیے اس نے مندرجہ ذیل اشعار لکھے :

أَتَيْتُكَ لَا مِنْ قُرْبَةٍ هِيَ بَيْنَنَا ۔۔۔ وَلَا نِعْمَةٍ قَدَّمْتَهَا أَسْتَثِيبُهَا

وَلٰكِنْ مَعَ الرَّاجِينَ إِنْ كُنْتَ مَوْرِداً ۔۔۔ إِلَيْهِ بُغَاةُ الدِّينِ تَهْفُو قُلُوبُهَا

أَغِثْنِي بِسَجْلٍ مِنْ نَدَاكَ يَكُفُّنِي ۔۔۔ وَقَاكَ الرَّدَى مُرْدَ الرِّجَالِ وَشِيبَهَا

تُسَمَّى ابْنَ عَبْدِاللّٰهِ حُرّاً كَوَصْفِهِ ۔۔۔ وَتِلْكَ الْعُلٰى يَعْنِي بِهَا مَنْ يَعِيبُهَا[1]

ترجمہ :

۱ ۔ میں آپ کے پاس قرابتداری کی وجہ سے حاضر نہیں ہوا اور نہ اپنے کسی احسان کا بدلہ لینے کے لیے آیا ہوں ۔

۲ ۔ بلکہ امیدوارانِ کرم کے ساتھ آیا ہوں جن کا یہ خیال ہے کہ آپ کے پاس دشمنانِ دین آتے ہیں جن کے دل خوف سے لرزاں رہتے ہیں ۔

۳ ۔ مجھ کو اپنی بخشش سے بہرہ ور فرمائیے ۔ اللہ تعالٰی آپ کی عمر دراز

---

۱ ۔ الاغانی ، ۱۶ : ۸۲ ، بار اول ۔

کرے ۔ میں آپ کے افضال و اکرام کے طفیل جوانوں اور بوڑھوں کے طعنوں سے محفوظ رہوں گا ۔

۴ ۔ آپ کا نام حر بن عبداللہ ہے اور آپ کی صفت جواں مردی اور حریت پسندی ہے ۔ یہ وہ بلند صفات ہیں جن کی تلاش عیب نکالنے والوں کو بھی رہتی ہے ۔

ایک بسیار گو شاعر کی حیثیت سے ابوعطاء کا شمار عربی ادب کی سربر آوردہ شخصیتوں میں ہوتا ہے ۔ نصر بن سیّار اور حماد الرّاویہ جیسے اشخاص نے اس کی شعری صلاحیتوں کی تعریف کی ۔ مؤخر الذکر ماقبل اسلام کی عربی شاعری پر ایک سند مانا جاتا ہے ۔ جب عباسی برسر اقتدار آئے ، تو اس نے ان کا ان الفاظ میں قصیدہ لکھا :

إنَّ الخِيَارَ مِنَ البَرِيَّةِ هَاشِمٌ ۔۔۔ وَ بَنُوأُمَيَّةَ أَرذَلُ الأَشرَارِ
وَ بَنُوأُمَيَّةَ عُودُهُم مِن خِروَعٍ ۔۔۔ وَ لِهَاشِمٍ فِی المَجدِ عُودُ نُضَارِ
أَمَّا الدُّعَاةُ إِلَی الجِنَانِ فَهَاشِمٌ ۔۔۔ وَ بَنُوأُمَيَّةَ مِن دُعَاةِ النَّارِ

ترجمہ :

۱ ۔ بنو ہاشم انسانوں میں بہترین ہیں اور بنوامیہ بد ترین اشرار ہیں ۔

۲ ۔ بنوامیہ ایک کمزور درخت کی لکڑی کے مانند ہیں اور بنو ہاشم ایک سرسبز درخت کی لکڑی کی طرح ہیں ۔

۳ ۔ بنو ہاشم تمہیں جنت کی طرف بلاتے ہیں اور بنو امیہ کے مبلغین آگ (دوزخ) کی طرف بلاتے ہیں ۔

لیکن جب عباسیوں کی طرف سے اس کو کوئی انعام نہ ملا تو ان کی ہجو ان الفاظ میں لکھی[۱] :

بَنِي هَاشِمٍ عُودُوا إِلَی نَخَلَاتِكُم ۔۔۔ فَقَد قَامَ سِعرُ التَّمرِ صَاعاً بِدِرهَمِ
فَإِن قُلتُم رَهطُ النَّبِيِّ و قَومُهُ ۔۔۔ فَإِنَّ النَّصَارَی رَهطُ عِيسَی بنِ مَريَمِ[۱]

ترجمہ :

۱ ۔ بنو ہاشم تم واپس اپنے نخلستان کی طرف لوٹ جاؤ ، کھجور کی قیمتیں بہت بڑھی ہوئی ہیں ۔

---

۱ ۔ ابن قتیبہ ، الشعر والشعراء ، قاہرہ ، ۱۳۶۴ھ : ۲ : ۷۳۶ (طبع ڈخویہ ، ص ۴۸۴)

۲ - تمہارے اور عیسائیوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے - تم اپنے آپ کو بالکل اسی طرح رسول کریم ؐ کے قبیلے سے منسوب کرتے ہو جیسے کہ عیسائی حضرت عیسیٰ ؑ کے ساتھ تعلق جوڑتے ہیں -

الاغانی کے صفحات اس عظیم شاعر کی تعریف سے بھرے پڑے ہیں جو برجستگی ، زور اور حسن بیان کی وجہ سے مشہور ہے - اس کی نظموں کے حوالے 'دیوان الحماسہ'، ابن قتیبہ کے 'الشعر والشعراء' اور کلاسیکی عربی ادب کے دوسرے انتخابات میں ملتے ہیں - مندرجہ ذیل نظم نے جو 'الحماسہ' کی پانچویں نظم ہے ، ابو عطاء کو غیر فانی بنا دیا ہے اور عربی ادب میں اس نے بہت اونچا مقام حاصل کر لیا ہے :

ذَكَرْتُكِ ، وَالْخَطِّيُّ يَخْطِرُ بَيْنَنَا   وَ قَدْ نَهِلَتْ مِنَّا الْمُثَقَّفَةُ السُّمْرُ[1]

فَوَاللهِ ! مَا أَدْرِي وَ إِنِّي لَصَادِقٌ   أَدَاءٌ عَرَانِي مِنْ حِبَابِكِ ، أَمْ سِحْرُ

فَإِنْ كَانَ سِحْرًا فَاعْذِرِينِي عَلَى الْهَوَى   وَ إِنْ كَانَ دَاءً غَيْرَهُ ، فَلَكِ الْعُذْرُ

ترجمہ :

۱ - میں نے تجھے جنگ کے عروج میں بھی یاد کیا ، جب کہ خطی نیزے ہمارے درمیان چل رہے تھے - سیدھے کیے ہوئے نیزے ہمارا خون بہا چکے تھے -

۲ - خدا کی قسم ! میں سچ کہتا ہوں کہ میں نہیں جانتا کہ مجھ پر تیری محبت کی بیماری غالب آ گئی ہے ، یا کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ہے -

۳ - اگر یہ جادو ہے تو میں اس محبت کے لیے معافی کا مستحق ہوں لیکن اگر یہ بیماری ہے تو سارا قصور تمہارے اوپر ہے -

ابو ضلع السندھی

ابو عطا السندھی کے بعد ابو ضلع السندھی کا نام آتا ہے جو موسی الہادی کا کا مملوک تھا - موسی الہادی چوتھا عباسی خلیفہ تھا - اس کے برعکس کچھ تاریخ دانوں کا یہ خیال ہے کہ وہ حضرت علی رض کے بھائی جعفر ابن طالب رض کے خاندان کا مملوک تھا - وہ ایک سیّاح اور بدیہہ گو شاعر تھا اور اپنی نظموں پر چار چار ہزار درہم کی شرط باندھا کرتا تھا - خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں وہ بغداد میں بہت

---

۱ - دیوان الحماسۃ ، پشاور ، بدون تاریخ ، ص ۲ -

مشہور ہوا اور اس نے مشرق ممالک کی، خاص طور پر اپنے وطنِ مولود کی بہت زیادہ سیاحت کی جس کے بارے میں اس نے ایک لمبی نظم لکھی[1] :

لَقَدْ أَنْكَرَ أَصْحَابِى وما ذٰلكَ بِالْأَمْثَلْ
إذا ما مُدِحَ الهِنْدُ وَ سَهْمُ الهِنْدِ فى المَقْتَلْ
لَعَمْرِى إِنَّهَا أَرْضٌ إذَا الْقَطْرُ بِهَا يَنْزِلْ
يَصِيْرُ الدُّرَّ وَالْيَاقُوتَ وَ الدُّرَّ لِمَنْ يَعْطَلْ
فَمِنْهَا الْمِسْكُ و الْكَافُورُ وَالْعَنْبَرُ وَ الْمَنْدَلْ
وَ أَصْنَافٌ مِنَ الطِّيبِ لِيَسْتَعْمِلَ مَنْ يَتْفَلْ
وَ أَنْوَاعُ الْأَفَاوِيهِ وَ جَوْزُ الطِّيبِ وَ السُّنْبُلْ
وَ مِنْهَا الْعَاجُ وَ السَّاجُ وَ مِنْهَا الْعُودُ و الصَّنْدَلْ
وَ إِنَّ التُّوتِيَا فِيهَا كَمِثْلِ الْجَبَلِ الْأَطْوَلْ
وَ مِنْهَا الْبَبْرُ وَالنَّمْرُ و مِنْهَا الْفِيلُ و الدَّغْفَلْ
وَ مِنْهَا الْكَرْكُ وَ الْبَبْغَاءُ و الطَّاوُسُ وَ الْجَوْزَلْ
وَ مِنْهَا شَجَرُ الرَّانِجِ و السَّاسَمُ وَ الْفُلْفُلْ
سُيُوفٌ مَا لَهَا مِثْلٌ قَدِ اسْتَغْنَتْ عَنِ الصَّيْقَلْ

---

۱ - ذکریا القزوینی ، آثار البلاد ، طبع و ستنفلٹ ۱۸۴۸ء ، ص ۸۵ -

وَ أَرْمَاحٌ إِذَا مَا هُــزَّتِ اهْتَزَّ بِهَا الْجَحْفَلُ

فَهَلْ يُنْكِرُ هَــذَا الْفَضْلَ إِلَّا الرَّجُلُ الْأَ خْطَلُ

ترجمہ :

۱ ۔ جب میدانِ جنگ میں ہندی تلوار اور تیر کی تعریف کی گئی ، تو میرے دوستوں نے اہلِ ہند کے فضل و کمال کا انکار کیا ، حالانکہ یہ کسی طرح بھی مناسب نہ تھا ۔

۲ ۔ میری عمر کی قسم جب ہند میں نزولِ باراں ہوتا ہے تو بارش کے یہ قطرے زیور سے خالی انسان کے لیے موتی اور یاقوت بن جاتے ہیں ۔

۳ ۔ اس میں مشک ، کافور ، عنبر اور صندل پیدا ہوتا ہے اور گندہ رہنے والے کے لیے بہت سی خوشبویات ہیں ۔

۴ ۔ اس میں قسم قسم کے خوشبودار پودے اور سنبل کے بوٹے ہیں اور ہاتھی دانت ، ساگوان ، عود اور صندل کے درخت پائے جاتے ہیں ۔

۵ ۔ یہاں توتیا لمبے چوڑے پہاڑ کی طرح ہوتا ہے اور (اس کے جنگلات میں) شیر ببر ، چیتے ، ہاتھی ، بھیڑیئے کے بچے ، سارس ، طوطے ، مور اور کبوتر پائے جاتے ہیں ۔

۶ ۔ ہند میں ، تل اور کالی مرچوں کے درخت ہیں ۔

۷ ۔ بے مثال ہندی تلواریں صیقل سے بے نیاز ہیں اور جب ہندی نیزے گردش میں آتے ہیں تو سارا لشکر حرکت میں آ جاتا ہے ۔

۸ ۔ اہلِ ہند کے فضل و کمال کا وہی شخص منکر ہو سکتا ہے جو احمق ہو ۔

اس کی نظموں میں ان لوگوں کے لیے جن کا زندگی پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے اور جو اس دنیا کی بے وفائی سے تنگ آ چکے ہیں ایک سبق ملتا ہے :

يَا نَفْسُ صَبْراً لَا تَمْلِكِي يَاساً[1]

قَدْ فَارَقَ النَّاسُ قَبْلَكَ النَّاسَا

صَبْراً جَمِيلاً ، فَلَسْتَ أَوَّلَ مَنْ

أَوْرَثَهُ الظَّاعِنُونَ وَسْوَاسَا

---

۱ ۔ ابو عبداللہ ابن جراح ، کتاب لورقۃ ، دارالمعارف ، قاہرۃ ، ص ۹۱ ۔

ترجمہ :

۱ - اے میری روح صبر کر اور امید کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑ - یہ سچ ہے کہ مجھ سے پہلے بھی بہت سے لوگ اپنے ساتھیوں سے رخصت ہو گئے -

۲ - صبر کر ، یہ تیرے لیے اچھا ہے کیوں کہ تو پہلا نفس نہیں جسے کوچ کر جانے والوں نے وساوس کا شکار بنا دیا ہے -

کشاجم السندی (م - ۹۷۰ء/۳۶۰ھ)

محمود بن الحسین بن السندھی بن شاھك عربی شاعری میں ایک اور ممتاز شخصیت تھی جس نے بغداد و حلب میں بڑی شہرت حاصل کی - وہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے محافظ دستے کے ایک رکن السندھی ابن شاھك کی اولاد تھا - اس کی نظم کا نمونہ درج ذیل ہے[1] :

وَالدَّهرُ حَربُ الْحَيِيّ وَسِلْمُ ذِی الْوَجهِ الْوَقَاحِ

وَ عَلَیَّ اَنْ اَسعیٰ وَ لَیسَ عَلَیَّ اِدرَاكُ النَّجَاحِ

ترجمہ :

زمانہ شرمیلے آدمی سے نبردآزما رہتا ہے اور بے شرم کےلیے صلح کن ہے - میری ذمہ داری کوشش کرنا ہے - میں کامیابی کا ذمہ وار نہیں ، کامیابی خدا کے ہاتھ میں ہے -

سندھ کا ایک عالم جو محمد بن محمد ابن رجا السندھی ہے اور جو ابوبکر کے لقب سے مشہور ہے ، عربی شاعری کے میدان میں عرب دنیا میں متعارف ہوا - اس کے مندرجہ ذیل اشعار ابن الوردی القرشی کی 'کتاب الانساب' میں ملتے ہیں :

مَنْ لَمْ یَکُنْ لَكَ مُنْصِفاً فِی الْوُدِّ ، فَابْغِ بِهِ بَدِیلاً

وَ مَنِ اسْتَخَفَّ بِنَفْسِهِ رزمت لَهُ قَال و قیلا

ترجمہ :

۱ - اگر دوستی میں کوئی شخص تمھارے ساتھ نا انصافی کرے تو پھر کسی دوسرے آدمی کو دوست بنا لو -

---

۱ - ابوالفضل محمد ابن طاہر ابن علی المقدسی ، کتاب الانساب ، ص ۸۷ - [السمعانی : کتاب الانساب ، ورق ۳۱۳] -

۲ - جو شخص اپنے آپ کو ذلیل و خوار کر لے ، وہ ہدفِ ملامت بن جاتا ہے -

عربی نثر

امیر معاویہؓ کے عہد میں عربی نثر کا آغاز ہوا - قدیم عربوں کی تاریخ میں امیر معاویہؓ کی دلچسپی کے باعث زمانہ قبل از اسلام کے عربوں کے بارے میں مختلف کہانیوں کا ایک مجموعہ ترتیب دیا گیا - یہ بیان کیا جاتا ہے کہ امیر معاویہؓ ایک شخص عبید بن شریح الجرہمی سے خاص طور پر متاثر تھے - یہ شخص عرب بائدہ کا نمائندہ تھا جس کو پرانے زمانے کی کہانیاں بیان کرنے کے عوض ایک خاصی بڑی پنشن دی گئی - ان کہانیوں کی بنیاد بالخصوص ان واقعات پر تھی جو عہد نامہ عتیق میں درج تھے ، نیز پرانے قصے کہانیوں اور بہادری کی داستانوں پر جو ابتدائی ایام سے عہد بہ عہد باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی رہیں - کہا جاتا ہے عبید نے قدیم عرب کی تاریخ پر متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے 'کتاب الملوک واخبار المدائن' المسعودی کے وقت میں بکثرت پڑھی جاتی تھی[1] -

عربی کی تحریر بھی غیر واضح اور اعراب اور نقاط سے معرّا ہوتی تھی اور جس کو صرف عرب ہی سمجھ سکتے تھے - اس لیے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک ایسی باقاعدہ تحریر کی تشکیل کی جائے جس کو مفتوحین پڑھ اور سمجھ سکیں - اس بات کا سہرا عراق کے مشہور وائسرائے حجاج بن یوسف کے سر ہے کہ اس نے عربی ابجد میں اعراب و اشکال و نقاط کی علامات کے استعمال کو ترقی دے کر ہم شکل حروف کے اوپر اور نیچے علامتیں وضع کر کے عربی ابجد کو وسعت دی - اگرچہ حجاج بن یوسف تاریخ میں اپنی خون آشامی کی وجہ سے بدنام ہے ، لیکن یہ بھی درست ہے کہ وہ ایک مہذب انسان اور علم کا بہت بڑا مربی تھا - اس کی حوصلہ افزائی سے کوفہ اور بصرہ میں قرآن اور حدیث کے بہت سے حلقے قائم ہوئے -

عربوں کی ابتدائی تاریخ کے مصنفین میں وہب ابن منبّہ اور کعب ابن احبار کا نام لیا جاتا ہے - کعب بن احبار 'کتاب التیجان فی ملوک الحمیر' کا مصنف تھا - اس کتاب کو ایک ضمیمے کے ساتھ جس کا نام 'اخبار العبید' رکھا گیا ہے ، حیدر آباد (دکن) سے ۱۹۲۸ء/۱۳۴۷ھ میں شائع کیا گیا[2] - پیغمبرِ خدا اور آپؐ کے صحابہؓ اکرامؓ کے اخلاق و عادات اور خصائل و حالات معلوم کرنے کی مساعی سے علمِ حدیث کی ترویج ہوئی - رسولِ اکرمؐ اور انؐ کے اصحاب کی سوانح لکھی گئیں اور

---

۱ - المسعودی ، مروج : ۴ : ۸۹ -

۲ - ہٹی ، عربوں کی تاریخ (انگریزی) حاورق ص ۲۴۴ -

نتیجتاً قرآن کی تفاسیر اور حدیث کی تشریحات کا سلسلہ شروع ہوا ۔ ابن اسحاق ، ابن ہشام ، الواقدی اور ابن سعد وغیرہ ایسے مصنفوں نے رسول خدا کی زندگی اور غزوات کے بارے میں معیاری کتابیں تصنیف کیں ۔

خلافت راشدہ میں عربوں کی توجہ زیادہ تر قرآن مجید پر مرکوز رہی ۔ انہوں نے سب سے پہلے قرآن کو صحت کے ساتھ پڑھنے اور صحیح تلفظ ادا کرنے پر زور دیا ۔ عرب میں مختلف لہجوں اور بولیوں کے استعمال کی وجہ سے ہر کوئی قرآن کی قرأت اپنے لہجے کے مطابق کرتا تھا ۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق کے عہد خلافت میں آنحضرتؐ کے تصدیق شدہ نسخہ قرآن مجید کی نقلیں کرا کر کتاب کی شکل میں جمع قرآن کا فرض سر انجام دیا گیا ۔ اس کا باعث جنگ یمامہ میں قراء و حفاظ قرآن کی کثیر تعداد کی شہادت تھی ۔ خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ خلفائے راشدین میں پہلے خلیفہ تھے جنہوں نے قرآن مجید کی عام مگر صحیح اشاعت کے پیش نظر عہد نبویؐ کے مصدقہ نسخہ قرآن کی نقول اطراف و اکناف عالم اسلامی میں روانہ کیں ۔ قرآن مجید اور علم حدیث کے قابل ذکر ابتدائی علماء حضرت زیدؓ بن ثابت ، عبداللہؓ بن مسعود اور عبداللہؓ ابن عباسؓ تھے ۔ حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ نبیؐ کریم کے چچا زاد بھائی تھے اور 'حبرالامۃ' کے لقب سے مشہور تھے ، جس کا مطلب ہے امت کی روشنائی اور وہ قرآن کی تفسیر، فقہی مسائل، زمانہ قبل از اسلام کی تاریخ اور عربی شاعری پر بڑا عبور رکھتے تھے ۔ اسلامی قانون کے پیچیدہ مسائل کے متعلق ان سے مشورہ کیا جاتا تھا اور ان کے فتویٰ کو حرف آخر سمجھا جاتا تھا ۔ ان کی تفسیر قرآن (تفسیر ابن عباس ،) اور اسناد (روایات حدیث) مشہور و معروف ہیں[1] ۔ سندھ کی عربی نثر کی نشوونما میں مذہبی ادب کا نمایاں حصہ ہے ۔ اس کا پہلا حوالہ 'چچ نامہ' میں ملتا ہے ، جو کہ قرآن اور حدیث سے ماخوذ دعا پر مشتمل ہے جسے حجاج نے عراق سے محمد بن قاسم کو بھیجا تھا ۔ اس بات میں یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ فاتح کے جوان ذہن کو مذہبی تحریروں کی معجزانہ تاثیر سے روشن کیا جائے جن کی تلاوت سے شکست بھی فتح میں بدل جاتی تھی :

اللّٰھم انا نسألك . . . . وعملا برضونك[2] ۔

مذہبی ادب کا صرف یہی ایک ٹکڑا ہے جو 'چچ نامہ' کے مصنف کی اصل تحریر سے نقل کیا گیا ہے جو چھٹی صدی ہجری یعنی بارھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی تھی۔ عربوں کی فتح سندھ کے بعد وادیٔ سندھ پر ایسے گورنر مقرر ہوئے جو اس ۵۵ سالوں

---

۱ ۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ، لائیڈن ، ۱ : ۲۰ ۔

۲ ۔ چچ نامہ ، ص ۱۴۳ ۔

کے عرصے میں جلد جلد تبدیل ہوتے رہے ۔ اس نصف صدی میں وادی میں کسی ادبی اور ثقافتی سرگرمی کا کوئی حوالہ نہیں ملتا ۔ گورنر انتظامی معاملات اور لشکر کشی میں مصروف رہے ۔ ادبی اور ثقافتی سرگرمی اور اس کی سرپرستی کے لیے انہیں اغلباً فرصت نہیں ملی۔ بایں ہمہ انہوں نے کئی شہروں میں مسجدیں بنوائیں جہاں بچے قرآن و حدیث اور مذہبی مضامین کی تعلیم پاتے تھے ۔ چونکہ فاتحین نے مفتوحین یا رعایا سے میل جول بڑھانے سے گریز کیا ، لہذا ان کے درمیان مکمل افہام و تفہیم پیدا نہ ہوسکی ۔ عربوں نے سندھ کے غیر مسلموں کے علوم کی حوصلہ افزائی ابن موسیٰ برمکی کے گورنر بننے کے بعد شروع کی ۔ برمکی ہندوستانی علوم کی قدردانی کے لیے مشہور تھے ۔ عمران نے پاک و ہند کے ادب سے گہری دلچسپی لی ۔ چنانچہ اس نے بغداد کے بیت الحکمۃ میں کام کرنے کے لیے سندھی علماء کا ایک وفد بھیجا ۔ ان علماء کے اسماء ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ اور علمی تصانیف میں محفوظ ہیں اور وہ یہ ہیں : منکا (منگا) ، بھلا (بھالا) ، کنکا (گنگا) ، راجا ، راجا رائے ، دھنوت رائے وغیرہ ۔ عمران نے جو ہندی تصانیف بیت الحکمۃ کے لیے بھیجی تھیں ان میں 'سوریہ سدھنتا' ، 'آریہ بھٹ' ، 'برھم گپت' ، 'کھندا کھندک' ، 'ارتھ شاستر' ، 'مہا بھارت' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں[1]۔ ان کتب کے تراجم نے عربی ادب کی نشوونما میں بڑا حصہ لیا اور اس سے پاک و ہند کے علوم لوگوں کے علم میں آئے ۔ اس سے پہلے نوشیرواں کے زمانے میں سندھی شاہکار 'پنج تنتر' کا فارسی میں ترجمہ ہوچکا تھا ، بعد ازاں اس کا برمکیوں نے عربی میں ترجمہ کیا جو 'کلیلہ و دمنہ' کے نام سے مشہور ہوا ۔ اسے ہندو سندھ کا پہلا شاہکار قرار دیا جاتا ہے جسے عربی ادب میں رائج کیا گیا ۔ سدھنت جسے سندھ ہند کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے ، کا محمد ابن ابراہیم انفزادی نے بیت الحکمۃ میں ترجمہ کیا تھا ۔ اس ترجمے کی وجہ سے صفر کو جو علم ریاضی میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے ، متعارف کروایا گیا ۔ بعض ذرائع کے اعتبار سے حتیٰ کہ پہلے ۱ تا ۹ عدد بھی پہلی بار عرب دنیا میں سدھنت کے ذریعے متعارف ہوئے اور پھر ہسپانیہ سے یورپ پہنچے ۔ یورپ میں ان کو عربی اعداد سمجھا گیا لیکن عربوں نے اسے 'حروف الغبار' یا 'الحساب الہندی' کا نام دیا[2] ۔ بعض اہم کتابوں کے ترجموں سے عربی نثر میں علم الادویہ کے اہم اضافے عباسیوں کے دور حکومت میں ہوئے ۔ ایک سندھی طبیب گنگا اپنے ساتھ اپنی کچھ کتابیں مثلاً 'کتاب النموزار فی الاعمار'، 'کتاب اسرار الموالید' ، 'کتاب قرنات الکبیر' ، 'کتاب قرنات الصغیر' اور 'کتاب فی الطب'

---

۱ - الیعقوبی ، تاریخ الیعقوبی ، بیروت ، ۱۹۵۵ء ، ۱ : ۹۵ : ۹۹ -
اخبار الحکماء ، لائیزگ ۱۹۰۳ء ، ص ۱۷۵

۲ - ہٹی ، عربوں کی تاریخ ، (انگریزی) ص ۵۷۳ -

اور دوسری بہت سی کتابیں لایا[1] ۔ ایک دوسرے پنڈت سنکھال (شنکل ؟) کے سر کتاب الموالید الکبیر[2] کی تصنیف کا سہرا ہے ۔ اس کتاب میں اس کو انسانوں ، جانوروں ، پرندوں اور کیڑوں ، مکوڑوں کی پیدائش اور اس کے رموز کو تفصیل سے بیان کرنے کا شرف حاصل ہے ۔ اس کی یہ کتاب ایک دوسرے حکیم جودھر کی اسی نام کی کتاب کے ساتھ بغداد میں عربی میں ترجمہ ہوئی ۔ تیسرا حکیم جس نے عرب دنیا میں اپنا نام پیدا کیا نیا ک (نایک ؟) تھا ۔ اس کی کتاب مسائلِ زندگی اور ان کے حل سے بحث کرتی ہے ۔ ہندوؤں کی مشہور رزمیہ نظم 'مہا بھارت' کو جس میں کہانیاں اور بہادری کے قصے بھی بیان کیے گئے ہیں ، ابو صالح ابن شعیب نے عربی میں ترجمہ کیا ۔ اس کا دوسرا ترجمہ ابوالحسن علی الجبلی نے ۱۰۲۶ء/۴۱۷ھ میں بنوبویہہ کی خواہش پر کیا ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سندھ سے تعلق رکھنے والی ہندوستانی تصنیفات نے پورے عباسی دور کے عربی ادب میں شاندار اضافہ کیا اور قریباً مختلف فنون و علوم کی تمام تصنیفات کو عربی ادب میں شامل کر لیا گیا ۔

مذہبی ادب

مذہبی ادب نے سندھ کے عربی ادب کی ترقی میں بہت نمایاں حصہ لیا اور اس میں معتد بہ اضافہ کیا ہے ۔ تفاسیرِ قرآن اور شروحِ حدیث کے علاوہ مختلف نصابوں کے لیے کتابیں تصنیف کی گئیں ۔ مساجد ، درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم کے مراکز کا کام دیتی تھیں ۔ عربوں نے سارے سندھ میں مذہبی تعلیم کے مراکز کھول رکھے تھے ۔ اس سلسلے میں دیبل ، منصورہ ، قصدار اور دوسرے شہر عرب دنیا میں خاصی شہرت رکھتے تھے ۔ منصورہ کے ممتاز علمائے دین میں احمد بن محمد المنصوری کا نام قابلِ ذکر ہے ۔

احمد ابن محمد المنصوری

احمد ابن محمد المنصوری جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے ، سندھ میں منصورہ کے مقام پر پیدا ہوا ۔ انہوں نے فارس میں ابوالعباس الاثرم اور بصرہ میں احمد الہزانی سے جو عرف عام میں ابو ذوق کے نام سے مشہور تھے ، سے تعلیم حاصل کی[1] ۔ احمد ، فارس کے صوبے ارجان میں قاضی تھے اور امام داؤد بن علی الاصفہانی کے مسلک پر سند کی حیثیت رکھتے تھے ۔ احمد نے عربی زبان میں بہت سی کتابیں

---

۱ ۔ ابن ابی اصیبعۃ ، عیون الانباء قاہرہ ، ۱۳۰۰ھ ، باب دوم ، ص ۳۲ ، اخبار الحکماء ، ص ۱۲۵ ۔

۲ ۔ الذہبی ، میزان الاعتدال ، ۱۳۲۷ھ ، ۱ : ۶۶ ، ابن حجر العسقلانی : لسان المیزان ، حیدر آباد (دکن) ۱ : ۲۷۱ ۔

لکھیں، مثلاً 'کتاب المصباح الکبیر'، 'کتاب الہادی'، 'کتاب النیّر' اور دوسری بہت سی کتابیں[1] ۔ علامہ السمعانی نے اس پر حدیث وضع کرکے اپنا الگ حلقہ بنانے کا الزام لگایا ہے[2] ۔ ابو جعفر المنصوری اور حبنین کو منصورہ میں بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ وہ بھی اعلیٰ پائے کے محدث اور فقیہہ تھے۔ انہوں نے حدیث اور فقہ پر دو کتابیں لکھیں ۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں تلف ہو گئیں ، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہمعصر حوالوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا ۔

رفتہ رفتہ سندھ کی مشہور بندرگاہ دیبل جو بّری اور بحری دونوں راستوں سے عرب دنیا سے ملی ہوئی تھی ، بلند پایہ محدثین اور علمائے دین کی جائے سکونت بن گئی ۔ السمعانی ، ابن الوردی ، القرشی ، یاقوت الحموی اور دوسرے مصنّفین کی کتابوں میں ان علماء کے نام محفوظ ہیں ۔

ابو جعفر الدیبلی

محمد ابن ابی جعفر دیبلی کے نام سے معروف ہیں ، مشہور محدث تھے ۔ اس کے علاوہ وہ اپنے زمانے میں علمِ حدیث کے عظیم استاد مانے جاتے تھے ۔ دیبل میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ علم کی تلاش میں مکہ ، مدینہ اور دوسرے مراکز میں تشریف لے گئے ۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے دو مشہور کتابیں ابن عیینہ کی 'کتاب التفسیر' اور ابن مبارک کی 'کتاب البر والصلة' پر حاشیے لکھے[3] ۔

احمد بن عبداللہ الدیبلی

احمد بن عبداللہ دیبلی، ابو جعفر دیبلی کے شاگرد تھے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے حصول علم کے لیے عرب دنیا کا سفر کیا ، وہ مصر میں علی بن عبدالرحمان اور محمد بن زبان سے ، دمشق میں حافظ احمد بن عمیر سے ، بیروت میں ابو عبدالرحمان مکحولہ سے، حران میں حافظ الحسین بن ابی معشر سے ، بصرہ میں قاضی ابو الخلیفہ سے ، بغداد میں جعفر بن محمد الفاریابی اور اس وقت کے دوسرے مشہور محدثین سے حدیث سنی تھی۔ علم کا شوق انہیں مکہ لے گیا ، جہاں انہوں نے اپنے استاد ابو جعفر دیبلی اور الفضل بن محمد الجندی کی زیرِ نگرانی علمِ حدیث حاصل کیا ۔ آخرکار وہ نیشاپور میں سکونت پذیر

---

۱ ۔ ابن ندیم ، الفہرست قاہرہ ۱۳۴۸ھ ، ص ۳۰۶ ۔
۲ ۔ السمعانی ، کتاب الانساب ، (طبع مصور) ، ۵۴۳ ۔
۳ ۔ یاقوت الحموی ، معجم البلدان ، قاہرہ ۱۹۰۶ء ، ۴ : ۱۸۸ ، ابن ندیم ، الفہرست ، ص ۳۱۹ ۔ السمعانی ، الانساب ، ص ۲۶۶ ۔

ہوئے اور حسن بن یعقوب الحداد کی خانقاہ میں شامل ہو کر تارک الدنیا ہو گئے۔ انہوں نے ۹۹۵ء/۳۴۴ھ میں نیشاپور میں وفات پائی اور الحیرہ کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ عمر کے آخری ایام میں ان کا لباس صرف ایک اونی چغہ رہ گیا تھا جس کے ساتھ وہ ویران جگہوں میں دیکھے گئے[1]۔ انہوں نے کتب حدیث مرتب کی تھیں جو بد قسمتی سے ضائع ہو گئیں، لیکن ان کے حوالے ہمعصر مذہبی اور ادبی مصادر میں ملتے ہیں۔

الحسن بن حامد دیبلی

پیشے کے اعتبار سے الحسن ابن حامد دیبلی ایک تاجر تھے۔ تجارت کے سلسلہ میں ہی وہ بغداد چلے گئے جہاں انہوں نے اپنے والد خان ابن حامد کے نام پر ایک سرائے بنوائی[2]۔ یہ سرائے غریبوں اور محتاجوں کے لیے پناہ گاہ بن گئی، جہاں ان کو مفت کھانا اور لباس مہیا کیا جاتا تھا۔ الحسن کی مذہب سے دلچسپی نے 'سرائے خان ابن حامد' کو دینی علوم اور ان کے متعلق بحث و مباحثہ کا مرکز بنا دیا۔ الحسن نے علم حدیث بغداد کے مشہور محدث علی بن محمد الموصلی، محمد ابوبکر بن الحسن النقاش اور ابو عبداللتری سے حاصل کیا۔ الحسن نے شام اور مصر کا سفر کیا اور وہاں وہ درس دیتے رہے حتیٰ کہ ۱۰۱۶ء/۴۰۷ھ میں انہوں نے قاہرہ میں وفات پائی۔

احمد بن محمد دیبلی

احمد بن محمد دیبل کے مقام پر پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ بعد میں انہوں نے الرّے کو ہجرت کی اور اسی وجہ سے وہ الرّازی کی نسبت سے بھی مشہور ہیں۔ بالآخر انہوں نے بغداد کے مشہور علاقے حربیہ میں سکونت اختیار کر لی۔ انہوں نے علم حدیث بغداد میں جعفر بن محمد الفاریابی اور کوفہ میں احمد بن شارک سے حاصل کیا۔ احمد ایک بہت بڑے قاری بھی تھے اور انہوں نے علم قرأت میں اپنے بہت سے شاگرد چھوڑے ہیں[3]۔

خلف بن محمد دیبلی

ابتدا میں یہ علی بن موسیٰ دیبلی کے شاگرد تھے بعد میں بغداد چلے گئے جہاں انہوں نے تدریس حدیث کے فرائض انجام دیئے۔ بعض حضرات کا بیان ہے کہ ابو حسین

۱۔ السمعانی، ص ۲۳۷۔

۲۔ خطیب البغدادی، تاریخ بغداد قاہرہ، ۱۹۳۱ء، ۷: ۳۰۳۔

۳۔ السمعانی، ص ۲۳۸۔

الجندی بغدادی اور احمد ابن عمیر ان سے بہت متاثر ہوئے اور ان سے بہت سا علم حاصل کیا۔

محمد بن محمد دیبلی

سندھ میں دیبل کے رہنے والے تھے لیکن علمِ حدیث کے حصول کے لیے وہ بغداد، بصرہ اور فاریاب تشریف لے گئے۔ وہاں انہوں نے جعفر بن محمد الفاریابی، قاضی ابو خلیفہ، محمد بن الحسن الفاریابی اور دوسرے علماء کی زیرِ نگرانی علمِ حدیث کی تحصیل کی۔ بعد میں وہ علم حدیث کے ورّاق بن گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ الحاکم نیشا پوری جیسے آدمیوں نے ان سے علمِ حدیث اور فنِ ورّاق سیکھا[1]۔ محمد ۹۵۷ء/۳۴۶ھ میں فوت ہوئے۔

ان علماء کے علاوہ جو سندھ میں مشہور ہوئے کچھ اور لوگ ایسے بھی ہیں جو مختلف علوم کے ماہر تھے اور سندھ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن وہ سندھ سے عرب میں ہجرت کرکے چلے گئے اور انہوں نے ازمنہ وسطیٰ میں علمِ حدیث میں بیش بہا خدمات سر انجام دیں۔ ان میں امام اوزاعی اور ابو معشرالسندھی کے نام قابل ذکر ہیں جنہوں نے اسلامی علوم میں دنیائے عرب کے بہت سے علماء پر سبقت حاصل کی تھی۔

شیخ الاسلام امام الاوزاعی

ابوعمرو عبدالرحمٰن بن عمرو کے نام سے مشہور تھے۔ اپنے زمانے کے نامور فقیہ اور ایک مشہور محدّث تھے۔ شام اور اندلس کے لوگ ان کے پاس پیچیدہ دینی اور فقہی مسائل میں فتویٰ لینے آتے تھے۔ وہ اپنے وقت کے امام مانے جاتے تھے اور شام و اندلس کے لوگ ان کے مسلک کی پیروی کرتے تھے۔ انہوں نے حدیث اور فقہ پر بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے 'کتاب فی الفقہ'، 'کتاب المسائل فی الفقہ' اور 'مسند الاوزاعی'، بہت اہم ہیں۔ بعض مصنفین کا بیان ہے کہ انہوں نے حدیث پر سترہ ہزار سوالوں کے جوابات دیے ہیں۔ اس طرح وہ علمِ حدیث کے چار مستند علماء میں شمار ہوتے ہیں[2]۔ اوزاعی کا اصل وطن سندھ مانا جاتا ہے[3] جہاں ان کے والدین غلاموں کی حیثیت سے آئے تھے۔ ابنِ خلکان لکھتا ہے کہ وہ یمن کے رہنے والے تھے اور پھر شام کو ہجرت کر گئے جہاں انہوں نے اوزاع کو اپنا مستقر بنایا جو دمشق کے مضافات میں ہے اور الاوزاعی کہلائے۔ انہوں نے ۷۷۴ء/۱۵۸ھ میں بیروت میں ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔

۱۔ السمعانی، ص ۲۳۷۔

۲۔ ابن حجر، ۶، ۲۳۸۔

۳۔ ابن حجر، تہذیب التذیب، (حیدرآباد دکن)، ۳: ۲۳۶۔

ابو معشر السندھی

ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن السندھی المدنی ، سندھ کے غلام یا کسی غلام کے بیٹے تھے جو بنو مخزوم کے موالی (غلام) بن گئے تھے ۔ بعد میں ابوجعفر منصور عباسی کی بیٹی اُم موسیٰ نے ان کو خرید لیا اور بالآخر اس نے ان کو آزاد کر دیا ۔ ابن عمرو کے ایک شاگرد ابومعشر نے ایک بڑے محدث اور مغازی پر سند ہونے کا شرف پایا ۔ ان کے علم کا اعتراف احمد ابن حنبلؒ نے بھی کیا ہے جو مسلمانوں کے چار فقہی مسالک میں سے ایک کے بانی ہیں ، انہوں نے 'کتاب المغازی' تصنیف کی جس میں رسول اکرمؐ کی زندگی اور ان کے غزوات کا ذکر ہے[1] ۔

عربی قواعد

قواعد کے علم نے کوفہ اور بصرہ کے شہروں میں فروغ پایا جو عراق میں عرب زندگی اور تہذیب کے بڑے مراکز تھے ۔ ان دونوں شہروں کی آبادی ان عرب بدؤوں پر مشتمل تھی جو مختلف قبیلوں اور علاقوں سے تعلق رکھتے تھے اور جن کی بولیاں اور لہجے مختلف تھے ۔ عربوں کے علاوہ ان مراکز میں غیر عربوں کی آبادی بھی تھی جن میں سے کچھ دستکار اور کچھ موالی اور غلام تھے ۔ اس لیے عربی زبان کے بگڑنے کے امکان موجود تھے ۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے کہ تمام تر توجہ کا مرکز قرآن تھا ۔ اس کو صحیح طور پر پڑھنے اور ادا کرنے کے لیے قواعد کا علم ایجاد کیا گیا ۔ قواعد کے اصول کی بنیاد کا سہرا ابوالاسود الدّولی (الدّیلی) کے سر ہے جس نے اسی دور میں بصرہ میں وفات پائی ۔ الدّولی نے اقرار کیا تھا کہ اس نے قواعد کے بنیادی اصول حضرت علیؓ ابن ابی طالبؓ سے سیکھے تھے ۔ لیکن اس نے ان اصولوں کو کبھی ظاہر نہیں کیا حتیٰ کہ زیاد ابن ابیہ نے اس کو حکم دیا کہ وہ قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے قواعد مرتّب کرے ۔ چنانچہ اس کو بصرہ کے نحوی مکتبِ فکر کا پیش رو تسلیم کیا جاتا ہے ۔ اس مکتب کا بانی اور ممتاز نمایندہ ابوعمر زبان بن العلاء تھا ۔ علمِ قواعد پر بہت سی کتابیں کوفہ اور بصرہ میں لکھی گئیں ۔ عراق میں ایجاد کیا جانے والا نظامِ قواعد بعض دوسرے مفتوحہ علاقوں کی طرح سندھ میں پھیل گیا ، جہاں اب تک مساجد اور مکتبوں میں وہی قدیم اصولِ قواعد پڑھائے جاتے تھے ۔

زبان اور رسم الخط

عربوں نے سندھ میں اپنی زبان کو رائج کیا جو ساری وادی کی سرکاری زبان بن

---

۱ ۔ الذھبی ، ۱ : ۲۱۶ ، خطیب البغدادی ، ۱۳ : ۴۲۷ ۔

گئی - یعنی تمام سرکاری خط و کتابت اسی میں ہوتی تھی اور یہاں کا پڑھا لکھا طبقہ اسی زبان کو استعمال کرتا تھا - یہ صورت حال سندھ پر عربوں کی حکومت کے تمام عرصہ میں قائم رہی - جو عرب جغرافیہ دان اس وادی میں آئے ، انہوں نے لکھا ہے کہ ملتان اور اس کے گرد و نواح[1] میں عربی اور سندھی دونوں زبانیں بولی جاتی تھیں - بدقسمتی سے آج اس زمانے کی کوئی تحریر ، مکتوب یا کتاب دستیاب نہیں ، سوائے سکّوں کے جو سندھ کے مختلف علاقوں سے نکالے گئے - سکّوں پر عربی نقش اور ان کے ڈھالے جانے کا مقام درج ہے۔ مثلاً منصورہ جس کو عربوں کے دورِ حکومت میں سندھ کے دارالحکومت کی حیثیت حاصل تھی، کا نام لکھا ملتا ہے - سکّوں پر کندہ تحریروں میں سے چند کے نمونے مندرجہ ذیل ہیں :

ابو مسلم کے تالبے کے سکے[2]

چہرہ (سیدھا رخ)　　لاالہ ا
لاالله
وحده

حاشیہ　　بسم الله مما امر به الامیر عبدالرحمن بن مسلم

پشت　　محمد
←——→
رسول الله

حاشیہ　　قل لا اسلکم ∴ علیه اجراً ∴ الاالمودة ∴ فی القربٰی

عمر ابن عبدالله الهباری کا چالدی کا سکہ[3]

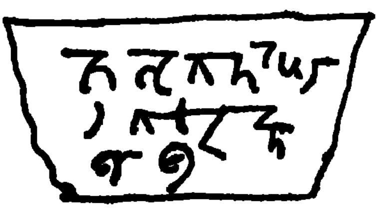
چہرہ　　بالله　　(روایت کو پانچ سطروں میں لکھا ہے)
محمد
رسول
الله
عمر

پشت　　بالله　　(کوئی روایت کو تین سطروں میں لکھا ہے)
بنو عمر
یا منذر

---

۱ - الاصطخری ، ص ۱۷۷ ، ابن حوقل ، ص ۳۲۶ ، المقدسی ، ص ۴۷۹ -
2. Indian Antiquary, 11 : 92
3. Indian Antiquary, p. 9

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عربی کا کوفی رسم الخط سندھ میں بھی عربوں کے زمانے میں رائج تھا ۔ کیونکہ یہ عرب گورنروں کے دور کے کتبات پر بھی ملا ہے کراچی کے قریب بھمبور میں آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے ایک مسجد کا ایسا کتبہ ملا ہے جس سے مسجد کی تاریخِ تعمیر ۷۲۷ء/۱۰۹ھ معلوم ہوتی ہے ۔ ہاتھی دانت کی ایک لوح شاہ داد پور کے قریب بھمبور کے کھنڈرات کے نزدیک بلاس نے دریافت کی ہے جس پر کوفی رسم الخط میں '(بسم) اللہ الرحمان الرحیم' کھدا ہوا ہے ۔ محسوس ہوتا ہے کہ کوفی رسم الخط عربوں نے اپنی فتوحات کے ابتدائی زمانے میں رائج کر دیا تھا ۔ محمد بن قاسم الثقفی نے سندھ کے حکمران راجہ داہر کو جو خطوط لکھے تھے وہ بھی یقیناً اسی رسم الخط میں تھے جس کے نمونے دیبر گھنگھرو کے مقام سے دریافت ہوئے ہیں اور انہی سے اس امر کی شناخت ہو سکی ہے کہ وہ مقام قدیم زمانے میں برہمن آباد تھا ۔ اسی طرح کچھ نمونے بھمبور کے کھنڈرات سے بھی ملے ہیں ۔ غزنوی دور کا شہرہ آفاق مصنف البیرونی بیان کرتا ہے کہ اس عہد میں سندھ میں تین رسم الخط 'ارد ناگری'، 'ملواری' اور 'سندھاب' مروّج تھے۔ 'ارد ناگری' رسم الخط 'سدھا ماتریکا' اور 'ناگرہ' کا مرکب تھا جو بھاٹیہ اور شمالی سندھ کے کچھ علاقوں میں مروّج تھا ۔ 'ملواری' (مالوستھان) میں جو کہ جنوبی سندھ کا ساحلی علاقہ ہے اور 'سندھاب' یا 'سندھاوا'، سندھ کے وسط میں المنصورہ کے علاقے میں رائج تھا[1] ۔ بھمبور کی کھدائی سے مندرجہ ذیل دو ٹکڑے ناگری رسم الخط میں ملے ہیں جس سے اس رسم الخط کی ونکی رسم الخط سے مماثلت کا پتہ چلتا ہے جو ہندوؤں میں قیامِ پاکستان سے پہلے مروّج تھا۔ یہ دو نمونے حسب ذیل ہیں[2] ۔





الفہرست کا شہرہ آفاق مصنف ابن ندیم لکھتا ہے کہ سندھ میں لکھے جانے والا رسم الخط بائیں سے دائیں کو لکھا جاتا تھا جو عربی رسم الخط کے برعکس ہے ۔ کیونکہ عربی رسم الخط دائیں سے بائیں کو لکھا جاتا ہے[3] ۔ تاہم یہ رسم الخط بدھوں اور

---

۱ - البیرونی ، کتاب الہند ، برلن ۸۶–۱۸۸۵ ، ۸۲ -

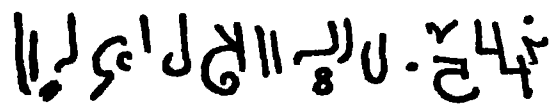
۲ - بھمبور کے متعلق کتابچہ ، مطبوعہ محکمہ آثار قدیمہ ، پاکستان ، ص ۱ -

۳ - البیرونی ، کتاب الہند ، ص ۸۶ -

ہندوؤں تک محدود تھا ، جب کہ مسلمان عربی رسم الخط استعمال کرتے تھے جو اس وقت سے وادی سندھ کے لوگوں کی زندگی اور ادب کی ترجمانی کا ذریعہ رہا ہے ۔ عربوں کی زبان کا بھی سندھ کی زبان پر بڑا گہرا اثر ہوا کیونکہ سندھ کے لوگوں کی روزمرہ کی زبان میں بیشتر عربی الفاظ ملتے ہیں ۔ مثلاً فوط (Poti) ، تلھ (Thalho) ، غنو (Ghuno) اجرک (Ajrak) ، خمیس (Khamis) ، فوم (Thum) ، بصل (Basar) ، سٹھ (Sit) ، نخ (Nukd) ، رواء (Rawa) ، اوتی (Otio) ، تعویذ (Tavith) ، غاشیہ (Gasho) بقال (Vakal) ، قفل (Kult) ، مودی (Maudi) وغیرہ ۔

عربوں کا اثر سندھ کی ادبیات پر بھی کافی گہرا ہے ۔ بیت اور شعر جو سندھی شاعری کی ایک غالب صنف ہے خالصتاً عربی نام رکھتی ہے ۔ سندھی لوک ادب یا سندھی عوامی ادب بھی انہی بنیادوں پر تخلیق کیا جاتا اور بیان کیا جاتا ہے جو عربی ادب کی بنیادیں ہیں ۔ مدح ، منقبت ، مناجات ، مولود ، مناظرہ اور واقعاتی بیت تمام خالصتاً عربی ماخذ سے اخذ کیے گئے ہیں اور عربی بحروں میں لکھے اور گائے جاتے ہیں ۔

اس عہد میں سندھ میں مروّج رسم الخط کے نمونے بھی بھمبور کے کھنڈرات سے لیے گئے ہیں جو عربی اور سندھی رسم الخط کی آمیزش ہے ۔ محکمہ آثارِ قدیمہ نے بھمبور پر جو کتاب شائع کی ہے اس کے صفحۂ اول پر یہ نمونہ شائع کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہے ۔



عربی ہندسے

سندھ میں استعمال ہونے والے ہندسے بھی وہی تھے جو عرب دنیا میں استعمال ہوتے تھے ۔ ممکن ہے کہ یہ ہندسے بغداد سے لائے گئے ہوں اور سندھی پنڈتوں نے یہاں انہیں رواج دیا ہو ۔ عرب ان ہندسوں کے بارے میں محمد بن ابراہیم الغزاری کے سوریہ 'سدھانت' کے ترجمے کے بعد واقف ہوئے ۔ برِّ صغیر ہندوستان کے سادھو اپنے شاگردوں کو پڑھاتے وقت یہ ہندسے زمین پر لکھا کرتے تھے اور اسی لیے یہ حروف الغبار کے نام سے مشہور ہوئے ہیں ۔ ابن ندیم لکھتا ہے کہ عربی میں یہ ہند سے تھوڑے سے تغیّر کے ساتھ لکھے جاتے تھے اور صفر کے اضافے کا طریقہ بھی آجکل کے طریق سے قدرے مختلف تھا ۔ کسی عدد کے سامنے صفر لگانے کے بجائے اس کے نیچے صفر لکھے جاتے تھے ۔

مثلاً ۱ ، ۲ ، ۳ ، ۴ ، ۵
.. ..

جس کا مطلب ایک سو ، دو سو ، تین سو ، چار سو ، اور پانچ سو ہوتا ہے ۔

عربوں کا ثقافتی اثر

ثقافتی اعتبار سے بھی سندھ پر عربوں کے اثرات کافی نمایاں ہیں کیونکہ ایشیا میں یہ واحد ملک ہے جس نے فاتحین کی ثقافت و تہذیب کو پورے انہاک اور ذوق و شوق سے قبول و جذب کیا ۔ یہاں کے عرب ، دنیائے عرب کے ساتھ جو گہرا رابطہ رکھتے تھے وہ وادیٔ سندھ کے لیے ثقافتی اعتبار سے بہت اہم تھا ۔ سندھ کے علاقے میں اپنے دور کی غالب ثقافت سے بہت فائدہ اٹھایا لیکن یہ صرف عرب حکومت کے دور تک ہی محدود تھا ۔ عربوں کے بعد ترکوں ، منگولوں اور افغانوں کے دورِ حکومت میں کچھ اسلامی قدریں غائب بھی ہو گئیں اگرچہ اسلامی تہذیب کی بنیادی روایات ایسی گہری ہو چکی تھیں کہ وہ بالآخر ہند اسلامی تہذیب کے روپ میں جلوہ گر ہوئیں ، جن کا آخری ثمر پاکستان ہے ۔ نئے حکمرانوں نے حکومت کے نئے دستور قائم کیے اور یہاں فارسی کا دور دورہ ہو گیا مگر عوام میں سندھی زبان اور لوک ادب کی آبیاری ہوتی رہی۔ تعلیم یافتہ اور با اقتدار طبقوں میں فارسی زبان ایسی مقبول ہوئی کہ یہاں کے لوگ فارسی میں اعلیٰ درجے کی تصانیف کے مالک ہوگئے ۔ فارسی ادب اور سندھی ادب کا بیان اپنی اپنی جگہ پر ہوگا ۔

★★★

---

۱ - ابن ندیم ، الفہرست ، ص ۸۴ ۔

تیسرا باب

غزنوی عہد (۹۹۸ء–۱۱۸۶ء)

غزنوی عہد میں ان علاقوں کے باشندوں نے جو اب پاکستان کا حصہ ہیں عربی زبان میں کیا کیا علمی کارنامے سر انجام دیئے ؟ یہ بحث دلچسپ ہے اور جی چاہتا ہے کہ اس ضمن میں تحقیق اور جستجو سے کام لیا جائے ، لیکن اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کرنے کے ساتھ ہی اس راہ کی مشکلات کا احساس بھی شدّت سے ہونے لگتا ہے ، اس لیے کہ عرب مؤرخین کے لیے یہ علاقے عام سیاسی دلچسپی تو رکھتے تھے مگر ان کے نزدیک کسی خاص علمی اہمیت کے حامل نہ تھے ۔ چنانچہ اس نواح کے تمدّنی اور علمی احوال بالتّفصیل رقم پذیر نہ ہوئے اور اگر کچھ ہوئے بھی تو وہ عمومی کوائف کی طرف ایک طرح کے اشاروں کی حیثیت رکھتے تھے ۔ افراد کی جانب قابلِ لحاظ توجہ مبذول نہ کی گئی ۔

سیاسی پس منظر

چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسویں) تک پہنچتے پہنچتے عالمِ اسلام میں خلافت ایک مرکزی سیاسی قوت کی حیثیت سے اپنی وقعت اور اہمیت کھو چکی تھی۔ اب اس ادارے کو ایک طرح کا روحانی تقدّس حاصل تھا اور عباسی خلیفہؑ بغداد کا مطالبہ فقط یہ رہ گیا تھا کہ جو مسلمان کسی علاقے میں اپنی حاکمیت قائم کر لے وہ خلیفہ کا خطبہ پڑھے اور سکّے پر اس کا نام ثبت کرے ۔ کسی علاقے کے امیر کا تقرر یا عزل خلیفہ کے بس سے باہر تھا ۔ ہاں خلیفہ ہر ایسے قابض ، متصرّف حاکم ، امیر یا سلطان کے لیے خلعت اور سند روانہ کر دیتا تھا جو خطبے اور سکّے میں خلیفہ کے نام کا ذکر قبول کر لیتا ۔ یہ خلعت اور سند گویا حکومت اور قبضے کے استقرار کی تصدیق کا کام دیتی تھی اور اس رسم کو وہ تقدّس اور اعتبار حاصل تھا کہ جس امیر یا سلطان کو خلیفہ کی خلعت اور سند مل جاتی اسے یقین ہو جاتا کہ اس کی حکومت کو شرعاً جائز مان لیا گیا ہے اور اب رعیّت اسے جائز حاکم تسلیم کر لے گی ۔ چنانچہ آلِ سامان نے ورائے جیحون میں اپنی مستقل سیادت قائم کر لی اور پھر فارس و ترکستان کے بہت بڑے علاقے پر چھا

گئے۔ آل سامان کی اس سلطنت کا آغاز ۸۱۹ء میں ہوا اور سامانی ۱۰۰۵ء تک ماورا النہر میں حکومت کرتے تھے ۔ اسی کی کوکھ سے غزنی کی سلطنت برآمد ہوئی ۔

جب ۹۶۲ء/۳۵۰ھ میں سامانی امیر عبدالملک فوت ہوا تو اس وقت الپتگین خراسان کا سپہ سالار اور گورنر تھا ۔ اس کا تقرر ایک سال قبل ہوا تھا[1] ۔ تخت نشینی کے سلسلے میں اختلاف رائے کی وجہ سے اس نے راہ اجتناب اختیار کی اور غزنی پہنچا اور وہاں کے حاکم کو نکال باہر کیا اور خود قابض ہوگیا ۔ الپتگین نے غزنی میں بمشکل ایک سال حکومت کی تھی کہ ۹۶۳ء/۳۵۲ھ میں اس کا انتقال ہوگیا[2] ۔ اس کے عہد حکومت میں برعظیم پاک و ہند کی حدود کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی ۔ الپتگین کے بعد اس کا فرزند ابو اسحاق ابراہیم تخت نشین ہوا ۔ اس کے بعد الپتگین کے جرنیلوں میں سے بلکاتگین اور پھر پرتگین کو حکومت سونپی گئی ۔ پرتگین اچھا آدمی ثابت نہ ہوا لہذا اسے تخت سے اتار کر ۹۷۶ء/۳۶۶ھ میں سبکتگین کو بادشاہ بنا لیا گیا ۔ گویا الپتگین کی وفات اور سبکتگین کی تخت نشینی کے مابین بارہ تیرہ سال کی مدت حائل ہے ۔

تخت نشین ہوتے ہی سبکتگین نے سلطنت کی خرابیوں کو دور کرنے کی ٹھان لی اور پھر بست و قصدار وغیرہ کو فتح کرنے کے بعد اس نے ہندوستان کی حدود کی سمت توجہ کی[3] ۔ غزنویوں کے عہد تک افغانستان تہذیبی اور سیاسی اعتبار سے گویا برصغیر ہی کا ایک جزو تصور کیا جاتا تھا ۔ نت نئے سرحدی مسائل سے نجات پانے کی خاطر پنجاب کے راجا جے پال نے ایک جرار لشکر تیار کیا اور وادیٔ لمغان میں جا پہنچا ۔ لیکن جے پال کو ایک طرف سبکتگین اور محمود کے عساکر نے بے حال کر دیا اور دوسری طرف طوفانِ برف و باراں نے[4] ۔ مجبوراً اس نے مصالحت کی پیشکش کی ۔

جے پال نے اپنی راجدھانی اوہند پہنچ کر عہد فراموش کردیا ۔ اس لیے سبکتگین کو گوشمالی کی خاطر حرکت میں آنا پڑا ۔ اب جے پال نے دہلی، اجمیر، قنوج اور کالنجر وغیرہ کے راجاؤں سے مدد طلب کی اور انہوں نے مدد بہم پہنچائی بھی ، مگر اس کے باوجود شکست کھائی اور لمغان اور پشاور پر سبکتگین کا قبضہ ہوگیا[5] ۔

---

۱ ۔ زین الاخبار (عبدالحیٔ حبیبی) ، ص ۱۶۱ ۔
۲ ۔ زین الاخبار ، ص ۱۶۶ (حاشیہ) ۔
۳ ۔ تاریخ الیمینی (مطبع ہدی ، لاہور) ، ص ۱۷ ، ۲۰ ، ۲۱ ۔
۴ ۔ ایضاً ، ص ۲۲ ، ۲۳ ۔
۵ ۔ تاریخ فرشتہ (اردو ترجمہ ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور) ، ص ۹۶ ۔

سبکتگین کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا اسمٰعیل تخت نشین ہوا مگر ۹۹۸ء میں اس کے دوسرے بیٹے محمود نے غزنی کے تخت و تاج پر قبضہ کرلیا ۔ تخت نشینی کے وقت محمود کی عمر تیس سال (۳۰) تھی ۔ محمود بڑا جرّی ، بہادر اور اعلیٰ منتظم تھا ۔ اس کے معاصر اور مابعد کے مؤرخ اس کی تعریف میں رطب اللّسان ہیں ۔ خاص طور پر 'چہار مقالہ' ، 'سیاست نامہ' ، 'اخبار الدولة السلجوقیہ' اور 'راحت الصدور' جیسی کتب میں جو سلجوقی اور غوری دور کی تصانیف ہیں محمود کی علم پروری اور عدل و انصاف پسندی کی بےحد تعریف کی گئی ہے ۔ وہ بڑے دبدبے کا بادشاہ تھا ۔ مذہباً سنّی تھا اور بقول بعض بڑا کٹّر سنّی ۔ اولیاء اور صوفیہ کا ادب کرتا تھا ۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ حضرت شیخ ابوالحسن خرّقانی سے بہت زیادہ متاثر تھا[1] ۔ محمود اہلِ علم کا ادب کرتا تھا اور علم پھیلانے میں کوشاں رہتا تھا ۔ اسکے دربار سے فردوسی ، عنصری اور فرخی جیسے باکمال شاعر وابستہ تھے ۔ ابوالریحان البیرونی جیسا عالم اور محقّق بھی اسی کے زیرِ سایہ تحقیق و جستجوئے علمی کے نئے آفاق تلاش کر رہا تھا ۔ ابوالفضل بیہقی ، ابونصر عتبی اور گردیزی جیسے مؤرخ اس کے منشی اور سیکرٹری تھے ۔ شمس الکفاۃ احمد بن حسن جیسے نابغوں کو اس کی وزارت کا شرف حاصل تھا ۔

۹۹۹ء/۳۸۹ھ میں محمود کو خلیفۂ بغداد کی طرف سے خلعت اور امین الملّت ، یمین الدولہ کا خطاب ملا[2] ۔ گردیزی کا بیان یہ ہے کہ 'ولی امیر المؤمنین' بھی خطاب کا حصہ تھا[3] ۔ محمود ۱۰۰۱ء/۳۹۲ھ میں برّصغیر کی حدود میں داخل ہوا اور اس نے پے درپے ہندو راجاؤں کے خلاف کئی جنگیں لڑیں ۔

۱۰۲۲ء/۴۱۳ھ تک محمود نے پنجاب کو باقاعدہ سلطنتِ غزنی کے ساتھ ملحق کر لیا تھا ۔ اب یہ سارا علاقہ بلاواسطہ اسلامی سلطنت کا حصہ بن گیا اور شمالی ہند میں لاہور نے ایک اسلامی مرکزی شہر کی حیثیت سے پھولنا پھلنا شروع کر دیا ۔ اسے علماء ، صوفیہ اور مبلّغین نے اپنا مسکن بنا لیا ۔ علاوہ ازیں جاگیروں اور ملازمتوں کی خاطر بھی قبیلوں کے قبیلے غزنی ، کابل اور بلخ وغیرہ سے آ کر پنجاب میں آباد ہونے لگے ۔

۱۰۲۴-۲۵ء میں محمود نے سومنات پر حملہ کیا ۔ اس تیرتھ کی حفاظت اور مدافعت کے لیے ہندوستان کے بہت سے راجاؤں کا لاؤ لشکر موجود تھا مگر محمود نے سب کو

---

۱ - تاریخ فرشتہ (اردو ترجمہ) ، ص ۱۵۷ تا ۱۵۹ -
۲ - تاریخ الیمینی ، ص ۱۳۳ -
۳ - زین الاخبار ، ص ۱۷۵ -

نابود کر دیا ۔ اس حملے نے پورے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا اور محمود کی ہیبت کا ڈنکا بج گیا ۔

۱۰۲۶-۲۷ء میں محمود نے سندھ کے جاٹوں کی سرکوبی کے لیے کارروائی کی اور بڑی حکمت عملی اور بہادری سے کام لے کر جاٹوں کی قوت کو بالکل تباہ کر دیا ۔ ازاں بعد وہ زیادہ عرصہ ایران و عراق کے مسائل میں مصروف رہا ۔ اس کا ۱۰۳۰ء/۴۲۱ھ میں انتقال ہوا ۔ محمود کا شمار بلاشبہ دنیا کے عظیم فاتحین میں ہوتا ہے ۔ اس کی سلطنت کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک طرف غور ، خوارزم ، خراسان ، طبرستان ، بلاد نیم روز ، پارس ، عراق ، جبال اور طخارستان تھے تو دوسری جانب موجودہ سارا مغربی پاکستان بلکہ قدرے اس سے بھی زیادہ ۔ وہ وسیع علاقے اس میں شامل نہیں جن کو مسخر تو کر لیا مگر انہیں سلطنت کا حصہ نہ بنایا گیا ، مثلاً سومنات ، بنارس ، نگر کوٹ ، متھرا ، اجمیر وغیرہ ۔

سلطان محمود کی وفات کے بعد اس کی وصیت کے مطابق شہزادہ محمد تخت سلطنت پر بیٹھا ۔ مگر کچھ ہی دنوں کے بعد امرا نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور اسے اندھا کر کے سلطان مسعود کی اطاعت قبول کر لی ۔

سلطان مسعود بن محمود بڑا علم دوست اور عالم شخص تھا ۔ اعلیٰ درجے کا مصنف تھا ، مگر طبیعت میں قرار نہ تھا ۔ ایک دھندے کو نمٹانے سے پہلے ہی کسی اور دھندے میں کھو جاتا ۔ بہرحال کچ ، مکران ، آمل اور ہمدان کے معاملات سے فارغ ہو کر اس نے ہندوستان میں سونی پت اور ہانسی کے قلعے فتح کر لیے ۔ لاہور میں اپنے بیٹے ابو مجدود کو حاکم مقرر کیا اور ایاز کو اس کا اتالیق بنا دیا[1] ۔ ۱۰۴۰ء/۴۳۱ھ میں جب وہ خراسان میں سلجوقی ترکوں سے شکست کھانے کے بعد دل برداشتہ ہو کر برِ صغیر کی طرف آ رہا تھا سو ماریگلہ (حال تلفظ مارگلا) کے قریب ایک سازش کے تحت اسے اس کے غلاموں نے تہ تیغ کر دیا اور اندھے شہزادہ محمد کو پھر سے بادشاہ بنا دیا[2] ۔ شہزادہ محمد نے بمشکل ایک سال حکومت کی ہوگی کہ امراء نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ، اسے امیر مودود بن مسعود کے ہاتھوں شکست فاش ہوئی ۔

شہزادہ مجدود کو سلطان مسعود نے ملتان کا گورنر مقرر کیا تھا ۔ مگر جب مسعود قتل ہو گیا تو مجدود نے ملتان سے نکل کر لاہور ، تھانیسر اور ہانسی غرض جملہ ہندی محروسہ علاقوں پر قبضہ کر لیا ۔ مودود نے ان علاقوں کو واگزار کرانے

---

۱ - تاریخ فرشتہ (اردو) ، ص ۱۷۸ -

۲ - زین الاخبار ، ص ۲۰۴ -

کی خاطر لشکر کشی کی۔ مجدود کی طاقت بہت زیادہ تھی مگر وہ اچانک چل بسا۔ ایاز مجدود کا سپہ سالار بھی تھا اور اتالیق بھی۔ وہ اپنے سال وفات ۱۰۵۸ء/۴۴۹ھ تک، غزنی کے ہندو پاکستانی مقبوضات کا گورنر جنرل رہا۔ مودود نے محروسہ اور مفتوحہ علاقوں کا نظم و ضبط درست کیا، وہ خاصا باوقار اور بارعب بادشاہ تھا[1]۔ البتہ ہندوستان کے ایک حصّے میں اسے ضعف پہنچا، وہ یوں کہ ہندو راجاؤں نے ایکا کر کے ہانسی، تھانیسر اور نگر کوٹ وغیرہ مقامات غزنوی امراء سے چھین لیے اور وہاں از سر نو بت پرستوں کا آئین رائج ہوگیا[2]۔ مودود کے بعد علی بن مسعود اور محمد بن مودود تھوڑے تھوڑے وقتوں سے تخت نشین ہوئے۔ ۱۰۵۰ء میں سلطان کا لڑکا عبدالرشید حکمران بنا اس کے زمانے میں نوشتگین برصغیر کا سپہ سالار مقرر ہوا۔ عبدالرشید کے بعد طغرل اور پھر مسعود کا بیٹا فرخ زاد اور اس کے بعد سلطان ابراہیم بن مسعود غزنی کا حاکم ہوا۔ وہ مرد جرّی بھی تھا اور صاحب عقل و دانش بھی، اس نے ازسر نو ہندوستان میں فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ اجودھن اور روپال کے قلعے فتح کر لیے جو اس سے پہلے کبھی اسلامی سلطنت کا حصہ نہ بنے تھے[3]۔ اس نے ملک شاہ بن الپ ارسلان سلجوقی جیسے با جبردت سلطان کو غزنی فتح کرنے سے مایوس کر دیا اور ناکام لوٹا دیا۔ سلطان ابراہیم کی مدت سلطنت (۳۰) تیس برس تھی۔ اس کی وفات ۱۰۹۹ء/۴۹۳ھ میں ہوئی[4]۔

سلطان ابراہیم کے بعد اس کا فرزند سلطان مسعود جو ملک شاہ سلجوق کا داماد اور سنجر کا بہنوئی تھا، تخت نشین ہوا اور ۱۱۱۳ء/۵۰۸ھ تک فرمانروا رہا۔ یہ بڑا نیکوکار، مبارک قدم اور خوش اطوار بادشاہ تھا۔ اس نے علم انصاف ہمیشہ بلند رکھا۔ اس کے عہد میں اس کے حکم سے طغاتگین حاجب نے کہ سپہ سالار ہند تھا دریائے گنگا عبور کیا اور وہاں تک یلغار کی کہ اس سے قبل خود سلطان محمود بن سبکتگین کے بعد کوئی دوسرا غزنوی بادشاہ یا اس کا کوئی امیر نہ پہنچا تھا[5]۔

سلطان مسعود بن ابراہیم کے بعد اس کا بیٹا کمال الدولہ شیر زاد تخت نشین ہوا۔ لیکن ایک سال بعد اس کے بھائی ارسلان نے اس کو قتل کر دیا اور خود تخت پر بیٹھ گیا۔ ارسلان نے اور بھی کئی شہزادوں کو قتل کرا دیا۔ البتہ اس کا سوتیلا بھائی

۱۔ تاریخ فرشتہ (اردو، ترجمہ)، ص ۱۸۵-۱۸۶۔
۲۔ سلطنت غزنویان، ص ۲۳۷۔
۳۔ سلطنت غزنویان، ص ۲۴۳۔
۴۔ اخبار الدولۃ السلجوقیہ، ص ۱۰۹۔
۵۔ سلطنت غزنویان، ص ۲۵۳۔

بہرام شاہ بھاگ کر اپنے ماموں سنجر سلجوقی کے پاس چلا گیا ، جس نے اسے سلجوقیوں کی مدد سے قتل کرکے تخت پر قبضہ کر لیا ۔

ہندوستانی مقبوضات پر بہرام شاہ کی گرفت مضبوط رہی تھی ۔ اس نے ہندوستانی علاقوں کے سپہ سالار محمد باہلیم کی بغاوت فرو کر دی تھی اور بعض دیگر علاقوں سے بھی سر اٹھانے والے فتنوں کو دبا دیا تھا ۔ بہرام شاہ کی وفات پر اس کا بیٹا خسرو شاہ تخت نشین ہوا ، مگر علاء الدین کی یلغار کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی ۔ چنانچہ وہ غزنی کو ترک کرکے لاہور چلا آیا اور یہیں کا ہو کر رہ گیا ۔ علاء الدین نے غزنی کو لوٹ کر جلا دیا ۔ اسی وجہ سے اس کو علاء الدین 'جہان سوز' کہتے ہیں ۔

خسرو شاہ کا انتقال ۱۱۶۰ء/۵۵۵ھ میں ہوا ۔ غزنی میں سبکتگین کے خاندان کا یہ آخری تاجدار تھا ۔ خسرو شاہ کے بعد اس کا فرزند خسرو ملک لاہور ہی میں تخت نشین ہوا ۔ اس نے ہندوستانی مقبوضات کو مضبوطی سے قابو میں رکھا ۔ لیکن شمال کی جانب سے جو سیلِ مخالفت بڑھا چلا آ رہا تھا اس کا تدارک اس کے بس میں نہ تھا ۔ معزالدین سام (محمد غوری) نے ۸۰-۱۱۸۱ء میں پشاور ، ملتان ، سندھ وغیرہ فتح کر لینے کے بعد لاہور کا رخ کیا ۔ خسرو ملک محصور ہوگیا اور غوری ناکام لوٹ گیا ۔ اس طرح دوبار ناکام لوٹنے کے بعد آخر ۱۱۹۳ء میں اس نے اس پر قابو پاکر اسے قلعہ فروزکوہ میں نظر بند کر دیا ۔ خسرو ملک نے ۱۱۸۶ء/۵۸۲ھ میں قلعہ فروز کوہ ہی میں انتقال کیا[1] ۔

ان یورشوں نے آج کے مغربی پاکستان میں مسلمان آبادی کو بڑھانے میں بڑی مدد کی ۔ ازاں بعد غلاموں کے عہدِ حکومت میں چنگیز اور ہلاکو کی تاخت و تاراج کے باعث جو لوگ ایران ، کابل ، خوارزم ، غور ، خیوا ، کاشغر ، لاچین وغیرہ سے بھاگے اور آکر اس برِّ صغیر میں پناہ گزین ہوئے ان کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا ۔ گویا اس علاقے کی مسلم اکثریت جہاں صوفیاء ، مبلّغین اور سلاطین اور امراء کی مرہونِ منّت ہے وہاں سلجوقی ، غوری اور چنگیزی حملہ آوروں کی بھی احسان مند ہے ۔ طبقاتِ ناصری اور تاریخِ فیروز شاہی اور اولیاء کرام کے ملفوظات و سوانح کو اس اعتبار سے دیکھیں تو بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے ۔

---

۱ ۔ طبقاتِ ناصری (کلکتہ) ، ص ۲۶ و منتخب التواریخ (اردو) ص ۵۳ ، و فرشتہ اردو ، ص ۱۸۴ ۔

عربی دفتری زبان

یہ تو ظاہر ہے کہ غزنوی خاندان کے زمانہ آغاز تک اسلامی حکومتوں کی دفتری زبان بالعموم عربی تھی ۔ علاوہ ازیں عربی علمی زبان بھی تھی اور دینی زبان بھی ۔ پھر دربار خلافت بغداد میں تھا ۔ اگرچہ خلفاء کا سیاسی اقتدار ضعیف ہو چکا تھا مگر پھر بھی انہیں ایک نیم سیاسی اور نیم روحانی سیادت میسّر تھی ۔ خلعت اور سند استقرار خلیفہ کی جانب سے آ جاتی تھی ۔ خطاب جو خلیفہ کی طرف سے ارزانی ہوتے تھے انہیں بڑے امتنان کے ساتھ قبول کر لیا جاتا تھا ۔ خلیفہ وقت کا نام سکّے اور خطبے میں شامل ہوتا تھا ۔

مشرق میں عربی کے دفتری زبان ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اگرچہ غیر عرب خود مختار ریاستیں وجود میں آگئی تھیں اس کے باوصف فارسی یا ترکی نے ابھی وہ ترقی نہ کی تھی کہ دفتری امور کی انجام دہی سے عہدہ بر آ ہوسکتیں ۔ سامانیوں نے بخارا میں فارسی زبان کی پرورش شروع کی تھی اور فارسی کی ترقی کا آغاز ہوگیا تھا ۔ سامانیوں کے بعد غزنویوں نے فارسی زبان کی سرپرستی کی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شعراء کی زبان ایک طرح سے فارسی ہوگئی ۔ تاریخ نویسی بھی متاثر ہوئی ۔ اگر ابونصر عتبی نے اپنی کتاب 'الیمینی' عربی میں تصنیف کی تھی تو ابوالفضل بیہقی نے اپنی مبسوط تاریخ جو تیس جلدوں پر مشتمل بتائی جاتی ہے فارسی میں قلمبند کی تھی ۔ گردیزی کی 'زین الاخبار' بھی فارسی میں ہے اور یہ دونوں مؤرخ محمود کے معاصر اور اس کے دبیروں میں شامل تھے ۔

صاف نظر آ رہا تھا کہ تسلّط کے زوال کے جلو میں عربی زبان کو بھی انحطاط سے دوچار ہونا پڑے گا ، تاہم ایسی تبدیلیاں آناً فاناً ممکن نہیں ہوتیں ۔ چنانچہ محمود کی حکومت کے دوران میں دفتری کاروبار عموماً عربی میں ہوتا رہا ۔ محمود کا پہلا وزیر ابوالعباس فضل بن احمد اسفرائنی تھا ۔ وہ عربی میں مہارت نہ رکھتا تھا ۔ چنانچہ اس نے مراسلت و فرامین عربی کے بجائے فارسی میں لکھوانے شروع کیے ۔ آقائے سعید نفیسی نے ناصرالدین بن عمدۃ الملک مصنف 'نسائم الاسحار من لطائم الاخبار' کے حوالے سے لکھا ہے کہ :

> "بہ سبب آنکہ در عربیت پیادہ و بے مایہ بود ، امثلہ و مناشیر دیوانی و تقلدات و احکام سلطانی را فرمود بپارسی نوشتن ۔ وزیر احمد حسن اشارت گرداند تا برقرار قدیم و قاعدۂ سالف تقلدات بروایت عربی نویسند[۱]" ۔

اس کے برعکس استاد خلیلی کہتے ہیں کہ اصل وجہ عربی میں عدم مہارت نہ تھی

۱ ۔ در پیرامون ، تاریخ بیہقی ص ۱۳۱ ۔ ۱۳۲

بلکہ حقیقت یہ تھی کہ ابوالعباس فارسی زبان کے حق میں متعصّب تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ دفاتر کی زبان عربی ہو[1] ۔ ۔ ۔ ۔ یہ الگ بات ہے کہ استاد خلیلی اپنی اس رائے کے لیے کسی قدیم مؤرخ یا بیہقی کے کسی ہم عصر صاحبِ قلم کا کوئی حوالہ نہیں دیتے کہ اس رائے کو استناد حاصل ہو ۔

ابوالعباس کے بعد جب خواجہ احمد بن حسن المیمندی (یا المیوندی) وزیر بنا تو اس نے مراسلات اور فرامین کی زبان پھر سے عربی قرار دے دی ۔ ڈاکٹر ناظم 'آثار الوزراء' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ احمد بن حسن میمندی ۴۰۱ھ/۱۰۱۰ء میں وزیر بنا اور ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء میں معزول ہو کر قلعۂ کالنجر (جنوبی کشمیر) میں محبوس ہوا[2] ۔ پھر سلطان مسعود نے جب حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو ۴۲۲ھ/۱۰۳۰ء میں میمندی کو دوبارہ قلمدانِ وزارتِ عظمٰی سونپ دیا گیا ۔ ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء اور ۴۲۲ھ/۱۰۳۰ء کے مابین ابوعلی حسن بن محمد بن عباس المعروف بہ حسنک میکال وزیراعظم رہا ۔ اس کے دور میں بھی دفتری زبان عربی ہی رہی ۔ سلطان مسعود بن محمود تو عربی کا بہت بڑا عالم تھا[3] ۔ اس لیے قیاس یہ چاہتا ہے کہ اس کے زمانۂ سلطنت میں دفتری زبان عربی ہی رہی ہوگی ۔ فرخ زاد (۴۴۳ھ/۱۰۵۲ء—۴۵۱ھ/۱۰۵۹ء) نے اپنے عہد کے اواخر میں ابوبکر بن ابی صالح کو اپنا وزیر بنا لیا ۔ ابوبکر قبل ازاں تقریباً تیس (۳۰) برس برِّصغیر پاک و ہند کے محروسہ علاقوں میں گورنر ، وزیر اور متصرّف رہ چکا تھا[4] ۔

خواجہ احمد بن حسن المیمندی سے لے کر ابوبکر بن ابی صالح تک جو لوگ بھی وزیر رہے وہ عالم اور فاضل تھے ۔ مثلاً احمد بن عبدالصمد الشیرازی الکاتب جسے سلطان مسعود نے خواجہ احمد بن حسن کے بعد خوارزم سے بلوا کر وزارت سونپی تھی ، اس کے بعد الوزیر طاہر المستوفی اور عبدالرزاق بن احمد بن حسن المیمندی ، الوزیر حسین بن مہران وغیرہ — بلکہ ابوبکر بن ابی صالح کے بعد الوزیر ابوسہل خجندی اور الوزیر عبدالحمید بن احمد بن عبدالصمد اور الصاحب الکبیر قوام الملک نظام الدین ابونصر ہبۃاللہ جیسے اربابِ علم و فضل مسندِ وزارت پر جلوہ گر ہوئے اور ان میں سے کسی کے بارے میں یہ مذکور نہیں کہ وہ عربی نہ جانتے تھے ۔ بلکہ ان میں سے ہر کسی کو کسی نہ کسی بلند علمی لقب سے یاد کیا گیا ہے ۔ مثلاً الفاضل الاجل یا فصیحِ بے نظیر وغیرہ (اس ضمن میں دیکھیے لباب الالباب) ۔ آخری غزنوی بادشاہ کا

---

۱ ۔ سلطنت غزنویان ، ص ۲۸۳ ۔
۲ ۔ سلطان محمود غزنوی از ناظم ، ص ۱۳۵ ، ۱۳۶ ۔
۳ ۔ معجم الادباء ، سترھویں جلد (وزارۃ معارف مصر) ، ۱۸۵ ۔
۴ ۔ غو یورلمون تاریخ بیہقی ، ص ۱۳۴ تا ۱۳۷ ۔

وزیر الصاحب نصراللہ بن عبدالحمید عربی میں بڑی مہارت رکھتا تھا ۔ اس نے بہرام شاہ کی حکومت کے زمانے میں 'کلیلہ و دمنہ' کو عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا اور وہ خود عربی میں شعر بھی کہتا تھا ۔ تاہم یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آیا غزنوی سلاطین نے آخر تک سرکاری و دفتری زبان عربی ہی رکھی یا اسے فارسی میں بدل دیا تھا ۔ ممکن ہے کچھ مدت تک عربی اور فارسی دونوں ساتھ ساتھ چلتی رہی ہوں ۔ ملتان اور منصورہ کے علاقوں میں پہلے بھی عربی رسمی زبان رہ چکی تھی اور غزنویوں کی آمد کے بعد وہی سلسلہ قائم رہا ۔ بلکہ ممکن ہے کہ سندھ کے نواح میں غزنویوں کے بعد بھی کچھ عرصے تک عربی ہی متداول رہی ہو ۔ اس لیے کہ ان علاقوں میں عربی نسبتاً زیادہ راسخ تھی اور شمالی علاقوں کے مقابل بہت پہلے سے وہاں رائج تھی ۔ مثلاً ابن حوقل نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ ملتان اور منصورہ کے لوگ ملکی (مقامی) زبان اور عربی میں گفتگو کرتے تھے ۔ یہ چوتھی صدی ہجری یعنی دسویں صدی عیسوی کے نصف کی بات ہے[1] ۔ اور پھر اسی صدی کے اواخر میں جب ملتان میں دیلمیوں کو عروج حاصل ہوا تو وہاں عربی کی جگہ فارسی نے لینا شروع کر دی ۔ مگر منصورہ کی ریاست میں کاروباری زبان سندھی بھی رہی اور عربی بھی[2] ۔ سندھی سے مراد بہرحال وہ سندھی نہیں جو آج کے سندھ میں بولی جاتی ہے بلکہ وہ مقامی زبان مقصود ہے جو منصورہ میں مروّج تھی ۔ یاد رہے کہ عرب مؤرخین برّ صغیر پاک و ہند کے جملہ مفتوحہ مسلم علاقوں کو سندھ ہی کہا کرتے تھے ۔ ان کے نزدیک برّ صغیر کے دو حصے تھے ۔ وہ اس سارے علاقے کو جو دیبل سے لے کر جہلم کی پہاڑیوں تک پھیلا ہوا تھا ، سندھ ہی کہتے تھے اور بلا امتیاز ، اس پورے علاقے کی بولیوں کو سندھی کا نام دیتے تھے ۔

بہرحال سلطان محمود بن سبکتگین کے دیوانِ انشا کی سربراہی خواجہ عمید ابونصر المشکان کو حاصل تھی ۔ ابوالفضل بیہقی اور گردیزی کے علاوہ بہت سے وہ لوگ جو دبیری میں اونچے مناصب تک پہنچے اپنی ملازمت کے ابتدائی مراحل میں کسی نہ کسی حیثیت سے دیوانِ انشا سے وابستہ رہ چکے تھے ۔ دیوانِ انشا کی ذیلی شاخیں، ظاہر ہے کہ سلطنت کے مفتوحہ علاقوں کے ہر اہم مقام میں موجود تھیں ۔ یہی عالم لاہور کا تھا جو ہندی محروسہ علاقوں کا دارالحکومت تھا ۔ کاروباری اور اصلاحی الفاظ کا تعیّن بھی ضروری تھا ، ورنہ ژولیدگی کا اندیشہ تھا ۔ ایک لفظ ایک دبیر کے قلم سے کسی اور مفہوم کے لیے مستعمل ہوتا اور کسی دوسرے دبیر کے قلم سے کسی اور

---

۱ ۔ تاریخ سندھ از ابوظفر ندوی ، ص ۳۶۵ ۔

۲ ۔ ایضاً ، ص ۳۶۶ ۔

معنی میں ۔ لہذا کچھ ضروری اصطلاحی کلمات کا استناد ناگزیر تھا ۔ ذیل میں کچھ کلمات درج کیے جاتے ہیں ۔ یہ اصطلاحی کلمات جملتہً عربی کے ہیں اور ظاہر ہے کہ فقط غزنی کے دیوان انشا ہی میں نہیں بلکہ اس برِّ عظیم کے سارے محروسہ علاقوں میں برتے جاتے تھے ۔ اُن میں سے بہت سے شاید آج بھی غزنوی عہد ہی کے مقرر کردہ معانی میں مستعمل ہوں ۔ اس اعتبار سے ان کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ۔ ابونصر مشکان نے ان الفاظ کو مقرّر کردہ معانی میں استعمال کرنے کی ہدایت کی ، استاد نفیسی نے آقائے علی اصغر حکمت کی 'پارسی نغز' میں سے یہ فصل نقل کی ہے[۱] ۔ آج اس فہرست کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہی نہیں کہ فارسی کلمات کی جگہ عربی کلمات تجویز کیے گئے، بلکہ بعض جگہ خود عربی کلمات ہی کے مقابل عربی اصطلاحی کلمات مقرر ہوئے ہیں ۔ مثلاً عطا کی جگہ بذل ، حکم کی جگہ قضیت (قضیة) آخر کی جگہ عقب ، فضولی کی جگہ تطاول ، ضیعة کی جگہ عقار ، مراد کی جگہ غرض ، خراج و مؤنة کی جگہ ضریبہ وغیرہ ۔ بہرحال ابونصر مشکان کی فہرست کا ایک حصہ یہ ہے :

شوریدگی	کی جگہ	اضطراب	یاری خواستن فریاد خواستن	کی جگہ	استغاثہ
زر و سیم	,,	مال صامت	پیوستہ داشتن	,,	مواظبت
رستکاری	,,	خلاص	این جہان	,,	معاش
اندیشہ	,,	تأمل	نیک شدن	,,	صلاح
آرزومندی	,,	تمنّی	ہمراہی	,,	صحبت
کردار	,,	صفت	یاد کردن نیکی	,,	محاسن
لاف	,,	ریا	حرمت	,,	ایجاب
یاری دادن	,,	اعانت	سختی رساندن	,,	نوائب
ضیاع و ستور	,,	مال ناطق	آن جہان	,,	معاد
چاکران و خادمان	,,	اتباع و اعوان	استواری	,,	ثقہ
آہستگی	,,	تأنی	عطا	,,	بذل
ہشیاری	,,	حزم	یاد کردن بدی	,,	مساوی
تکیہ کردن	,,	اعتماد	ستدن و دادن	,,	تصرف
استواری دادن	,,	احتیاط	اندیشگی	,,	تغافل
مرگ	,,	وفات	بخویش خواندن	,,	استمالت

۱ - در پیرامون تاریخ بیہقی ، ص ۱۰۰۵ تا ۱۰۱۳ -

ترسانیدن	کی جگہ	ترہیب ، تہدید	کاغذ نانوشتہ	کی جگہ	بیاض
پیش	,,	مقدم	از حال گردانیدن	,,	تغیّر
بر رسیدن	,,	تعرف	خو	,,	سیرت
شاید ، بود	,,	ممکن	بسیاری	,,	اضعاف
ہلاک	,,	تلف	خانگیاں	,,	اہلِ بیت
نبرد کردن	,,	مقاومت ، مزاحمت جہد کردن		,,	استقصا
مانندگان	,,	نظائر	خوشی	,,	طیبۃ النفس
پس	,,	مؤخر	حریصی کردن	,,	ترغیب
کار پوشیدہ	,,	مبہم	کاغذ نوشتہ	,,	سواد
جماعتے از مردماں	,,	طبقات	استوشدہ	,,	اعراف
حکم	,,	قضیت	مہر	,,	اشفاق
روستا	,,	سواد	بردباری	,,	احتمال
شتاب کردن	,,	تعجیل	خوار داشتن	,,	اہانت
بیگانگاں	,,	اباعد	آگاہ کردن	,,	انہاء
پوشیدہ شدن کار	,,	اشتباہ	مسوس	,,	سُخریّت
استوار	,,	محکم	خویشاونداں	,,	اقارب
برابری کردن	,,	مقاومت	ضیعت	,,	عقار
بسازی	,,	موافقت	بگماں شناختن	,,	تفرس
نشان	,,	شعار	دوستی	,,	مصادقت
آخر	,,	عقب	دیگر بار	,,	معاودت
دانستہ	,,	معلوم	حال خویش	,,	قائم بعینہٖ
تمام	,,	وافر	نان و آب	,,	طعام و شراب
پس یکدیگر	,,	ترتیب	اندازہ کردن	,,	اعتبار
کارزاو	,,	وقعت	کار باز افتادن	,,	انفساخ
فضولی	,,	تطاول	سازگاری	,,	اہبت
درماندگی	,,	اضطرار	مراد	,,	غرض
مردم بیاباں	,,	اہل بر	داوری	,,	منازعت
میانجی	,,	متوسط	نیازمندیہا	,,	حوائج
زندگی و مرگ	,,	حیاۃ و ممات	اصل شمار	,,	قانون
باز داشتیہا	,,	موانع	غلط افگندن	,,	سرآشت

پشت دادن	کی جگہ	ادبار	گلہ کردن	کی جگہ	شکایت
صرف روزگار	,,	صرف دهر	شائستگیہا	,,	مصالح
برآغالیدن	,,	تضریب	آشکارا	,,	علانیة
دفتر	,,	جریدہ	خویشتن داشتن	,,	صیانت
اسباب	,,	دعاوی	گمان	,,	تخمین
راز	,,	سر	پیمان	,,	میثاق
خداوندی کردن	,,	رعایت	دوگروہی	,,	عصبیت
مدارا	,,	تلطف	اہلِ شہر	,,	اہلِ حضر
بدحال	,,	ممتحن	دعویٰ طلب	,,	مطالبت
غمز کردن	,,	سعایت	بریدن	,,	قطعیّت
درخواستن	,,	تکلیف	روئے نہادن	,,	اقبال
گزیدن	,,	ایثار	حجت	,,	برہان
دو روئی	,,	مداہنت	پیوستگی کردن	,,	وسیلت
ارزانی	,,	استحقاق	کوشش	,,	سعی
دلیری	,,	تجاسر	پیمان	,,	شریطہ
کارفرمان	,,	قہرمان	مایہ	,,	رأس المال
			کارپوشیدہ کردن	,,	تلبیس
ازبن برکندن	,,	استیصال	از ستم نالیدن	,,	تظلم
ناخوبیہا	,,	فواحش	حرام	,,	محارم
سخن کشادہ کردن	,,	تصریح	کج رفتن	,,	زلت
خراج ، مؤنت	,,	ضریبہ	کارہائے پیش آمدہ	,,	مہمّات
تبرہ کاریہا	,,	مآثم	آزار	,,	سخط
فخر کردن	,,	مباہات	فزونی چیزے برچیزے	,,	ترجیح
حرز کردن	,,	توقی	توانگری	,,	مکثری
جدائی	,,	مفارقت	حق دادن	,,	انصاف
حقیقت و مجاز	,,	جد و ہزل	ستیہیدن	,,	مناظرہ
زاری کردن	,,	جزع ، تضرع	یک بار	,,	دفعت (دفعة)
گرانی کردن	,,	تثقیل	گون ہا	,,	انواع
مال جمع کردن	,,	حیلت	گردن کشیدن	,,	عصیان
کدخدائی خانہ	,,	صاحب عیال	مہربانی	,,	تعطف

شائستگی کردن	,,	کفایت	چیزے بر مردم قسمت کردن	,,	توزیع
باز داشتن از بدی	,,	نہی منکر	ہمداستانی	,,	رضا
نازیدن	,,	افتخار	روزگار دیر	,,	عہدِ بعید
آسانی	,,	سہل	تمام ناکردن	,,	تقصیر
سبکی کردن	,,	تخفیف	ناپارسائی	,,	فسق و فجور
روزگار نزدیک	,,	عہد قریب	نکوہشہا	,,	ذمائم
از اندازه گزشتن	,,	افراط	نکوہیدن	,,	توبیخ
پارسائی	,,	ستر و صلاح	از حد گزشتن	,,	تعدّی
روئے از کار گردانیدن	,,	اعراض	بگزاردن	,,	استیفا
			شرانگیزی	,,	غوغا
حرز کردن	,,	قیاس	سبک داشتن	,,	استخفاف
فرمودن نیکی	,,	امر معروف	چیزے در وقت پیدا کرده	,,	وظیفه
شائسته ہا	,,	مناقب	پناه گرفتن	,,	اکتفا ، اقتفا
ناکامی	,,	عنف	انگاشتنی	,,	محسوب
گناه	,,	زلت	نیکو شناخته	,,	مشہور
خویشتن برداشتن	,,	تکبر	مردمان بکار آمده	,,	خاص
کار در گردن کسے کردن	,,	تکلیف و تقلید	ستوہی	,,	ملامت
ناروان کردن	,,	خلف	پسندگی	,,	اکتفا
خویشی نازیدن	,,	عجب	دل بچیزے نہادن	,,	اعتقاد
روزگار دادن	,,	امہال	ترسیدن	,,	فزع
آخر کار	,,	انتہا	عفو کردن	,,	تجاوز
کینه کشیدن	,,	انتقام	ہم مانند	,,	شکل
فروتنی	,,	تواضع	اندیشه کردن	,,	اہتمام
درویشی	,,	مقل	رنجی سخت	,,	مشقت
خبر درست ناشنیده	,,	ارجاف	ہمتائی کردن	,,	موافقت
حق ستدن	,,	اتصاف	دست یافتن	,,	فرصت
گرانمایه	,,	نفیس	ناگاه رسیدن	,,	مفاوضه
اول	,,	ابتدا	بخشش	,,	قسط

برفرودی مردمان	,,	مراتب	بیکار شدن	,,	معطّل
شمار باریک کردن	,,	مناقشت	کار بر حال گزاشتن	,,	توقّف
هنر نیکو	,,	معجز	بدی شناخته	,,	متہم
گزریان	,,	ابناء السبیل	فرو تر ایشان	,,	عام
رہا کردن	,,	اطلاق	پشیمانی	,,	ندامت
بے نیاز شدن	,,	استغنا	آزمودن	,,	ابتلا
آرائش	,,	زینت	ناشناختی	,,	مجهول
خورد انگارشی	,,	تدنق	زنده	,,	حی، ذوحیاة قائم
دیدار نیکو	,,	منظر	سبک ساری	,,	طیش
چیزے نهاده	,,	ذخیره	بدسگال	,,	حسود
مردمان باکار	,,	اوباش	نوافتادن	,,	عارض،حادث
بزرگ داشتن	,,	تعظیم	خرسندی	,,	قناعت
برخوردن از چیزے	,,	استمتاع	پذیرفتن	,,	قبول
عیب	,,	منقصت	باریک دیدن	,,	بصارت
نشان	,,	سیما	دراز کردن	,,	تطویل
گروه	,,	طائفه	بے خردی کردن	,,	سفاہت
در رسیدن	,,	تدارک	زیارت	,,	فضیلت
زبان خسروان	,,	وضعیّت	ستد و عطا	,,	اخذ و عطا
خواری	,,	مذلّت	سپاس داری	,,	حمد
راست کردن	,,	مرمّت	بے آرام شدن	,,	قلق
اندوه	,,	تأسف	تواند بود	,,	امکان
گزند رسیدن	,,	مضرّت	استوار کردن	,,	ابرام
ہم پشتی کردن	,,	مظاہرت	حرمت داشتن	,,	توقیر
آرزومند	,,	مشتاق	فرزند بد	,,	ناخلف
سود	,,	منفعت و ربع	آشوب	,,	تشویش
درویشی	,,	فاقت	خویشتن درافگندن	,,	اقتحام
بیداری	,,	تنبه	گماشته	,,	مسلّط
ناشائستگی	,,	مکابره			
نااعتنائی کردن	,,	مخالفت	آزمائش	,,	تجربت (تجربة)

فریفتن ,, غبن
شادی ,, مسرت
سبک روحی ,, ظرافت
سخن کوتاه کردن ,, ایجاز
بکاری خویشتن درافگندن ,, تہوّر
پیراختن ,, فراغ
باز داشتن ,, منع
شنیدن ,, سماع
دشوار داشتن ,, کرہ
دست یافتن ,, ظفر
روئی شناسی ,, معرفت
نرمی کردن ,, رفق
تنہائی ,, عزلت
بہ بد یاد کردن ,, طعن
تنگدلی ,, جزع
دشوار فرمودن ,, اکراہ
پذیرفتار شدن ,, ضمان
تواند کرد ,, تمکین
درگردن کسے کردن ,, الزام
عطا دادن مہتران ,, صلت (صلۃ)
دل سنگی ,, وحشت
بر خدا اعتماد کردن ,, توکّل
نیمانیم ,, مناصفت
تعریف ,, تعریض
سخن از دہن گرفتن ,, تلطّف
باز جست کردن ,, تفحّص
ہم بخش کردن ,, مقاسمت
ہم نشینی ,, مناوعت
دشمن کامی ,, شماتت
آموختن ,, تعلّم

خجستگی گرفتن ,, متبرک
یکدگر را یاد کردن ,, مذاکرات
سیم ستدن و دادن ,, مضاربت
عتاب کردن ,, مقابلت
سخن پوشیدہ شدن ,, اشکال
شناسا کردن ,, تعریف
شگفت داشتن ,, تعجّب
نیک زیستن ,, تنعم
یکدگر را نامہ نوشتن ,, مکاتبہ
روئے با روئے ,, مشاہدت
نیکی نمودن ,, احتساب
برون آوردن ,, استخراج
شادی کردن ,, تہنت (تہنئۃ)
درگرو حساب داشتن ,, غلّت
زیادتی پیدا آوردن ,, توفیر
بر چیزے فرونہادن ,, مواضعت
ہمیشگی ,, دوام
خجلت ,, تشوین
برابر آمدن ,, استقبال
ارزانی ,, استحاب
واقف شدن ,, احاطت
شکوہیدن ,, احتشام
مصیبت رسیدن ,, تعزیت
ناصواب ,, غلط
پارسائی ,, ورع
روئے در روئے کردن ,, مواجہت
درکارے شدن ,, شروع وخوض
تعلیم ,, ریاضت
ازیک دگر جداشدہ ,, فرق
بے روئی با روئی گفتن ,, غیبت

ادب کردن	,,	تعزّر	گردن نہادن	,,	اطاعت وانقیاد
از خویش خوبی نمودن	,,	تجمل	اندیشہ کشیدن	,,	عنایت
سخن باروئے گفتن	,,	مخاطبہ	فراموشی	,,	سہو
برداشت کردن	,,	مرافعہ	عمل دادن	,,	تولیت
نان و نمک خوردن	,,	ممالحت	پرہیز کردن	,,	احتما
پس نگریستن	,,	التفات	پارسائی	,,	عفاف
پذیرہ شدن	,,	تلقی	کار راست ایستادن	,,	استقامت
عطا دادن امیران	,,	جائزہ	گردن کشیدن	,,	طغیان
رامس	,,	نزہت	سخن بازگردانیدن	,,	حکایت
گمان بردن	,,	توہم	تنہائی	,,	خلوت
دشمن وارگی کردن	,,	معادات	تازہ روئی	,,	بشّاشہ و بشاشہ
سخن از کسے یادگرفتن	,,	روایت	آرامیدن	,,	استقرار
ستیہیدن	,,	لجاجت	منت نہادن	,,	امتنان
خوشنود شدن	,,	انکار	حق جستن	,,	تقاضا
خوستو شدن	,,	اقرار	نیرومند کردن	,,	تقویت
بیزار شدن	,,	تبرّا	کم و بیش آمدن	,,	تفاوت
گردانیدن	,,	تحویل	استفادہ سندن	,,	استفادت
گشتن از جائے بجائے	,,	تحوّل	سایہ گرفتن	,,	حمایت
فائدہ دادن	,,	افادت	بازی	,,	لہو
سخن بیہودہ	,,	ہذیان و طغیان	پایندگی	,,	بقا
خواندن	,,	دعوت	ہم دیدار شدن	,,	التقاء
دیدن	,,	لقا	بر چیزے خداوند شدن	,,	مستولی

اس دور یعنی چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کے اواخر تک عالم اسلام میں عربی ہی ایک طرح سے زبانِ علم و ادب تھی ۔ اس دور کے خاتمے پر بھی عراق سے لے کر مراکش تک یہی کیفیت رہی ۔ مگر مشرق میں فارسی نے بھی زبانِ علم و ادب کی حیثیت سے سر نکالنا شروع کردیا تھا ۔ مشرق علاقوں میں ابومسلم کی بغاوت کے بعد یعنی عباسی خلافت کے آغاز سے خالص عربی کا تسلط کم ہونا شروع ہوگیا تھا اور پھر مختلف غیر عرب ریاستیں وجود میں آ گئیں ۔ ایران و ترکستان کی عرب آبادیاں کچھ تو اُمویوں کے خلاف ظہور میں آنے والے بے پناہ سیلابِ انقلاب کی زد میں آ کے برباد ہو

گئیں اور کچھ بعد میں رفتہ رفتہ ناپید ہو گئیں ۔ اگر وہ انقلاب محض تبدیلیٔ خاندانِ خلافت ہوتا تو اور بات تھی ، مگر اس انقلاب کی تہہ میں ایک محرّک ایران کے احیاء کی تمنا بھی تھی ۔ باغی عرب تعداد میں تھوڑے تھے ۔ اکثریت ایرانی کسانوں کی تھی ۔ لہٰذا مارے جانے والے شام سے لے کر سمرقند تک فقط عرب تھے[1] ۔ بغاوت کرنے والے دہقان سارے مسلمان نہ تھے ۔ ان میں بھاری تعداد مجوسیوں کی بھی شامل تھی[2] ۔ پھر ابومسلم کے قتل کے بعد اس کو مہدی اور نہ جانے کیا کیا ماننے والوں کے ہاتھوں جس طرح فتنے بپا ہوئے اور اہلِ عرب کو جس طرح تہس نہس کیا گیا اس کے لیے 'سیاست نامہ نظام الملک طوسی' کے ابواب چھیالیس ، سنتالیس اور اڑتالیس لائقِ مطالعہ ہیں ۔ اس بے پناہ انقلاب نے عربی زبان کے پھیلاؤ کو روک دیا ۔ ورنہ کچھ بعید نہ تھا کہ جس طرح شام سے لے کر بحر اوقیانوس کے ساحل تک بشمول سوڈان مسلمان علاقوں کی زبان عربی ہو گئی تھی اور تاحال ہے اسی طرح مشرق میں بھی عراق سے لے کر کاشغر اور سمرقند تک بشمول مغربی پاکستان سارے نواح کی زبان عربی ہوتی ۔ تاہم چونکہ امویوں ہی کے عہد میں عربی نے ایک دینی ، علمی اور ادبی زبان کا مقام حاصل کر لیا تھا اس لیے غیر عرب مسلمان (بلکہ بہت سے غیر مسلم بھی) عربی ہی میں لکھتے تھے اور اسی میں شعر کہتے تھے ۔ مثلاً بنو بویہ جو اصلاً ایرانی تھے اور اصل ایران کے بہت سے اہم دیار وامصار پر قابض تھے ، انہوں نے بھی عربی ہی کی خدمت کی اور وہ خدمت رہتی دنیا تک یادگار رہے گی ۔ آلِ سامان اور آلِ سبکتگین نے فارسی کی جانب خصوصی توجہ کی اور ان کے بعد آلِ سلجوق نے تو اسے پوری طرح اپنا لیا ۔ اس کے باوصف مشرق نواح میں غیر عرب شعرائے عربی کی تعداد بے حساب ہے ۔ 'یتیمۃ الدھر' ، 'معجم الادباء' اور 'الانساب' وغیرہ کتب ان کے تذکرے سے پُر ہیں ۔ حصہٗ رسد برِّصغیر پاک و ہند کو بھی ملا ۔ بدقسمتی سے اس برِّصغیر سے تعلق رکھنے والوں کی اس دور کی تحریریں اکثر و بیشتر ناپید ہیں ۔ تاہم ذکر مل جاتا ہے ۔ اس ذکر کی بنا پر سطورِ آئندہ میں بعض اہلِ قلم سے تعارف کرایا جا رہا ہے ۔ ان میں ان حضرات کے علاوہ کہ جو یہیں کے ہو رہے تھے ، ان حضرات کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جو اس برِّعظیم کے کسی علاقے میں کچھ عرصہ مقیم رہے اور پھر تشریف لے گئے ۔ مثلاً البیرونی اور احمد بن حسن المیمندی وغیرہ ۔

نیز وہ حضرات بھی شامل ہیں جنہوں نے عربی میں اس نواح اور اس دور کی

---

۱ ۔ حطی ، تاریخ عرب (انگریزی) ، ص ۲۸۶-۲۸۷ ۔

۲ ۔ زین الاخبار ، ص ۱۱۹ ۔

مستقل تاریخ قلمبند کی ۔ مثلاً العتبی اور تیسرا طبقہ وہ ہے جو اصلاً یہاں کا تھا مگر باہر جا کر آباد ہو گیا ۔ مثلاً الحسن بن حامد الدیبلی البغدادی ۔

ابوالعطا بن یعقوب الغزنوی معروف بناکوک

مولانا عبدالحئی صاحب 'نزھۃالخواطر' اور محمد عوفی نے 'لباب الالباب' میں اس کا نہایت مختصر ذکر کیا ہے ۔ عوفی نے اسے 'انعمید الاجل'، 'افضل العصر' اور 'الکاتب المعروف' کہہ کر یاد کیا ہے ۔ صاحب 'نزھۃالخواطر' نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ابوالعطا الباخرزی کی کتاب 'دمیۃ القصر' اور یاقوت کی کتاب 'معجم الادباء' میں اس کا تذکرہ موجود ہے ۔ عوفی لکھتا ہے کہ جب سلطان ابراہیم بن مسعود کے رایات کا رخ ہند کو ہوا تو اس وقت ابوالعطا لاہور میں مقیّد تھا اور اسے قید خانے میں آٹھ برس ہو رہے تھے ۔ وہ فارسی میں بھی صاحب دیوان تھا اور عربی میں بھی ۔ یاقوت نے 'معجم الادباء' میں قاضی معین الدین محمد بن محمود غزنوی صاحب 'سرالسرور' کے کچھ اشعار نقل کئے ہیں جو ابوالعطا کی مدح میں ہیں ۔ عوفی نے ابوالعطا کے ایک قصیدے کا بھی ذکر کیا ہے جو ''سیدالمرسلین و خاتم النبیین علیہ افضل الصلوت و التحیات'' کی نعت میں ہے اور اعشی کے قصیدۂ ذیل کی زمین میں ہے :

أم تغمض عيناك ليلة ارمدا

ترجمہ : کیا آشوب چشم نے تجھکو رات بھر سونے نہیں دیا ۔

عوفی کے بقول ابوالعطا کی وفات ۱۰۹۷ء/۴۹۱ھ میں ہوئی ۔ عوفی نے یہ تو لکھا ہے کہ جب سلطان رضی ابراہیم بن مسعود ہندوستان میں وارد ہوا تو ابوالعطا کو قید خانے میں آٹھ برس ہو گئے تھے، مگر یہ مذکور نہیں کہ پھر کیا ہوا ۔ ممکن ہے اس کا رہا کیا جانا عوفی کا موعود ذہنی ہو ۔ عوفی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابوالعطا نے سلطان کی مدح میں ایک قصیدہ کہا جس کا ہر شعر اپنے حسن و جمال الفاظ کے باعث دیوان کا وزن رکھتا ہے ۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ سلطان سے مراد سلطان رضی ابراہیم بن مسعود ہی ہے ۔ اس قصیدے کا ایک شعر ہے :

خَشْمِ اُو "كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ" عَفْوُ "يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ"

ترجمہ : اس کا عتاب لوگوں کے لیے پیغام فنا ہے اور اس کی درگذر مردہ ہڈیوں میں جان ڈال دیتی ہے ۔

صاحب 'نزھۃالخواطر' نے 'کشف المحجوب' کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ ابوالعطا نے ایک کتاب تصوّف کے موضوع پر تحریر کی تھی جس کا نام 'منہاج السراج' تھا[1] ۔

اس کے القاب سے ظاہر ہے کہ وہ جہاں بہت بڑا رئیس اور سردار تھا وہاں عالی قدر ادیب بھی تھا ۔ معاصرین کی نگاہوں میں اس کی بڑی وقعت تھی ۔ مسعود سعد سلمان نے اپنے کلام میں اس کا بڑی محبت اور بڑے ادب سے ذکر کیا ہے ۔ مثلاً :

اے رفیقان من اے عمر و منصور و عطا
کہ شما ہر سہ سائید و ہوائید و صبا
عطائے یعقوب اے روشن از تو عالم علم
تو آفتابے و ما ذرہ را ہمی مانیم

مسعود نے عطا کا مرثیہ بھی کہا تھا جس کا پہلا شعر ہے :

عطائے یعقوب از مرگ تو ہر اسیرم
شدی و نبود بیشم ز مرگ ہیچ ہراسں[2]

یہ یاد رہے کہ مسعود سعد سلمان خود بھی عالی خاندانی رئیس تھا ۔ سلطان رضی ابراہیم ۱۰۸۱ء/۴۷۶ھ میں وارد ہندوستان ہوا تھا[3] ۔ گویا ابوالعطا یعقوب ۱۰۷۵ء/۴۶۸ھ سے زندان میں تھا ۔ ذیل میں ابوالعطا کے بعض عربی اشعار نقل کیے جاتے ہیں ۔ یہ اشعار 'نزھۃ الخواطر' سے لیے گئے ہیں :

اَللّٰہُ جَارُ عِصَابَۃٍ وَدَّعتُھُم ... وَالدَّمعُ یَھمِی وَالفُؤَادُ یَھِیمُ
قَدْ کَانَ دَھرِی جَنَّۃً فِی ظِلِّھِم ... سَارُوا فَأَضحَی الدَّھرُ وَ ھُوَ جَحِیمُ
کَانُوا غُیُوثُ سَمَاحَۃٍ وَ تَکَرُّمٍ ! ... فَالیَومَ بَعدَھُم الجُفُونُ غُیُومُ !
رَحَلُوا عَلَی رَغمِی وَ لٰکِن حُبُّھُم ! ... بَینَ الفُؤَادِ المُستَھَامِ مُقِیمُ ،

---

۱ ۔ محولہ بالا جملہ احوال ماخوذ از 'لباب الالباب' حصہ اول ص ۴۲-۴۳ و نزھۃ الخواطر' حصہ اول ، ص ۸۶ ۔

۲ ۔ دیوان مسعود سعد سلمان مرتبہ رشید یاسمی ، ص ۵ ، ۳۶۷ ، ۴۰۳ ، دیوان میں ہر سہ شعر اسی طرح منقول ہیں ۔

۳ ۔ سلطنت غزنویاں ، ص ۲۸۴ ۔

قَدْ خَانَهُمْ صَرْفُ الزَّمَانِ لِأَنَّهُمْ کَانُوا کِرَاماً وَالزَّمَانُ لَئِیمُ !!

طَلَّقْتُ لَذَّاتِی ثَلَاثاً بَعْدَهُمْ ! حَتّٰی یَعُودَ العِقْدُ وَ هُوَ نَظِیمُ !!

اللّٰهُ ، حَیْثُ تَحَمَّلُوا ، جَارٌ لَّهُمْ وَالْاَمْنُ دَارٌ ، وَالسُّرُورُ نَدِیمٌ ، !

وَ الْعَیْشُ غَضٌّ وَ الْمَنَاهِلُ عَذْبَةٌ

فَالْجَوُّ طَلْقٌ وَ الرِّیَاحُ نَسِیمٌ !

ترجمہ :

۱ - اللہ اس قوم کا حامی و ناصر ہو جن کو وداع کرتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور دل زار و نزار تھا -

۲ - ان کے سایۂ عاطفت میں مجھ کو تمام نعمیں میسّر تھیں - لیکن ان کے چلے جانے کے بعد یہ دنیا میرے لیے دوزخ بن گئی -

۳ - وہ ابرِ کرم تھے جن کے فراق میں میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں -

۴ - وہ میری خواہش کے خلاف سفر پر روانہ ہو گئے ، لیکن ان کی محبت دلِ بیقرار میں گھر کیے ہوئے ہے -

۵ - گردشِ زمانہ نے ان سے بے وفائی کی کیونکہ وہ فیاض اور معزّز تھے اور زمانہ کمینہ ہے -

۶ - ان کے بعد میں نے دنیاوی لذّتوں کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا تاآنکہ ہمیں دوبارہ رفاقت نصیب ہو سکے -

۷ - وہ جہاں کہیں بھی جائیں اللہ کی رحمت ان کے شاملِ حال ہو اور امن و اطمینان ، عیش و سرور ان کا ہمدم و مونس ہو -

۸ - شیریں چشموں سے سیراب ہوتے رہیں - وہ آزاد فضا میں سانس لیتے رہیں اور ان کے ملک میں بادِ بہاری چلتی رہے -

اب اس قصیدۂ نعت کے دو شعر ملاحظہ ہوں جو ابوالعطا نے اعشی کی زمین میں کہی تھی - یہ شعر 'لباب الالباب' سے لیے گئے ہیں :

أَم أعبُدُ الدُّنيَا الدَّنيـة أعْبُدا　　وَ فَضْلُ اللّهِ مَاجَ كَالْبَحْرِ مزْبدًا

أَعْطَى جبانا لايحيط بعَدّه　　حسَابُ عَطَاءِ أَلْفَ عَام مُرَدَّدًا

ترجمہ :

۱ ۔ کیا میں اس کمینی دنیا کی پرستش کروں گا جب کہ فضلِ الٰہی پرجوش سمندر کی طرح موجزن ہے ۔

۲ ۔ اس کی فیاضی ان گنت اور بے حساب ہے جس کے سامنے ہزاروں واپس آنے والے سالوں کا بخشش و کرم بھی بے وزن ہے ۔

لفظ یاسمین سے جو کھیل کھیلا ہے وہ پر لطف ہے ملاحظہ ہو :

إِلَـيْكَ اَلْيَاسمِينَ اَلْغَضَّ منّی　　إلَيْك فَانّ فيه شرّ فَال

فَنصْفٌ مِنْهُ يَأسٌ مِن وصَالٍ　　وَ نصْفٌ منْهُ مِينٌ من خيال

ترجمہ :

۱ ۔ میں نے تجھ کو یاسمین کا تازہ پھول بھیجا ہے کہ اس میں بدحالی پنہاں ہے ۔

۲ ۔ اس لفظ کے نصف (یاس) سے مایوسی ٹپکتی ہے اور دوسرے نصف (مین) سے خیالِ خام کا اظہار ہے ۔

نمونۂ کلام سے صاف ظاہر ہے کہ ابوالعطا بڑی سہولت اور فنکارانہ لطافت کے ساتھ عربی میں شعر کہہ سکتا تھا ۔ ان اشعار کو پڑھ کر یہ احساس نہیں ہوتا ہے کہ شاعر کوئی غیر عرب ہے ۔ اس کی معنوی رعایات اور یاسمین اور نسیم کا ذکر اسے عباسی دور کے عرب شعرائے متاخرین سے مماثل ثابت کر رہا ہے ۔

رابعة بنت کعب القزداری

صاحب لباب الالباب نے رابعہ کا ذکر باب نہم (جلد اول) میں کیا ہے اور اسے شعرائے آلِ سبکتگین کے زمرے میں شامل کیا ہے ۔ اس کا سالِ پیدائش و وفات مذکور نہیں ۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے ابنِ حوقل کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ رابعہ کا تعلق چوتھی صدی ہجری یعنی دسویں صدی عیسوی سے تھا ، وہ یہ ذکر تو کرتے ہیں

کہ رابعہ فارسی میں شعر کہتی تھی مگر یہ نہیں بتاتے کہ وہ عربی میں بھی طبع آزمائی کرتی تھی یا نہیں ۔

قزدار جسے قضدار ، قصدار ، خضدار اور خضدر بھی کہا جاتا ہے ۔ بلوچستان کا ایک قدیم قصبہ ہے ۔ اسے ۶۸۰ء/۶۱ھ میں ابوالاشعث منذر بن جارود نے فتح کر کے اسلامی سلطنت میں شامل کیا[1] ۔ سبکتگین نے قزدار کو اپنی سلطنت کے آغاز کار ہی میں فتح کر کے سلطنت غزنویہ کا حصّہ بنا لیا تھا[2] ۔

ابن حوقل کا بیان ہے کہ قزدار ایک بلند وادی میں واقع ہے ۔ درمیان شہر قلعہ ہے ، اردگرد ہری بھری کھیتیاں ہیں ۔ ابن حوقل کے نزدیک قزدار اور بست کے مابین اسّی فرسنگ کا فاصلہ حائل ہے اور وہ ملتان سے بیس منزل کے فاصلے پر ہے[3] ۔

چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) کے آغاز تک اس نواح کی آبادی میں خوارج کا غلبہ تھا ۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں مہلّب بن أبي صفرہ نے شکست دے کر منتشر کر دیا تھا[4]۔ صاحب 'لباب الالباب' کے بقول رابعہ تھی نو عورت مگر علم و فضل میں مردوں سے برتر تھی ۔ نظم عربی پر قدرت رکھتی تھی۔ فارسی میں بھی بمہارت تمام شعر کہہ لیتی تھی ۔ ذہین و طبّاع تھی اور دل گرم کی مالک تھی ، محبّت کیش تھی ، اس کا نام 'مگس روئیں' پڑ گیا تھا ۔ سبب اس کا یہ تھا کہ اس نے ایک شعر میں مگس روئیں ' استعمال کیا تھا دیکھئے :

خبر دہند کہ بارید بر سر ایّوب
ز آسمان ملخان و سر ہمہ زریں !!
اگر ببارد زریں ملخ بر و از صبر
سزد کہ بارد بر من یکی مگس روئیں

ذیل میں ایک ملمع درج ہے ، جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں شعر کہنے کی مہارت رکھتی تھی :

شَاقَنِي نَائِحٌ مِنَ الْأَطْيَارِ ۔۔۔ هَاجَ سُقْمِي وَ هَاجَ لِي تَذْكَارِي

---

۱ ۔ تاریخ سندھ از ابوظفر ندوی ، ص ۳۸ ۔
۲ ۔ طبقات ناصری (کلکتہ ایڈیشن) ، ص ۷ ۔
۳ ۔ دیوان مسعود سعد سلمان (از رشید یاسمی) ، مقدمہ ''م'' ۔
۴ ۔ رجال السند و الهند ، ص ۳۰۶ ۔

ترجمہ :

۱ - ایک نوحہ کناں پرندے نے میرے دل میں شوق محبت پیدا کر دیا۔ اس نے میرے مرض عشق کو برافروختہ کیا اور یاد محبت کو تازہ کر دیا۔

دوش بر شاخک درخت آن مرغ   نوحہ میکرد و میگریست بزاری !

★★★

قُلْتُ لِلطَّیْرِ لِمَ تَنُوحُ و تَبْکِی؟   فِی دُجَی اللَّیْلِ وَ النُّجُومُ دَرَارِی!

ترجمہ :

۱ - میں نے اس پرندے سے پوچھا کہ رات کی تاریکی میں جب کہ ستارے درخشاں ہیں تو کیوں گریہ و زاری کر رہا ہے ؟

★★★

ہرآئینہ نہ دروغست آنچہ گفت حکیم   فمن تَکَبَّرَ یَوْماً فَبَعْدَ عِزّ ذُلّ

ابوالقاسم شمس الکفاۃ احمد بن حسن میمندی

احمد بن حسن اپنے باپ کے نام سے مشہور ہے۔ اسے احمد میمندی کے نام سے کوئی نہیں جانتا ، سبھی حسن میمندی کے نام سے پہچانتے ہیں۔ اس کا والد حسن ، امیر سبکتگین کی جانب سے نواح بست کا عامل تھا[1] مگر اہل حسد کی غمازی کے باعث وہ سبکتگین کی نظروں سے گر گیا۔ بعض مؤرخین نے حسن کو بھی محمود کے وزراء میں شامل کیا ہے ، لیکن یہ غلط ہے۔ محمود کا پہلا وزیر ابوالعباس فضل بن احمدا لاسفرائنی تھا اور دوسرا احمد بن حسن میمندی اور تیسرا حسنک میکال۔

احمد بن حسن میمندی سلطان محمود کا رضاعی بھائی بھی تھا[2] . . . اصل وطن میوند تھا۔ چنانچہ استاذ خلیلی نے اسے اپنی تاریخ 'سلطنت غزنویان' میں میمندی کے بجائے میوندی ہی لکھا ہے[3]۔ احمد حسن نے ابوالعباس کی معزولی کے بعد ۴۰۱ھ/۱۰۱۰ء میں

---

۱ - لباب الالباب (جلد دوم) ، ص ۶۲ -

۲ - تاریخ فرشتہ (اردو) ، ص ۱۶۲ -

۳ - کاظم ، (بحوالہ آثار الوزراء) ، ص ۱۳۵ -

قلمدانِ وزارت سنبھالا[1] ۔ یہ بڑی شان و شکوہ اور رعب و دبدبے کا مالک تھا ۔ ابوالعبّاس کو چونکہ عربی زبان میں زیادہ مہارت حاصل نہ تھی ، لہذا وہ سرکاری فرامین و مناشیر عربی کے بجائے فارسی میں لکھواتا تھا ۔ مگر احمد بن حسن میمندی نے دفاتر کی زبان پھر سے عربی کر دی[2] ۔ ڈاکٹر ناظم کی رائے میں اس نے کل گیارہ برس وزارت کی تھی ۔ اس لیے کہ ۱۰۲۵ء/۴۱۶ھ میں اسے معزول کر کے قلعہ کالنجر (جنوبی کشمیر) میں نظربند کر دیا گیا تھا[3] ۔

صاحب 'آثار الوزراء' اور صاحب 'چہار مقالہ' اور دیگر بہت سے اہلِ قلم نے اس کی اہلیت کی داد دی ہے ۔ اس کے فیصلے صریح اور مختصر ہوتے تھے ۔ یہ فیصلہ کہ 'الخراج خراج أداءہ دواءہ' = خراج جلد کی خارش کی طرح ہے اس کا علاج اس کی ادائیگی ہے ، تو ضرب‌المثل بن گیا[4] ۔

احمد بن حسن میمندی کی انتظامی سخت گیری کے باعث امراء کبار کا ایک گروہ اس کا دشمن ہو گیا ۔ ان میں التونتاش حاجب اور امیر علی خویشاوند جیسے لوگ بھی شامل تھے ۔ انہوں نے محمود کے یہاں اس کی چغلیاں کھائیں اور آہستہ آہستہ محمود اس سے بدگمان ہوتا چلا گیا[5] اور آخر کار اسے وزارت سے علیحدہ کر کے کالنجر میں قید کر دیا ۔

پھر جب سلطان محمود کا بیٹا مسعود تخت نشین ہوا تو اس نے ۱۰۳۲ء/۲۸ صفر ۴۲۳ھ میں احمد بن حسن میمندی کو دوبارہ باصرار وزارت کا قلمدان سونپ دیا ۔ اس طرح گویا وہ تقریباً چھ برس کالنجر (جنوبی کشمیر) کے قلعے میں مقیم رہا ۔ فرشتہ نے اس کی مدت حبس تیرہ برس بتائی ہے جو غلط ہے ۔ سلطان اس کی بڑی ہی عزت و تکریم کرتا اور کہا کرتا تھا کہ میں تو انہیں والد کی جگہ سمجھتا ہوں[6] ۔ اس نے ۱۰۳۲ء/۴۲۴ھ میں بمقام ہرات انتقال کیا ۔

عوفی نے احمد بن حسن میمندی کے فضل و جود کی بڑی تعریف کی ہے اور اس کی عربی دانی کو خوب سراہا ہے اور ذیل کے تین شعر بھی نقل کیے ہیں . . . فارسی کی طرح گویا عربی شعروں میں بھی محبوب کے لیے صیغہ مذکر استعمال ہوا ہے :

---

۱ ۔ ناظم ، ص ۱۳۶ ۔
۲ ۔ ایضاً ، ص ۱۳۶ ۔
۳ ۔ ایضاً ۔
۴ ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے چہار مقالہ (قزوینی ایڈیشن) ، ص ۳۰ ، ۳۱ ۔
۵ ۔ در پیرامون تاریخ بیہقی ، ص ۱۶۸ ۔
۶ ۔ سلطنت غزنویان ، ص ۲۹۱ ۔

وَ مُهَفْهَفٍ لَدْنِ الْمَعَاطِفِ نَصْبَةٌ — فِي حُسْنِ طَاوُسٍ يَدُورُ بِكَأْسِ

عَانَقْتُهُ مُتَمَنْطِقًا بِوَدَاعِنَا — لِحُسْنٍ بِهِ مِنْ زِينَةٍ وَ لِبَاسِ !!

فَتَمَايَلَتْ أَعْطَافُهُ مُتَبَخْتِرًا — فَوَقَعْتُ بِالْوَسْوَاسِ فِي الْوَسْوَاسِ

ترجمہ :

۱ ۔ وہ ناز و نزاکت کا پیکر ، مور کی طرح خوبصورت جام لیے پھرتا ہے ۔

۲ ۔ میں نے الوداع کہتے ہوئے اس سے معانقہ کیا ۔ وہ زینت اور لباس سے حسین نظر آ رہا تھا ۔

۳ ۔ جب اس کے پہلو ناز و انداز سے بل کھانے لگے تو میں وسوسوں کا شکار ہو گیا ۔

عمر بن اسحاق الواشی اللاهوری

قاضی اطہر مبارکپوری کی رائے میں اسکا چھٹی صدی ہجری یعنی بارھویں صدی عیسوی سے تعلق تھا ۔ اسکا شمار اپنے زمانے کے علمائے مشاہیر میں ہوتا تھا ۔ صاحب 'نزھة الخواطر' نے اسے الشیخ الامام کے لقب سے یاد کیا ہے ۔ شاعر تھا اور دلکش شعر کہتا تھا[1] ۔

علی بن عمر بن الحکم اللاهوری

قاضی اطہر مبارکپوری نے المعانی کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ ابوالحسن علی بن عمر بن الحکم لاہوری کا شمار چھٹی صدی ہجری یعنی بارھویں صدی عیسوی کے بزرگوں میں ہوتا ہے ۔ وہ ادیب بھی تھا اور شاعر بھی ۔ حافظہ قوی تھا اور اسے حفظ بہت کچھ تھا ۔ السمعانی کا بیان ہے کہ ہم تک اس کی باتیں ابوالفضل محمد بن نصیر اسلمی البغدادی کے سلسلے کی روایت سے پہنچی ہیں ، ہم خود اس سے نہیں ملے[2] ۔ یہ ابوالفضل ۵۵۰ھ/۱۱۵۵ء میں فوت ہوا تھا ۔ خود حافظ تھا ۔ جب ابوالحسن علی بن عمر کی شہرت بغداد تک پہنچی تو اس کا شاگرد ہو گیا اور پھر روایت حدیث جو اس سے حاصل کی تھی وہ اپنے شاگرد السمعانی کو منتقل کر دی[3] ۔ اس طرح السمعانی بالوسطہ ابوالحسن علی بن عمر کا شاگرد ہوتا ہے ۔

---

۱ ۔ رجال السند و الهند ، ص ۱۷۹ ۔

۲ ۔ رجال السند و الهند ، ص ۱۷۷ ۔

۳ ۔ محمد اسحاق ، Indian contribution to Hadith Literature ص ۲۷ ۔

علی بن عبداللہ السندی

قاضی اطہر مبارک پوری نے خطیب بغدادی کے حوالے سے لکھا ہے کہ محمد بن عیسیٰ بن عبدالکریم بن حبیش بن الطباخ بن مطر ابی بکر التمیمی الطرسوسی بغداد میں آیا اور اس نے علی بن عبداللہ السندی کی روایت فضائل طرسوس کے ضمن میں کچھ باتیں بیان کیں ۔ قاضی اطہر کے حسب بیان اس کا تعلق پانچویں صدی ہجری یعنی گیارھویں صدی عیسوی کے اصحاب علم سے تھا اور اسکے پاس ایک کتاب تھی جس میں فضائل طرسوس جمع کیے تھے، ممکن ہے یہ کتاب اس کی اپنی تصنیف ہو اور یہ بھی ممکن ہے اس کے اساتذہ میں سے کسی کی ہو[1] ۔

ابونصر محمد بن جبار العتبی

محمد بن عبدالجبار العتبی 'تاریخ یمینی' کا مصنف ہے ۔ گمان یہی ہے وہ خود ہندوستان میں نہیں آیا مگر اسے غزنوی سلطنت کا مؤرخ ہونے اور خصوصاً ان علاقوں کی تاریخ جو آج پاکستان کا حصہ ہیں، بزبان عربی لکھنے کے باعث اس مقالے میں شامل کیا جا رہا ہے ۔ 'تاریخ یمینی' امیر سبکتگین اور سلطان محمود کے دور حکومت کے بارے میں خاصی مستند دستاویز ہے ۔ وہ خود محمود کے دبیروں (سیکرٹریوں) میں سے تھا ۔ اس کے خاندان کے کئی افراد آل سامان کے زیر سایہ اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے ۔ دو ایک کا ذکر خود 'تاریخ یمینی' میں بھی موجود ہے ۔

'تاریخ یمینی' ۱۰۱۹ء/۴۱۰ھ تک کے حالات اور واقعات پر ختم ہو جاتی ہے ۔ فقط ایک واقعہ ایسا ہے جس کا تعلق ۱۰۲۹ء/۴۲۰ھ سے ہے ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ۱۰۱۹ء/۴۱۰ھ کے بعد بھی بقید حیات تھا ۔ تاہم اس کی واقعات نگاری کا سلسلہ سال مذکور کے بعد ختم ہو جاتا ہے[2] ۔

ثعالبی نے 'یتیمۃ الدھر' میں اس کا ذکر کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ رے کا باشندہ تھا اور عنفوان شباب میں وہاں سے نکل کر اپنے ماموں ابونصر عتبی کے پاس خراسان چلا گیا تھا ۔ ماموں وہاں کسی اعلیٰ عہدے پر مامور تھا ۔ ماموں نے اسے اپنے عزیزوں اور فرزندوں کی طرح رکھا ۔ جب ماموں کا انتقال ہو گیا، تو اسے نیرنگیٔ احوال کا سامنا کرنا پڑا ۔ امیر ابوعلی اور امیر سبکتگین کے ہمراہ دبیر کی حیثیت سے گھومتا پھرا ۔ مثلاً جب امیر سبکتگین بست گیا، تو

---

۱ ۔ رجال السند و الہند ۔

۲ ۔ ایلیٹ اینڈ ڈوسن، کتاب محل لاہور (جلد اول)، ص ۱۳ ۔

یہ اس کے ہمرکاب تھا ۔ کچھ عرصہ اس نے شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کی نیابت میں بسر کیا ، پھر نیشاپور کو وطن بنا لیا ۔ ثعالبی کے بقول وہ بڑا خوش خلق ، اعلیٰ پایہ کا عالم اور شاعر و نثر نگار تھا ۔ نیشاپور میں مقیم ہو جانے کے بعد اس نے اپنے آپ کو علم و ادب کی خدمات کے لیے وقف کر دیا ۔ ثعالبی اسے بہت سی کتابوں کا مصنف قرار دیتا ہے ۔ جن میں سے ایک 'لطائف الکتاب' ہے[1] ۔ البتہ لائقِ توجہ بات یہ ہے کہ ثعالبی نے یمینی کا ذکر نہیں کیا ۔ عوفی نے اپنی کتاب 'لباب الالباب' میں اپنے طریقے کے مطابق یمینی کے طرزِ تحریر کی مبالغہ آمیز تعریف کی ہے ۔ اس کی شاعری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے مطلعوں اور مقطعوں کا مطالعہ دل کے لیے آسائش اور سینے کے لیے راحت ہے[2] ۔

'تاریخ یمینی' کا اسلوب بڑا ہی پُرتکلّف ہے ۔ قافیے اور سجع کا اہتمام ہے ۔ محاورہ و مثل بھی قدم قدم پر جلوہ‌گر ہے ۔ تاریخ نگاری جس متانت کا تقاضا کرتی ہے عتبی کا پیرایہ اس سے بالکل مختلف ہے ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اس دور کے عام مشرق عربی کے پُر تصنع ادبی اسلوب کی پیروی کی ہے اور تاریخ میں اس فن کو آزمایا ہے ۔ اس کے معاصر عجمی ادبائے زبانِ عرب نے نثرِ مصنوع کو ایک طرح سے اپنا خاصا بنا لیا تھا ۔ مثلاً صاحب ابن عباد کے 'رسائل' دیکھیے یا 'مقاماتِ بدیع الزمان ہمدانی' ملاحظہ کیجیے اور لطف یہ ہے کہ عتبی کے معاصر اور دربارِ غزنہ کے فارسی مؤرخ فارسی میں نسبتاً زیادہ بے تکلف بات کر رہے تھے ۔

الثعالبی نے 'یتیمة الدھر' میں العتبی کے کچھ عربی رقعات بھی نقل کیے ہیں جو اس دور کی نثرِ مصنوع کی بخوبی نمایندگی کرتے ہیں ۔ العتبی بڑا خوش گو شاعر تھا ۔ الثعالبی نے اس کے چار درجن کے لگ بھگ شعر نقل کیے ہیں ، جن کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ شعر کہنے میں مہارت رکھتا تھا ۔ نیز یہ کہ طبیعت میں کسی قدر ظرافت اور شوخی بھی تھی ۔ کچھ اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں[3] ۔ یہاں بھی محبوب کے لیے صیغہ بہرحال مذکر ہی ہے :

لَهُ وَجْهُ الْهِلَالِ لِنِصْفِ شَهْرٍ   وَ أَجْفَانٌ مُكَحَّلَةٌ بِسِحْرِ

فَعِنْدَ الْابْتِسَامِ كَلَيْلِ بَدْرٍ   وَعِنْدَ الْانْتِقَامِ كَيَوْمِ بَدْرِ

---

۱ ۔ یتیمة الدھر پہلا ایڈیشن چوتھی جلد ، ص ۳۶۵ و سلطنت غزنویان ، ص ۳۵۲ ۔

۲ ۔ لباب الالباب حصہ اول ، ص ۲۳ ۔

۳ ۔ الثعالبی ، یتیمة الدھر ، م ۔

۱ ۔ اس کا چہرہ چودھویں کا چاند ہے اور سرمگیں آنکھوں میں جادو بھرا ہوا ہے ۔
۲ ۔ مسکراتے ہوئے اس کا چہرہ چودھویں رات کی طرح کھل جاتا ہے ، لیکن بوقت انتقام یوم بدر دکھائی دیتا ہے ۔

بنفسی من غدا ضَیفًا عزیزاً — علیَّ ، و إن لقیتُ به عذاباً
ینالُ هواه مِن کبدی کباباً — و یشربُ مِن دمی أبداً شراباً

ترجمہ :
۱ ۔ میری جان گرامی قدر مہمان پر قربان ، اگرچہ وہ مجھکو مبتلائے عذاب ہی رکھتا ہے ۔
۲ ۔ اس کی بارگاہِ محبت میں جگر کے کباب اور خون کی شراب کا تحفہ پیش کرتا ہوں ۔

***

لَا تحسبنّ هشاشتی لكَ عَن رضًی — فوحَق فضلكَ أنّنی أتملّقُ
ولقد نطقتُ بشکرِ برّكَ مفصحاً — ولسانِ حَالی بالشکایة أنطقُ

ترجمہ :
۱ ۔ یہ نہ سمجھنا کہ میری زندگی تیری رضا پر منحصر ہے ، میں کبھی کبھی تملق سے بھی کام لیا کرتا ہوں ۔
۲ ۔ میں نے تیرے حسن سلوک کا کھل کر شکریہ ادا کیا ہے اور میری زبانِ حال شکایت کر رہی ہے ۔

ابوالقاسم ابوالمنصور بن علی الغزنوی النوکی

صاحب 'نزهة الخواطر' بیہقی کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ ابوالمنصور بن علی مشہور دبیروں میں سے تھا ۔ خود صاحبِ 'نزهة الخواطر' نے بھی اسے 'الشیخ الفاضل' کے لقب سے یاد کیا ہے ۔ اس نے ایک عرصے تک شاہانِ غزنہ کی خدمت میں رہ کر انجام دی ۔ پھر ۴۲۶ھ/۱۰۳۴ء میں مسعود نے اسے اپنے بیٹے امیر مجدود کے

ہمراہ ممالک محروسۂ برّعظیم پاک و ہند میں بھیج دیا ۔ مجدود نے اسے دیوان انشا کا سربراہ مقرر کر دیا ۔ چنانچہ اس نے شہر لاہور ہی میں سکونت اختیار کر لی[1] ۔

احمد بن محمد المنصوری

ابوالعباس احمد بن محمد بن صالح المنصوری السندی منصورہ میں قاضی تھا ۔ اس نے داؤد اور الاصفہانی کے مذہب و مسلک کے ضمن میں کئی کتب مرتب کیں جیسا کہ یاقوت نے 'معجم الأدباء' میں ذکر کیا ہے ۔ المقدسی نے اپنی کتاب 'احسن التقاسیم' میں اس امر کا ذکر کیا ہے کہ وہ قاضی ابوالعباس المنصوری داؤدی سے ملا تھا اور اسے اپنے مذہب کا امام پایا تھا ۔ وہ پڑھاتا بھی رہا تھا اس نے لکھا بھی تھا ۔ کئی خوبصورت کتب اس کی تصنیف ہیں ۔ محمد بن اسحاق بن الندیم نے اپنی کتاب 'الفہرست' میں بیان کیا ہے کہ وہ اپنے داؤدی مذہب کے افاضل میں سے تھا ۔ کئی کتابوں کا مصنف تھا جن میں کتاب 'المصباح الکبیر'، 'کتاب الہادی' اور 'کتاب النیّر' شامل ہے ۔ 'الأنساب' میں السمعانی نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے اور انہی باتوں کو دہرایا ہے جن کو اوپر بیان کیا گیا ہے[2]

مسعود بن ابی الیمن الکرمانی

نورالدین محمد عوفی نے اسے الامیر فخر الدولۃ والدین کے لقب سے یاد کیا ہے اور کہا ہے کہ ''شعر تازی او از لطافت چوں در آب دار و شعر پارسئی او از طراوت چوں وصل دلدار'' ـــ محمد عوفی نے پیدائش اور وفات کے سنین کی جانب بہت کم توجہ کی ہے ۔ بہرحال مسعود بن ابی الیمن الکرمانی کو اس نے شعرائے آل سبکتگین کی صف میں شامل کیا ہے[3] ۔ ہم نے اس کو اس احتمال پر اس مقالے میں جگہ دی ہے کہ ممکن ہے وہ کرمان کے اس حصے سے تعلق رکھتا ہو جو آج بلوچستان میں مدغم ہے ۔ محمد عوفی نے اس کے دو عربی شعر بھی نقل کیے ہیں اور کہا ہے کہ اس نے عالم‌الدین کرمانی سے سنے تھے :

تَنَبَّه فَأَلْحَانُ الْحَمَامِ الْمُطَوَّقِ تَحُثُّ علی شُرْبِ الْمُدَامِ المروّق

---

۱ - نزھة الخواطر، جلد اول ، ص ۸۱ -

۲ - نزھة الخواطر ، جلد اول ، ص ۶۵ -

۳ - لباب الالباب ، ص ۵۹ ، ۶۰ -

يَقُولُ اصْطَبِحْ وَأَشْرَبْ وَاعْتَقِ مِنَ الْجَوَى
رَقِيْقٌ فَـرَأَدَ بِالرَّحِيقِ الْمُعَتَّقِ !!!!!

ترجمه :

۱ - جاگ اٹھو ! کہ فاختہ کی آوازیں شرابِ ناب کے پینے کا شوق دلا رہی ہیں -

۲ - وہ زبان حال سے پکار رہی ہے کہ صبح دم پرانی شراب پی کر سوزشِ جگر کو تسکین دو -

ان دو شعروں کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسعود عربی شاعری کی روایت سے بخوبی آگاہ تھا اور اس روایت کا پابند ہو کر شعر کہنے پر قادر تھا -

سلطان محمود بن سبکتگین

سلطان محمود کے سوانح حیات صفحات سابقہ میں گذر چکے ہیں - سلطان محمود کو بیشتر دلچسپی فارسی زبان سے تھی تاہم عربی سے بھی وہ خاصا آگاہ تھا - وہ شاعر بھی تھا اور نثر نگار بھی - کہا جاتا ہے کہ اس نے فقہ پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا نام 'التفرید فی الفروع' تھا - حاجی خلیفہ نے اپنی کتاب 'کشف الظنون' میں اس کتاب کا بڑے اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے[1] - صاحب 'کشف الظنون' کی روایت امام مسعود بن شیبہ کی روایت پر مبنی ہے کہ سلطان محمود اعیان فقہاء میں سے تھا اور اس کی یہ کتاب غزنی کے علاقوں میں عام معروف تھی - 'تاتار خانیہ' میں اس سے بہت کچھ اقتباس کیا گیا ہے[2] - تاہم استاد سعید نفیسی نے اس امر کی تردید کی ہے - ان کا بیان ہے کہ فقہ حنفی کی کتاب 'مجموعۂ سلطانی' کے مقدمے کے حوالے سے جس کو ایک حد تک محمود سے نسبت دی جاتی ہے اور جو لاہور میں ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۹ء میں چھپی تھی، محمود کی نہیں ہے - بلکہ حنفی فقہاء کی ایک جماعت نے محمود کے حنفی آئین کے مطابق مرتب کی تھی - ساتھ ہی سعید نفیسی نے عام مؤرخین کی یہ رائے بھی رد کر دی ہے کہ محمود پہلے حنفی تھا اور بعد میں شافعی ہوگیا - یہ بحث طویل ہے - اس کے لیے دیکھیے 'در پیرامون' 'تاریخ بیہقی' صفحہ ۵۷۷ تا ۵۷۹ -

الحسن بن حامد الدیبلی البغدادی

خطیب بغدادی نے اپنی 'تاریخ بغداد' میں الحسن بن حامد بن الحسن بن حامد

---

۱ - ڈاکٹر زبید احمد The Contribution of Indo-Pak to Arabic Literature II Ed. P. XXXII نیز ناظم ، ص ۱۵۷ -

۲ - در پیرامون تاریخ بیہقی ، ص ۵۷۷ -

الحسن بن حامد ابومحمد کو 'ادیب' کہہ کے یاد کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ علی بن محمد بن سعید الموصلی کا شاگرد تھا ۔ اس کا بیان ہے کہ مجھے محمد بن علی الصوری نے اس کے بارے میں یہ اطلاع دی ہے کہ وہ بڑا صاحب اخلاص شخص تھا ۔ بڑا خوشحال اور فارغ البال تاجر تھا ۔ زعفرانی محلے کی سرائے 'خان بن حامد' اسی سے منسوب ہے وہ تجارت کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا ۔ حدیث کی تحصیل علی بن محمد بن سعید الموصلی (م - ۹۶۹ء/۳۵۹ھ) و علج (۹۶۲ء/۳۵۱ھ) اور محمد النقاش (م- ۹۶۲ء/۳۵۱ھ) اور ابوعلی التمری کے یہاں کی تھی ۔ حدیث سے وہ دلبستگی تھی کہ روایت کرتے وقت آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں ۔ علم حدیث میں اس کی فضیلت اور ثقاہت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ حدیث پر خطبے دینے کے لیے دمشق اور شام گیا ۔ علاوہ ازیں وہ شاعر بھی تھا اور نثرنگار بھی[1] ۔

مشہور عرب شاعر متنبی بغداد میں آیا تو اس کے یہاں فروکش ہوا اور اس سے اس قدر متأثر ہوا کہ کہنے لگا اگر میں نے کسی بھی تاجر کی مدح کی ہوتی تو آپ کی مدح میں ضرور شعر کہتا ۔ ابن عساکر نے بھی اپنی 'تاریخ الکبیر' میں اس کا ذکر کیا ہے ۔ ابن الخطیب اور جوہری اور التنوخی نے اس کے یہ دو شعر نقل کیے ہیں اور کہا ہے کہ یہ شعر انہوں نے خود الحسن بن حامد کی زبان سے سنے تھے :

شَرَيْتُ ٱلْمَعَالِي غَيْرَ مُنْتَظِرٍ بِهَا ۔۔۔ كَسَاداً وَلَا سُوقاً تَقُومُ لَهَا أَجْرِى

وَمَا أَنَا مِنْ أَهْلِ الْمَكَاسِ وَكُلَّمَا ۔۔۔ تَوَفَّرَتِ ٱلْأَثْمَانُ كُنْتُ لَهَا أَشْرِى !

ترجمہ :

۱ ۔ میں نے کسادبازاری اور کسی دوسری جگہ منفعت کا خیال کیے بغیر عظمتیں حاصل کیں ۔

۲ ۔ میں پرانی چیزوں کا کاروبار نہیں کرتا بلکہ میں مہنگی چیزیں خریدنے کا عادی ہوں ۔

الحسن بن حامد کی وفات ۱۰۱۴ء/۴۰۷ھ میں ہوئی اور اس وقت وہ مصر میں تھا[2] ۔

---

۱ ۔ محمد اسحاق ، Indian Contribution to the Study of Hadith Literature, pp. 35-36

۲ ۔ رجال السند والہند ، ص ۹۸ ۔

الحسن بن علی بن الحسن الداوری السندی

داور کے ذکر میں یاقوت حموی نے بیان کیا ہے کہ ابوالعباس الحسن بن علی بن الحسن الداوری ایک کتاب کا مصنف ہے جس کا نام 'منہاج العابدین' ہے ۔ یہ بڑا فصیح البیان شخص تھا اور خوبصورت شعر کہتا تھا ۔ بعد ازاں بعض ظالموں نے اس کے اشعار کو ابوحامد الغزالی سے منسوب کر دیا ۔ چنانچہ وہ لوگوں میں خوب پھیلے ۔ اس لیے کہ لوگ الغزالی کے کلام کے شائق تھے ۔ حالانکہ الغزالی کی تصانیف کا شعر سے کوئی واسطہ نہیں ۔ لہذا واضح ہے کہ یہ شعر الغزالی کے نہیں . . . سلفی کا بیان ہے کہ اس نے ۱۰۴۳ء/۴۳۴ھ میں شہر قدس میں اس دار فانی سے رحلت کی[1] ۔

احمد بن سعید المالکی الہمذانی ابن الہندی

الشیخ برہان الدین ابراہیم بن علی بن محمد بن فرحون الیعمری المدنی نے کتاب 'المذہب فی اعیان علماء المذہب' کے دیباچے میں احمد بن سعید بن ابراہیم الہمذانی المعروف با بن الہندی کا ذکر کیا ہے ، یہ کتاب مالکی مذہب کے بارے میں تھی . . . ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ 'علم الشروط' کے معاملے میں یگانۂ روزگار تھا ۔ اس امر کا اعتراف جملہ فقہائے اندلس نے کیا ہے ۔ علم الشروط میں اس کی ایک کتاب جو بڑی جامع اور ذخیرۂ معلومات ہے اس پر اندلس اور مغرب کے ثقہ علماء بھروسا کرتے ہیں ۔

ابن الہندی کی ایک کتاب اور بھی مذکور ہے جس کا نام 'کتاب الوثائق' تھا ، الفقیہ الزاہد الورع ابوالمطرف عبدالرحمٰن بن مروان النزاعی القرطبی متوفی ۱۰۲۲ء/۴۱۳ھ نے اس کتاب کا اختصار تیار کیا تھا ۔ ابن الہندی کی وفات ۱۰۰۸ء/۳۹۹ھ میں ہوئی تھی[2] ۔

ابوالمعالی نصراللہ منشی بن محمد بن عبدالحمید

نصراللہ منشی عربی اور فارسی دونوں زبانوں سے بخوبی آگاہ تھا ۔ سلطان نے بہرام شاہ کے زیر سایہ ملازمت شروع کی ۔ اسے اپنے دور کے شیریں کلام اور خوش ذوق شعراء میں شمار کیا جاتا تھا ۔ اس نے 'کلیلہ و دمنہ' کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا ۔ یہ ۱۱۴۳ء/۵۳۸ھ اور ۱۱۴۶ء/۵۴۰ھ کے لگ بھگ کا واقعہ ہے[3] ۔ اس ترجمے کو قبول عام

---

۱ ۔ رجال السند والہند ، ص ۱۰۴ ۔

۲ ۔ رجال السند و الہند ، ص ۵۶ ۔

۳ ۔ کلیلۃ و دمنہ از نصراللہ منشی شائع کردہ مجتبی مینوی صفحہ 'یا' مقدمہ مصحح ۔

نصیب ہوا ۔ یہ کتاب سلطان بہرام شاہ ہی کے نام معنون ہے ۔

نصراللہ منشی کی علمی ترقی کے ساتھ ساتھ منصبی ترقی بھی جاری رہی ۔ چنانچہ خسرو ملک نے اسے اپنا لیا ۔ خسرو ملک غزنوی خاندان کا آخری بادشاہ تھا جس کا پایۂ تخت لاہور تھا ۔ وہ لاہور ہی میں پروان چڑھا اور لاہور ہی میں مسند نشین سلطنت ہوا ۔ یاد رہے کہ خسرو ملک کے والد خسرو شاہ نے معزالدین سام محمد غوری کے ہاتھوں شکست یاب ہو کر غزنی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا اور برِّصغیر پاک و ہند کے مقبوضات پر قناعت کر لی تھی ۔

نصراللہ منشی کا انجام بخیر نہ ہوا ۔ خسرو ملک نے اس کے حاسدوں اور بدخواہوں کی غمازی سے متاثر ہو کر اسے قید خانے میں ڈال دیا ۔ قید خانے میں اس نے یہ رباعی بادشاہ کی خدمت میں ارسال کی :

شاہ مکن آنچہ پرسند از تو — روزی کہ تو دانی کہ تر سند از تو
خورسندنۂ زملک و دولت ز خدائی — من چوں باشم بحبس خورسند از تو

مگر اس رباعی کے مطالعہ سے بھی بادشاہ کا دل نہ پسیجا اور اس نے نصراللہ منشی کی موت کے احکام صادر کر دیئے ۔ موت کا استقبال کرتے وقت اس نے ذیل کی رباعی پڑھی :

از مسند عز اگرچہ ناگاہ رفتیم — حمداً للہ کہ نیک آگاہ رفتیم
رفتند و شدند نیز آیند و روند — ما نیز توکلت علی اللہ رفتیم

نصراللہ منشی کے علم و فضل کو صاحبِ 'لباب الالباب' اور صاحبِ سلطنت غزنویاں نے خوب سراہا ہے ۔ اس نے 'کلیلہ و دمنہ' کے دیباچہ میں اپنے عربی کے دوشعر بھی نقل کیے ہیں جو اس نے بہرام شاہ کی زبان سے کہلوائے ہیں :

إِنَّا لَنَحْرُزُ بِالْأَسْيَافِ مُصْلَتَةً — مَمَالِكَ الرُّومِ وَالْأَتْرَاكِ عَنْ كَثَبٍ [۱]
حَتَّى تَكُونَ لَنَا الدُّنْيَا بِأَجْمَعِهَا — مَحْمِيَّةً بَيْنَ مَوْرُوثٍ وَ مُكْتَسَبٍ

ترجمہ :

۱ ۔ ہم ننگی تلواروں سے ممالکِ روم و ترک کو زیرِ نگیں کرتے ہیں ۔

۲ ۔ حتیٰ کہ ہم موروثی اورکسبی طور پر سارے جہاں کے وارث بن جاتے ہیں ۔

---

۱ ۔ کلیلہ و دمنہ از نصراللہ منشی ، شائع کردہ مجتبی مینوی ۔ صفحہ یا مقدمہ مصحح ۔

۲ ۔ لباب الالباب ، جلد اول صفحہ ، ۹۲ ۹۳ ۔

مسعود سعد سلمان

مسعود سعد سلمان اصلاً ہمدانی تھا ۔ سلطنت غزنویہ کی شان و شوکت سے متاثر ہو کر اُس کے بزرگ غزنی میں چلے آئے ۔ اُس کے والد سعد نے غزنی کے سلاطین کی کوئی ساٹھ برس تک خدمات سرانجام دیں ۔ اُسے سلطان مسعود نے اپنے بڑے بیٹے مجدود کی رکاب میں ہندوستان روانہ کر دیا ۔ مجدود نے ہی مسعود کو ہندوستانی محروسہ علاقوں کا حاکم مقرر کیا تھا ۔ اس طرح گویا یہ خاندان غزنی سے لاہور میں منتقل ہوگیا ۔

نورالدین محمد عوفی نے اپنی کتاب 'لباب الالباب' میں اس کا مولد ہمدان بتایا ہے ۔ مگر یہ غلط ہے ۔ اس کا مولد شہر لاہور تھا ۔ اس امر کا خود مسعود نے اپنے کلام میں ایک سے زیادہ بار اظہار کیا ہے ۔ مثلاً دیوان (مرتبہ رشید یاسمی) کے صفحہ ۵۹ پر کہا ہے :

بہیچ نوع گناہ دگر نمی دانم　　　مرا جز اینکہ ازین شہر مولد و منشاست

اسی طرح صفحہ ۴۹۳ پر کہا ہے :

اے لاہُوُر ویحک بے من چگونہٗ　　　بے آفتاب روشن روشن چگونہٗ
ناگہ عزیز فرزند از توجدا شدہ است　　　با درد او بنوحہ و شیون چگونہٗ

مسعود سعد سلمان کئی علوم و فنون میں ماہر تھا[1] ۔ مگر اس کی شہرت کا انحصار اس کی شاعری پر ہے ، رشید یاسمی نے دیوان مسعود سعد سلمان کے مقدمے میں صفحہ آغاز پر دولت شاہ اور تقی الدین اوحدی کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ مسعود کا والد بھی شعر کہتا تھا ۔ نمونے کے طور پر رشید یاسمی نے چند شعر نقل بھی کیے ہیں ۔ مسعود سعد نے اپنے کلام میں بارہا اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ اس کا تعلق خاندانِ علماء و فضلاء سے ہے ۔ مثلاً 'مولد و منشاست' والے محولہ بالا قصیدے میں اس کا شعر ہے :

اگر رئیس نیم یا عمیدِ زادہ نیم　　　ستودہ نسبت و اصلم زدودۂ فضلست

مسعود سعد سلمان کا سالِ ولادت معرضِ بحث میں رہا ہے ۔ محمد قزوینی نے اپنی مختصر سی کتاب میں جو مسعود سعد سلمان کے احوال پر مشتمل ہے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کا سالِ ولادت ۱۰۴۶ء/۴۳۸ھ اور ۱۰۴۸ء/۴۴۰ھ کے مابین ہے ۔ رشید یاسمی بھی

---

۱ ۔ نزہۃ الخواطر ، حصہ اول ، صفحہ ۱۱۴ ۔

اس سے متفق ہیں کہ اگر سعد کا سال ولادت ۴۳۸ھ/۱۰۴۶ء قبول کر لیا جائے تو کوئی بعید از قیاس بات نہ ہو گی[1] ۔

مسعود نے لمبی زندگی پائی تھی اور کئی اتار چڑھاؤ دیکھے تھے ۔ خواجہ امیر خسرو کی طرح کئی بادشاہوں سے واسطہ پڑا ۔ یہ الگ بات ہے کہ حضرت خواجہ امیر خسرو ہر بادشاہ کے منظور نظر رہے ، مغضوب و معتوب نہ ہوئے ۔ اس کے برعکس مسعود کو بارہا زیر عتاب رہنا پڑا ۔ قید کی سزا بھی بھگتی ۔ جائداد کی ضبطی بھی عمل میں آئی ۔ قید کے عالم میں مسعود نے جو درد انگیز قصیدے کہے وہ زندانی ادب میں ایک خاص مقام کے مالک ہیں ۔

مسعود کے بچپن نے سلطان فرّخ زاد کا دور دیکھا ۔ جب سلطان ابراہیم بن مسعود بن محمود غزنوی تخت نشین ہوا تو اس وقت مسعود کی عمر کوئی گیارہ بارہ برس تھی یہ بادشاہ ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء سے ۴۹۲ھ/۱۰۹۸ء تک تخت حکومت پر جلوہ‌گر رہا ۔گویا اس کی وفات کے وقت مسعود کی عمر باون ترپن برس کے لگ بھگ تھی ۔ سلطان ابراہیم کے بعد اس کا بیٹا مسعود تخت نشین ہوا ۔ جس نے ۵۰۹ھ/۱۱۱۵ء تک حکومت کی ۔ اس کی مدت سلطنت سترہ برس ہوتی ہے ۔ سلطان مسعود کے بعد اس کا بیٹا شیر زاد تخت نشین ہوا جسے اس کے بھائی نے جلد ہی قتل کر ڈالا ۔ ۵۰۹ھ/۱۱۱۵ء میں سلطان کا بھائی ارسلان تخت سلطنت پر متمکّن ہوا ۔ لیکن اس کا ایک سوتیلا بھائی بہرام شاہ بھاگ کر خراسان میں سلطان سنجر کے پاس چلا گیا اور اس سے امداد چاہی ۔ سلطان سنجر نے غزنی پر حملہ کیا اور ملک ارسلان بھاگ گیا ۔ یہ ۵۱۱ھ/۱۱۱۷ء کا واقعہ ہے ۔ ۵۱۲ھ/۱۱۱۸ء میں بہرام شاہ غزنی میں تخت نشین ہوا اور ۵۴۷ھ/۱۱۵۲ء تک کوس فرمانروائی بجاتا رہا ۔ مسعود سعد سلمان کی وفات اسی سلطان بہرام شاہ کے عہد میں ہوئی سال وفات ۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء ہے ۔ اس اعتبار سے مسعود کی عمر پچھتّر اور اسّی کے درمیان بنتی ہے ۔

مسعود نے بڑی عزت و عظمت کے دن بھی دیکھے ۔ اعلیٰ مناصب پر بھی فائز رہا ۔ یہاں تک کہ دوسرے شعراء نے اس کی مدح میں قصیدے کہے[2] ۔ لاہور میں اس نے ایک عالی شان محل تعمیر کروایا تھا اور ابوالفرج رونی جیسے صاحب کمال شاعر اور رئیس نے اس محل کی تعریف میں قطعہ تصنیف کیا تھا[3] ۔ عوفی نے 'لباب الالباب'

---

۱ ۔ دیوان مسعود سعد سلمان (رشید یاسمی) ، صفحہ ح (مقدمہ) ۔

۲ ۔ نزهة الخواطر ، حصہ اول صفحہ ۱۱۵ ۔

۳ ۔ دیوان مسعود سعد سلمان (رشید یاسمی) مقدمہ ص 'یہ'

میں کہا ہے کہ میں نے اسکا ذکر طبقۂ شعراء میں کیا ہے اس لیے کہ اہلِ تاریخ نے اسے زمرۂ شعراء میں شامل کیا ہے ۔ ورنہ میں اسے رؤساء و امراء کے طبقے میں رکھتا[1] ۔

رشید یاسمی کے بقول اس کی عمر تقریباً چالیس برس تھی کہ اس کے لیے ہوائے ادبار چلنا شروع ہوگئی ۔ یعنی بدخواہوں نے اس کے عروج سے جل کر اس کے خلاف سازشیں شروع کر دیں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان ابراہیم نے اسے زندان میں ڈال دیا ۔ یہ بھی گمان کیا جاتا ہے اس کے خلاف غمازی کرنے والوں میں خود رونی جیسے دوست بھی شامل تھے ۔ جیسا کہ مسعود نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے :

بوالفرج شرم نائدت کہ ز خبث　　　در چنین حبس و بندم افگندی

ممکن ہے استاد ابوالفرج کو شاعرانہ و معاصرانہ رقابت اور حسد نے اس قبیح اقدام پر اکسایا ہو[2] ۔ یہ کہ اسے کس جرم میں قید کیا گیا واضح نہیں ۔ صاحبِ 'چہار مقالہ' کا بیان ہے کہ کسی صاحبِ غرض نے سلطان ابراہیم کو پرچہ لگایا کہ اس کے بیٹے سیف الدولہ امیر محمود کی نیت یہ ہے کہ بھاگ کر عراق میں ملک ساہ سلجوق کے پاس چلا جائے ۔ اس پر سلطان کو غصہ آگیا اور اسے اچانک دھر پکڑا ۔ یہی نہیں بلکہ ساتھ ہی اس کے ندما کو بھی گرفتار کرا لیا اور قید کر لیا ۔ انہی میں مسعود بن سعد بھی تھا[3] ۔

بہرحال اسے قلعہ دھک میں نظر بند کیا گیا تھا ۔ کچھ مدت جس کا صحیح اندازہ ممکن نہیں وہاں گزاری تھی کہ اسے قلعہ سو میں بھیج دیا گیا ۔ سو کے بعد اس کا محبس قلعۂ نائی قرار پایا وہاں وہ تین سال رہا ۔ تینوں قیدوں کی مجموعی مدت دس سال تھی ۔ جس کا معنی یہ ہے کہ دھک اور سو دونوں کی قید کا عرصہ سات سال بنتا ہے ۔ یہ مفہوم مسعود کے شعر ذیل سے حاصل ہو جاتا ہے :

ہفت سالم بسود سو و دھک　　　پس ازانم سہ سال قلعۂ نائی !

دس سال کے بعد ایک سردار عماد الدولہ ابوالقاسم خاص کی سفارش سے اسے رہائی نصیب ہوئی ۔ جیسا کہ دیوان مسعود سعد سلمان (رشید یاسمی) کے قصیدہ مرقومۂ صفحہ ٦٦٤ سے ظاہر ہوتا ہے :

از تو بودی ہمہ تعہد من !　　　گاہ محنت بحصنہائے حصین
جان تو دادی بمن پس از ایزد　　　اندرین حبس و بند باز پسین !

---

۱ ۔ لباب الباب ، حصہ دوم ، ص ٢٣٦ ۔
۲ ۔ در پیرامون تاریخ بیہقی ، صفحہ ٣١٣ ۔
۳ ۔ چہار مقالہ (قزوینی ایڈیشن) ، صفحہ ٧٢ - ٧١ ۔

یہ رہائی اسے سلطان ابراہیم کے عہد حکومت کے آخری حصے میں نصیب ہوئی اور وہ واپس لاہور پہنچ کر اپنی جائداد کی خبرگیری میں اور مکان و شبستان کی مرمت وغیرہ میں مصروف ہوگیا ۔ اس دوران میں اسے سلطان ابراہیم کی وفات کی اطلاع ملی ۔ سلطان ابراہیم کا بیٹا مسعود جو ہندی محروسہ علاقوں کا حکمران تھا بادشاہ بنا اور اپنی جگہ شیرزاد کو نائب بنا کر خود غزنی چلا گیا ۔

سلطان مسعود بن ابراہیم کے زمانے میں مسعود نے قلعۂ جالندھر کی فتح کے ضمن میں قابل قدر خدمات انجام دی تھیں چنانچہ اسے اس علاقے کا حاکم و جاگیردار بنا دیا گیا ۔ اس کی اس کامگاری کو دیکھ کر بدخواہوں کو تکلیف ہوئی اور انہوں نے پھر اس کے خلاف سازشوں کا جال بچھا دیا ۔ ابونصر فارسی بڑا ہی ذوالقدر سردار تھا وہ مغضوب ہوا تو مسعود بھی بے آسرا ہوگیا ۔ ویسے مسعود مزاجاً آزادہ رو تھا ۔

چو زاد سرو مرا دید راست در ہمہ کار

شاید خوشامد کا عادی نہ ہونے کے باعث مغرور سمجھا جاتا ہو اور اس کے خلاف شکایت جلدی کارگر ہو جاتی ہو ۔ چنانچہ علاقۂ جالندھر کی حکومت اور جاگیر سے بمشکل ایک سال لطف اندوز ہو پایا تھا کہ اسے قلعۂ مرنج میں بھیج دیا گیا اور پھر آٹھ سال تک وہ وہیں مقید رہا[1] ۔ آخر ۱۱۰۶ء/۵۰۰ھ کے اواخر میں اسے سلطان مسعود بن ابراہیم نے رہائی بخشی اور شاہی کتب خانے کا نگران بنا دیا[2] ۔

جیسا کہ شروع میں بیان ہوا سلطان مسعود کے بعد جب ارسلان تخت نشین ہوا تو اس کا ایک سوتیلا بھائی بہرام شاہ جو سلطان سنجر کا بھانجا تھا ، خراسان کی طرف بھاگ گیا اور سلطان سنجر سے جا کر پناہ طلب کی اور مدد بھی مانگی ۔ چنانچہ سلطان سنجر کی مدد کے باعث طویل مدت تک تخت سلطنت پر جلوہ افروز رہا ۔ اس کی مدت سلطنت ۱۱۱۸ء/۵۱۲ھ سے لے کر ۱۱۵۲ء/۵۴۷ھ تک ہے ۔ وہ ہندی علاقوں میں خود مختار تھا ۔ مگر غزنی اور دیگر علاقوں میں سنجر کا باجگذار بادشاہ تھا ۔ بہرحال بہرام شاہ کے زمانے میں اسے آرام اور احترام کی فضا میسّر رہی ۔

عوفی کے بقول مسعود سعد سلمان فارسی ، عربی اور ہندی تینوں زبانوں میں شعر کہتا تھا اور تینوں زبانوں میں صاحب دیوان تھا[3] ۔ لیکن یہ کہ اس کا فقط فارسی دیوان موجود ہے اور دوسرے دونوں دیوان ناپید ہیں اور بقول صاحب 'نزھة الخواطر'

---

۱ ۔ دیوان مسعود سعد سلمان (رشید یاسمی) ، مقدمہ صفحہ 'یہ' ۔

۲ ۔ ایضاً صفحہ 'مز'

۳ ۔ لباب الالباب ، جلد دوم ، صفحہ ۲۴۶ ۔

ان دونوں دیوانوں کو عنقا اڑا لے گیا[1] ۔ مسعود کے بعض عربی اشعار 'حدائق السحر' مؤلفہ رشید الدین وطواط میں مندرج ہیں ۔

تاہم مسعود کے جس قدر بھی عربی اشعار میسر ہیں ان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ عربی زبان پر بخوبی قادر تھا اور بڑی سلیس زبان میں شعر کہہ لیتا تھا اور ساتھ ہی یہ امر بھی عیاں ہوجاتا ہے کہ وہ فارسی میں جن رعایات کو ملحوظ رکھتا تھا ان کا عربی میں بھی خیال رکھتا تھا ۔ گویا اسے عربی پر بھی فارسی ہی کی طرح تسلّط حاصل تھا ۔ وہ خود کہتا ہے :

مرا بدان تو کہ در پارسی و در تازی !!
بہ نظم و نثر ندارد چون من کس استقلال

ذیل میں اس کے بعض عربی اشعار نقل کیے جاتے ہیں اور یہ 'حدائق السحر' سے ماخوذ ہیں ، مسعود کے عربی اشعار جس بھی کتابِ ادب یا تذکرہ میں مندرج ملتے ہیں وہ 'حدائق السحر' ہی سے لیے گئے ہیں ، مثلاً :

ثِقْ بِالْحُسَامِ فَعَهْدُهُ مَيْمُونُ، أَبَداً وَ قُلْ لِلنَّصْرِ كُنْ فَيَكُونُ،

ترجمہ :

۱ ۔ تلوار پر اعتماد کرا کہ اس کا عہدِ حکومت ہمیشہ کے لیے بابرکت ہے ۔ فتح و نصرت کو حکم تعمیل دو اور وہ امر واقعہ بن جائے گی ۔

★★★

وَلَيْلٍ كَأَنَّ الشَّمْسَ ضَلَّتْ مَمَرَّهَا وَلَيْسَ لَهَا نَحْوَ الْمَشَارِقِ مَرْجِعُ

نَظَرْتُ إِلَيْهِ وَ الظَّلَامُ كَأَنَّهُ ، عَلَى الْعَيْنِ غِرْبَانٌ مِنَ الْجَوِّ وُقَّعُ ،

فَقُلْتُ لِقَلْبِي طَالَ لَيْلِي وَ لَيْسَ لِي مِنَ الْهَمِّ مَنْجَاةٌ وَ فِي الصَّبْرِ مَفْزَعُ ،

أَرَى ذَنَبَ السِّرْحَانِ فِي الْجَوِّ سَاطِعاً
فَهَلْ مُمْكِنٌ أَنَّ الْغَزَالَةَ تَطْلُعُ

---

[1] ۔ نزھۃ الخواطر (جلد اول) صفحہ ۱۱۶ ۔

ترجمہ :

۱ - بارہا درازیٔ شب ختم ہونے میں نہ آتی تھی - معلوم ہوتا تھا کہ سورج اپنی گزرگاہ سے بھٹک گیا ہے اور وہ مشرق سے طلوع نہیں ہوگا -

۲ - میں نے آسماں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا - اندھیرے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں پر کوا آکر بیٹھ گیا ہے -

۳ - میں نے اپنے دل سے کہا کہ رات غیر معمولی طور پر لمبی ہو گئی ہے ، غم و اندوہ سے چھٹکارا نہ ہوگا - بس اب صبر کرو کہ صبر کے بغیر چارہ نہیں -

۴ - میں دیکھ رہا ہوں کہ صبحِ کاذب طلوع ہو رہی ہے تو کیا سورج بھی نکلے گا -

اوپر درج کردہ اشعار میں صنعتِ ایہام سے کام لیا گیا ہے ، اب نیچے درج ہونے والے شعروں میں صنعتِ ذوقافیتین ملاحظہ ہو :

یَا لَیْلَةً أَظْلَمَتْ عَلَیْنَا لَیْلَاءَ قَارِیَّةِ الدُّجنَّه

قَدْ رَکَضَتْ فِی الدُّجی عَلَینَا دَهْماً خُدارِیَّةَ الدّعنَه

فَبِتُّ اَقْتَاسُهَا فَـكَانَتْ حُبْلَـى نَهَارِیَّةَ الدُّجْنه!

ترجمہ :

۱ - اے سخت اندھیری رات جو کہ ہم پر چھا گئی ہے -

۲ - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ گھوڑا جس کی لگام عقاب کی ہے دوڑے جا رہا ہے -

۳ - میں رات بھر غم و حزن کا شکار رہا - حالت حاملہ عورت کی طرح نظر آ رہی تھی جس میں روزِ روشن مستور تھا -

کچھ عربی اشعار اور مصرعے مسعود کے فارسی دیوان مرتبہٗ رشید یاسمی ، سے لیے گئے ہیں - اشعار جس صفحے سے لیے گئے ہیں اس کا نمبر شعر کے مقابل دے دیا گیا ہے :

لَزِمْتُ سِجناً و البَابُ مُغْلَقٌ دُونِي وَلَيْسَ يَفْتَحُ دُونَ المُهَيْمِنِ الفَتّاحِ (۷۷)

ترجمہ : میں قید خانے میں پڑا رہا اور دروازہ بند تھا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرا کون تھا جو دروازہ کھول سکے۔

★★★

بَدِینسَان گزارم همی روزگار ا و مَأمُول غنیِّ منیع المرام

ولَا زِلْتُ اَسْطُو کَلَیْثِ العَرِیْنِ عَلٰی کُلِّ خَصْمٍ اَلَدِّ الخِصَام (۳۲۷)

ترجمہ :

۱ - میں اسی طرح وقت گزارتا ہوں - میں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا -

۲ - پھر بھی میں کچھار کے شیر کی طرح ہر جھگڑالو دشمن پر حملہ کرتا ہوں۔

★★★

أَصْبَحَتْ شَمْسُ العُلٰی فِی دَوْلَةٍ مِنْ مَشْرِق نَحْمَدُ الرَّحمانَ حَمْداً وهو ربُّ العَالَمِین (٤٦٠)

ترجمہ : ملک کے مجد و شرف کا سورج مشرق سے طلوع ہوا۔اس کے لیے ہم خدائے رحمان کے سپاس گزار ہیں جو کہ تمام جہانوں کا رب ہے -

★★★

شاه باشد درآن ثواب شریك وَهُوَ عِنْدَاللهِ لَیْسَ یَضِیعُ (٦٠٧)

ترجمہ : بادشاہ اس ثواب میں شریک ہے اور اللہ کے ہاں اس کا ثواب ضائع نہیں ہوگا۔

★★★

نیست چون من کس از جهان مخصوص بِالبَلِیّاتِ مِنْ جَمِیعِ النَّاسِ (۲۹٦)

ترجمہ : ساری دنیا میں مصائب و آلام کے لیے مجھے ہی مخصوص کر لیا گیا ہے -

★★★

چون شکایت کنم که فائده نیست مِنْ زَمَانٍ عَلَی الکَرِیمِ یَجُورُ (۲٦۸)

ترجمہ : شریف اور معزز انسان پر زمانے کے جور و ظلم کا کیوں شکوہ کروں ۔
(اس کا) کچھ فائدہ نہیں ہے ۔

فَاللَّیلُ بِمَا یُطلَبُ مِن جدّك حُبلٰی   ہر روز فزون گرد دت از گردون ملکیے   (۱۸)

ترجمہ : اللہ کرے کہ ہر روز تمہارے لیے آسمان کی طرف سے ایک نئے ملک کا اضافہ
ہو کیونکہ جن باتوں کو تم طلب کرتے ہو رات اُن کی کفیل ہے ۔

ابوالریحان البیرونی

ڈاکٹر زبید احمد کے بقول البیرونی کی کتاب 'ماللھند' اور اس قسم کی دوسری تحریریں "عربی زبان و ادب کی ترقی میں پاکستان کا حصہ" کی ذیل میں شامل ہو سکتی ہیں ۔ اس لیے نہیں کہ بعض معروف عرب اہلِ قلم نے البیرونی کو سندھ کا باشندہ قرار دیا ہے ، بلکہ اس وجہ سے کہ ان کی (بہت سی) تحریروں کا تمام تر مواد برِّ صغیر پاکستان و ہند سے لیا گیا ہے ۔ البیرونی کا نام برِّ صغیر پاکستان و ہند کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو گیا ہے کہ اس ملک کے پیدا کردہ عربی ادب کا البیرونی کے بغیر تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا[1] ۔

ہم ڈاکٹر زبید احمد کی اس وضاحت کو اپنی طرف سے کافی دلیل و حجت جانتے ہیں اور البیرونی کی بہت سی تحریروں کو اس خطّے کی پیداوار ماننے کے باعث اس خطّے سے تعلق رکھنے والے عربی نویس اہلِ قلم میں شامل کرتے ہیں ۔

خوارزم کا علاقہ اس وقت یورپی روس کے مقبوضات میں شامل ہے اور ازبک کی ریپبلک کا حصہ ہے ۔ یہ زیریں جیحوں کا سرسبز و شاداب علاقہ ہے جو اپنے قدرتی جمال کے باعث ایشیا کے دلکش علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے ۔ اس علاقے کو حجّاج کے منظورِ نظر سپہ سالار قتیبہ بن مسلم الباہلی نے ۷۱۱ء/۹۳ھ میں فتح کیا ۔ اس وقت دارالخلافہ دمشق اور ولید بن عبدالملک سریرِ آرائے خلافت تھا ۔ اسی زمانے میں محمد بن قاسم ثقفی نے سندھ اور موسیٰ بن نصیر نے مغربی افریقہ اور اندلس کے بہت سے حصے فتح کیے ۔ اندلس سے لے کر چین کے شمالی اقطاع تک کا وسیع رقبہ ایک سلطنت بن گیا ۔ پھر جوں جوں دربارِ خلافت کی گرفت ڈھیلی ہوتی گئی صوبجات خوُد مختاری کی روش اختیار کرتے گئے ۔ خوارزم میں بھی یہی کچھ ہوا ۔

---

1 - The Contribution of Indo-Pakistan to Arabic Literature, p. 10.

البیرونی کی پیدائش احمد بن محمد خوارزم کے دورِ حکومت اور چوتھی صدی ہجری یعنی دسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ہوئی ۔ احمد بن محمد شاہانِ خوارزم کی شاخ آل عراق سے تعلق رکھتا تھا[1] ۔ جب البیرونی تقریباً تئیس (۲۳) سال کا ہوا تو آلِ عراق کا خاتمہ ہوگیا، احمد بن محمد مارا گیا اور حاکم جرجانیہ مامون بن محمد کی حکومت شروع ہوگئی[2] ۔ یہ ۹۹۷ء/۳۸۷ھ کے اردگرد کا واقع ہے ۔ مامون بن محمد نے ۱۰۰۹ء/۴۰۰ھ تک حکومت کی ۔ اس کی وفات پر اس کا بھائی ابوالعباس مامون خوارزم شاہ بنا ۔ مامون بن محمد کی طرح یہ ابوالعباس مامون بھی محمود غزنوی کا بہنوئی تھا ۔ اس طرح گویا خوارزم شاہی سلطنت کے تعلقات غزنی کی نوزائیدہ مگر ابھرتی ہوئی سلطنت کے ساتھ نہایت دوستانہ تھے ۔ تاہم یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی ۔ مامون کو محمود کی طرف سے دھڑکا بہرحال لگا رہتا تھا ۔ لہذا اس نے چاہا کہ ہمسایہ ترک خود مختار امراء کے تعاون سے خراسان میں فسادات بپا کیے جائیں اور محمود کو وہاں الجھائے رکھا جائے تاکہ وہ خوارزم کی جانب توجہ نہ دے سکے ۔ اس بات سے محمود مشتعل ہوگیا اور کڑی شرائطِ صلح پیش کیں جن کے پورا نہ ہونے کی صورت میں چڑھائی کرنے کی دھمکی دی ۔ ابوالعباس مامون نے مارے خوف کے وہ شرائط قبول کر لیں ۔ اس پر اس کے اپنے بعض امراء باغی ہو گئے اور انہوں نے اسے قتل کر دیا ۔ اس خبر نے محمود کو موقع دیا کہ وہ اپنے رشتہ دار مامون کے باغیوں اور قاتلوں کو سزا دینے کے بہانے خوارزم پر چڑھ دوڑے[3] ۔ چنانچہ اس نے ۱۰۱۶ء/۴۰۷ھ میں خوارزم پر قبضہ کر لیا اور اسے سلطنتِ غزنہ کا ایک صوبہ بنا لیا ۔ اس ہلے میں جہاں اور بہت کچھ محمود کے ہاتھ لگا وہاں البیرونی بھی پکڑا گیا ۔ اس طرح البیرونی کا غزنہ کی سلطنت سے تعلق شروع ہوا جو اس کی وفات تک استوار رہا ۔

البیرونی کے وطن کے بارے میں بعض مؤرخین کو تسامح ہوا ہے ۔ ان کا خیال ہے کہ وہ البیرونی اس لیے کہلاتا ہے کہ بیرون نامی ایک گاؤں کا رہنے والا تھا اور یہ گاؤں سندھ میں تھا ۔ ابن ابی اصیبعہ نے 'طبقات الاطباء' میں کہا ہے کہ البیرونی بیرون سے منسوب ہے اور وہ سندھ میں ایک شہر ہے[4] ۔ یہی بات ابوالفداء نے 'تقویم البلدان' میں کہی کہ بیرونی جس بیرون سے منسوب ہے وہ سندھ کے ان اقطاع میں ہے جو کھاری پانی کی اس خلیج پر واقع ہے جو بحرِ فارس سے نکلی ہے ۔ اسی طرح صاحبِ

---

۱ ۔ البیرونی (سید حسن برنی) ، ص ۲۸ ۔

۲ ۔ ایضاً ، ص ۳۵ ۔

۳ ۔ فرشتہ (اردو) ، ص ۱۲۵ ۔ ۱۲۶ ۔

۴ ۔ نزهة الخواطر ، جلد اول ، ص ۸۸ ۔

'آداب اللغۃالعربیہ' نے اظہارِ خیال کیا ہے کہ البیرونی بیرون سےمنسوب ہے اور وہ ایک قصبہ ہے جو سندھ میں ہے[1] ۔ صاحب 'تاج العروس' نے بیرون کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ سندھ میں ہے اور میرا خیال ہے کہ بیرونی کا تعلق اسی مقام سے تھا— لیکن اس کے مقابل صاحب 'معجم الادباء' اسے خوارزمی قرار دیتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے کسی صاحب سے ابوالریحان کے 'البیرونی' مشہور ہو جانے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ میرا گمان یہ ہے کہ البیرونی چونکہ خوارزم میں بہت کم ٹھہرا اور خوارزم والے پردیسی اور اجنبی کو بیرونی کہتے ہیں اس لیے البیرونی اس کا نام پڑ گیا ۔ وہ زیادہ عرصہ پردیس میں رہا لہذا ان کے لیے پردیسی ہو گیا[2]۔ صاحبِ 'معجم البلدان' مزید لکھتا ہے کہ میرا گمان یہ ہے کہ وہ خوارزم کے آس پاس کے علاقے سے تعلق رکھتا تھا ۔

السمعانی کا بیان یہ ہے کہ البیرونی نسبت ہے نواح خوارزم یعنی خوارزم کے باہر کے علاقے سے تعلق رکھنے کی ۔ جو خاص خوارزم کا رہنے والا نہ ہو اس کے بارے میں اہلِ خوارزم یہ کہتے ہیں کہ 'فلاں بیرونی است' اور اسی نسبت سے ابوالریحان المنجم مشہور ہے[3] ۔ الغضنفر التبریزی[4] ، اور فرشتہ[5] اور ایلیٹ اینڈ ڈوسن[6] وغیرہ سب شدت سے اس امر کے مؤید ہیں کہ ابوالریحان خوارزم کا رہنے والا تھا ۔ البیرونی کی اپنی کتاب 'آثار الباقیہ' کی اندرونی شہادتیں بھی یہی ثابت کرتی ہیں کہ وہ خوارزمی تھا ، سندھی نہ تھا ۔ البلاذری نے 'فتوح البلدان' میں ایک قصبے کا نام نیرون بتایا ہے ۔ گمان یہ ہے کہ نیرون کو غلطی سے بیرون سمجھ لیا گیا ۔ ن کی جگہ ب نے لے لی ۔ ایلیٹ کہتے ہیں کہ البیرونی کی ان تحریروں سے جو برّصغیر پاک و ہند اور سندھ کے بارے میں ہیں ، قطعاً اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ وہ اس علاقے سے کوئی جذباتی ربط رکھتا تھا ۔

'انسائیکلوپیڈیا آف اسلام' کی رو سے یہ ثابت ہے کہ البیرونی نے زندگی کے ابتدائی پچیس برس اپنے وطن میں بسر کیے اور وہاں ابونصر منصور بن علی عراق جیسے ریاضی

---

۱ ۔ رجال السند و الہند ، صفحہ ۲۲۳ نیز البیرونی (سید حسن برنی) ، صفحہ ۳۰ ۔

۲ ۔ معجم الادباء (وزارۃ معارف مصر) سترھویں جلد ، صفحہ ۱۸۰ ۔

۳ ۔ کتاب الانساب (گب میموریل ایڈیشن) ، صفحہ ۹۸ ۔

۴ ۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ، جلد اول ، صفحہ ۱۲۳۶ ۔

۵ ۔ فرشتہ (اردو) ، صفحہ ۱۸۲ ۔

۶ ۔ ایلیٹ اینڈ ڈوسن (کتاب محل لاہور) ، جلد دوم ، حاشیہ صفحہ اول ۔

داں سے علم حاصل کیا اور یہیں اپنے وطن ہی سے اس نے بوعلی سینا کے ساتھ خط و کتابت کی۔ بوعلی سینا اس وقت بخارا میں تھا۔ پھر وہ منصور دوم بن نوح سے ملنے بخارا گیا۔ یہ ۹۹۷ء - ۹۹۸ء/۳۸۷ھ - ۳۸۸ھ کا واقعہ ہے اور ذکر کیا ہے کہ منصور اس کا اوّلین مربّی تھا۔ پھر وہ جرجان گیا جو بحیرۂ خضر کے جنوب مشرق میں ہے۔ وہ شمس المعالی ابوالحسن قابوس بن وشمگیر کا دور تھا۔ وہاں سے نکل کر اس نے طہران کی سیر و سیاحت کی۔ اپنی پہلی کتاب جو تقویم ریاضی اور فلکیات کے بارے میں تھی قابوس ہی کے دربار میں لکھی تھی اور اسی کے نام سے مُعنوَن کی تھی۔ یہ تقریباً ۱۰۰۰ء/۳۹۰ھ کی بات ہے۔

البیرونی گفتگو فارسی میں کرتا تھا مگر علمی کتب عربی میں لکھتا تھا، اس لیے کہ اس دور میں عربی ہی مسلمانوں کی مشترک علمی زبان تھی۔ 'انسائیکلو پیڈیا آف اسلام' سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عمر کے آخری حصے میں عربی کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی کہنے لگ گیا تھا[1]۔ ۱۰۰۸ء/۳۹۹ھ سے قبل وہ واپس خوارزم میں پہنچ چکا تھا اور وہاں کے شہزادہ ابوالحسن علی بن مامون نے اس کا شاندار استقبال کیا تھا۔ اس نے شہزادے کے بھائی کی ملازمت میں سات برس بسر کئے۔ اس کا نام خوارزم شاہ ابوالعباس مامون بن مامون تھا۔ سیاسی مشورت و رسالت اس کے ذمّے تھی اس لیے کہ اس کی زبان میں اثر تھا اور وہ جانتا تھا کہ سیاسی کام کس لب و لہجہ سے لیے جا سکتے ہیں۔

جیسا کہ قبل ازیں بیان ہوا ابوالعباس خوارزم شاہ کے قتل پر محمود نے خوارزم پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور بعض دوسرے علماء سمیت البیرونی بھی اس کے ہاتھ لگ گیا۔ یہ[2] ۱۰۰۸ء/۴۰۷ھ کی بات ہے۔ مسیحی طبیب ابوسہل عیسیٰ بن یحییٰ الجرجانی بھی ساتھ تھا۔ البیرونی کو غزنہ میں اس کا تعاون حاصل رہا۔ یہاں تک کہ اس کی تحریریں بھی البیرونی کے نام سے شہرت پاتی تھیں۔ ازاں بعد البیرونی غزنی ہی کے دربار سے منسلک رہا۔ ممکن ہے وہاں اس کا منصبِ شاہی نجومی ہو[3]۔ ہندی یلغاروں میں وہ محمود کے ساتھ رہا۔ تاریخ 'مالِلہند' ۱۰۳۰ء/۴۲۱ھ میں ختم ہوئی۔ یعنی محمود کی وفات کے تھوڑے ہی عرصے بعد۔ اس نے اور بھی بہت سی کتب تصنیف کیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔ اس کی وفات عام طور پر ۱۰۴۸ء/۴۴۰ھ میں بتائی جاتی ہے۔ مگر الغضنفر التبریزی کا خیال ہے کہ اس کی وفات ۱۰۵۰ء/۴۴۲ھ کے بعد ہونی چاہیے۔ البیرونی کے دور میں مختلف

---

۱ - انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، صفحہ ۱۲۲۶ -

۲ - ایضاً -

۳ - دیکھئے چہار مقالہ (قزوینی ایڈیشن) مقالہ متعلقہ بہ نجوم -

علاقوں کی حکومتوں کے سربراہ اہلِ علم و فضل کے قدردان تھے، چنانچہ البیرونی کے اپنے ہم وطن آل عراق نے اس کی پرورش کی تھی - یہی باعث ہے کہ جب مامون بن محمد والیِ جرجانیہ نے آلِ عراق کے آخری امیر ابوعبداللہ کو قتل کر کے آلِ عراق کی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا تو البیرونی کو بڑا ہی دکھ ہوا - وہ بے سروسامانی کے عالم میں خوارزم کو چھوڑ کر نکل پڑا اور غریب الوطنی کے صدمات سہنے لگا - اسی عالم میں شمس المعالی قابوس بن وشمگیر نے جو جرجان اور طبرستان کا امیر تھا اسے اپنے یہاں مدعو کر لیا - یہ امیر بھی اپنے زمانے کے علم دوست سربراہان حکومت میں سے تھا - وہ خود بھی عالم اور عالی قدر ادیب تھا مگر ساتھ ہی بڑا سختگیر اور جفا کار بھی تھا - البیرونی اس کی فیاضی سے مستفیض ہونے کے باوصف اس سے اجتناب کرتا تھا، جیسا کہ اس کے ذیل کے شعر سے واضح ہوتا ہے:

وَشَمْسُ الْمَعَالِی کَانَ یَرْتَادُ خِدْمَتِی   عَلَی نَفْرَۃ مِنّی وَقَدْ کَانَ قَاسِیًا

ترجمہ: شمس المعالی میری خدمات کا طلبگار تھا، اگرچہ میں اس سے متنفر تھا کیونکہ وہ سنگدل تھا -

یہ احوال اس نے اپنی کتاب 'الآثار الباقیہ' میں خود قلمبند کیے ہیں - یہ کتاب اسی دور میں مرتب ہوئی اور قابوس ہی کے نام سے معنون بھی ہوئی - البیرونی نے جرجانیہ میں ایک رصدخانہ بھی قائم کیا تھا، جہاں وہ مشاہداتِ ہیئت کیا کرتا تھا - چنانچہ 'قانون مسعودی' میں ۱۰۰۹ء/۴۰۰ھ سے لے کر شروع ۱۰۱۶ء/۴۰۷ھ تک کے مشاہدات پائے جاتے ہیں[1] - تاہم چونکہ البیرونی کو قابوس کا مزاج پسند نہ تھا لہذا وہ وہاں ہمیشہ کے لیے ڈیرہ نہ ڈال سکا - دوسری وجہ یہ بھی ہوئی کہ خود اس کے امیرِ وطن یعنی خوارزم نے اسے واپس بلا لیا - مامون بن محمد جس نے آلِ عراق کا خاتمہ کیا تھا، وہ ۹۹۷ء/۳۸۷ھ میں وفات پا گیا اور اس کی جگہ اس کا فرزند علی فرمانروا بنا، وہ بھی اہل علم اور اہلِ کمال کا بے حد قدردان تھا - اس کا وزیر احمد بن محمد السُّہَیْلِی الخوارزمی بھی عالم آدمی تھا[2] - چنانچہ البیرونی واپس خوارزم پہنچ گیا - علی بن مامون کی وفات پر اس کا فرزند ابوالعباس خوارزم شاہ ہوا - وہ بھی البیرونی کی خوش قسمتی سے علم و ہنر اور کمال و فن کا دلدادہ اور سرپرست تھا - لہذا البیرونی کی حوصلہ افزائی جاری رہی اور اس کے جوہر کی تابندگی میں اضافہ

---

۱ - البیرونی (سید حسن برنی، ص ۷۷) -

۲ - معجم الادباء، ج دوم، ص ۱۰۲، ۱۰۳ -

ہوتا رہا ۔ یہ سرزمین اس دور کے علمی ستاروں کے باعث آسمان ہو رہی تھی ۔ البیرونی کے علاوہ بوعلی سینا ، ابونصر عراق (جس کا تعلق خوارزم کے شاہی خاندان آلِ عراق سے تھا) ، ابوالخیر حسن بن سوار ، (جو ابن الخمّار کے نام سے معروف ہے) ابوسہل عیسیٰ بن یحییٰ ، ابومنصور الثعالبی وغیرہ اس دربار کی زینت تھے ۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے ابوالعباس کی فوج کے ایک بااثر حصے نے بغاوت کر کے اسے تہہِ تیغ کر دیا ۔ اس لیے محمود کو خوارزم پر حملہ کرنے کا بہانہ مل گیا اور اس نے سارا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا ۔ اس فتح کے بعد محمود نے وہاں اپنے امیر التونتاش کو حاکم مقرر کر دیا اور اسے خوارزم شاہ کے خطاب سے نوازا[1] ۔ خوارزم سے بے شمار اسیر غزنی بھیجے گئے ۔ ان میں ابوالریحان بھی تھا ۔ 'معجم الادباء' کے مصنف نے لکھا ہے کہ محمود جب البیرونی اور اس کے استاد عبدالصمد الاوّل کو قرمطی ہونے کے باعث قتل کرانے لگا تو اسے بتایا گیا کہ ابوالریحان بہت بڑا ماہرِ نجوم ہے اور ایسے شخص کی اس جیسے بادشاہ کو بڑی ضرورت ہے ۔ اس پر ابوریحان کی جان بخشی کی[2] . . . . مگر یہ بیان قرینِ حقیقت معلوم نہیں ہوتا اس لیے کہ ابو ریحان کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور محمود جیسا علم دوست شخص اس کی شہرت سے بے خبر نہ تھا ۔ صاحبِ 'چہار مقالہ' نے تو بتفصیل یہ لکھا ہے کہ محمود نے خوارزم شاہ سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ فلاں فلاں اہلِ علم کو جو اس کے دربار میں تھے غزنی روانہ کر دے ۔ ان طلب کردہ علماء میں ابوالریحان کا نام بھی تھا ۔ یہ الگ بات ہے کہ ابوالریحان نے وہاں جانا پسند نہ کیا تھا[3] ۔ رہا یہ کہ ابو ریحان شیعی تھا یا نہیں تو علامہ شبلی اسے علانیہ شیعہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محمود اتنا شدید متعصّب نہ تھا ورنہ البیرونی کی قدر و منزلت کیوں کرتا[4] ۔

بہرحال جب البیرونی غزنی پہنچ گیا تو اس کی ترقی کی راہیں اور کھل گئیں ۔ غزنی ہی کی بدولت اسے ہندوستانی علوم سے آگاہی ہوئی ۔ غزنی ہی کی بدولت اس نے سنسکرت پر عبور حاصل کیا اور ہندوستان اور ہندوستانی اقوام کے مذاہب اور عقائد پر 'ماللهند' جیسی مبسوط و مفصل کتاب رقم کی جو ہندو قوم کے ذہنی پس منظر اور اس کے مزاج کو سمجھنے کے معاملے میں نہایت مفید مآخذ ہے ۔ یہ کتاب 'کتاب الہند' کے نام سے مشہور ہے ۔

---

۱ ۔ تاریخ فرشتہ (اردو) ، ص ۱۲۵ ۔

۲ ۔ معجم الادباء (سترھویں جلد) ، ص ۱۸۶ ، (وزارت معارف مصر) ۔

۳ ۔ چہار مقالہ (قزوینی ایڈیشن) ، ۱۱۸ ، ۱۱۹ ۔

۴ ۔ شعر العجم ، حصہ اول (اعظم گڑھ ایڈیشن) ، ص ۹۷ ۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ ابوالریحان نے 'آثار الباقیہ' میں بارہا اپنے وطن خوارزم کی تباہی کو بڑے کرب کے ساتھ بیان کیا ہے ، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ محمود کو پسند نہ کرتا تھا ۔ محمود کی علم دوستی کا اس نے اعتراف کیا ہے اور خود اس کی ذات پر محمود کے جو احسانات تھے ان کو بھی یاد کیا ہے ۔ مثلاً وہ کہتا ہے :

وَلَمْ یَنْقَبِضْ مَحْمُودُ عَنِّیْ بِنِعْمَةٍ   وَأَغْنَیَ وَأَقْنَیَ مُغْضِیاً عَنْ مَکَاسِیَا

عَفَی عَنْ جِهَالَاتِیْ وَأَبْدَیَ تَکَرُّماً   وَطَرَّیَ بِجَاهٍ رَوْنَقِیْ وَلِبَاسِیَا !

ترجمہ :

۱ ۔ محمود نے خوشدلی سے مجھ کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا ۔ مجھ کو مالا مال کر دیا اور میرے سخت تقاضوں سے چشم پوشی کی ۔

۲ ۔ اس نے میری نادانیوں کو معاف کیا ، میری عزت افزائی کی اور اس کی جاہ سے میری رونق و لباس تازہ ہوگئے ۔

ڈاکٹر زخاؤ(Sachau) کا یہ کہنا کہ البیرونی کے قلم سے محمود کی تعریف نہیں نکلتی ، صحیح نہیں معلوم ہوتا[۱] ۔ اس کی مشہور کتاب 'ماللھند' محمود کی وفات کے بعد ختم ہوئی لہذا وہ مسعود بن محمود کے نام معنون ہوئی ورنہ لازماً محمود کے نام معنون ہوتی ۔ این ۔ این ۔ لا کہتے ہیں کہ البیرونی اور حسن میمندی کے مابین اختلافات تھے لہذا اس نے البیرونی کو محمود کی نظروں میں ابھرنے نہ دیا[۲] ۔ حالانکہ صاحب 'چہار مقالہ' کے بقول احمد بن حسن میمندی نے اسے محمود کی قید سے رہائی دلوائی تھی[۳] ، تاہم یہ امر بحث طلب ہے کہ آیا واقعی محمود نے البیرونی کو قیدخانے میں ڈال دیا تھا یا نظامی عروضی نے محمد حسین آزاد کی طرح محض کہانی کو دلچسپ بنایا ہے . . . بہرحال یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ ہندوستان میں کتنا عرصہ رہا ۔ کتاب 'ماللھند' کے مطالعے سے اتنا ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ وہ محمود کی وفات کے وقت تک تقریباً سارا عرصہ ہندوستان ہی میں رہا ۔ اگر درمیان میں غزنی گیا بھی تو وہاں زیادہ عرصہ نہیں ٹھہرا ۔ البیرونی محمود کی وفات سے کوئی چودہ برس قبل خوارزم سے غزنی لایا گیا تھا ۔

---

۱ ۔ البیرونی ، جلد دوم (انگریزی) دیباچہ ۔

۲ ۔ عہد اسلامی میں علمی ترقی (اردو ترجمہ) ، ص ۳۵ ۔

۳ ۔ چہار مقالہ (قزوینی ایڈیشن) ، ص ۹۳ ۔

لاہور کو ۱۰۲۰ء/۱۱ ۴ھ میں غزنی کی سلطنت کا حصہ بنا لیا گیا تھا ۔ ملتان اس سے کوئی دس برس قبل مفتوح اور ملحق ہو چکا تھا ۔ محمود کی وفات ۱۰۳۱ء/۴۲۱ھ میں ہوئی تھی ۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد تخت نشین ہوا مگر چند ہی ماہ بعد اسے مسعود کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا اور قیدخانے کی رونق بنا۔ سلطان مسعود اپنے باپ سے زیادہ علم دوست لیکن باپ سے کم دانشمند تھا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی بہادری اور جگرداری اس کے کام نہ آئی اور ملکی سیاست کی چولیں ڈھیلی ہو گئیں ۔ اس نے سلجوقیوں سے ۱۰۳۹ء/۴۳۱ھ میں دندانقان کے مقام پر شکست فاش کھائی[1] اور خراسان پر سلجوق قابض ہو گئے ۔

محمود اور مسعود کی حکومت کے سارے عرصے میں ہم البیرونی کو کسی سیاسی منصب پر فائز نہیں پاتے ۔ نہ وہ مشیر تھا ، نہ وزیر ، نہ سفیر ۔ اس کی سیاسی بصیرت اور مدبّرانہ اہلیت سے نہ محمود نے کوئی استفادہ کیا اور نہ مسعود نے ۔ ان حکمرانوں کے دور میں وہ محض علمی و تحقیقی مشاغل میں مصروف رہا ۔ مسعود کے زمانے میں البیرونی نے 'القانون المسعودی' مکمل کی ۔ اس کار نمایاں کے انعام میں مسعود نے اسے ہاتھی کے ہم وزن روپے ادا کیے ۔ اس کتاب کے بارے میں 'معجم الادباء' کے مصنف نے لکھا ہے کہ 'قانون المسعودی' ایسی کتاب ہے جس نے ان تمام کتابوں کا جو تنجیم اور حساب پر لکھی گئی ہیں ، نام و نشان مٹا دیا[2] ۔

مسعود کے بعد اس کا بھائی محمد جسے اندھا کر دیا گیا تھا تخت پر بیٹھا مگر اس کی حکومت بے اقتدار تھی ۔ بد نظمی کا دور دورہ رہا ۔ بمشکل ایک سال حکومت کر پایا تھا کہ مودود بن مسعود نے اسے شکست دی اور غزنی پر قبضہ کر لیا ۔ اس نے تقریباً نو سال حکومت کی ۔ یہ گویا آخری بادشاہ تھا جس سے البیرونی کو واسطہ پڑا ۔ البیرونی کی مشہور کتاب 'الجماہر فی الجواہر' اور 'الدستور' اسی دور میں رقم ہوئیں ۔ اوّل الذکر علم جواہرات کے بارے میں ہے اور ثانی الذکر اخلاقِ عالیہ سے متعلق ۔

البیرونی کی زندگی کا عالم اب آفتاب سرِ کوہ کا سا تھا ۔ اسے احساسِ ضعف ہونا شروع ہو گیا تھا ۔ مگر اس کے علمی شغف میں کوئی فرق نہ پڑا ۔ یہاں ایک خط نقل کیا جاتا ہے جو سید حسن برنی نے اپنی کتاب 'البیرونی' میں شامل کیا ہے مگر حوالہ سند نہیں دیا ۔ بہر حال البیرونی کی عمر کے آخری حصے کو سمجھنے میں یہ خط بڑی مدد دیتا ہے ۔ لہٰذا اس کو یہاں درج کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا :

---

۱ ۔ اخبار الدولۃ السلجوقیہ ، ص ۱۲ ، و زین الاخبار ، ص ۲۰۳ ۔
۲ ۔ البیرونی (طبع دوم) سید حسین برنی ، ۹۶ ۔

"اب میری عمر قمری حساب سے ۶۵ اور شمسی حساب سے ۶۳ سال کی ہے ۔ تعجب نہیں اگر میرے خواب کی تعبیر سچی ہو ۔ اگرچہ میری حرص اس کی تصدیق کی متمنی نہیں . . . . اور خواب کی تعبیر کا جو ذکر کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کتنا ہی عقلمند کیوں نہ ہو اپنی محنت اور مصیبت کے زمانے میں بھی خوشی کا امیدوار ہوتا ہے ۔ مژدوں سے اسے راحت ملتی ہے ۔ ناگواریوں اور بدفالیوں سے کبیدہ خاطر ہوتا ہے اور فال اور احکام کی طرف مائل ہو جاتا ہے . . . . میں بھی بشریت کی وجہ سے ایسے اوقات میں نجومیوں سے خواہش کرتا تھا کہ میری پیدائش کے بعد کے واقعات پر غور کریں ۔ وہ نہایت اختلاف کے ساتھ میری عمر نکالتے تھے ۔ بعض سولہ سال ، بعض چالیس سے اوپر ۔ حالانکہ میں پچاس برس سے متجاوز ہو چکا تھا ۔ بعض ساٹھ سے کچھ زیادہ بتاتے تھے ۔

جب میری عمر اس کے لگ بھگ پہنچی تو مہلک بیماریوں نے چاروں طرف سے آن دبایا ۔ بعض ایک ہی وقت میں پیدا ہوئیں اور بعض یکے بعد دیگرے . . . . نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے ہڈیوں کو پارہ پارہ کر دیا ، حرکت تک سے معذور اور حواس باختہ کر دیا ۔ باوجود اس کے کہ بڑھاپے سے قوٰی ماؤف ہو چکے تھے میں نے طبیعت کو درست کرنے کی کوشش کی ۔

جب میری عمر اکسٹھویں برس میں پہنچی تو ایک رات کا ذکر ہے کہ میں نے یہ خواب دیکھا کہ میں ہلال کے نکلنے اور چاند کے غروب ہونے کے مواقع پر غور کر رہا ہوں ۔ لیکن وہ مجھے نظر نہیں آتے ۔ اسی حالت میں مجھ سے کسی کہنے والے نے یہ کہا کہ اس خیال سے باز آ ، تو ایک سو نو مرتبہ اس کا بیٹا ہے ۔ اس کے بعد جب میں جاگا ۱۵ سال دس ماہ قمری کو شمسی سال و ماہ میں منتقل کیا اور ساڑھے پانچ ماہ گھٹا دئیے اور سب عطارد کے سالوں کے قریب ہوئے جس کا کہ نجومیوں نے ذکر کیا ہے ، کہ پیدائش کے قریب اس کا غلبہ ہوتا ہے ۔ باوجود اس کے مجھے کچھ خوشی نہ ہوئی اس لیے کہ عمر بسر ہو چکی تھی اور اس میں صرف ایک کام کرنے کے لیے تھوڑا سا حصہ رہ گیا تھا ۔ وہ کام ان کتابوں کا مکمل کرنا ہے جو ناقص حالت میں موجود ہیں اور ان مسوّدوں کو صاف کرنا

ہے جو ابھی تک ناصاف پڑے ہیں ۔ مثلاً 'قانون مسعودی' وغیرہ اور ان
کتب ہند کو حوالۂ قلم کرنا جن کا ترجمہ پیشِ نظر ہے ۔
اس کے لیے خدا کی مدد ، فکر کے منتشر کرنے والی چیزوں سے امن ،
درازی عمر ، تاخر اجل ، سلامت حواس اور عمر کے موافق صحت بدن کے
سوا کوئی چیز معیّن نہیں ہے"[1] ۔

یہ خط بتا رہا ہے کہ البیرونی کو موت کی منزل قریب دکھائی دے رہی ہے ۔ اسے احساس ہونے لگا ہے اور زیادتِ حیات کا طالب ہے تاکہ کچھ علمی کام جو نامکمل ہیں مکمل کر لے ۔ ایک صاحبِ قلم درویش منش آدمی کی یہی فتوحات ہیں کہ وہ علم کے ضمن میں ہل من مزید پکارتا رہے ۔ بہرحال آخر وہ دن آیا کہ البیرونی کا طائرِ زیست قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا ۔ یہ ۱۰۴۸ء/۴۴۰ھ رجب کا واقعہ ہے[2] ۔ قمری سال کے حساب سے تقریباً ۸۰ سال عمر ہوئی ۔

البیرونی لغوی معنوں میں تادمِ آخر علم کی روشنی کا طالب رہا ۔ اس امر کی تصدیق اس بیان سے ہوتی ہے جو یاقوت حموی نے ابوالحسن علی بن عیسٰی الوّالجی کے حوالے سے نقل کیا ہے ۔ وہ بیان یوں ہے "میں ابوالریحان سے ملنے گیا اور وہ نزع کے عالم میں تھا ۔ آواز خرخرا رہی تھی ۔ سینہ تنگ ہو رہا تھا ۔ مجھ سے کہنے لگا کہ "تم نے مجھ سے ایک روز سوتیلی دادیوں کے حصۂ وراثت کے بارے میں کیا بات کی تھی ؟" مجھے اس پر ترس آ گیا اور میں نے کہا کہ اس عالم میں یہ سوال ؟ بولا "بھلے آدمی اگر میں اس مسئلے سے آگاہ ہونے کے عالم میں دنیا کو خیر باد کہوں تو بہتر ہے یا یہ بہتر ہے کہ اس مسئلے سے ناواقف رخصت ہو جاؤں ؟" چنانچہ میں (ابو الحسن) نے (سوتیلی دادیوں کا حصہ) حساب سے گنوا دیا ۔ اس نے حفظ کیا اور جو کچھ مجھے پڑھانے کا وعدہ کیا تھا وہ پڑھا دیا ۔ ازاں بعد میں وہاں سے چل دیا[3] ۔

وہ عنفوانِ شباب تک غربت ہی میں رہا ۔ آلِ عراق کے یہاں پذیرائی ہوئی تو ذرا سنبھلا مگر انہیں مامونیوں نے تباہ کر دیا اور البیرونی از سرِ نو تنگ حال ہو گیا ۔ جب وہ اس عالم میں تھا تو اسے ایک نجومی سے جو خوارزم کے اونچے منجموں میں شمار کیا جاتا تھا ، واسطہ پڑا ۔ اس نجومی نے البیرونی کو غریب اور قلاش جان کے اس کے سوالوں کا بدتمیزی سے جواب دیا ۔ حالانکہ اس کا درجہ فی الحقیقت نجوم میں

---

۱ ۔ البیرونی (سید حسن برنی) ، ص ۱۰۱ ، ۱۰۲ ، ۱۰۳ ۔
۲ ۔ معجم الادباء (سترھویں جلد) ، ص ۱۸۶ ۔
۳ ۔ معجم الادباء (جلد ۱۷) ، ص ۱۸۲ ۔

کوئی ایسا بلند نہ تھا ۔ البیرونی کا اپنا مقام اس سے بلند تر تھا ۔ البیرونی کہتا ہے کہ ''ہمارے مابین جو فرق تھا وہ فقر و غنا کا تھا ۔ فقر کمالات کو نقائص میں بدل دیتا ہے ۔ پھر جب میرے احوال میں خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی تو وہ نجومی مجھ سے دوستانہ انداز میں ملاقات کرنے لگا[1]'' ۔

مگر یہ غریب خاندان کا فرد جس پر عالی خاندان نہ ہونے کے طعن توڑے جاتے تھے اپنی ذاتی قابلیت کی بنا پر ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا رہا ۔ قابوس بن وشمگیر نے اسے جرجانیہ میں خود اپنے محل میں ٹھہرایا[2] . . . . خوارزم شاہ خود اس کے ملنے کو آیا، سوار تھا اور کچھ پی رہا تھا ۔ کسی کو اشارہ کیا کہ البیرونی کو اس کے کمرے سے باہر بلا لائے ۔ البیرونی کو ذرا دیر ہوگئی ۔ بادشاہ کو غلط فہمی ہوئی (کہ شاید البیرونی کو میرا یوں بلانا ناگوار گزرا ہے) لہذا اس نے سواری آگے بڑھائی اور کمرے کے قریب پہنچ کر اترنے لگا کہ سامنے سے البیرونی آ گیا اور خدا کا واسطہ دیا کہ اتریں نہیں ۔ بادشاہ نے حسبِ حال بطورِ مثال ذیل کا شعر پڑھا ۔

اَلْعِلْمُ مِنْ أَشْرَفِ الْوِلَايَاتِ   يَأْتِيهِ كُلُّ الْوَرَىٰ وَلَا يَأْتِي

ترجمہ : علم معزز ترین ملک ہے ۔ سارا جہان چل کر اس کے ہاں آتا ہے لیکن وہ کسی کے ہاں نہیں جاتا ۔

یاقوت کے بقول البیرونی خوش خلق اور ملنسار شخص تھا ۔ وہ خوش کلام اور خوش کردار بھی تھا ۔ اس جیسا صاحبِ علم و فہم پیدا نہیں ہوا[3] ۔ مزاج کے استغنا اور درویشی کا عالم یہ تھا کہ سلطان مسعود بن محمود نے 'القانون المسعودی' کی تکمیل پر پیل وار (ہاتھی کے ہموزن) روپہلی سکے انعام میں دیے ۔ مگر اس نے یہ کہہ کر وہ رقم خزانے میں واپس کر دی کہ یہ میرے کس کام[4] ۔

جو شخص تحصیل و تعلّم کا اس قدر دلدادہ رہا ہو اور جسے ذہانت وافر ملی ہو اور ذوق فراواں ، نیز یہ کہ جو دنیوی الجھیڑوں سے حتی المقدور لاتعلق رہا ہو ، مزاج میں لالچ اور ہوس کا مادہ بھی نہ پایا گیا ہو ، ساتھ یہ کہ اسے بار بار بہتر سے بہتر مربیانِ علم اور

---

۱ ۔ آثار الباقیہ ، ص ۲۳۸ ۔
۲ ۔ معجم الادباء، ص ۱۸۰ ۔
۳ ۔ ایضاً ، ص ۱۸۶ ۔
۴ ۔ ایضاً ، ص ۱۸۱ ۔

قدر شناسانِ فضل ملتے رہے ہوں اور پھر اللہ نے عمر بھی تقریباً اسی برس عطا کر دی ہو تو اس سے بھی توقع کی جا سکتی ہے کہ اس نے بہت کچھ لکھا ہوگا۔

البیرونی نے اپنے رسالہ 'الرسالۃ فی فہرست کتب' بنام محمد بن زکریا رازی میں اپنی کتابوں کی تعداد جو خود بتاتی ہے وہ ایک سو تین (۱۰۳) ہے . . . . اس فہرست کے بعد بھی جو کتب لکھی جاتی رہیں اگر ان سب کو حساب میں رکھا جائے تو تعداد تقریباً ایک سو اسی (۱۸۰) ٹھہرتی ہے[1] اور ظاہر ہے کہ یہ کتب محض خیالی قصوں پر مبنی مجلدات نہ تھیں . . . . اور نہ یہ کسی ایک خاص علم کے بارے میں تھیں۔ البیرونی کی دلچسپیاں گوناں گوں تھیں اور حیرت ہوتی ہے کہ کوئی اتنے مختلف النوع علوم سے بیک وقت اور اس قدر شغف کس طرح رکھ سکتا ہے۔ صاحبِ 'نزہۃ الخواطر' نے جلد اول کے صفحہ ۸۸، ۸۹ اور ۹۰ پر البیرونی کی بعض کتب کا نام درج کیا ہے۔ یہ اندراج 'معجم الادباء' کے حوالے سے ہے۔ مگر سید حسن برنی نے وہ سارا رسالہ درج کر دیا ہے جو البیرونی نے محمد بن زکریا رازی کو مشتمل برفہرست کتب خود نوشت ارسال کیا تھا[2]۔

۱۔ زیج خوارزمی کے علل کے متعلق۔ اس میں بہت سے مفید مسئلے اور محکم جوابات درج کیے گئے ہیں۔

۲۔ 'ابطال البہتان براد البرہان علی علل الخوارزمی'۔ ابو طلحہ طبیب نے کتاب نمبر ایک کے متعلق کچھ ایسے مسائل اٹھائے جن کا اس کتاب میں جواب دیا گیا ہے۔

۳۔ اسی موضوع پر البیرونی کو الحسن الاھوازی کی کتاب ملی۔ جس میں خوارزمی کی حق تلفی ہوئی تھی۔ بیرونی نے ایک کتاب لکھ کر اس نزاع کا عادلانہ فیصلہ کیا۔

۴۔ 'تکمیل زیج حبش بالعلل و تہذیب اعماله من زلل' مشہور منجم احمد بن عبداللہ حبش کی بنائی ہوئی زیج پر علل کا اضافہ کیا اور زیج مذکور میں جو غلطیاں تھیں ان کی تصحیح کی۔

۵۔ 'جوامع الموجود لخواطر الهنود فی حساب التنجیم'۔ اس کتاب میں البیرونی نے اہل ہند کے علم نجوم کی بابت نہایت مکمل تحقیقات درج کی تھیں اور سند ہند (سدھانت) پر مجتہدانہ تبصرہ لکھا ہے۔

۱۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (جلد اول) ۱۲۳۶ء۔

۲۔ البیرونی طبع دوم، ص ۱۱۰ تا ۱۳۸۔

۶ - 'کتاب مقالید علم الهیئة ما یحدث فی بسیط الکرة'۔ البیرونی نے اس کتاب کو اصفہبد جیلجیلان مرزبان بن رستم کے لیے لکھا تھا ۔

۷ - 'تہذیب فصول الفرغانی'۔ ابوالحسن مسافر کے لیے کتاب حصول الفرغانی کے متعلق جو علمِ ہیئت پر تھی البیرونی نے یہ کتاب لکھی ۔

۸ - 'أفراد المقال فی أمر الظلال' ۔ علم مساحت میں ظل نامی خطوط مستقیم کی پیائش وغیرہ کے متعلق جتنے امور ہیں ، ان سب کا مفصّل اور مکمل تذکرہ اس کتاب میں کیا گیا ہے ، یہ کتاب ابوالحسن مسافر کے لیے لکھی گئی ۔

۹ - 'استعمال دوائرالسموات لاستخراج مراکز البیوت'۔ اس رسالے میں ستاروں کے خانوں کے مرکز نکالنے کے لیے دوائر سموات کے استعمال پر بحث کی گئی ہے یہ کتاب بھی ابوالحسن مسافر کے واسطے لکھی گئی تھی ۔

۱۰ - 'تحدید نہایات الاماکن لتصحیح مسافات المساکن'۔ موقعوں کی حد بندی اور شہروں کے فاصلوں کی تصحیح کے بارے میں ہے ۔

۱۱ - 'تہذیب الاقوال فی تصحیح العروض والاطوال . . .' عرض بلد اور طول بلد کی درستی کے متعلق ۔

۱۲ - 'کعاب' (جمع کعب) اور کعب کے علاوہ حساب کے دوسرے قاعدوں کا نکالنا ۔

۱۳ - 'تجرید الشعاعات و الانوار عن الفضائح المدوّنة فی الاسفار'۔ شعاؤں اور روشنیوں کی بحث کے متعلق جو خرابیاں کتابوں میں جمع ہوگئی تھیں ۔

۱۴ - عبدالملک طبیب بستی نے مبدأ و منتہائے عالم کے متعلق جو حکایات لکھی تھیں ان کی تکمیل ۔ اس کتاب میں البیرونی نے اپنی ذاتی معلومات سے مسئلہ آغاز و انجام عالم کے متعلق مختلف قوموں کے عقائد بیان کیے ہیں ۔

۱۵ - کتاب منازل قمر ۔

۱۶ - ابوحفص عمر بن الفرخان کے نوادر و عجائبات کے متعلق تحقیق و تفحص ۔

۱۷ - 'کتاب فی تحقیق ما للهند من مقالة مقبولة او مرذولة' (معروف بنام کتاب الہند) ہندوستانیوں کے علوم و فنون ، فلسفہ و فکر ، رسوم و رواج ، عقائد و توہمات پر انسائیکلوپیڈیا ۔

۱۸ - قانون مسعودی نجوم کی معرکة الآرا کتاب 'الآثار الباقیة عن قرون الخالیة' یعنی قدیم

قوموں کے نظریات و عقائد بالخصوص ان کے میلے ، ان کی عیدیں - تیوہار وغیرہ ہندوؤں کے ضمن میں تفصیل زیادہ ہے -

۲۰ - 'کتاب الارقام' -

۲۱ - 'کتاب فی الاخبار القرامطة و المبیّضة' . . . . یہ فرقہ ہائے قرامطہ و مبیّضہ کی تاریخ ہے -

۲۲ - 'کتاب عجائب الطبقة و غرائب الصناعیّة' -

۲۳ - 'ارشاد فی احکام النجوم' -

۲۴ - ' استیعاب فی تسطیح الکرة' -

۲۵ - 'الجماہر فی الجواہر' -

۲۶ - 'تعلیل باحالة الوہم فی معانی النظم' -

۲۷ - 'شرح أبی تمام' -

۲۸ - 'زیج العلائی' -

۲۹ - 'کتاب الصیدلہ' -

۳۰ - 'مختار الاشعار و الآثار' -

۳۱ - 'خلاصة مجسطی' -

۳۲ - 'کتاب التاریخ ایام السلطان محمود و اخبار أبیه' -

۳۳ - 'کتاب المسامرة فی اخبار خوارزم وغیرہ' -

سعید حسین برنی لکھتے ہیں کہ البیرونی کی تحریر کردہ (۱۸۰) کتب میں سے جو باقی رہ گئی ہیں وہ اصل تعداد کا بمشکل دس فیصد بنتی ہیں - ان میں 'کتاب الہند' اور 'آثار الباقیہ' کو ڈاکٹر زخاؤ نے انگریزی اور جرمن میں ترجمہ کرکے بڑے اہتمام سے شائع کر دیا ہے -

عربی زبان کا شاید ہی کوئی عالم ایسا ہو جس نے شعر قلمبند نہ کیے ہوں - خواہ اس کی علمی سرگرمیوں کے اصل شعبے کو شعر سے دور کا بھی تعلق نہ ہو - یہی عالم البیرونی کا تھا - اس کا اصل شعبہ اور دائرہ تحقیق و تصنیف ریاضی ، نجوم ، منطق ، ہیئت اور حکمت تھا - مگر اس کے باوصف شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا - اس نے ابو تمام کے کلام کی شرح لکھی جس کا ذکر یاقوت نے 'معجم الادباء' میں کیا ہے - اس کا بیان ہے کہ میں نے یہ کتاب خود البیرونی کے خط میں دیکھی ہے ، جسے البیرونی نے مکمل نہیں کیا - اسی طرح البیرونی کی ایک کتاب اور تھی جس کا نام 'مختار الاشعار

و الاثار' تھا[1] . . . . ظاہر ہے کہ اسے شعر و شاعری کے مطالعے کا شوق تھا . . . . اس کے اپنے اشعار عام اکابر کی طرح ہی کے تھے یعنی کوئی ایسے بلند نہ تھے ۔ البتہ بقول حموی اپنے جیسوں سے بہرحال اچھے تھے[2] ۔ ذیل میں البیرونی کے وہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں جو معجم الادباء میں شامل ہیں ۔ پہلی نظم میں ''صحبت ملوک'' کا تذکرہ ہے اور ابو الفتح بستی کی مدح ہے : (طویل)

مَضَی أَکْثَرُ الْأَیَّامِ فی ظِلِّ نِعمَةٍ ‏ عَلیٰ رُتَبٍ فیهَا عَلَوْتُ کَرَاسِیَا

فَآلُ عِرَاقٍ قَدْ غَذَوْنِی بِدَرِّهِم ! ‏ وَ مَنْصُورٌ مِنْهُمْ قَدْ تَوَلَّیٰ غِرَاسِیَا

وَ شَمْسُ الْمَعَالِی کَانَ یَرْتَادُ خِدْمَتِی ! ‏ عَلیٰ نَفْرَةٍ مِنّی وَ قَدْ کَانَ قَاسِیَا

وَ أَوْلَادُ مَأْمُونَ وَ مِنْهُمْ عَلِیُّهُمْ ‏ تَبَدّیٰ بِصُنْعٍ صَارَ لِلْحَالِ آسِیَا

وَ آخِرُهُمْ مَأْمُونُ رَفَّهَ حَالَتِی ‏ وَ نَوَّهَ بِاسْمِی ثُمَّ رَأَّسَ رَاسِیَا !

وَ لَمْ یَنْقَبِضْ مَحْمُودُ عَنّی بِنِعْمَةٍ ‏ فَأَغْنیٰ وَأَقْنیٰ مُغْضِیًا عَنْ مَکَاسِیَا

عَفَا عَنْ جَهَالَاتِی وَ أَبْدیٰ تَکَرُّمًا ‏ وَ طَرّیٰ بِجَاهٍ رَوْنَقِی وَ لِبَاسِیَا !

عَفَاءٌ عَلیٰ دُنْیَایَ بَعْدَ فِرَاقِهِمْ ! ‏ و واحزنی ان لَمْ أَزُرْ قَبْلُ آسِیَا

وَ خُلِّفْتُ فی غَزْنِینَ لَحْمًا کَمُضْغَةٍ ‏ عَلیٰ وَضَمٍ لِلطَّیْرِ لِلْعِلْمِ نَاسِیًا !

فَأُبْدِلْتُ أَقْوَامًا وَّ لَیْسُوا کَمِثْلِهِمْ ‏ معاذَ إِلٰهِی أَنْ یَکُونُوا سَوَاسِیَا

بِجَهْدٍ شَأَوْتُ الْجَاهِلِیْنَ أَئِمَّةً ‏ فَمَا اقْتَبَسُوا فی الْعِلْمِ مِثْلَ اقْتِبَاسِیَا

---

۱ ۔ معجم الادباء (سترھویں جلد) ، ص ۱۸۵ ۔

۲ ۔ ایضاً ، ص ۱۸۶ ۔

فما برکوا للبحث عند معالم ولا احتبسوا فی عقدة کاحتباسیا

فسائل بمقداری هنوداً بمشرق وبالغرب من قد قاس قدر عماسیا

فلم یثنهم عن شکر جهدی تقاسة بل اعترفوا طراً و عافوا انتکاسیا

أبوالفتح فی دنیای مالك ربقتی فهات بذکراه الحمیدة کاسیا !

فلقد زال للدنیا و للدین عامرا !

فلقد زال فیها للغواة مواسیا

ترجمہ :

۱ - میں نے اپنی زندگی کے بیشتر اوقات اس کے اقبال کے سائے میں بسر کر دیے اور بلند مناصب پر فائز ہوتا رہا ۔

۲ - آل عراق نے اپنے دودھ سے میری پرورش کی اور ان کے مقصود نے مجھ کو پروان چڑھایا ۔

۳ - شمس المعالی میری خدمت کا طالب تھا حالانکہ اس کی سنگدلی کی وجہ سے میں اس سے نفرت کرتا تھا ۔

۴ - اور اولاد مامون میں سے علی نے میری ہر طرح غم خواری و دستگیری کی ۔

۵ - اس خاندان کے آخری فرد مامون نے مجھ کو خوشحال بنا دیا ، مجھ کو مشہور کیا اور سرفراز کیا ۔

۶ - محمود نے کسی نعمت کے عطا کرنے میں مجھ سے بخل نہیں کیا ۔ مجھ کو مالا مال کر دیا اور کافی دیا اور میرے سخت تقاضوں سے چشم پوشی کی ۔

۷ - میری نادانیوں سے درگزر کیا اور میری عزت افزائی کی اور اس کے چاہ سے میری رونق و لباس تازہ ہو گئے ۔

۸ - ان کے فراق کے بعد میری دنیا اندھیر ہو گئی ۔ ہائے افسوس اگر میں انہیں اپنے کوچ سے قبل نہ دیکھ لوں ۔

۹ - میں غزنی میں پارۂ گوشت کی طرح چھوڑ دیا گیا ہوں ، اُن لوگوں کے لیے جو علم کو بھولے ہوئے ہیں جس طرح پرندے کے لیے قصائی تختے پر گوشت رکھ چھوڑتا ہے -

۱۰ - ان کی جگہ مجھ کو ایسی قوم سے پالا پڑا ہے جو اُن کے نہیں بنے اور خدا نہ کرے کہ وہ اُن کے ہم مرتبہ ہو -

۱۱ - میں کوشش میں آئمہ جالبین (علوم) سے آگے بڑھ گیا اُن لوگوں نے علم میں میری طرح اقتباس نہیں کیا -

۱۲ - وہ بحث کے لیے ایسے علمی موقوں پر نہیں بیٹھے اور نہ وہ میری طرح گتھیوں میں اُلجھ کر رہ گئے -

۱۳ - میری قدر ہندوؤں سے مشرق میں پوچھو اور مغرب میں اُس شخص سے جس نے میرے دشوار کام کا اندازہ کیا ہو -

۱۴ - بلکہ وہ پوری طرح اعتراف کریں گے اور میری ناقدری کو ناپسند کریں گے -

۱۵ - ابوالفتح دین و دنیا میں میرا آقا ہے - اُسی کے محامد سے میری زبان تر رہنی چاہئے

۱۶ - اُس کے اقبال سے دین اور دنیا آباد رہے اور وہ سائلوں سے ہمدردی کرتا رہے -

اب ایک اور نظم ملاحظہ ہو جو البیرونی نے ایک شاعر کی شان میں کہی تھی - اس شاعر نے البیرونی کی مدح فرمائی تھی اور اس کے نسب پر طعن توڑا تھا -

یا شَاعراً جَاءَ نی یحزی عَلَی ٱلادَب ۔۔۔ وَافَی لِیَمْدَحَنی وَالذَّمُّ مِنْ اَدَبِی

وَ ذَاکراً فِی قَوَافی شعْرہ حَسَبِی ۔۔۔ وَلَسْتُ وَاللهِ حَقًّا عَارفاً نَسَبِی

اِذْلَستُ أعْرفُ جِدّی حَقَّ مَعْرفَة ۔۔۔ وَکَیفَ اَعْرفُ جَدّی ؟ اِذْ جَہلْتُ اَبِی!

اِنّی أبُو لَہَبٍ شَیْخٌ بِلا أدبٍ ۔۔۔ نَعَمْ وَ وَالِدَتِی حَمَّالَةَ الحَطَبِ !

اَلْمَدْحُ وَالذَّمُّ عِنْدِى يَا أَبَا حَسَنٍ سِيَّانِ مِثْلُ اسْتِوَاءِ الْجِدِّ واللَّعِبِ
فَاعْفِنِي عَنْهُمَا لَا تَشْتَغِلْ بِهِمَا بِاللهِ لَا تُوقِعَنْ مَفْسَاكَ فِى تَعَبِ

***

وَمَنْ حَامَ حَوْلَ الْمَجْدِ غَيْرَ مُجَاهِدٍ ثَوَى طَاعِمًا لِلْمَكْرُمَاتِ وَكَاسِيًا !

***

وَبَاتَ قَرِيرَ الْعَيْنِ فِى ظِلِّ رَاحَةٍ وَلَكِنَّهُ عَنْ حُلَّةِ الْمَجْدِ عَارِيًا

***

فَلَا يَغْرُرْكَ مِنِّى لِينُ مَسٍّ تَرَاهُ فِى دُرُوسٍ وَاقْتِبَاسِ
فَإِنِّى أَسْرَعُ الثَّقَلَيْنِ طُرًّا ! إِلَى خَوْضِ الرَّدَى فِى وَقْتِ بَأْسِ

***

تَنَغَّصَ بِالتَّبَاعُدِ طِيبُ عَيْشِى فَلَا شَىْءٌ أَمَرُّ مِنَ الْفِرَاقِ
كِتَابُكَ إِذْ هُوَ الْفَرَجُ الْمُرَجَّى ! أَطَبُّ لِمَا أَلَمَّ مِنَ الْفِرَاقِ

***

أَتَأْذَنُونَ لِصَبٍّ فِى زِيَارَتِكُمْ إِنْ كَانَ مَجْلِسُكُمْ خِلْوًا مِنَ النَّاسِ !
فَأَنْتُمُ النَّاسُ لَا أَبْغِى بِكُمْ بَدَلًا وَأَنْتُمُ الرَّأْسُ وَالْإِنْسَانُ بِالرَّاسِ !
وَكَدُّكُمْ لِمَعَالٍ تَنْهَضُونَ بِهَا وَغَيْرُكُمْ طَاعِمٌ مُسْتَرْجِعٌ كَأْسِي !

فَلَيْسَ يَعْرِفُ مِنْ أَيَّامِ عِيشَتِهِ   سِوَى التَّلَهِّي بِأَيْسَرٍ قَامَ أَوْ كَاسِ !

لَدَى الْمَكَايِدِ إِنْ رَاجَتْ مَكَايِدُهُ

يَنْسَى الْإِلٰهَ وَ لَيْسَ اللّٰهُ بِالنَّاسِ !

ترجمہ :

۱ ۔ اے وہ شاعر جو میرے ادب و اخلاق کا مذاق اڑاتا ہوا آیا اس کا ارادہ تھا کہ میری مدح و توصیف کے پردے میں میری برائیاں بیان کرے ۔

۲ ۔ یہ شاعر اپنے اشعار کے قافیوں میں میرے حسب و نسب کا ذکر کرتا ہے حالانکہ بخدا میں اپنے نسب سے اچھی طرح واقف نہیں ہوں ۔

۳ ۔ میں تو اپنے دادا سے بھی واقف نہیں ہوں اور دادا کو کیسے جان سکتا ہوں جب کہ میں اپنے باپ کو بھی نہیں جانتا ۔

۴ ۔ بے شک میں ابولہب اور بے ادب شیخ ہوں اور میری ماں بلاشبہ حمالتہ الحطب ہے ۔

۵ ۔ اے ابا حسن میں مدح اور ذم کو مثل شائستگی اور تمسخر کے برابر سمجھتا ہوں ۔

۶ ۔ لہٰذا تو مجھ کو ان دونوں سے معاف رکھ اور ان میں مشغول نہ ہو ۔ میں تجھ کو خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ اپنی اسفل کو تکلیف میں نہ ڈال ۔

ترجمہ :

۱ ۔ جو کوئی شرف و عزت کا آرزومند ہو لیکن اس کے لیے کوشاں نہ ہو تو وہ صرف کھانے پینے اور پہننے میں عمر عزیز کے اوقات گنوا دیتا ہے ۔

ترجمہ :

۱ ۔ وہ ساری عمر آرام و راحت میں پڑا رہتا ہے لیکن عظمت و بزرگی کے حصول میں ناکام رہتا ہے ۔

ترجمہ :

۱ - میری حس کی نرمی تمھیں دھوکے میں نہ ڈال دے - وہ نرمی جو کہ تم درس اور اقتباس میں دیکھتے ہو -

۲ - میں جنگ کے وقت ہلاکت میں گھسنے میں انسانوں اور جنوں میں تیز ترین شخص ہوں -

ترجمہ :

۱ - تمھارے فراق میں زندگی بے لطف ہے ، فراق سے بڑھ کر کوئی چیز تلخ نہیں -

۲ - تمھارا خط پیغامِ امید ہے اور بیمار کے لیے ہزار جھاڑ پھونک کرنے والوں سے زیادہ شفا بخش ہے -

ترجمہ :

۱ - کیا تم ایک عاشقِ زار کو ملاقات سے سرفراز کر سکتے ہو ، اگر تمھاری مجلس لوگوں سے خالی ہو -

۲ - کیونکہ تم وہ انسان ہو جس کا بدل میں تلاش نہیں کرتا ، تم سر ہو اور انسان سر سے زندہ رہتا ہے -

۳ - تمھاری سعی و کوشش بلند مقامات تک رسائی کے لیے ہے جب کہ دوسرے لوگ کھانے پینے ، پہننے والے اور إنّاللہ پڑھنے والے ہیں -

۴ - ان لوگوں نے عیش پرستی اور شراب نوشی کو زندگی کا ماحصل سمجھ رکھا ہے -

۵ - مکاریوں کے وقت اگر ان کی مکاریاں چل جائیں تو وہ خدا کو بھی دھوکہ دینا چاہتے ہیں حالانکہ خدا دھوکہ نہیں کھاتا -

اس آخری حصے میں عربی کے بعض ان علماء اور فضلا کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو عہدِ غزنوی میں اپنے علم و فضل اور تحقیق و تجسّس کے باعث صاحبِ شہرت اور دارائے قدر و منزلت تھے - ان میں بھی کچھ تو وہ حضرات شامل ہیں جو اُسی سرزمین میں بس رہے اور کچھ وہ ہیں جو تھے یہاں کے مگر کسی اور جگہ جا بسے - ان اہلِ

علم حضرات کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے یہ ذکر نہیں کیا کہ وہ کسی کتاب کے مصنف بھی تھے یا نہیں ۔ تاہم وہ اپنے دور میں حدیث ، تفسیر اور دیگر علوم کے متعلم بھی تھے، معلم بھی اور راوی بھی . . . . اس اعتبار سے وہ عربی زبان کی بالواسطہ خدمت کرتے رہے ۔ مناسب معلوم ہوا کہ ایسے بزرگوں میں سے بھی بعض کا ذکر کر دیا جائے۔

ابو محمد بختیار بن عبداللہ الہندی

یہ ابو محمد الہندی ابو بکر محمد السمعانی کا آزاد کردہ غلام تھا ۔ ابو بکر محمد السمعانی کی پیدائش ۱۰۷۳ء/۴۶۶ھ میں اور وفات ۱۱۱۶ء/۵۱۰ھ میں واقع ہوئی ۔ وہ عبد الکریم السمعانی صاحب 'الانساب' کا والد تھا ۔ اس کی نسبت الہندی مظہر ہے کہ وہ ازروئے اصل برّ صغیر پاک و ہند کا باشندہ تھا ۔

ابو محمد نے حدیث کا علم ابوبکر سے حاصل کیا ۔ پھر ابوبکر اس کو علم حدیث کی مزید تعلیم دلانے کی خاطر اپنے ہمراہ عراق ، حجاز اور شام لے گیا ۔ چنانچہ بغداد میں اس نے جعفر بن احمد بن حسین السرّاج ، محمد بن عبدالسلام الانصاری وغیرہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ۔ ہمدان میں اس نے عبدالرحمٰن بن حمد بن الحسن الدوینی کی شاگردی اختیار کی ، اصفہان میں اس نے محمد بن حدّاد سے درس لیا ۔ عبدالکریم السمعانی نے اس سے بعض احادیث سنی تھیں ۔ اس کی وفات ۱۱۴۹ء میں مطابق ماہ صفر ۵۴۴ھ مرو کے مقام پر ہوئی[1] ۔

ابوالحسن بختیار بن عبداللہ الہندی

گمان یہ ہے کہ ابوالحسن بن عبداللہ الہندی ، ابو محمد بختیار بن عبداللہ الہندی کا ہم عصر بھی تھا اور بھائی بندوں میں سے بھی تھا ۔ ابوالحسن محدّث بھی تھا اور صوفی بھی ۔ وہ قاضی ابو شنج محمد بن اسماعیل یعقوبی کا آزاد کردہ غلام تھا ۔ اسے السمعانی کا استاد ہونے کے باعث شہرت حاصل ہوئی ۔ ابو محمد کی طرح ابوالحسن نے بھی اپنے استاد کے ہمراہ دور دراز کے اسلامی علاقوں اور ممالک کا سفر اختیار کیا تھا اور وہاں کے معروف اساتذۂ حدیث کے یہاں تعلیم پائی تھی ۔ مثلاً الشرف ابونصر محمد ، ابوالفوارس محمد بن علی ، رزق اللہ بن عبدالوہاب التمیمی البنداری ، علی بن احمد بن علی الستری اور عبدالملک بن علی الحافظ (ابن خلف بن شعبہ) اور احمد بن محمد العبدی البصری وغیرہ ۔

---

۱ ۔ محمد اسحاق اور رجال السند و الہند ، ص ۸۴ ۔

ان کے علاوہ کچھ اور علمائے حدیث کے حضور بھی زانوئے تلمذ تہ کیا ۔ اُن میں سے کوئی اصفہان میں تھا ، کوئی جبال میں اور کوئی خوزستان میں ۔ السمعانی کا بیان ہے کہ اس نے اس سے قاوشیج اور ہرات میں حدیث کی تحصیل کی تھی۔ وفات ۱۱۵۱ء/۵۴۳ھ میں ہوئی[۱] ۔

احمد بن محمد ابوبکر الفقیہ المنصوری البکر آبادی

الامام الحافظ ابوالقاسم حمزہ بن یوسف بن ابراہیم السہمی نے اپنی مشہور کتاب 'تاریخ جرجان' میں بیان کیا ہے کہ ابوبکر احمد بن محمد المنصوری البکر آبادی فقیہ تھا اور وہ ابوبکر اسماعیل اور ابن عدی الحافظ کی روایت سے درس فقہ دیتا تھا ۔ اس کی وفات ۱۰۲۱ء/۴۱۲ھ میں ہوئی[۲] ۔

الشیخ محمد اسماعیل لاہوری

الشیخ محمد اسماعیل لاہوری کو سرزمین پاک و ہند میں تشریف لانے والے اوّلین مبلّغین اسلام میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے وعظ اور تلقین کے باعث بہت سے نامسلموں نے دین اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل کیا ۔ الشیخ محمد اسماعیل اپنے دور کے بزرگ‌ترین محدّثین اور مفسّرین میں سے تھے اور گمان کیا جاتا ہے کہ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اس سرزمین میں حدیث اور تفسیر کو رواج دیا ۔ ان کا انتقال ۱۰۵۶ء/ ۴۴۸ھ میں لاہور ہی کے شہر میں ہوا[۳] ۔

پروفیسر محمد اسحاق کی تحقیق کے مطابق ان کا وطن بخارا تھا اور ۱۰۰۴ء/۳۹۵ھ میں لاہور میں وارد ہوئے تھے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے ۔ اسی وجہ سے ان کی نسبت لاہوری ہے ۔ 'خزینۃ الاولیاء' ، 'حدائق الحنفیۃ' اور 'تذکرۂ علمائے ہند' میں شیخ محمد اسماعیل کا ذکر مرقوم ہے[۴] ۔

ابوالقاسم محمد بن محمد بن خلف لاہوری

السمعانی نے اپنی 'کتاب الانساب' میں ذکر کیا ہے کہ ابوالقاسم محمد بن محمد لاہوری

---

۱ ۔ محمد اسحاق پروفیسر Indian Contribution to the Study of Hadith Literature, p. 216.

۲ ۔ رجال السند و الہند ، ص ۵۸ ۔

۳ ۔ رجال السند و الہند ، ص ۹۷ ۔ ڈاکٹر زبید احمد XXXIII.

۴ ۔ محمد اسحاق پروفیسر ، Indian Contribution to the study of Hadith Literature.

فقیہ بھی تھے اور واعظ و مناظر بھی ۔ انہوں نے فقہ کی تعلیم السمعانی کے دادا بزرگوار الامام ابوالمظفر السمعانی اور بعض دیگر علماء کے یہاں حاصل کی تھی ۔ السمعانی لکھتے ہیں کہ اسفرائن کے مقام پر میں ان سے ملا اور ان سے کسی قدر فیضِ روایت بھی حاصل کیا ۔ انہوں نے اسفرائن ہی میں توطّن اختیار کر لیا تھا اور وہیں ۱۱۴۵ء/ ۵۴۰ھ کے اردگرد وفات پائی تھی ۔ یاقوت حموی نے 'معجم البلدان' میں ابوالقاسم محمد بن محمد بن خلف اللاہوری کا ذکر کیا ہے اور السمعانی کے بیان کی تائید کے ساتھ ساتھ محمد بن محمد کی عقل و دانش کی خوب تحسین کی ہے ۔ نیز یہ بھی ذکر کیا ہے کہ وہ عبدالرزاق بن حسان المنیعی اور ابونصر محمد بن محمد الماہانی اور ابوبکر بن خلف الشیرازی کے درس میں بھی شامل ہوئے تھے ۔ یاقوت حموی مزید لکھتا ہے کہ محمد بن محمد کے احوال ابوسعید نے اسفرائن میں قلم بند کیے تھے ۔ اور یہ ۱۱۹۳ء/ ۵۹۰ھ کی بات ہے[1] ۔

نصراللہ بن احمد بن السندی البغدادی

الخطیب البغدادی نے اپنی 'تاریخِ بغداد' میں ابوالحسنؔ نصراللہ بن احمد کا ذکر کیا ہے جو ابن السندی کے نام سے معروف تھے ۔ وہ ایک سندھی غلام کے پوتے تھے ۔ خراسان میں ابن السندی ہی کے نام سے پہچانے جاتے تھے ۔ وہ ابوالقاسم بن سبنک کی طرف سے روایت کرتے تھے ۔ بڑے راست گفتار اور حق پسند شخص تھے ۔ انہیں یہ شرف بھی حاصل تھا کہ الخطیب البغدادی کے اساتذہ میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے ۔ الخطیب نے ان سے بعض احادیث نقل کی تھیں ۔ وفات ۱۰۴۱ء/ ۴۳۳ھ میں ہوئی ۔

ابوالفتح عبدالصمد بن عبدالرحمن لاہوری

یہ ابوالحسن علی بن عمر کے شاگردوں میں سے تھے اور سمرقند میں درسِ حدیث دیتے تھے ، وہاں السمعانی (صاحبِ 'الانساب') نے ان سے وہ احادیث سنیں جو اُن تک ان کے استاد ابوالحسن کے ذریعے پہنچی تھیں ۔ ان کا زمانہ چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) کا نصفِ اول ہے ۔ وفات ۱۱۵۸ء/ ۵۵۰ھ کے اردگرد ہوئی[2] ۔

مولانا منہاج الدین عثمان ابراہیم جوزجانی

آپ مولانا عبدالخالق جوزجانی کے فرزند تھے ۔ سلطان ابراہیم غزنوی کی ایک

---

۱ - محمد اسحاق ، ص ۷ ، ۸ ، رجال السند و الہند ، ص ۲۳۵ ، ۲۳۶ ۔

۲ - محمد اسحاق ، ص ۵ ۔

دختر مولانا عبدالخالق کو بیاہی تھیں ۔ معاصر تواریخ میں مذکور ہے کہ سلطان ابراہیم کی چالیس بیٹیاں تھیں جو اس نے سادات کرام اور علمائے عظام کے حبالۂ عقد میں دے دی تھیں ۔ گویا مولانا منہاج الدین عثمان غزنی کی شہزادی کے بطن سے تھے اور نانا سلطان ابراہیم کے نام کی نسبت ظاہر کرنے کے لیے ان کے نام کا ایک جزو 'ابراہیم' بھی تھا ۔ غزنی میں انہیں اہلِ دربار اور اہلِ مناصب میں بڑا وقار اور اعتبار حاصل تھا ۔ خود بھی وقیع عہدوں پر فائز رہے تھے ۔ عباسی خلیفہ المستضیئی باللہ (۵۶۶ھ/۱۱۷۰ء تا ۵۷۷ھ/۱۱۸۱ء) کے زمانۂ خلافت میں وہ حج پر گئے ۔ بغداد میں خلیفہ کی طرف سے پذیرائی ہوئی اور ان کو خلعتِ فاخرہ پہنائی گئی ۔ وہاں سے وہ از راہِ سیستان ، غزنی اور غزنی سے لاہور واپس پہنچ گئے ۔ سیستان میں سلطان شمس الدین بن تاج الدین ابوالفتح نے ان کے ذکر سے متاثر ہو کر اپنے یہاں ان کی پذیرائی کی اور ان سے نصیحت اور تلقین و وعظ کی فرمائش کی ۔ سلطان شمس الدین عالم تھا اور اہلِ علم کی قدر کرتا تھا ۔

وہ لاہور میں کون رہائش پذیر تھے ؟ کیا فرائض انجام دیتے تھے ؟ وہاں کتنی مدت مقیم رہے؟ یہ اور ایسے کئی دیگر امور وضاحت طلب ہیں ۔ صاحبِ 'طبقات ناصری' کے بقول (وہ عثمان ابراہیم کے حقیقی پوتے تھے) اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں کہ وہ براستہ سیستان و غزنہ لاہور پہنچے تھے ۔ یہ ۵۷۲ھ/۱۱۷۶ء کے اردگرد کا واقعہ ہے ۔ حتمی طور پر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ فوت کب ہوئے ؟ ظاہر ہے کہ ۵۷۲ھ/۱۱۷۶ء کے بعد ہی فوت ہوئے ہونگے[1] ۔

مولانا سراج الدین محمد افصح العجم وا عجوبۃ الزمان بن مولانا منہاج الدین عثمان ابراہیم

لاہور کے آخری غزنوی سلطان خسرو ملک کو سلطان معزؒ الدین سام محمد غوری نے (جو شہاب الدین غوری کے نام سے معروف ہے) ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء میں مغلوب اورگرفتار کرکے لاہور میں غزنوی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور غوری حکومت کا سنگِ بنیاد رکھا ۔ معز الدین سام نے اپنے سپہ سالار ملتان کو جس کا نام علی کرماج تھا ، لاہور میں متعین کر دیا اور مولانا سراج الدین محمد کو ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء میں قاضیٔ لشکرِ ہندوستان کا منصب سونپا اور شاہی خلعت سے نوازا ۔ مولانا منہاج الدین عثمان ابراہیم کے بارے میں ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ انہوں نے لاہور میں سکونت اختیار کرلی تھی اور گمان اغلب یہ ہے کہ لاہور ہی میں وفات پائی ہوگی ، ساتھ ہی یہ گمان بھی

---

۱ ۔ طبقات ناصری (پنجاب یونیورسٹی ایڈیشن بہ تصحیح عبدالحیؒ حبیبی) ، ص ۳۰ ، ۲۹ ۔

ہے کہ مولانا سراج الدین کا مولد لاہور ہی تھا ۔ محمد عوفی نے اسی طرح بیان کیا ہے ۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ پیدا لاہور میں ہوئے مگر نشو و نما انہوں نے سمرقند میں پائی تھی جو درست معلوم نہیں ہوتا ۔

اس دور میں دربارِ بامیان [خراسان] علم‌وفضل کا گہوارہ ہو رہا تھا اور سلطان بہاءالدین بن سلطان شمس الدین کی (جس نے ۱۱۹۱ء/۵۸۷ھ سے ۱۲۰۵ء/۶۰۲ھ تک حکمرانی کی) تمنا یہی تھی کہ ہر صاحبِ علم و فضل اس کے دربار کی زینت بن جائے ۔ اس کی نظر مولانا سراج الدین پر بھی تھی اس لیے کہ ان کے علم و بلاغت اور امورِ سیاسی اور معاملاتِ مملکت داری سے ان کی آگاہی کی شہرت اس تک پہنچ چکی تھی ۔

یہ پتہ نہیں چلتا کہ مولانا سراج الدین اسلامی لشکرِ ہندوستان کے قاضی کتنا عرصہ رہے ۔ اتنا معلوم ہے کہ وہ سلطان شمس الدین والئی بامیان کے دورِ حکومت میں دربارِ غور میں سلطان غیاث الدین محمد سام کے یہاں تھے اور وہیں سے بغیر اجازتِ سلطان ، بامیان گئے تھے۔ بامیان سے ۱۱۹۳ء/۵۹۰ھ کے ازدگرد واپس دربارِ غور پہنچ گئے ۔ دربارِ سیستان سے بھی بزمانۂ سلطان تاج الدین وابستہ رہے ۔

دوبار دربارِ خلافت میں پہنچ کر فرائضِ سفارت ادا کیے اور خلعت سے سرفراز ہوئے ۔ اس واقعہ کا تعلق خلیفہ الناصر الدین باللہ سے ہے ۔ یہ فرض پہلی بار سلطان تاج الدین والئی سیستان کی طرف سے ادا کیا تھا اور دوسری بار سلطان غیاث الدین محمد سام کی طرف سے ۔ دوسری بار جب بغداد سے لوٹ رہے تھے تو مکران کے مقام پر فرشتۂ اجل کو لبیک کہا اور راہی ملک عدم ہوئے[1] ۔

★★★

---

۱ ۔ طبقات ناصری (بہ تصحیح عبدالحیؑ حبیبی ، پنجاب یونیورسٹی ایڈیشن) ، ص ۴۳۱-۴۳۰ ۔
نیز رجال السند و الهند ص ۲۲۹-۲۲۵ ۔

کتابیات

عبدالحیؒ حبیبی ، زین الاخبار از گردیزی ۔
عتبی ، تاریخ الیمینی ، مطبع مجدی لاہور ۔
طوسی ، نظام الملک ، (اردو ترجمہ) سیاست نامہ ، مجلس ترقی ادب لاہور ۔
اساذ خلیل کابل ، سلطنت غزنویاں ۔
تاریخ فرشتہ (اردو ترجمہ) ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۔
شیخ محمد اقبال ، مرتب اخبار الدولۃ السلجوقیہ ، طبع پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ۔
طبقات ناصری ، کلکتہ ایڈیشن ۔
استاذ سعید نفیسی ، در پیرامون تاریخ بیہقی ۔
ڈاکٹر ناظم ، سلطان محمود ۔
معجم الادباء (سترھویں جلد) ، وزارت معارف مصر ایڈیشن) ۔
ابوظفر ندوی ، تاریخ سند ۔
حطی ، تاریخ عرب ۔
عوفی ، نور الدین محمد ، (حصہ اول و دوم) لباب الالباب ، (طہران ایڈیشن) ۔
مولانا عبدالحی ندوی ، نزھۃ الخواطر ۔
رشید یاسمی ، دیوان مسعود سعد سلمان ۔
قاضی اطہر مبارکپوری ، رجال السند و الهند ۔
عروضی ، چہار مقالہ ، قزوینی ایڈیشن ۔
محمد اسحاق ، پروفیسر India's Contribution to Hadith Literature
ایلیٹ اینڈ ڈوسن ، تاریخ ہند ، کتاب محل لاہور ایڈیشن ۔
ثعالبی ، یتیمۃ الدھر (پہلا ایڈیشن) ۔
زبید احمد، ڈاکٹر The Contribution of India-Pakistan to Arabic Literature.
البیرونی سید حسن برنی ، (اردو) ، (دوسرا ایڈیشن) ۔
السمعانی ، کتاب الانساب ، گب میموریل ایڈیشن ۔
انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ، جلد اول اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ، طبع دانش گاہ پنجاب ، لاہور ، ۱۹۷۰ء ، ۵ : ۲۶۱ تا ۲۷۰ ۔
لاء ، این ۔ این ، عہد اسلامی میں علمی ترقی ۔

چوتھا باب

فصل اول*

سلاطینِ دہلی (قطب الدین ایبک سے حملۂ تیمور تک)

۱۲۰۶ء - ۱۳۹۹ء/۶۰۳ھ - ۸۰۱ھ

''مرکزِ اسلامِ ہند[1]'' یعنی لاہور کو ایک فضیلت یہ بھی حاصل ہے کہ اس سرزمین کی سب سے پہلی خود مختار اسلامی ریاست کے قیام کی قرارداد یہیں منظور ہوئی۔ ۱۲۰۶ء/۶۰۳ھ کے اوائل میں سلطان معزالدین[2] محمد بن سام الغوری نے لاہور میں ایک دربار منعقد کیا جس میں تمام اعیانِ دولت اور امرائے سلطنت نے شرکت کی۔ اس موقعہ پر اس نے اپنے غلام قطب الدین ایبک کو ''سلطان'' کا خطاب عطا کیا[3] اور اس کے لیے ہندوستان کے سب سے اہم اور بڑے شہر دہلی کو مستقرِ حکومت قرار دیا۔ اس جشنِ عظیم کے بعد سلطان معزالدین اپنے دارالملک غزنہ کو واپس جا رہا تھا کہ جہلم کے نواح میں دھمیک کے مقام پر باغیوں کے ایک گروہ نے اسے شہید کر دیا[4]۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا غیاث الدین محمود (بن محمد بن سام) الغوری سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس نے قطب الدین ایبک کو عتاق سے سرفراز کیا[5] اور اسے مملکِ ہند تسلیم کر کے ''چترِ شاہی'' اور ''دور باش'' کہ اس زمانے میں اماراتِ سلطنت شمار ہوتے تھے، بھیجے۔ ۲۷ جون ۱۲۰۶ء/۱۸ ذوالقعدہ ۶۰۲ھ کو لاہور میں تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی[6]۔ ایبک کو ''قطب الدین الرشید[7]'' کا لقب دیا گیا۔ اس طرح سلاطینِ دہلی کے دور کا آغاز ہوا اور ہندوستان پر اسلامی پرچم لہرانے لگا۔

تاریخِ ہند کا ہر طالبِ علم جانتا ہے کہ کس طرح پندرہ سال پیہم کوششوں کے

---

* نوٹ: ڈاکٹر احسان الٰہی رانا کے ملک سے باہر ہونے کی وجہ سے اس فصل میں بعض کتبِ عربی کے متعلق تفصیلی معلومات اور تبصرہ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے کیا جس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔

۱ - فخرالدین مبارک شاہ مروروزی، تاریخ، لنڈن ۱۹۲۷ء، ص ۳۰۔

۲ - سلطان معزالدین الغوری عام طور پر شہاب الدین الغوری کے لقب سے بھی مشہور ہے۔ اس کے اپنے سکوں پر ''معزالدین'' کندہ ہے۔

۳ - تاریخ مبارک شاہی، کلکتہ ۱۹۳۱ء، ۱۴: طبقات ناصری، کوئٹہ ۱۹۴۹ء، ص ۴۰۹۔

۴ - تاریخ مبارک شاہی، ۱۲؛ طبقات ناصری، ص ۴۷۴۔

۵ - تاریخ مبارک شاہی، ۱۳: نزهة الخواطر ۱، ۱۰۰: ص ۲۰۱۔

۶ - تاریخ مبارک شاہی، ۱۴: طبقات ناصری، ۴۰۹ - تاج المآثر، ورق ۸۱ ب

۷ - قلیج بیگ فریدون بیگ، ۱۰۔

بعد سلطان معزالدین الغوری اور قطب‌الدین ایبک نے دہلی ، قنوج اور گردو نواح کے عوام کو ہندو راجاؤں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائی ۔ یہ راجپوت منتشر ہو کر کچھ تو راجپوتانے میں جا بسے اور کچھ دریائے گنگا کے ساتھ ساتھ اودھ اور بہار کے مختلف دیہات میں اتر پڑے اور وہاں کے چودھری بن گئے[۱] ۔

قطب‌الدین نے زمام اقتدار سنبھالتے ہی معاشرتی عدل[۲] اور رعایا پروری کے زریں اصول کے مطابق ، جو اسلامی سلطنت کا طرۂ امتیاز ہے ، مروجہ لگان کی شرح گھٹا کر نصف بلکہ اس سے بھی کم کر دی ۔ بالفاظ دیگر شریعت اسلام کے مطابق معیّن کر دی[۳] جس سے رعایا خوش حال اور زمیندار مالا مال ہو گئے ۔

اس دور کے علم و ادب کے بارے میں بہت کم معلومات ہم تک پہنچی ہیں ۔ اس ربع مسکون میں علوم و فنون کی تحصیل اور اشاعت صدیوں سے صرف برہمن کے لیے مخصوص رہی ہے[۴] ۔ مگر مسلمان یہاں آئے تو انہوں نے سر بازار شمع علم کو روشن کیا اور اس کی ضیاپیزیوں سے اس ظلمت کدے کا گوشہ گوشہ منور کر دیا ۔

دہلی میں قصر علم کی خشت اول ایک ایسے سلطان نے رکھی جو خورد سالی میں بردہ فروشوں کے ہاتھ لگ گیا تھا ۔ انہوں نے اسے نیشا پور میں بطور غلام کے بیچ ڈالا ۔ اس بیکس بچے کو ، ''ایبک'' کا نام دیا گیا ۔ نوشتۂ ازل میں اس بچے کی تعلیم و تربیت کا انتظام نیشاپور کے قاضی فخرالدین بن عبدالعزیز النعمانی الکوفی[۵] الحنفی کے ہاں تھا ۔ یہ قاضی امام ابوحنیفہ کی اولاد سے تھے[۶] ۔ انہیں کے ہاں ان کے بچوں کے ساتھ ایبک نے قرآن خوانی[۷] اور لکھنے پڑھنے[۸] کے علاوہ شہسواری اور تیراندازی جیسے مردانہ فنون میں مہارت حاصل کی[۹] ۔ قاضی فخرالدین حنفی کی تربیت نے ایبک کے دل میں اسلام کی محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی ۔ ماحول کا اثر اس پر کافی پڑا ۔ خراسان اور ماوراء النہر میں فقۂ حنفی کا زور تھا ۔ ایبک نے

---

۱ ۔ Imperial Gazetteer ، ۱ : ص۴۳۳ ۔
۲ ۔ تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ، ص۳۳ ۔
۳ ۔ ایضاً ، ص۳۳ ، ۳۴ ۔
۴ ۔ Encyclopaedia Britannica طبع نہم ۱۱ : ص۸۴۱ ۔
۵ ۔ طبقات ناصری ، ص۸۳۲ ، ۸۳۳ ۔
۶ ۔ تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ، ص۲۱ : طبقات ناصری ، ص۳۸۸ ۔
۷ ۔ تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ، ص۲۱ : طبقات ناصری ، ص۳۸۸ ۔
۸ ۔ تاریخ فرشتہ ، ۱ : ص۱۰۵ ، ۱۰۶ ۔
۹ ۔ طبقات ناصری ، ۳۸۸ ۔

بھی اپنے عہد میں اسی مذہب کی پرورش کی ۔ اس کا قاضی القضاۃ وجیہ الدین کاشانی[1] اور شیخ الاسلام نورالدین المبارک غزنوی دونوں حنفی تھے[2] ۔ لاہور کی قضا کے لیے بھی اس نے رضی الدین الصنعانی الحنفی کو تجویز کیا[3] ۔ ایبک شعر و سخن اور علم و فن میں بھی دبستانِ غزنہ کی روایات کا مقلّد تھا ۔ ۱۱۹۱ء/۵۸۷ھ ہی میں اس نے ایک پرانے مندر کے خرابے پر آٹھ فٹ چوڑی دیوسار دیواروں سے گھری ہوئی مسجد 'قوۃ الاسلام' کی بنیاد رکھی[4] ۔ یہ مسجد ۱۱۹۶ء/۵۹۲ھ میں جا کر مکمل ہوئی ۔ جس جوشِ عقیدت اور اخلاص سے ایبک نے اس معبدِ عظیم کی تعمیر کا انتظام کیا اس کی مناسبت سے ماذنے کے طور پر ایبک نے دو سال کے بعد دہلی اور جےپور کے پتھر سے اس بلند اور خوش وضع مینار (منار) کی تعمیر شروع کروا دی جو اب عجائبات عالم میں شمار ہوتا ہے ۔ فرگوسن (Ferguson) اس مینار کو جو اسمائے حسنیٰ اور آیاتِ قرآنیہ سے آراستہ ہے ، مسلمانوں کی فتحِ ہند کا علم سمجھتا ہے[5] ۔ یہ مینار غزنہ کے میناروں کی طرز پر ہے[6] ۔ ہندی سنگتراشی اور منبت کاری نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے ۔ ۱۲۰۰ء/۵۹۶ھ میں ایبک نے اجمیر میں بھی ایک شاندار جامع مسجد تیار کروائی[7] ۔ الغرض قطب الدین ایبک نے ملک میں جابجا مسجدیں اور خانقاہیں تعمیر کروائیں[8] اور علم کے نور کو عام کر دیا ۔

ایبک اور اس کے جانشینوں کی شہرت نے اطراف و اکناف سے اہلِ علم کو کھینچ لیا ۔ ادھر خراسان اور ماوراء النہر میں تاتار کے تابڑ توڑ حملوں کا سلسلہ شروع ہوا ۔ انہوں نے شیرازۂ نظام بکھیر کر رکھ دیا ۔ یہ طوفان کی طرح اٹھے اور جہاں جہاں سے گزرے اپنے دنبال میں بربادی و بدامنی کے آثار چھوڑتے گئے ۔ انہوں نے علوم و فنون کے بیش بہا خزائن کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ۔ مسجدیں بے چراغ اور خانقاہیں ویران کر دیں ۔ یہاں کے امراء اور نامور علماء و شعراء گھبرا کر لاہور اور دہلی کی طرف ہجرت کر گئے اور اسی سر زمین کو انہوں نے اپنا وطنِ ثانی بنا لیا اور علم و دین کی خدمت

---

۱ ۔ نزہۃ الخواطر ، ۱ : ۳۳۹ ۔

۲ ۔ ایضاً : ۱ ، ۲۰۱ ، ۲۰۲ ۔

۳ ۔ ایضاً ، ۱ : ۱۳۷ ۔

۴ ۔ آثارالصنادید ، باب ۲ ، ص ۱۳ (مشرق دروازے پر ایبک کے نام کا ایک مؤرخ کتبہ کندہ ہے) ۔

۵ ۔ فرگوسن ، ۲ : ۲۰۶ (Emblem of Conquest)

۶ ۔ Encyclopaedia Britannica طبع نہم ، ۱۰ : ۵۵۹ ۔

۷ ۔ فرگوسن ، ۲ : ۲۱۰ ۔

۸ ۔ تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ص ۲۶

میں مشغول ہو گئے - متوسّط درجے کے شعراء اور علماء دیہات میں چلے گئے اور وہیں گوشۂ خمول میں زندگی گزارنے لگے - لاہور تو پہلے ہی سے علمائے اسلام کا مستقر تھا، مگر تھوڑی مدت میں دہلی بھی "محط رجال آفاق"[1] بن گیا -

ان دو صدیوں میں اگرچہ سیاسی فضا ہیجان و تکدّر سے پاک نہ تھی اور اقتصادی و معاشرتی حالات بھی کچھ معتدل نہ تھے، پھر بھی یہاں نہالِ علم و عرفان خود بخود پرورش پاتا رہا - ایبک کے علاوہ ناصر الدین قباچہ، التتمش، بلبن، جلال الدین خلجی اور غیاث‌الدین تغلق نے بھی اپنے اپنے عہدِ حکومت میں کشت زارِ علوم کی خوب خوب آبیاری کی - بالخصوص آٹھویں صدی ہجری یعنی چودھویں صدی عیسوی کا نصف آخر تو یہاں کے علم و ادب کا کہکشانی دور کہلانے کا مستحق ہے - سلطانِ دانش پژوہ فیروز شاہ تغلق کے عواطفِ خسروانہ سے علوم و فنون کو بہت فروغ حاصل ہوا - شہاب الدین احمد بن علی القلقشندی (م - ۱۴۱۸ء/۸۲۱ھ) نے دہلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں ایک ہزار مدرسے ہیں، ایک شافعیوں کا اور باقی حنفیوں کے[2] -

سلطان ایبک کے زمانے ہی میں عزالدین محمد بن بختیار خلجی نے بنگالہ میں جابجا مدرسے، مسجدیں اور زاویے تعمیر کروائے اور اشاعتِ علم کے اسباب مہیا کیے[3] - اس کے جانشین غیاث‌الدین (دورِ حکومت ۱۲۱۲ء-۱۲۲۷ء) کے مآثرِ جمیلہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے لکھنوتی میں ایک رفیع الشان مسجد، ایک مدرسہ اور ایک کارواں سرائے تعمیر کروائی[4] -

اس دور کے سلاطین و امراء اور مشایخ اشاعتِ علم کے فریضے کو خوب ادا کرتے رہے - چنانچہ دہلی اور لاہور کے علاوہ ملتان، اوچ (اچ)، اجودھن (پاکپتن) ناگور، اجمیر، جالندھر، بدایوں، جونپور (جو اس وقت 'شیرازِ ہند' تھا)[5]، رنگپور لکھنوتی، قندھار، جیول، گلبرگہ، بیدر، جنیر، دولت آباد، ایلچ پور اور برہان پور وغیرہ میں علمی درسگاہیں قائم ہوئیں -

ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ سلاطینِ لاہور و غزنہ کی طرح سلطان ایبک بھی حنفی المذہب تھا - اس لیے یہاں حنفی علماء کو خدمت کا زیادہ موقعہ ملا اور اس اقلیم میں علماء نے فقۂ حنفی کی زیادہ خدمت کی -

---

۱ - طبقات ناصری، ص۵۱۶ -
۲ - صبح الاعشی، ۵ : ص۶۹ -
۳ - نزہۃ الخواطر، ۱ : ص۲۰۷ -
۴ - سٹیوارٹ (Stewart) : History of Bengal، ص۵۶ - ۵۷ -
۵ - بلکہ "پورب" کو "شیراز مملکت ما" سے تعبیر کیا گیا ہے (مآثر الکرام، ۱ : ص۲۲۲)۔

اس دور کے علماء نے یہاں بھی وہی نظام تعلیم جاری کیا جو عراق ، شام ، ایران اور بالخصوص خراسان اور موجودہ افغانستان کے علاقوں میں صدیوں سے رائج تھا ۔ یہاں بھی علماء نے انفرادی طور پر چھوٹی بڑی ہر مسجد کے ساتھ ایک مکتب (یعنی پرائمری سکول) قائم کیا ۔ عام طور پر بچوں کا مکتب مسجد کے اندر قائم نہیں کیا جاتا تھا ، کیونکہ بچے دیواروں پر دھبے لگا دیتے ہیں اور نجاست سے احتراز کرنے کی تمیز نہیں رکھتے[۱] ۔ مسجدوں کے ساتھ زاویے بنا دیے جاتے تھے جہاں بچے ابتدائی تعلیم حاصل کرتے تھے ۔ اسی طرح ہر محلے اور ہر گاؤں میں کسی 'دانشمند' (مولوی) کے آنگن میں یا قاضی کی حویلی میں بچے جمع ہو جایا کرتے تھے، جہاں وہ حرف شناسی کے ساتھ ساتھ قرآن مجید یاد کرتے تھے ، خط کی مشق کرتے اور صرف و نحو کے بنیادی قواعد ازبر کر لیتے تھے ۔ آغاز تعلیم قرآن کریم ہی سے ہوتا تھا جس پر ہر اسلامی ملک نے ہر زمانے میں اصرار کیا ہے ۔ عظیم سیاح ابن جبیر (م - ۱۲۱۷ء/۶۱۴ھ) نے بھی لکھا ہے کہ اس نے ہر جگہ جہاں وہ گیا دیکھا کہ بچوں کو قرآن مجید پڑھایا جاتا ہے اور اسی کی تلقین کی جاتی ہے ۔ خط کی مشق کے لیے اشعار اور امثال سائرہ کو چنا جاتا ہے اور قرآنی آیات کو استعمال نہیں کیا جاتا ، محض اس ڈر سے کہ کلام ربانی کی بے حرمتی نہ ہو ۔ بچے الواح (یعنی تختیوں) کو دھو کر عبارت محو کر ڈالتے ہیں[۲] ۔ ایسا ہی مشاہدہ ابن بطوطہ (م - ۱۳۷۷ء/۷۷۹ھ) کا بھی ہے[۳] ۔

خط کی مشق کے لیے تختہ (=تختی) پر پہلے معلم خود ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھتا تھا اور کبھی کبھی ''رب یسر ولا تعسر'' بھی لکھ دیتا تھا ، اس کے آگے ''ا ـ ب ـ پ ـ ت ـ ث ـ ج'' لکھ کر بچے کو مشق کے لیے تختی دے دیتا تھا[۴] ۔ لوح کا رواج زمانہ قدیم سے ہے ۔ ام الدرداء بچوں کو انہی الواح پر امثال و حکم لکھ کر کتابت کی مشق کرواتی تھیں[۵] ۔

اس دور میں ، بلکہ صدیوں بعد تک بھی مکتب اور مدرسے میں التزام کیا جاتا تھا کہ تعلیم یا سبق کا آغاز بدھ کے دن سے ہو ۔ یہ روایت علامہ مرغینانی (م - ۱۱۹۷ء/۵۹۳ھ) صاحب 'الہدایۃ' جیسے اساتذہ سے چلی آتی ہے ۔ الزرنوجی نے ''بدایۃ السبق'' کے عنوان سے ایک فصل باندھی ہے[۶] اور لکھا ہے کہ ہمارے استاد اور شیخ علامہ

---

۱ - الشیزری : نہایۃ الرتبۃ (فی طلب الحسبۃ) ، ۱۰۳ -

۲ - ابن جبیر : الرحلۃ ، ص ۲۷۲ -

۳ - تحفۃ النظار ، ج ۱ : ۲۱۴ -

۴ - فوائد الفواد ، ص ۱۵۱ - ۱۵۲ -

۵ - تہذیب الالفاظ ، قاہرہ بدون تاریخ ۲ : ۹۶۳ -

۶ - تعلیم المتعلم ، ص ۴۳ -

مرغینانی ''بدایۃ السبق'' کو چہار شنبہ پر موقوف رکھتے تھے اور یہ حدیث سنایا کرتے تھے :

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، مامن شئی بدئ یوم الاربعاء الا تم

ترجمہ: آنحضرت ؐ کا ارشاد ہے جوکام بدھ کے دن شروع کیا جائے وہ ضرور مکمل ہوتا ہے ۔

اور مزید فرماتے تھے کہ امام ابوحنیفہؒ کا بھی یہی طریق تھا ۔ علامہ برہان الدین مرغینانی نے 'الھدایۃ' بھی، جو ان کی اشہر التالیفات ہے اور ایسی معتمد علیہ ہے کہ علمائے حنفیہ کے فتوے کا مدار اسی پر ہے ، مئی ۱۱۷۸ء/ ذوالقعدہ ۵۷۳ھ کے دن نمازِ ظہر کے بعد تصنیف کرنا شروع کی ۔ اس ابتدائی تعلیم کے بعد القدوری (م ۔ ۱۰۳۷ء/۴۲۸ھ) کی 'المختصر' وغیرہ جیسی فقہی متن کی کوئی کتاب پڑھ کر بچے بالعموم فارغ ہو جاتے تھے ۔

مکتب کی یہ تعلیم 'علم ضروری' کا درجہ رکھتی تھی ، جسے ختم کیے بغیر کوئی طالبِ علم 'دانشمند' (یعنی 'ملا') کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا تھا ۔ اس مرحلے پر بچے عام طور پر تھوڑی بہت عربیت سے مناسبت پیدا کر لیتے تھے ۔ اس کے بعد وہ قرآن مجید، حدیث ، فقہ یا اسلامی ادبیات والی عربی کو خود بخود سمجھنے لگتے تھے ۔ پھر جیسے جیسے ان کی مشق و مزاولت بڑھتی جاتی تھی عربی زبان پر انہیں پورا قابو حاصل ہو جاتا تھا ۔ بظاہر شعرِ جاہلی یا متقدمینِ شعراء کے دواوین، محاضرات و مسامرات کی انشائی کتابوں والی عربی سے انہیں بہت کم سروکار تھا ۔

اس تعلیم کی اساس دین پر تھی اور یہ دین کا ایک ضروری جزو بن چکی تھی ۔ چونکہ دین کی بنیادی کتب عربی زبان کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں ، اس لیے اس نظامِ تعلیم سے عربیت کو بہت حد تک تقویت ملی اور نتیجۃً عربی زبان (یعنی لغۃً فصحی) نہایت احتیاط سے محفوظ رہی ، حالانکہ قدیم عربی نہ اس ملک کی زبان تھی نہ حکومت کی ۔ چونکہ ہند میں پہلے پہل وارد ہونے والے علماء غزنہ ، سمرقند و بخارا سے تعلق رکھتے تھے اس لیے وہ فارسی زبان ہی میں گفتگو کرتے تھے ۔ یہ زبان آسان تھی ، اسی میں تعلیم بھی دیتے تھے ۔ سلاست اور سہولت کی بناء پر اور کچھ سلطان کی زبان ہونے کی بناء پر فارسی عام طور سے بولی، سمجھی اور لکھی جانے لگی ۔ برہان الدین الزرنوجی نے اپنی تالیف 'تعلیم المتعلم' (تصنیف ۱۲۰۳ء/۶۰۰ھ) میں اپنے استاد بزرگ شیخ برہان الدین المرغینانی سے ایک خوبصورت واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کے ایک شاگرد فقیہ نے ایک بار 'قرآن مجید' پر دوات رکھ دی ۔ شیخ نے بے ساختہ فارسی میں تنبیہہ فرمائی ، ''برنیائی''۔ یعنی تجھے تیرے علم نے نفع نہ دیا[1] ۔ اس کے

۱ ۔ الزرنوجی ، برہان الدین تعلیم المتعلم ، ص ۲۶ ۔

باوجود علمی زبان عربی ہی تھی - تفسیرِ قرآن ، حدیث ، فقہ ، عقائد ، تصوّف کی کتابیں سبھی عربی ہی میں تھیں - بلکہ یہ کتابیں ابھی اس دور میں فارسی میں منتقل بھی نہ ہوئی تھیں - اس کے علاوہ رائج الوقت سکّوں پر تمام عبارتیں عربی میں تھیں - کتبے بھی عربی ہی میں کندہ کیے جاتے تھے[1] - دستاویزات اور بالخصوص فتاویٰ کی زبان بھی عربی ہی تھی -

بات سے بات نکلتی ہے ، ان علماء نے مقامی اور ملکی زبان میں علم و ادب کی خدمت کی ہے - مکتبِ صبیان کے معلّمین اور عام مسجدوں کے واعظ اور قصہ گو بالعموم مقامی زبان میں اپنے سامعین سے مخاطب ہوتے تھے - اسلام کی بدولت یہاں کی روزمرہ کی زبان میں عربی اور فارسی کے الفاظ بڑی کثرت سے داخل ہو چکے تھے- مثنوی 'پرتھوی راج راسا' جو کوی چاند بردائی (تقریباً ۱۲۰۰ء) کی تالیف سمجھی جاتی ہے[2] - اس دور کی ہندی زبان کا شاہکار ہے - اس میں جا بجا عربی اور فارسی کے لفظ وارد ہوئے ہیں - اس مثنوی میں تاریخ کی نسبت افسانوی رنگ زیادہ ہے -گویا نئی پراکرت جنم لے رہی تھی - اس زبان کو واعظوں نے خاص طور پر فروغ دینے کی کوشش کی ہے - اسی طرح ہندوی میں ایک مثنوی 'لورک چندا' جو سلطان فیروز تغلق کے عہد میں مولانا داؤد نے نظم کی تھی[3] ، بہت مقبول ہوئی - شیخ تقی الدین واعظ ربّانی دہلی میں اکثر اسی مثنوی کے ابیات منبر پر سے لوگوں کو سنا کر وجد میں لے آتے تھے - کسی شخص نے ان سے اس مثنوی سے اشعار اختیار کرنے کا سبب پوچھا تو شیخ تقی الدین نے کہا :

> "تمام آن حقائق و معانی ذوقیست و موافق بوجدان اہل شوق و عشق و مطابق بہ تفسیر بعضی از آیات قرآنی"[4] -

بنگلہ زبان کو بھی ان علماء نے نظر انداز نہیں کیا - شیخ سراج الدین عثمان جب سلطان المشایخ نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں آئے تو :

> "ہنوز موی ریش آغاز نہ شدہ بود در حلقۂ ارادت شیخ در آمدہ بود، و در سلک خدمتگاران پرورش یافتہ[5] " -

شیخ عثمان صورت و سیرت میں مرتاض تھے- انہوں نے زیورِ علم سے آراستہ کرکے اشاعتِ علم و دین کے لیے انہیں ان کے اپنے وطن بنگال روانہ کر دیا -

---

۱ - تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں الواح-ملحقہ -

۲ - Encyclopaedia Britannica ، ص ۵۸ ، ۱۱ : ص ۸۴۱ ، ۸۴۴ - ۸۴۳ -

۳ - منتخب التواریخ ،ص ۲۵۰ -

۴ - ایضاً -

۵ - اخبار الاخیار ، ۹۰ -

'علمِ ضروری' کا نصاب کچھ ایسا طویل نہ تھا کہ تکمیل میں سالہا سال لگ جائیں ۔ ابنِ خلکان کا بیان ہے کہ ابنِ سینا (م - ۱۰۳۷ء/۴۲۸ھ) نے دس سال کی عمر میں نہ صرف 'قرآن مجید' کے علم کو پختہ کیا اور ادب میں دسترس پیدا کی بلکہ اصولِ دین کے مسائل (یعنی عقائد) بھی یاد کیے اور ساتھ ساتھ حساب اور الجبرا کے علم کو بھی سیکھا[1] ۔ اسی طرح سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء نے ۱۵ سال کی عمر میں علمِ ضروری حاصل کرلیا[2] ۔ سراج الدین عثمان (م - ۱۳۵۷ء/۷۵۸ھ) بھی عنفوانِ شباب میں دہلی آئے اور سلطان المشایخ نظام الدین اولیاء سے براہِ راست فیض حاصل کرنے سے پیشتر دہلی کی اضافی بستی غیاث پور میں مولانا فخر الدین الزّرادی (م - ۱۳۴۸ء/۷۴۹ھ) کی نگرانی میں علمِ ضروری کا ابتدائی نصاب چھ ماہ میں مکمل کر لیا[3] ، جس کے بعد انہوں نے الزّرادی کے شاگرد رکن الدین الاندپتی کے ہاں ابن الحاجب (م - ۱۲۴۹ء/۶۴۶ھ) کی 'الکافیة فی النحو' ، الزمخشری (م - ۱۱۴۴ء/۵۳۸ھ) کی 'المفصل (فی النحو)' ، القدوری (م - ۱۰۳۷ء/۴۲۸ھ) کی 'المختصر' اور ابن السّاعاتی (م - ۱۲۶۹ء/۶۹۶ھ) کی 'مجمع البحرین (فی الفقه)' بالاستیعاب پڑھیں اور فارغ ہو کر بنگال چلے گئے[4] ۔

نصاب کی ان کتابوں کی اساسی حیثیت معروف ہے ۔ القدوری کی 'المختصر' کا مستند متنِ متین ۱۲۰۰۰ جزئیاتِ مسائل پر مشتمل ہے جو مؤلف نے بے شمار کتابوں سے منتخب کیے ۔ اس کتاب کے مسائل نہایت معتبر ہیں[5] ۔ افادیت اور اہمیت کے اعتبار سے یہ کتاب اب بھی داخلِ نصاب ہے ۔ 'الکافیه' نحوی مسائل کی مختصر مگر نہایت معتبر کتاب ہے ۔ ابن الحاجب نے بہت سے مسائل میں پہلے نحویوں میں اختلاف کیا ہے اور ان کے مسلّمات پر ایسے اشکال وارد کیے ہیں جن کا ردّ آسان نہیں[6] ۔ یہ کتاب اب بھی نصاب میں داخل ہے ۔ 'المفصّل' (تألیف ۱۱۲۰ء/۵۱۴ھ) ایک عظیم القدر کتاب ہے[7] ۔ مگر عام مدرسوں میں اب نہیں پڑھائی جاتی ۔ 'مجمع البحرین' و 'ملتقی النہرین فی فروع الحنفیة' میں ابن الساعاتی نے القدوری کی 'المختصر' کے مسائل مع

---

۱ ۔ وفیات الاعیان ، ص ۱۸۲ ، ابن ابی اصیبعة ، ۲ : ۲ ببعد ۔
۲ ۔ نزھة الخواطر ، ۲ ، ص ۱۲۲ ۔
۳ ۔ سیرالاولیاء ، ۲۸۸ : نزھة الخواطر ، ۲ : ص ۱۰۳ ۔
۴ ۔ سیرالاولیاء ،ص ۲۸۹ ۔
۵ ۔ کشف الظنون ، ص ۲ : ۲۰۳ ۔
۶ ۔ ایضاً ۔ ۲ : ۲۴۹ : لباب المعارف ، ص ۲۴۶ (رقم ۱۱۶۳ء) ۔
۷ ۔ ایضاً ، ۲ : ۲۸۸ ۔

زیادات، بتقلم کی شکل میں جمع کیے ہیں ۔ حسن ترتیب اور سہولت حفظ کی بنا پر بہت مقبول ہوئی[1] ۔ مگر اب خارج از نصاب ہے ۔

تعلیم کا یہ حصہ عوام کے لیے تھا بلکہ ہندو بھی اس تعلیم سے بہرہ مند ہو سکتے تھے ، یہاں تک کہ آگے چل کر بعض ہندو افاضل بھی تدریس و تعلیم میں حصہ لینے لگے ۔ بدایونی نے ایک برہمن کا ذکر کیا ہے :

یکی از شعرای عهد سکندر لودی برهمن بود ، می گویند که باوجود کفر کتب علوم رسمی را درس می‌گفت[2] ۔

اسلام نے اور بالخصوص اس دور کے علماء نے علم کو انسان کے بنیادی حقوق میں شمار کیا ہے بلکہ علم کو ''مختص بالانسانیة'' قرار دیا ہے ۔ تمام خصلتیں ماسوائے علم کے انسان اور باقی تمام حیوانات میں مشترک ہیں ۔ مثلاً شجاعت ، جرأت ، قوت ، جود ، شفقت و غیرہا اور اسی علم ہی کی بدولت آدم کو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ پر فضیلت عطا فرمائی اور ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں ۔ نیز یہ علم ہی ہے جو تقویٰ کا وسیلہ بنتا ہے[3] ۔

اکثر 'دانشمند' اسی 'علم ضروری' کے بعد نظام سلطنت سے منسلک ہو جاتے تھے ۔ اپنی ذاتی قابلیت اور ذہانت کے مطابق ، قاضی ، مفتی ، محتسب ، متصدّی یا دبیر کے عہدوں پر فائز کر دیے جاتے تھے ۔ عام مسجدوں میں امام ، خطیب اور واعظ اور مکتبوں کے معلّم بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے ۔

'علم ضروری' کے بعد 'فضل' کا درجہ شروع ہوتا ہے ۔ یہیں سے تخصّص کے لیے صرف مستعد اور ذہین طلبہ مدرسوں میں چلے جاتے تھے ۔ ایسی علمی درسگاہیں شہر کی جامع کبیر میں یا کسی عالم محقّق کی خانقاہ میں یا کسی نامور ماہر فن کی اقامتگاہ میں قائم تھیں ۔ ابن سینا (م ۱۰۳۷ء/۴۲۸ھ) کے مکان پر ہر رات کو طالب علم جمع ہوتے تھے ، کیونکہ انہیں دن کے اوقات میں کام سے فراغت نہ تھی ۔ طلبہ کے اسی گروہ میں ابن سینا کے مشہور شاگرد الجرجانی نے ان سے 'کتاب الشفا' پڑھی[4] ۔

علماء کی یہ جماعت فکر معاش سے آزاد تھی ۔ اس کے افراد کے لیے حسب منزلت 'معالیم' یعنی ادرار ، وظیفے اور تنخواہیں مقرر تھیں ۔ اس طبقے کو معاشرے میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور انہیں خاص مراعات اور حقوق حاصل تھے ۔ وضاحت کے لیے دو ایک مثالیں کافی ہونگی ۔

---

۱ ۔ کشف الظنون ، ۲ : ص ۳۸۴ ۔

۲ ۔ منتخب التواریخ ، ۱ : ص ۳۲۳ ۔

۳ ۔ تعلیم المتعلم ، ص ۷ ۔

۴ ۔ ابن ابی اصیبعة : عیون الانباء ، ۲ : ۴ ۔ ابن القفطی : تاریخ الحکماء [illegible]

واعظ ناصرالدین الترمذی ، جب سلطان محمد تغلق (م - ۱۳۵۱ء/۷۵۲ھ) کے عہد میں دہلی آیا تو سلطان نے اسے ایک لاکھ دینار نقد کا تحفہ دیا - پھر اس کے لیے سفید صندل کا ایک منبر بنوایا جسے سونے کے تاروں اور میخوں سے مرصّع کروایا اور بالائی حصہ میں یاقوت کا ایک بڑا ٹکڑا جڑوایا - ناصرالدین نے اسی منبر پر سے سلطان کی عطا کردہ پُرتکلّف خلعت پہن کر وعظ بیان کیا - وعظ کے بعد سلطان اٹھ کر ناصرالدین سے بغل‌گیر ہوا اور ہاتھی پر سوار کرا کے اسے کم خواب اور ریشم کے خیمے میں اتارا - یہ خیمہ سونے کے برتنوں سے مزّین تھا - یہ سب سامانِ آرائش سلطان نے ناصرالدین کو عطا کر دیے[1] -

امیر تاج الدین الدز المعزّی نے اپنے بیٹوں کے لیے ایک 'دانشمند' کو اتالیق مقرر کر رکھا تھا - ایک بار اس اتالیق نے ایک بچے کو اس طرح پیٹا کہ وہ راہیٔ ملک بقا ہوگیا - اتالیق کو فی‌الفور الدز کے سامنے پیش کیا گیا - الدز نے پوچھا ، ''ارے مسکین تو نے یہ کیا کیا'' ؟ اس نے جواب دیا ، ''واللہ مجھ سے تو صرف تأدیب سرزد ہوئی'' - الدّز نے فوراً اتالیق کو کچھ رقم دے کر فارغ کر دیا اور کہا ، ''اب تو غائب ہو جا ورنہ بچے کی ماں جو صبر کی طاقت نہیں رکھتی تجھے مروا ڈالے گی اور میں تیری مدد نہیں کر سکوں گا[2]'' -

'درجۂ 'فضل' کی تعلیم کا اصل مقصد یہ تھا کہ طالبِ علم میں خود سوچنے اور دوسرے مفکّرین کی سوچی ہوئی باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے - اس عرصۂ تعلیم میں شاگرد ''مفارضہ'' یعنی سوال و جواب اور ردّ و قدح کرتا تھا اور بحث و تحقیق میں حصہ لیتا تھا - شمس‌الدین یحیٰی بن یحیٰی نے اپنے دور کا طریقۂ تعلیم بیان کیا ہے :

''شبہات تحقیق می کردیم ، و آنچہ لوازم آن سبقہا بودی از شبہات و قیود مستحضر می کردیم[3]''

مشہور علماء کے تراجم میں اکثر ایسے فقرے ملتے ہیں : فلاں کتاب را از فلان بحث کردم'' یا ''تحقیق کردم''[4] -

اس دور کی درسگاہوں میں تعلیم و تدریس کا طریقہ بالعموم 'املاء' پر مبنی تھا - استاد اپنی مسند ، منبر (یا کرسی/تخت) پر بیٹھ جاتا تھا اور اپنے خاص فن کے مسائل زبانی بیان کرتا جاتا تھا - شاگرد دوات قلم لے کر بیٹھتے تھے اور ان تحقیقات کو

---

۱ - نزهة الخواطر ، ۲ : ص ۱۳۰ -
۲ - فرشتہ ، ۱ : ص ۱۱۱ -
۳ - سیرالاولیاء ، ص ۲۲۶ -
۴ - منتخب التواریخ ، ۱ : ص ۳۱۵ -

استاد کے خالص لفظوں میں لکھتے چلے جاتے تھے - اس طرح ہر ایک کے پاس مستقل کتاب تیار ہو جاتی تھی - یہ کتاب یک گونہ تعلیقات کا درجہ رکھتی تھی - ایسے عرف عام میں 'اکالی' کہتے تھے - اگر حلقۂ درس میں طلبہ کی تعداد زیادہ ہوتی تو استاد کے دائیں یا بائیں چند افاضل کھڑے ہو جاتے تھے جو دور والوں کو استاد کے خاص الفاظ دھرا کر سنا دیتے تھے ، انہیں 'مستعلی' کہتے تھے[1] - استاد جب درس دے چکتا تو سب سے ذہین شاگرد تکرار کے طور پر اپنے ساتھیوں کے روبرو استاد کا سبق دہراتا - یہ 'معید' کہلاتا تھا[2] - مولانا شمس الدین محمد بن محمود الخوارزمی سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد کا مشہور 'معید' تھا[3] -

درجۂ 'فضل' کا نصاب بھی عام طور پر ہرجگہ یکساں تھا - الزمخشری کی 'الکشاف' برہان الدین المرغینانی کی 'الہدایۃ' ، القاضی البزدوی کی 'کنز' ،الصغانی کی 'مشارق الانوار' اور البغوی کی 'مصابیح السنۃ' بڑی محنت سے پڑھائی جاتی تھیں - 'الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التأویل' (تألیف ۱۱۳۴ء/۵۲۸ھ) ایک عدیم النظیر تفسیر ہے - 'محاسن النکت' اور 'لطائف المعانی' جو الزمخشری نے 'قرآن حکیم' میں استخراج کیے ہیں اور اسرار بلاغت ، اسالیب اور محاورات قرآنیہ کی جو تحقیق اس نے کی ہے ، اس کے اعتبار سے یہ تفسیر منفرد حیثیت کی حامل ہے - چنانچہ باوجود رنگ اعتزال کے جو اس کتاب میں غالب ہے اس کی دھوم مشرق بعید سے مغرب تک پہنچتی ہے[4] - برہان الدین المرغینانی (م - ۱۱۹۷ء/۵۹۳ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب 'الہدایۃ' (تالیف ۱۱۷۸ء-۱۱۹۰ء/۵۷۳ھ-۵۸۶ھ) ان کی اپنی 'بدایۃ المبتدی' کی شرح ہے اور حنفی فقہ کی مستند اور متداول کتاب ہے[5] - البزدوی (م - ۱۰۸۹ء/۴۸۲ھ) کی 'کنزالوصول إلی معرفۃ الاصول' جو عام طور پر 'اصول البزدوی' کے نام سے معروف ہے ، اصول فقۂ حنفی کی جلیل الشّان ، رفیع البرہان اور مقبول عالم کتاب ہے[6] - امام اللغۃ رضی الدین الصغانی اللاھوری (م - ۱۲۵۲ء/۶۵۰ھ) کی 'مشارق الانوار' جو 'الصحیحین' کی ۲۲۴۶ قولی احادیث کا مجموعہ ہے اور خلیفہ المستنصر کے لیے لکھی گئی ، بہت مقبول اور

---

۱ - وفیات الاعیان ، (طبع دیسلان) ، جلد ۱ ، علامہ -

۲ - یہ کلمہ ''معید'' اسمائے حسنیٰ سے نہیں جو انہ ھو یبدی (قرآن مجید ، سورۃ البروج ، ۹) پر مبنی ہے -

۳ - نزہۃ الخواطر ، ۲ : ص ۱۳۱ -

۴ - کشف الظنون ، ۲ : ص ۳۱۰ ، ۳۱۱ -

۵ - ایضاً ، ۲ : ص ۶۴۸ ببعد -

۶ - ایضاً ، ۱ : ص ۱۱۴ -

متداول کتاب ہے[1] ۔ البغوی الشافعی (م - ۱۱۲۲ء/۵۱۶ھ) کی 'مصابیح السنۃ' ۴,۷۱۹ احادیث پر مشتمل ہے جن میں سے ۱.۰۵۱ حدیثیں 'الصحیحین' سے ہیں اور باقی دیگر کتب سے[2] ۔

نصاب کی انہیں کتابوں کا ذکر ہمیں جا بجا علماء کے تذکروں میں ملتا ہے ۔ مثلاً مشہور شاعر قاضی عبدالمقتدر الشریحی الکندی (م - ۱۳۸۹ء/۷۹۱ھ) نے شمس الدین محمد بن یحییٰ الادی (م - ۱۳۴۷ء/۷۴۷ھ) کے ہاں درسی کتابیں پڑھیں ۔ پھر ان کے بھائی نصیر الدین محمود الاودی (م - ۱۳۵۶ء/۷۵۷ھ) کے ہاں 'الکشّاف' اور البزدوی کی 'کتاب الاصول' وغیرہ پڑھیں اور علومِ متعارفہ کی تحصیل میں بہت مستعدی کا ثبوت دیا اور بحث و اشغال سے اپنے علم کو پختہ کیا[3] ۔ شیخ قاسم بن عمر دہلوی ، جو شیخ نظام الدین بدایونی کی ہمشیرہ کی اولاد سے تھے ، قرآن مجید حفظ کر لینے کے بعد مولانا جلال الدین دہلوی[4] کے ہاں تعلیم پاتے رہے ۔ انہوں نے بھی 'الھدایۃ' ، البزدوی کی 'کنز المشارق' اور 'الکشّاف' وغیرہ انہیں سے پڑھیں[5] ۔ شیخ نصیر الدین محمود بن یحییٰ الاودی نے بھی ، جو ۹ سال کی عمر میں یتیم ہوگئے ، دہلی میں 'الھدایۃ' 'اصول البزدوی' اور دیگر درسی کتب کے علاوہ 'بحث و اشتغال' سے ۲۵ سال کی عمر میں فارغ[6] ہوگئے ۔ جلال الدین الحسین بن احمد البخاری الاچی (م - ۱۳۸۳ء/۷۸۵ھ) نے ابتدائی تعلیم کے بعد ملتان جاکر شیخ رکن الدین ابوالفتح اور مجد الدین ملتانی کے ہاں یہ تمام درسی کتابیں پڑھیں اور ایک سال میں فارغ ہوگئے[7] ۔

اسی دور میں علماء کی تصوّف سے دلبستگی بڑھنے لگی ۔ وہ عام درسی کتب کے علاوہ 'عوارف' اور 'تعرّف' جیسی کتابیں اضافی مطالعہ کے طور پر پڑھنے لگے ۔ مثلاً سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء (م-۱۳۲۵ء/۷۲۵ھ) نے شمس الدین الخوارزمی سے 'الحریری' کے چالیس مقامات پڑھے بلکہ انہیں حفظ کرلیا[8] ۔ پھر کمال الدین الماریکلی (م - ۱۲۸۵ء/۶۸۴ھ[9]) کے ہاں الصّغانی کی 'مشارق الانوار' پڑھی اور تصوّف کے اصول سیکھنے کے

---

۱ - نزھۃ الخواطر ، ۲ : ص۴۳۶ -
۲ - ایضاً ، ۲ : ص۱۷ -
۳ - جلال الدین سلطان علاء الدین خلجی کے عہد کے عالم تھے (نزھۃ ، ۲ : ص۲۳) -
۴ - نزھۃ الخواطر ، ۲ : ص۱۱۳ -
۵ - جلال الدین سلطان علاء الدین خلجی کے عہد کے عالم تھے(نزھۃ ، ۲ : ص۱۵۹ -
۶ - نزھۃ الخواطر ، ۲ : ص۲۸ -
۷ - جلال الدین سلطان علاء الدین خلجی کے عہد کے عالم تھے - (نزھۃ ، ۲ : ص۲۳) -
۸ - نزھۃ الخواطر ، ۱ : ص۲۰۴ -
۹ - ابوشکور ، پانچویں صدی ہجری(گیارھویں صدی عیسوی) کے ایک صوفی عالم تھے-(بروکلمن، تکملہ ، ۱ :ص۷۴۴) -

لیے شیخ کبیر فرید الدین (م - ۱۲۶۵ء/۶۶۴ھ) کے پاس پاکپٹن میں گئے اور قرآن مجید کے چھ پارے مع التفسیر پڑھ کر ابو شکور محمد بن عبدالسیّد السّالمی[1] کی 'کتاب التمہید فی بیان التوحید' اور السہروردی (م- ۱۲۳۴ء/۶۳۲ھ) کی 'عوارف المعارف' پڑھیں[2] -

علاء الدین علی بن اسعد الدہلوی نے جلال الدین الحسین البخاری الاچی (م - ۱۳۸۳ء/۷۸۵ھ) سے جب وہ دہلی میں تشریف لائے بہت فیض حاصل کیا اور ان سے القدوری کی 'المختصر' کا کچھ حصہ ، 'مجمع البحرین' ، 'اصول البزدوی' ، 'العقائد النسفیۃ' ، 'المدارک (فی التفسیر)' ، 'العوارف' ، 'الرسالۃ المکیۃ' اور تصوّف کی چند اور کتابیں پڑھیں[3]- 'العقائد' نجم الدین عمر بن محمد الماتریدی النسفی (م- ۱۱۴۲ء/۵۳۷ھ) کی ایک مقبول کتاب ہے - اس میں اشاعرہ کے مسلّمہ مسائلِ اعتقاد کو نہایت اختصار اور جامعیّت سے لکھا گیا ہے - اس پر التفتازانی (م- ۱۳۸۹ء/۷۹۱ھ) کی شرح بہت معروف ہے اور اب تک داخلِ نصاب ہے - 'مدارک التنزیل' ، ابوالبرکات عبداللہ احمد النسفی(م- ۱۳۱۰ء/۷۱۰ھ)کی تالیف ہے اور 'الکشّاف' کی طرز پر ایک مختصر تفسیر ہے - 'التعرّف' محمد بن اسحاق الکلاباذی (م- ۹۹۰ء/۳۸۸ھ) کی مشہور تالیف ہے اور تصوّف سے متعلق ہے -

اسی طرح منطق ، فلسفہ اور علم الکلام سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ ان فنون کے ماہرین کی خدمت میں جا پہنچتے اور ان کے چشمۂ فیض سے اپنی تشنگی بجھاتے - یہ سر زمین ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں بھی علومِ حکمیہ کے ماہرین سے خالی نہ تھی - قاضی اسمٰعیل بن علی السندی المؤرخ[4]، حکیم حمید الدین المطرّزی[5] اور بلبن کے دور کا حکیم عبدالعزیز بن محمد الدمشقی ، جو علامہ فخرالدین الرّازی کا شاگرد تھا ، سبھی علومِ حکمیہ کے ماہر تھے[6] - ایک حکیم کمال الدین افلاطون بن عبداللہ الہندی بھی ۱۲۸۶ء/۶۸۵ھ میں مراغہ میں وارد ہوا اور دروسِ حکمیہ کی تحصیل کے لیے علامہ نصیرالدین الطوسی کی خدمت میں جا پہنچا[7] -گویا یہاں کے لوگوں میں علومِ حکمیہ سے بہرہ مند ہونے کا شوق بیدار ہوچکا تھا - آٹھویں صدی ہجری (چودہویں صدی

---

۱ - ابوشکور پانچویں صدی ہجری (گیارھویں صدی عیسوی) کے ایک صوفی عالم تھے (بروکلمن، تکملہ ، ۲ ص ۱۰۴ -

۲ - نزہۃ الخواطر ، ۱ ص ۲۳۴ ، ۲ ص ۱۲۲ - ۱۲۳ -

۳ - ایضاً ۲ ص ۱۰۴ -

۴ - ایضاً ۱ ص ۱۲۵ -

۵ - ایضاً ۱ ص ۱۴۶ -

۶ - ایضاً ۱ ص ۱۷۴ -

۷ - ابن الفوطی ، الحوادث الجامعہ -

عیسوی) کے وسط سے یہاں معقولات کی تعلیم کی طرف توجہ شروع ہوئی ۔ محمد بن تغلق شاہ (عہد حکومت ۱۳۲۵ء - ۱۳۵۱ء/۷۲۵ھ-۷۵۲ھ) نے اس فن کی طرف بہت رغبت اور میلان کا اظہار کیا[1] ۔ چنانچہ اس کے دور میں معین الدین العمرانی ، جو منطق اور کلام میں بہت ماہر تھے اور علم الدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ محمد بن تغلق شاہ نے تو مقدم الذکر کو بہت سے تحائف دے کر شیراز بھیجا تاکہ عضدالدین الایجی (م - ۱۳۵۵ء/۷۵۶ھ) کو ہندوستان آنے کی دعوت دیں ۔ صدر الدین محمد بن یوسف الحسینی ۱۳۳۷ء/۷۳۷ھ میں اگرچہ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے مگر مزید تعلیم کے لیے دولت آباد سے دہلی چلے گئے وہاں انہوں نے قاضی عبدالمقتدرالشریحی سے 'الھدایۃ'، 'اصول البزدوی'، 'الکشاف' اور دیگر درسی کتب کے علاوہ 'الشمسیۃ'، 'الصحائف' اور السکاکی کی 'مفتاح العلوم' پڑھیں[2] ۔ 'الشمسیۃ' منطق پر ایک مختصر سا رسالہ ہے جو نجم الدین عمر بن علی القزوینی (م - ۱۲۹۴ء/۶۹۳ھ) کی تصنیف ہے ۔ بعد کو یہ مختصر متن قطب الدین الرازی (م - ۱۳۶۴ء/۷۶۶ھ) اور السید الشریف الجرجانی (م - ۱۴۱۵ء/۸۱۸ھ) کی شرحوں کے ساتھ بہت مقبول ہوا ۔ یہ شرحیں 'قطبی' اور 'میر قطبی' کے نام سے معروف ہیں ۔ الصحائف (الالہیۃ فی الکلام) شمس الدین محمد بن اشرف الحسینی السمرقندی (متوفی حدود ۱۲۰۴ء/۶۰۰ھ) کا ایک مختصر رسالہ ہے جو عقائد سے متعلق ہے ۔ 'مفتاح العلوم' دراصل علوم عربیہ کے متداول فنون پر مشتمل ہے ۔ السکاکی نے ہر فن کے اصول مہمہ نہایت جامعیت کے ساتھ بیان کیے ہیں ۔ اس کا ہر باب ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے ۔

ظاہر ہے کہ یہ اسلامی فتوحات کا زمانہ تھا ۔ عوام کی دینی یعنی روزمرہ کی ضرورتوں اور ملک داری کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نظام تعلیم میں فقہ بالخصوص فقہ حنفی کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ۔ توسیع مملکت کے ساتھ ساتھ تبلیغ اسلام کا سلسلہ بھی جاری رہا مگر تبلیغ کا سب سے مؤثر ذریعہ یہاں کے صوفی علماء کا اپنا کردار تھا ۔

علماء کے ہاں تصوف کا شوق دراصل گیارھویں صدی عیسوی میں پیدا ہوا ۔ اس فن شریف کے امام اعظم ابوالقاسم القشیری (م - ۱۰۷۲ء/۴۶۴ھ) نے اپنے رسالے میں نہ صرف ان اعتراضات کا رد پیش کیا جو عام طور پر تصوف اور صوفیہ کرام پر عائد کیے جاتے تھے بلکہ یہ بھی ثابت کیا کہ تصوف شریعت اور سنت سے جدا نہیں ۔ کچھ ایسی ہی کوشش داتا گنج بخش علی الھجویری اللاھوری (م - ۱۰۷۳ء/۴۶۵ھ) نے

---

۱ - سیر المتاخرین ، ۱ ص ۲۲۴ -

۲ - نزھۃ الخواطر ، ۲ ص ۱۵۳ -

عوامی زبان فارسی میں کی اور اس نظریے کو افغانستان، خراسان اورشمالی ہند کے علماء میں زیادہ مقبول بنا دیا۔ بارھویں صدی عیسوی میں فلسفۂ تصوف پورے طور پر مدوّن و مرتب ہوگیا۔ اس دور میں امام ابوحامد الغزالی (م - ۱۱۱۱ء/۵۰۵ھ) نے علمی اعتبار سے تصوّف کو ایک مستقل فن کی شکل دے دی اور شیخ عبدالقادر الجیلانیؒ (م - ۱۱۶۷ء/ ۵۶۱ھ) نے تصوّف کے عملی پہلو پر زیادہ زور دیا اور اس تحریک میں نئی زندگی بھر دی۔ اسی طرح شیخ شہاب الدین السہروردیؒ نے اصلاح و تربیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک روحانی سلسلے کی داغ بیل ڈالی۔ شیخ سہروردی نے اپنی 'عوارف' میں تصوف کے مبادیات، خانقاہوں کی تنظیم، مرید و شیخ کے تعلّقات وغیرہ پر تفصیلی بحث کی ہے۔ یہ تحریک عوام کے لیے نہایت جاذب تھی۔ ادھر شیخ اکبر محی الدین ابن العربی (م - ۱۲۴۰ء/۶۳۸ھ) نے ایک نیا فلسفہ پیش کیا جس کا مرکزی نقطہ 'وحدۃ الوجود' تھا یعنی اللہ کے سوا کائنات میں کوئی چیز موجود نہیں۔ یہ نظریہ خوّاص کو یعنی اسلام کے بہترین دانشوروں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہا۔ منجملہ دیگر نتائج و اثرات کے اس تحریک نے اہلِ اسلام کے دلوں سے تنگ نظری اور تعصّب کو دھوڈالا۔ اس فلسفے کا یہ پہلو اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں بہت مفید رہا۔ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کا قول ہے کہ:

"ایں قوم (ہندو) را چنداں بکلفتِ کسی دل نہ گردد۔ امّا اگر صحبتِ صالح بیابد امید باشد کہ بہ برکتِ صحبتِ او مسلمان شود[1]"۔

علماء کے ساتھ ساتھ شعراء نے بھی تصوّف کی بڑی خدمت کی ہے۔ درحقیقت تصوّف کو عوامی تحریک بنانے کا سہرا شعراء ہی کے سر باندھا جاتا ہے۔ شعراء نے اپنے دلگداز اشعار سے صوفیانہ خیالات کی خوب اشاعت کی۔

ادھر جب تاتاریوں کی پے بہ پے یلغاروں سے مسلمانوں کا سیاسی نظام درہم برہم ہوگیا، لوٹ مار اور قتل و غارت سے سینکڑوں پُر رونق شہر خاک کا ڈھیر ہوگئے اور دیہات کے سرسبز و شاداب کھیتوں میں فصلوں کی جگہ خاک اڑنے لگی، صنعت و حرفت کے مرکز تباہ ہوگئے اور تجارت کے وسائل یکسر معطل ہوگئے، خانقاہیں برباد اور مدرسے ویران ہوگئے تو ان درد ناک نوائب و نوازل کو دیکھ کر طبیعتیں خود بخود تصوّف کی طرف جھک گئیں۔ یہ انقلاباتِ روزگار صوفیہ کی آنکھوں کے سامنے گزرے۔ کہیں اسلامی فتوحات کا سلسلہ کہیں راجاؤں کی یورشیں اور کہیں مقامی امراء کی سازشیں، یہ عجب افراتفری اور نفسانفسی کا دور تھا۔ ان علماء نے تصوّف کے میٹھے راگوں سے عوام کی دلجوئی کی۔ ان کی پریشان نظری کا علاج کیا، انہوں نے علم کی

---

۱ - فوائد الفؤاد، ص ۱۸۲ -

نئی شمع روشن کی جس نے تشحیذِ دماغ کے ساتھ ساتھ دل کی تربیت کا سامان بھی مہیا کیا ۔ آہستہ آہستہ طبیعتیں مجتمع ہونے لگیں اور ذہن ایک مرکز پر آنے لگے ۔ اخلاق سدھرنے لگے اور معاشرتی حالات مائل بہ اعتدال ہوگئے ۔

فراخنائے ہند میں صوفیہ کا سب سے زیادہ مقبول طبقہ اصحابِ چشت کا ہے ۔ اس سلسلے کے پہلے بزرگ جنہوں نے یہاں آ کر علم اور محبت کی جیوت جلائی خواجۂ بزرگ معین‌الدین حسن السجزی الاجمیریؒ ہیں جو لاہور اور دہلی سے ہوتے ہوئے ۱۱۸۴ء/۵۸۰ھ کے لگ بھگ اجمیر (راجپوتانہ) میں وارد ہوئے جبکہ یہاں ہندوؤں کا راج تھا ۔ خواجۂ بزرگ کی صحبتِ فیض باز سے متاثر ہو کر خلقِ کثیر مشرف بہ اسلام ہوئی ۔ بعد کو جب ایبک اور معزالدین الغوری نے اجمیر فتح کیا تو وہاں حسین خنگ سوار (م ۔ ۱۲۱۱ء/۶۰۷ھ) کو والی مقرر کیا ۔ اس کے زمانے میں بھی صنم پرستوں کی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا[۱] ۔ خواجہ معین‌الدینؒ کے خلفاء میں سے ان کے صاحبزادے فخرالدین بن معین‌الدین ، خواجہ قطب‌الدینؒ بختیار الاوسی ، قاضی حمیدالدین الناگوریؒ ، شیخ وجیہہ‌الدینؒ اور سلطان التارکین حمیدالدین صوفیؒ کے نام بیان کیے گئے ہیں ۔ اس دور کے دیگر اہم خواجگانِ چشت میں شیخ کبیر فریدالدین شکرگنج مسعودؒ اور سلطان المشائخ نظام‌الدین اولیاءؒ کے اسمائے گرامی ، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔

اگر ان بزرگوں کی تعلیمات کا طائرانہ جائزہ لیا جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا محورِ عمل اشتغال بالقرآن تھا ۔ چنانچہ اس سلسلے میں قرآن مجید کے حافظ ، مقریٔ اور عامل بالقرآن کی کثیر تعداد کو دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے ۔ خواجۂ بزرگ اجمیری خود حافظِ قرآن تھے[۲] ۔ خواجہ بختیار کاکیؒ (کعکی) نے قرآن مجید حفظ کر رکھا تھا[۳] ۔ سلطان المشائخؒ اور ان کے مریدوں کا ایک لامتناہی سلسلہ سبھی حافظ تھے ۔ ان کا 'جماعت خانہ' دراصل 'مدرسة الحفّاظ' تھا[۴] اور اس کام پر مولانا علاءالدین الاندپتی کو خاص طور پر مامور کیا گیا تھا[۵] ۔ وہ اپنے مریدوں کو ہمیشہ یہی تلقین فرماتے تھے، ''قرآن یادگیر'' ۔ شاعر حسن علاء سجزی جو سپہ سالار بھی تھے حافظِ کلامِ ربّانی بھی تھے[۶] ۔ اس کے علاوہ امیر خسرو اور مولانا ظہیرالدین کوتوال مندو سبھی

۱ ۔ نزهة الخواطر ، ۱ : ص ۱۳۲ ۔
۲ ۔ مناقب العارفین ، ص ۲۵۰ ۔
۳ ۔ فوائد الفواد ، ص ۹۷ ۔
۴ ۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ، ۱ : ص ۱۵۹ ۔
۵ ۔ سیرالاولیاء ، ص ۳۱۶ ۔
۶ ۔ فوائد الفواد ، ص ۹۳ ۔

حافظ تھے[1] ۔ احمد نہروالی عرف مادھو حافظ قرآن تھے[2] ۔ مشائخ چشت نے 'فہم قرآن' پر بہت زور دیا ۔ سلسلہ چشتیہ ناگوریہ حمیدیہ نے تفسیر 'مدارک' کو داخل نصاب رکھا اور اسی تفسیر کے درس کو سلوک کا طریقہ بنا کر اپنے سلسلے میں رائج کیا ۔ انہوں نے عربی ادب کی بھی خدمت کی اور تصوف پر عربی میں چند مستقل تصنیفات چھوڑیں ۔ مثلاً شمس الدین ناگوری سوالی (م - ۱۲۷۴ء/۶۷۳ھ) نے 'اصول الطریقة' اور حمیدالدین ناگوری (م - ۱۲۷۵ء/۶۷۳ھ) نے 'طوالع الشموس' اور 'اللوائح' تصنیف کیں ۔ شیخ جمال الدین احمد خطیب ہانسی (م - ۱۲۶۰ء/۶۵۹ھ) کی 'ملہمات' ، ابن التاج الملتانی (وفات بعد ۱۳۳۵ء/۷۳۶ھ) کی 'نسبة خرقة التصوف' اور 'الذکر الاکبر' مشہور ہیں ۔ مختلف علماء نے سہروردی کی 'عوارف' پر شرحیں اور حاشیے لکھے ۔

سہروردیہ سلسلے کے صوفیہ نے بھی اپنے طور پر خوب خدمت کی اور چشتی صوفیہ سے ان کے تعلقات ہمیشہ برادرانہ رہے ۔ اس دور میں زکریا ملتانی[3] ، مبارک غزنوی ، محمد بن عطاء ، حمیدالدین ناگوری ، شرف الدین عراقی ، سلیمان بن عبداللہ کنتوری ، شہاب الدین جگ جیوت خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ اسی زمانے میں سلسلہ فردوسیہ کے بھی چند علماء یہاں آئے ۔ مثلاً بدرالدین سمرقندی اور رکن الدین دہلوی ۔ قلندری سلسلے میں بھی یہاں کے چند نامور عالم منسلک رہے ہیں ۔ مثلاً ابوبکر طوسی ، ابراہیم ہمدانی اور حمیدالدین قلندری دہلوی ۔

یہ مناسب ہوگا کہ یہاں علم کے ایک ایسے خاموش اور بے زبان خادم کا ذکر بھی کر دیا جائے جو اپنے کاغذی پیرہن میں صدیوں سے فریاد کر رہا ہے کہ میری خدمات کا کچھ تو صلہ ملنا چاہیے ۔ تاریخ ادب کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ 'کاغذ' نے علم کو عام کرنے میں علماء کی بہت مدد کی ہے ۔

معروف ہے کہ مسلمان اس ملک میں آئے تو اپنے ساتھ کاغذ بھی لائے ۔ جس شہر کو علماء نے اپنا وطن بنا لیا وہاں کاغذ سازوں ، وراقوں ، جلد سازوں اور خوشنویسوں کی ایک اضافی بستی بھی قائم ہو گئی ۔ جیسے جونپور کے پاس ظفرآباد کی بستی تھی ، جس میں پانچ سو دکانیں کاغذ بنانے کی تھیں ۔ جو کاغذ یہاں بنتا تھا اس کی اقسام ، ارولی ، نصیری ، پیرانندی ، راسی ، موٹھا ، پتنگی ، چوکھٹا اور سلم کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے[3] ۔ چنانچہ ان علماء کی بدولت کتابت اور کتاب سازی بھی یک گونہ دین کا جزو بن گئی ۔

---

۱ - سیرالاولیاء ، ص ۱۷ -

۲ - فوائد الفواد ، ص ۱۷۴ -

۳ - مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ، ۱ ; ص ۹۲ -

یہ حقیقت ہے کہ یہاں کے لوگ ایک زمانے تک نہ کاغذ سے واقف تھے نہ شیرازہ بندی سے آشنا ۔ ابوالفضل نے سنسکرت ، تامل اور پالی کی قدیم ''پوتھیوں'' کے متعلق لکھا ہے :

''پیشتر بر برگ سار و توز بفولادی قلم بر نوشتہ و امروز بر کاغذ در نوشتن از چپ آغازند و ورق پیوستہ نباشد و شیرازہ رسم نہ بود''[1] ۔

یہاں قدیم زمانے میں تاڑ کے پتوں کو تراش کر گول کر لیا جاتا تھا ۔ پھر لوہے کے قلم کی نوک سے مسطر لگا لیے جاتے تھے اور سنبھالو یا ایسے کوئی عرق‌دار پتوں کو ہاتھوں میں مسل کر تاڑ کے پتوں پر پھیر دیا جاتا تھا جس سے کتابت کے لیے نشانات نمایاں ہو جاتے تھے ۔ ایسے نیس چالیس پتوں کا ایک مجموعہ تاگے میں پرو لیا جاتا تھا ، اسے ''پوتھی'' کہتے تھے[2] ۔ پھر ایک ایک پوتھی الگ الگ ڈبیہ میں محفوظ کر لی جاتی تھی ۔

تـُوز کا درخت جسے یہاں کی زبان میں بھوج پتر (Birch Papyraeca) کہتے ہیں کشمیر کے پہاڑوں میں آٹھ نو ہزار فٹ کی بلندی پر ملتا ہے ۔ اس درخت کے پوست کا کچھ حال 'محیط اعظم' اور طب کی دوسری کتابوں میں ملتا ہے :

''و آن پوست درخت ہندی کشمیری ذی طبقات کثیرہ مثل طبقاتِ ابرک بود ۔ ہر طبقہ مثل کاغذ و خطوط مستقیم سرخ و سفید مثل الف بر آن کشیدہ و مردم کشمیر بر آن کتاب می نویسند و درخت او بزرگ می شود و ہر برگہائے او نقطہ''[3] ۔

بھوج پتر نہایت مضبوط کاغذ ہے اور اسے کمان پر بھی چڑھایا جاتا تھا ۔ اس کے چھال کی چھت صدیوں تک خراب اور بوسیدہ نہیں ہوتی[4] ۔ کشمیر کے لوگ آج کل بھی مکھن کو اس کاغذ میں لپیٹ کر زمین میں دفن کر دیتے ہیں اور اس طرح مکھن کئی سال تک محفوظ رہتا ہے ۔

سلاطینِ دہلی کے دورمیں شام اور عراق کا کاغذ جو دبیز ہوتا تھا، استعمال کیا جاتا تھا ۔ سمرقندی کاغذ باریک اور چکنا ہونے کی بنا پر قدرے مہنگا تھا ۔ مقامی طور پر ہندوستان میں بھی کاغذ بننے لگا ۔ کالپی کاغذ بہت مشہور ہوا لیکن یہ جاندار نہ

---

۱ ۔ آئین اکبری ، ۲ : ۴۸ ۔
۲ ۔ تحقیق ماللہند ، ۸۱ ۔
۳ ۔ محیط اعظم ، ۱ : ۳۸۲ ۔
۴ ۔ Encyclopaedia Britannica (طبع نہم) ، ۳ ; ۶۹۸ ۔

تھا کہ ''کالپی کاغذ در آب زود متلاشی می گردد[1]''۔ البتہ کشمیر کا کاغذ مضبوط تھا :

''نقوش آن از کاغذ شستن چنان می رود کہ ہیچ اثری از سیاہی[2] نماند''۔

سلطان المشایخ نے سفید کاغذ کا بھی ذکر کیا ہے :

''مردی مرا کاغذہا سپید داد ؛ یک جا جلد کردہ من آن رابستدم ، فوائد شیخ ہم‌در آنجا ثبت کردم[3]''۔

اس زمانے میں کاغذ بقدرِ ضرورت عام مل جاتا تھا ۔ شیخ عثمان سراج‌الدین بھی جب بنگالہ سے چل کر دہلی آئے تو اپنے ساتھ کتاب اور کاغذ کے سوا کچھ سرمایہ نہ رکھتے تھے :

''کاغذ و کتاب خود کہ جز آن دیگر رختے نداشت[4]''۔

قرآنِ کریم کا ایک نسخہ ایک تنکے میں بھی مل جاتا تھا[5] ۔ بلکہ ورّاق گاہکوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے ۔ ایک بار شیخ فریدالدین شکر گنج کے بھائی شیخ نجیب‌الدین متوکل کو عوفی کی 'جوامع الحکایات' کے نسخے کی ضرورت پڑی مگر تنگدستی کی بناء پر اس کتاب کی نقل کا انتظام نہ کر سکے ۔ حمید نامی ایک ناقل شیخ نجیب کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ انہوں نے 'جوامع الحکایت' کی نقل کی فرمائش کی اور اپنی عسرت کی طرف بھی اشارہ کر دیا ۔ حمید نے کہا : ''حالے چہ موجود داری'' ۔ شیخ نجیب نے کہا : ''یک درم'' ۔ حمید نے اس درم کو غنیمت جانا اور کاغذ خرید کر کتابت میں مشغول ہو گیا[6] ۔ درسی کتابوں کے نسخے تو ہر کوچہ و بازار میں دستیاب ہو سکتے تھے[7] ۔

ان دو صدیوں میں ہندوستان کی علمی سرگرمیوں کا جائزہ لینے سے پیشترعالمِ اسلام کے معاصر علماء کی خدمات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا مفید رہے گا ۔ جہاں تک عربی ادب کا تعلق ہے ہمیں اس دور میں ایران اور بالخصوص خراسان اور ماوراء النہر میں قاضی نظام‌الدین اصفہانی (م - ۱۲۷۹ء/۶۷۸ھ) کے سوا کسی بلند پایہ شاعر کا نام نہیں ملتا ۔

---

۱ - مآثر الکرام ، ۸۵ -
۲ - منتخب التواریخ ، ۳ : ۱۴۴ -
۳ - فوائد الفواد ، ۳۱ -
۴ - سیرالاولیاء ، ۳۸۸ -
۵ - فوائد الفؤاد ، ۱۱۰ -
۶ - فوائد الفؤاد ، ۲۸ -
۷ - منتخب التواریخ ، ۳ : ۲۸۵ -

تاتار کے تصادم کی تاب نہ لا کر نامور شعراء ادھر ادھر بکھر گئے - البتہ عراق ، شام اور مصر میں شعر و ادب کی گرم بازاری رہی - کمال الدین المبارک ابن الشعار الموصلی (م - ۱۲۵۶ء/۶۵۴ھ) نے 'عقودالجمان' میں اپنے دور کے شعراء کا تذکرہ بڑی محنت سے مرتب کیا ہے[1] - ابن الساعاتی (م - ۱۲۰۷ء/۶۰۴ھ) ، ابن سناءالملک (م - ۱۲۱۱ء/۶۰۸ھ) ، ابن المقرب (م- ۱۲۳۲ء/۶۲۹ھ) اور اس کا بیٹا ، حسام الدین عیسیٰ بن سنجر (م - ۱۲۳۵ء/۶۳۲ھ)، جمال الدین ابن حمیر (م - ۱۲۵۳ء/۶۵۱ھ) ، صدرالدین البصری (۱۲۶۲ء/۶۶۰ھ)، ابو زکریا الصرصری (م- ۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ) ، شہاب الدین التلعفری (م - ۱۲۷۷ء/۶۷۵ھ) ، عفیف الدین التلمسانی (م- ۱۲۹۱ء/۶۹۰ھ) ، کمال الدین ابن الاعمی (م - ۱۳۹۲ء ۶۹۲ھ) ، البوصیری (م- ۱۲۹۶ء ۶۹۳ھ)، شہاب الدین العزازی (م - ۱۳۱۰ء/۷۱۰ھ) ابن الصائغ (م - ۱۳۳۵ء/۷۲۵ھ) ، ابن مکانس (م - ۱۲۹۲ء/۶۹۴ھ) اور ابن حجة الحموی (م - ۱۴۳۴ء/۸۳۶ھ) اس دور کے نامور شعراء ہیں -

اس خطۂ ارض میں وقائع نگاری اور شاہان سلف کی سوانح یا سیاحتنامے لکھنے کا رواج بہت کم تھا - اس موضوع پر سنسکرت یا پالی میں تو کسی کتاب کا سراغ ہی نہیں ملتا[2] - بروکلمن (Brockelmann) نے اپنی Geschichte der arab litteratur میں اس دور کے (بالخصوص سیف تاتار کی تنفیض کے بعد) کسی نامور مؤرخ اور مشہور سیاح کا ذکر نہیں کیا جو ایران و توران سے تعلق رکھتا ہو - ہندوستان میں تاریخ نگاری کا جو کام ہوا وہ بالعموم فارسی میں ہوا - مزید برآں یہ فن مغلوں کے عہد میں زیادہ استقلال کے ساتھ ظہور میں آیا -

فقہ کا تعلق عامة الناس سے ہے چنانچہ ایران و توران کے علماء نے بھی اس علم یعنی فقۂ حنفی کی خوب خدمت کی - اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے بروکلمن کی 'تاریخِ ادبِ عربی' جہاں اساسی مآخذ بھی درج ہیں - ادھر مصر ، عراق ، جزیرہ اور اس کے نواح میں شافعی فقہ پر خوب کام ہوا - تاج الدین السبکی نے اپنی کتاب 'طبقات' میں اس کا مفصل جائزہ لیا ہے - شام میں حنبلی فقہ پر خاصہ کام ہوا - ابن درامة' ابن قیم ، ابن تیمیة اور ابن رجب اس سلسلہ میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں - مالکی فقہ صرف عرب کے چند علماء ہی تک محدود رہا - ایران و خراسان میں حنفی علماء مصروفِ کار رہے تا آنکہ نوروز بیگ اور مفتیٔ بخارا علی علائی حنفی صاحب 'حیرة الفقہاء' کی مساعی جمیلہ سے ۱۲۹۵ء/۶۹۴ھ میں غازان بن ارغون بن چنگیز بھی بدھ مت اور نصرانیت کا اثر قبول نہ کرتے ہوئے اپنے آبائی دین کو ترک کر کے حلقۂ بگوش اسلام ہو گیا[3] - جب سے یہاں حنفی فقہ

---

۱ - اس کا ایک نسخہ استانبول میں موجود ہے (مجموعہ اسعد آفندی ، ۲۳۲۳ - ۲۳۳۰) -

۲ - Encyclopaedia Britannica ۱۱ : ۸۴۳ -

۳ - حیرة الفقہاء ، ورق ۲ الف -

کو اور زیادہ فروغ ملنے لگا ۔ کچھ ایسی ہی کیفیت ہندوستان کے ادب میں بھی پائی جاتی ہے جس کی بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ دور در اصل تبلیغ و تعلیم کا دور تھا ۔ علماء تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے ۔ یہاں علم کے تمام چشمے عامة الناس اور نو مسلموں کی دینی ضرورت کو پورا کرتے تھے یا کسی حد تک حکومت کی ملک داری کے سلسلے میں مدد دیتے تھے ۔ قاضی ، مفتی ، محتسب ، منشی اور متصدّی کی آسامیوں کو پُر کرنے کے لیے انھی علماء کے شاگرد ہوا کرتے تھے ۔ نیز ہندوستان میں کاغذ عام نہ تھا ۔ تالیف کے کام کی رفتار کچھ اس لیے بھی مدھم رہی کہ فارسی عربی کی نسبت بہت آسان زبان ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس دور کے سلاطین اور علماء کی مادری زبان بھی تھی اس لیے شعر و انشاء کے میدان میں طبیعت کی جولانیوں کو فارسی ہی راس آئی ۔ چونکہ علم کے سرچشموں تک رسائی صرف عربی ہی کے طفیل ہو سکتی تھی اس لیے اس دور کی فارسی میں بھی عربیت کا رنگ غالب نظر آتا ہے ۔

ہر اقلیم کے علماء کی توجہ تفسیر و حدیث کی طرف تقریباً یکساں رہی ۔

جہاں تک تصوف کا تعلق ہے دنیائے اسلام کو محی‌الدین ابن العربی ، شہاب‌الدین السہروردی البغدادی ، جلال الدین الرومی (م ۔ ۱۲۷۳ء/۶۷۲ھ) ، صدر الدین قونوی (م ۔ ۱۲۶۳ء/۶۷۲ھ) ، ابن عطاء الشاذلی (م ۔ ۱۳۰۹ء/۷۰۹ھ) اور عفیف الدین الیافعی (م ۔ ۱۳۶۷ء/۷۶۸ھ) کے فیوض کا پورا اعتراف ہے ۔

ذیل میں اس دور کے ممتاز ہندی علماء کی علمی سرگرمیوں کا ذکر کیا جاتا ہے ۔ یہاں ان علماء کے نام ، احوال اور تصنیفات ان کی تاریخِ وفات کے اعتبار سے مرتب نہیں کی گئیں ۔ بلکہ تاریخ کے جس دور میں انہیں ناموری حاصل ہوئی وہیں ان کا ذکر کر دیا گیا ہے ۔

ایبک جب 'مظلة الملوکیہ' کے سائے میں پہلی بار بیٹھا (۱۲۰۶ء/۶۰۲ھ) تو ۶۵ سالہ بزرگ شیخ معین‌الدین چشتیؒ تقریباً بیس سال سے شمع علم کی کرنوں سے اجمیر اور آس پاس کے علاقوں کو روشن کر رہے تھے ۔ ملتان میں رئیس الاولیاء شیخ زکریا بہاؤالدینؒ (م ۔ ۱۲۳۴ء/۶۳۲ھ) سلسلہ سہروردیہ کے رکن اعظم کا چشمۂ فیض جاری تھا ۔ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا 'کشف‌المحجوب' (فارسی) کا ایک عمدہ نسخہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم کے کتب خانے میں موجود ہے ۔ ادھر اجودھن (پاکپٹن) میں ۳۳ سالہ فریدالدین مسعود شکرگنجؒ تعلیم و تربیت میں مصروف تھے ۔ ۷۰/۸۰ سالہ نورالدین المبارک الغزنوی السہروردیؒ (م ۔ ۱۲۳۴ء/۶۳۲ھ) دہلی میں شیخ‌الاسلام تھے ۔ وہ شاہی

دربار میں بڑا اثر رکھتے تھے ۔ شیخ وجیہ‌الدین الکاشانی دہلی میں مقیم تھے اور مملکتِ ہند کے قاضی القضاۃ تھے۔ وہ ۱۲۰۶ء/۶۰۳ھ میں وفات پاگئے[1] اور ان کا بیٹا جلال‌الدین الکاشانی ان کی جگہ قاضی القضاۃ مقرر ہوا[2] ۔ قاضی علی بن عمرالمحمودی نے سلطان ایبک سے اپنی علمی سرگرمیوں کی بنا پر خوب انعام حاصل کیے ۔ ان کے رسائل ہندوستان میں ایک عرصہ تک مشہور رہے ہیں[3] ۔

اسی زمانے میں لاہور کے ایک عالم محمد بن المأمون الشافعی کو ، جو خراسان ، نیشاپور اور بغداد سے ہوتے ہوئے آذر بائیجان کے علاقے میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ کچھ ملحدوں نے ۱۲۰۶ء/۶۰۳ھ میں شہید کر دیا[4] ۔ زنجان کے ایک بزرگ اور عمر رسیدہ شیخ یعقوب بن علی الکاظمی کا چراغِ علم لاہور میں تقریباً ستر سال روشن رہ کر بجھ گیا[5] ۔ اسی عرصہ میں شیخ قاضی قدوۃالدین بن میرک شاہ غزنہ سے آکر اودھ میں مقیم ہو گئے ۔ اس خاندان میں بڑے بڑے علماء اور مشایخ پیدا ہوئے ۔

اس دور کی ایک نہایت درخشندہ شخصیت رضی‌الدین حسن بن محمد الصغانی (= الصاغانی) ہے ۔ وہ اپنے دور کے نامور محدّث اور فقیہہ تھے اور علم اللغۃ کے مشہور امام ہو گزرے ہیں ۔ الصغانی ۱۱۸۱ء/۵۷۷ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے ۔ یہیں نشوونما پائی اور یہیں کے علماء سے تعلیم حاصل کی ۔ جب فارغ ہوئے تو سلطان ایبک نے لاہور کی قضاۃ پیش کی مگروہ تحقیق و تدریس سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ غزنہ چلے گئے، وہاں کچھ مدت درس و تدریس میں مشغول رہے ۔ پھر عراق اور عرب کے علماء سے استفادہ کرتے رہے ۔ ۱۲۲۰ء/۶۱۷ھ میں بغداد کے خلیفہ‌الناصر (م ۔ ۱۲۲۵ء/۶۲۲ھ) کی طرف سے سلطان التتمش کے دربار میں سفیر بن کر آئے[6]۔ چھ سات برس یہاں رہنے کے بعد واپس عراق چلے گئے ۔ دوسری بار خلیفہ المستنصر باللہ نے ۱۲۳۶ء/۶۳۳ھ میں رضیہ کے دربار میں بطور سفیر کے بھیجا ۔ مگر جلد ہی ۱۲۳۹ء/۶۳۷ھ میں واپس چلے گئے جہاں انہوں نے ۱۲۵۲ء/۶۵۰ھ میں وفات پائی ۔ ان کی وصیّت کے مطابق انہیں مکہ مکرمہ میں دفن کیا گیا ۔ الصغانی کی سب سے مشہور تالیف 'مشارق الانوار النبویۃ فی صحاح الاخبار المصطفویۃ' ہے ۔ کتاب بے حد مقبول ہوئی ۔ کئی بار چھپ چکی ہے اور

---

۱ ۔ نزھۃ الخواطر ، ۱ ص ۲۳۹ ۔
۲ ۔ ایضاً ، ۱ ص ۱۳۳ ، ۱۳۵ ۔
۳ ۔ ایضاً ، ۱ ص ۱۹۶ ۔
۴ ۔ معجم البلدان ، بذیل مادہ لہاور : نزھۃ ، ۱ ص ۲۲۳ ۔
۵ ۔ نزھۃ الخواطر ، ۱ ص ۱۳۰ ۔
۶ ۔ ایضاً ۔

اس کے قلمی نسخے دنیا کے مشہور کتب خانوں اور عجائب گھروں میں محفوظ ہیں۔ اس پر ایک درجن کے قریب شرحیں لکھی گئیں اور کئی علماء نے اس کے خلاصے تیار کیے اور بعض علماء نے اس کی احادیث کو نئی ترتیب سے بھی جمع کر کے پیش کیا۔ الصغانی نے یہ کتاب خاص طور پر خلیفہ المستنصر (۱۲۲۶ء - ۱۲۴۲ء/۶۲۳ھ ۶۴۰ھ) کے ذاتی کتب خانے کے لیے تالیف کی۔

امام الصغانی رحمۃاللہ علیہ کی 'مشارق الانوار' کی شہرت و مقبولیت کے بہت سے اسباب ہیں، ایک تو یہ ہے کہ یہ کتاب بخاری اور مسلم کی احادیث کا انتخاب ہے جن کی صحت و ثقاہت پر امت کا اجماع ہے اور مصنف نے اپنے تبحرِ علمی اور مہارتِ حدیث کے طفیل بڑے حسنِ انتخاب سے کام لیا اور یہ حسنِ انتخاب اہلِ علم کو بہت پسند آیا۔ کتاب کی شہرت و مقبولیت کا ایک سببِ حسنِ ترتیب ہے، مثلاً بارہ ابواب پر مشتمل کتاب کا ہر باب اور فصل الصغانی کے حسنِ ترتیب کا مظہر ہے، پہلا باب ان احادیث پر مشتمل ہے جن کے شروع میں لفظ مَن آتا ہے۔ (من آمن باللہ ورسوله و اقام الصلوة و صام رمضان کان حقا علی اللہ ان یدخله الجنة الحدیث) اسی طرح دوسرا باب ان احادیثِ صحاح پر مشتمل ہے جو ''ان'' سے شروع ہوتی ہیں (ان ابر البر ان یصل الرجل ود ابیه اذا توفی الاب)۔ پھر اسی ترتیب سے جو احادیث لفظ ''انی'' سے شروع ہوتی ہیں وہ الگ فصل میں بیان کی گئیں۔ حسن انتخاب اور حسن ترتیب کے علاوہ کتاب کا اختصار اور جامعیّت بھی اس کی شہرت و مقبولیت کے اہم اسباب میں سے ہیں، امام صغانی کتاب کا تعارف اور اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ولما توجنی اللہ تعالی ودوجنی بتاج مصباح الدجی من صحاح حدیث المصطفی و دواج الشمس المنیرة من الصحاح الماثورات و انثال الناس الی الاشتغال بهماجدا لاهوادة فیه و استیضاح کل حدیث منهما و استکشاف معانیه رأیت ان اتباع الحسنة الحسنة و اجرار حصان الخیر رسنه فی العمر الذی سنة سنه احسن ما انصرفت الیه اعنة الهمم الشوارع العوالی و احسن ما انحرفت الیه الصمم الشوارع والعوالی فمزجت البحرین یلتقیان وغصت علی ما فیهما من الدرر والعقیان و ضممت الی ما فیهما ماصح من کتابی الشهاب والنجم لیجتمع الصحاح فی کتاب خفیف الحجم وهذا الکتاب حجة بینی و بین اللہ تعالی فی الصحة و الرصانة والاتقان و المتانة وهو انیسی مدة حیاتی فی الدنیا وشفیعی المشفع فی العقبی وکفی باللہ الذی هوعاضد من وضع لتعالی جده وعاضدمن وضع لتعس جده فی تعدی حده عالما

بما عانیت فی تالیفه و ترتیبه وقاسیت فی تصنیفه وتهذیبه وسمیته 'مشارق الانوار' النبویة من صحاح الاخبار المصطفیة'' -

ترجمه : جب اللہ تعالیٰ نے مصباح الدجی من صحاح حدیث المصطفی اور الشمس المنیرۃ من الصحاح الماثورۃ کے طفیل مجھے تاجِ شہرت پہنایا اور میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ بڑے انہماک اور تندہی سے انہیں پڑھنے اور ان کے معانی کو سمجھنے میں شوق مشغولیت رکھتے ہیں تو میں نے یہ مناسب خیال کیا کہ نیکی کے بعد دوسری نیکی کرنا اور بھلائی کی طرف لپکنا اس مختصر سی زندگی میں سب سے بہتر کام ہے ، ان کاموں میں سے جن میں بلند اور نڈر ہمتیں صرف ہوتی ہیں اور لمبے مضبوط نیزوں کو متوجہ کیا جاتا ہے ، چنانچہ میں نے دونوں متصل واقع ہونے والے سمندروں کو ملا دیا اور ان کے موتیوں کی خاطر غوطہ لگایا اور ان دونوں کتابوں کے علاوہ بخاری و مسلم کی احادیث صحیحہ کا اضافہ بھی کر دیا تاکہ صحیح حدیث کا ایک خفیف حجم والا مجموعہ تیار ہو جائے - اور یہ کتاب میرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجت ہے جو اس دنیا میں میری غمگسار اور آخرت میں مقبول شفاعت سفارش کرنے والی ہے ، اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں جو عاجزی کرتا ہے اس کا وہی بہترین مددگار ہے اور جو اس کے سامنے سرکشی کرتا ہے اور حد سے تجاوز کرتا ہے وہی اس کی جڑ کاٹنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کتاب کی تالیف و ترتیب اور تصنیف و تہذیب میں میں نے جو محنت و مشقت برداشت کی ہے ، اور اس کتاب کا نام میں نے 'مشارق الانوار النبویة من صحاح آلاخبار المصطفیة' رکھا ہے[1] - ص ۲۶

'مشارق الانوار' سے پہلے الصغانی نے حدیث سے متعلق دو تین اور کتابیں بھی مرتب کر رکھی تھیں : 'مصباح الدجی فی حدیث المصطفی' (جو محذوف الاسانید ہے) اور 'الشمس المنیرۃ' ، ان کا ذکر 'مشارق' کے مقدمے میں موجود ہے - مصباح اب نایاب ہے اور 'الشمس المنیرۃ' کا ایک نسخہ مشہد میں بتلایا جاتا ہے[2] - حاجی خلیفہ نے الصغانی کی ایک اور کتاب کا بھی ذکر کیا ہے جو اب نادرالوجود ہے - یعنی 'کشف الحجاب عن احادیث الشہاب' جو القضاعی (م - ۱۰۶۲ء/۴۵۴ھ) کی کتاب

---

۱ - مشارق الانوار طبع مصر ۱۳۲۸ھ ص ۱۷ ببعد -

۲ - بروکلمن : تکملۃ ، ۱ ص ۶۱۵ -

'شہاب الاخبار' (فی الحکم و الامثال و اداب من الاحادیث النبویة) کی تہذیب ہے[۱] ۔ الصغانی نے ایک اور معروف و مقبول کتاب تالیف کی جسے 'الرسالة فی الاحادیث الموضوعة' کا نام دیا ۔ یہ بھی زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے[۲] ۔ اس کے بھی کئی قلمی نخسے دنیا میں موجود ہیں[۳] ۔ ان کی کتاب 'دارالسحابة' (فی بیان مواضع وفیات الصحابة) بھی شائع ہو چکی ہے[۴] ۔ حدیث سے متعلق ان کی مندرجہ ذیل کتابیں بھی علماء کی نظروں سے گزری ہیں :

(۱) کتاب فی اسماء شیوخ البخاری ، جس کے کئی نسخے موجود ہیں[۵] ۔

(۲) 'زبدة المناسک[۶] ، (۳) درجات العلم و العلماء' اور (۴) شرح صحیح البخاری'

الصغانی نے علم اللغة پر بھی چند تالیفات چھوڑی ہیں ۔ ان میں سب سے اہم اور مشہور ان کی 'التکملة والذیل والصلّة' ہے یہ الجوہری (م - ۱۰۰۵ء/۳۹۵ھ) کی 'الصحاح' کا تکملہ ہے ۔ 'الصحاح' کا ایک تکملہ ابن بری (م - ۱۱۸۷ء/۵۸۲ھ) نے شروع کیا تھا جو صرف حرف 'شین' تک پہنچ سکا اور جسے عبداللہ بن محمد البسطی نے مکمل کیا ۔ مگر الصغانی نے از سر نو ایک مستقل تکملہ مرتب کیا ۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی ۔ بروکلمن اور زبید احمد نے اسکے متعدد نسخوں کی نشاندہی کی ہے ۔ اس کا ایک خود نوشت نسخہ استنبول میں موجود ہے[۷] ۔ الصغانی کی دوسری اہم تالیف 'مجمع البحرین (فی اللغة)' ہے ۔ اس میں الصغانی نے الجوہری کی 'الصحاح' اور اپنے 'تکملہ' کا مواد یکجا کر دیا اور اپنے حواشی سے کتاب کی قدروقیمت کو دو چند کر دیا ۔ اس کے بھی کئی قلمی نسخے موجود ہیں ۔ الصغانی کی ایک اور اہم تالیف 'العباب الزاخر واللباب الفاخر' (بترتیب جوہری) ہے جو تشنۂ تکمیل رہ گئی ۔ الصغانی ابھی صرف میم (مادہ 'بکم') تک ہی پہنچے تھے کہ وفات پاگئے ۔ 'العباب' کو تاج الدین ابن مکتوم القیسی (م- ۱۳۴۸ء/۷۴۹ھ) نے مکمل کیا[۸] ۔ 'العباب' کے کئی قلمی نسخے دریافت ہوچکے ہیں[۹]۔ ایڈورڈلین (Edward Lane) نے بھی اپنی 'مدّالقاموس' کے لیے 'العباب' سے

---

۱ - کشف الظنون ، ۲ ص ۷۲ -

۲ - قاہرہ ۱۳۰۵ھ (یہ قاوقجی کی اللولؤالمرصع میں شامل ہے) -

۳ - زبید احمد ، ص ۲۹۲ -

۴ - حیدرآباد دکن ، ۱۳۵۴ھ (برنامج ، ۱۲) -

۵ - بروکلمن : تکملہ ، ۱ ص ۶۱۵ -

۶ - اتحاف النبلاء ۴۴۸ -

۷ - مجموعہ داماد زادہ مراد ، رقم ۱۷۹۴ -

۸ - کشف الظنون ، ۲ ص ۱۰۵ -

۹ - زبید احمد ، ص ۲۵۴

بہت فائدہ اٹھایا ۔ مجد الدین الفیروز آبادی (م - ۱۴۱۵ء/۸۱۷ھ) نے اپنی کتاب 'القاموس المحیط' (۴ جلد) اور 'اللامع المعلّم العجاب' (۵ جلد) کےلیے مواد الصغانی کی 'العباب' اور ابن‌سیدہ (م - ۱۰۶۶ء/۴۵۸ھ) کی 'المحکم'ہی سے جمع کیا ہے ۔ امام صغانی کی 'العباب الزاخر' کا تذکرہ کرتے ہوئے حاجی[1] خلیفہ نے بتایا ہے کہ یہ کتاب بیس مجلدات پر مشتمل ہے اور الصغانی چونکہ اس کتاب کو مادہ 'بکم' تک لکھ پائے تھے کہ فرشتۂ اجل آ پہنچا اور 'بکم' کا معنی ہیں وہ گونگا ہوگیا ، اس لیے کسی مخالف نے اس موقع پر کہا ۔

إنّ الصغانی الذی حاز العلوم و الحکم

کان قصاری امرہ ان انتہی الی بکم

ترجمہ : وہ صغانی کہ جس نے علوم و حکمت کو سمیٹا تھا ، اس کا معاملہ مختصراً یہ ہوا کہ انجام کار وہ گونگا ہو گیا ۔

بقول حاجی خلیفہ تاج الدین القیسی مذکور نے 'العباب الزاخر' کی تکمیل کے علاوہ ابن سیدہ کی 'المحکم' کا مواد بھی اس میں شامل کر دیا۔ الصغانی کی اس کتاب کی وسعت و اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ عربی زبان و ادب کے مشہور عالم‌ومحقّق مولانا عبدالعزیز میمن نے اپنے دیارعرب کےایک سفرکے دوران یہ تجویزپیش کی تھی کہ اس عظیم کتاب کو ایڈٹ کرنا کسی ایک عالم کے بس کا روگ نہیں بلکہ عالمِ اسلام کے منتخب عربی دانوں کا ایک بورڈ بنایا جائے جو اس ضخیم کتاب کی تحقیق و اشاعت کا فریضہ انجام دے[2] ۔

الصغانی کی چند اور تالیفات بھی قابلِ ذکر ہیں ۔ مثلاً 'کتاب الاضداد'[3] 'نقعة الصدیان فیا جاء علی وزن فعلان'[4] ۔ 'کتاب اسماء الذئب'[5] 'الشوارد من اللغات'[6] 'کتاب الانفعال' جو ضائع ہونے سے بچ گئی ہیں اور کتاب یفعول اسماء الغادة فی اسماء العادة' ، 'ما تفرد بہ بعض ائمة اللغة' ، 'تعزیزیّۃ الحریری' (یہ الحریری کے مقامہ ۴۰ کے دو بیت سے متعلق ہے) ۔ کتاب فیما بنت العرب علی لفظ فعال' اور 'خلق الانسان'

---

۱ ۔ کشف الظنون ۲ : ۱۰۵ ۔

۲ ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ڈاکٹر یوسف کی عربی میں نشری تقریر در مجلہ اذاعة پاکستان کراچی ۔

۳ ۔ زبید احمد ، ص ۲۵۲ ۔

۴ ۔ داماد زادہ مراد ، رقم ۱۷۸۹ ۔

۵ ۔ بروکلمن ، تکملہ ، ۱ ص ۶۱۵ ۔

۶ ۔ مجموعہ داماد زادہ مراد ، رقم ۱۷۸۹ ۔

نادر الوجود ہیں ۔ ان کی 'المختصر فی العروض' کے لیے بروکلمن دیکھیے ۔ ابن الفوطی نے الصغانی کی ایک اور تصنیف بدائع 'النظام فی جوامع الاحکام' کا بھی ذکر کیا ہے[1] ۔

یہاں یہ ذکر کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ ایبک کی وفات کے بعد اس کا بیٹا آرام شاہ تخت نشین ہوا ۔ لیکن حالات سلطنت بہت جلد بگڑ گئے ۔ امرائے دربار نے بدایوں کے حاکم شمس الدین التتمش کو تخت و تاج پیش کیا ۔ التتمش (۱۲۱۰ء ۔ ۱۲۳۶ء/۶۰۷ھ ۔ ۶۳۳ھ) نے ایبک کا چھوڑا ہوا کام سنبھالا ۔ اپنی خداداد ذہانت اور فراست سے نظام مملکت کو جلد درست کر لیا ۔ بہرحال تھوڑے ہی عرصے میں سلطان التتمش کی معدلت گستری اور علم دوستی نے اسے گرویدۂ عالم بنا دیا ۔

ادھر اوچ اور ملتان کے خطے میں سلطان ناصر الدین قباچہ (۱۲۰۶ء ۔ ۱۲۲۸ء/ ۶۰۲ء ۔ ۶۲۵ھ) کا دربار گویا کاشانۂ علم و ادب، اور گہوارۂ شعر و سخن بنا ہوا تھا ۔ آسمان ادب کے کئی درخشندہ ستارے عہد ناصری کو اپنی تابانیوں سے منور کر رہے تھے ۔ الور کے قاضی اسمٰعیل بن علی بن محمد بن موسی الثقفی نے اپنے آباء و اجداد سے سنداً (عربی میں) 'تاریخ السند' مرتب کر رکھی تھی ۔ اب اصل نسخہ حوادث روزگار کی نذر ہوگیا ہے[2] ۔ البتہ شیخ فاضل علی بن حامدالکوفی السندی (م ۔ ۱۱۶۰ء/۵۵۵ھ) الور میں وارد ہوا اور قاضی موصوف سے ملاقات ہوئی ۔ اس نے اس تاریخ کے کچھ اجزاء کو فارسی کا جامہ پہنایا اور وزیر عین الملک کے نام معنون کر دیا[3] ۔ عہد ناصری کے دو اور نامور ادیب خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ (۱) سدیدالدین عوفی جو تقریباً ۱۲۱۹ء/۶۱۶ھ میں ۴۰ سال کی عمر میں قباچہ کے دربار سے منسلک ہوا اور ۹ سال کی خدمت کے بعد التتمش کے دربار کی رونق بنا ۔ اس نے عربی ادب کے ایک شاہکار 'الفرج بعد الشدۃ' کو فارسی میں منتقل کیا ۔ یہ کتاب قاضی ابو علی الحسن التنوخی (م ۔ ۹۹۴ء/۳۸۴ھ) کی تصنیف ہے[4] ۔ (۲) قاضی منہاج الدین عثمان السراج الجوزجانی صاحب 'طبقات ناصری' (م ۔ بعد ۱۲۵۹ء/۶۵۸ھ) جو پہلے مدرسہ فیروزیہ کے مہتمم اور سرمدرس رہے ، پھر گوالیار کے قاضی ، پھر دہلی کے مدرسۂ ناصریہ کے مہتمم اور آخر (۱۲۵۴ء/۶۵۲ھ) میں "صدر جہاں" کے لقب سے نوازے گئے ، عربی میں شعر کہہ لیتے تھے ۔ انہوں نے امام یحیٰی بن اعقب رض کے عربی قصیدہ کا فارسی میں ترجمہ کیا ۔

۱۲۲۸ء/۶۲۵ھ میں ناصر الدین قباچہ جب التتمش کی افواج سے منہزم ہو کر

---

۱ ۔ ابن الفوطی ، الحوادث الجامعۃ ، ص ۲۹۲ ، طبع ۲ ۔
۲ ۔ نزھۃ الخواطر ، ۱ ؛ ۱۲۵ ۔
۳ ۔ یہ کتاب 'چچ نامہ' کے عنوان سے شائع ہوچکی ہے ۔
۴ ۔ لباب ، ۱ ؛ ۵۱ ۔

دریائے سندھ میں غرق ہوگیا تو اس کے نامور علماء اور شعراء التتمش کے ساتھ دہلی چلے آئے۔ یہ علماء اپنے مشاغل میں پھر سے مصروف ہوگئے اور شمعِ علم کی تابانیوں سے ہندوستان جگمگا اٹھا۔

عوفی نے اپنی 'جامع الحکایات' التتمش کے دور میں تالیف کی اور اسی زمانے میں قطب الدین بختیار الاوشی الکعکیؒ بھی یہاں آئے۔ التتمش ان کی بہت قدر کرتا تھا۔ ہر جمعہ کو ان کی زیارت کے لیے جاتا تھا۔ اسی کے زمانے میں محمد بن محمد اسماعیل الخطیب الاشقور قانی ۱۲۱۹ء/۶۱۶ھ میں تاتار کے خوف سے بھاگ کر دہلی میں مقیم ہوگئے۔ ہندوستان میں فقہ کی پہلی تصنیف 'صنوان القضاء و عنوان الافتاء' (سال تالیف ۱۲۴۴ء/۶۴۲ھ) انہی کے قلم کا نتیجہ ہے۔ ہمیں اس کتاب کے صرف دو نسخوں کا پتا چل سکا ہے[۱]۔ ۱۲۲۰ء/۶۱۷ھ میں ۷۰ سالہ بزرگ سلیمان بن عبداللہ الہاشمی ہندوستان میں وارد ہوئے۔ التتمش نے ان کی خوب آؤ بھگت کی اور دہلی میں رہنے کو کہا مگر وہ کنتور (اودھ) میں چلے گئے اور وہیں ۱۲۲۸ء/۶۵۷ھ میں وفات پائی۔ التتمش ہی کے دور میں رضی الدین الصغانی بھی خلیفہ بغداد کے سفیر بن کر آئے اور سات سال رہ کر خلیفہ کی وفات کے بعد واپس چلے گئے۔

سلطان التتمش کی وفات کے بعد ہندوستان کئی سال سیاسی اضطراب میں مبتلا رہا۔ تاآنکہ ناصر الدین محمود بن التتمش ۱۲۴۶ء/۶۴۴ھ میں سریرِ آرائے سلطنت ہوا۔ ناصر الدین بڑا نیک، زاہد اور عادل فرمانروا تھا۔ اس نے بیس سال حکومت کی۔ وہ 'حافظِ قرآن' تھا، خوشنویس تھا اور مصحف لکھ لکھ کر گزر کرتا تھا۔ علماء اور صوفیہ کو اس کی سرپرستی حاصل رہی۔ سلطان ناصر الدین کا نائب السلطنت غیاث الدین بلبن ایک بار کسی فوجی مہم پر ملتان جا رہا تھا، راستے میں اجودھن (پاکپتن) پڑا۔ بلبن نے شیخ کبیر فرید الدین شکرگنجؒ کے ہاں حاضری دی۔ بلکہ فوج کے ہر فرد نے سعادتِ زیارت حاصل کرنا چاہی۔ چنانچہ شیخ کبیر نے اپنی قمیض کی ایک استین بام سے لٹکا دی۔ فوجی نیچے سے گزرتے جاتے تھے اور اسے بوسہ دیتے جاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ''آں ہم پارہ پارہ شد''[۲]۔ سلطان ناصر الدین کے عہد ہی میں جمال الدین احمد خطیب ہانسی (م۔ ۱۲۶۱ء/۶۵۹ھ) کی 'الملہمات' (سال تالیف ۱۲۶۰ء/۶۵۸ھ) تصوف کے میدان میں پہلی تصنیف ہے جو ہندوستان میں لکھی گئی[۳]۔

۱۔ فہرست کتب آصفیہ لائبریری، ۱: ۳۴۔ فہرست کتب بانکپور لائبریری، ۱۹ ص رقم ۱۶۸۲ (نیز ملاحظہ ہو بروکلمن: تکملہ، ۲ ص ۱۶۰۵)۔

۲۔ نزہۃ الخواطر، ۲: ۱۵۲۔ سیرالاولیاء، ص ۶۵۔

۳۔ زبید احمد، ۳۴۴: نزہۃ ۱ ص ۱۲۲۔

سلطان ناصر الدین محمود کی وفات کے بعد غیاث الدین بلبن تخت نشین ہوا ۔ اس کے عہد میں درس و تدریس کو بہت فروغ ملا ۔ علماء علوم حکمیہ کی طرف بھی توجہ دینے لگے ۔ بلبن بھی نیک اور عادل حکمران تھا ۔ نماز با جماعت کی پابندی کے علاوہ اشراق اور تہجد کی نماز بھی گزارتا تھا ۔ ہر جمعہ کے دن اہل علم مثلاً برہان بلخی ، سراج الدین السجزی اور حکیم نجم الدین عبدالعزیز کی زیارت کےلیے پاپیادہ جاتا تھا[۱]۔

بلبن کی وفات کے بعد حکومت خاندان غلاماں سے خلجیوں کی طرف منتقل ہوئی ۔ جلال الدین فیروز شاہ خلجی جو بلبن کے عہد میں میر جامدار تھا، کبرسنی میں تخت پر فائز ہوا ۔ جلال الدین عالم تھا، شعر بھی کہہ لیتا تھا اور علماء کی قدر کرتا تھا ۔ ۱۲۹۶ء/۶۹۵ھ میں اس کے بھتیجے علاءالدین محمد شاہ نے اسے دھوکے سے قتل کر ڈالا اور تخت پر متمکن ہوگیا ۔ علاءالدین کو حکومت کےلیے بیس برس کی طویل مدت ملی۔ کابل سے لے کر بنگالہ تک اور دہلی سے دکن تک تمام علاقے اس کے زیر نگیں تھے ۔ اس کے دور میں ۸۴ معرکے ہوئے اور وہ ہر معرکے میں ظفرمند رہا[۲]۔ اس کی خوش تدبیری سے سلطنت کو عروج ملا ۔ رعایا کی بہبود کے لیے اس نے اشیاء کے نرخ مقرر کر دیے اور اندرونی فسادات اور بیرونی حملوں کا سدّ باب کیا جس سے تجارت کو بہت فروغ نصیب ہوا ۔ رعایا خوشحال ہوگئی ۔ اس کے عہد کے تقریباً ہر سال کے سکّے بڑی کثرت سے ملتے ہیں جو اس دور میں سونے اور چاندی کی فراوانی پر دلالت کرتے ہیں ۔

سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء محمد بن احمدؒ (م ۔ ۱۳۲۵ء/۷۲۵ھ) کا نام خلجیوں کے عہد کے ممتاز علماء اور صوفیہ میں شمار ہوتا ہے ۔ وہ اپنے طالب علمی کے زمانے میں "بحاث" مشہور تھے ۔ اس کے باوجود وہ بہت کم آمیز تھے اور دربار شاہی سے دور رہتے تھے ۔ جلال الدین فیروز خلجی کو ان کی زیارت کا بہت شوق تھا ۔ مگر وہ ہر بار اسے اپنے ہاں آنے سے روک دیتے تھے ۔ ایک بار جلال الدین نے ارادہ کیا کہ اچانک بلا اطلاع ان کی خانقاہ میں پہنچ جائے ۔ نظام الدین اولیاء کو سلطان کی نیت کا پتا چل گیا وہ چپکے سے پاکپتن تشریف لے گئے ۔ علاءالدین محمد شاہ خلجی نے انہیں ایک بار کسی اہم معاملے میں مشورہ لینے کے لیے طلب کیا مگر انہوں نے حاضر ہونے سے انکار کر دیا[۳]۔

خلجیوں کے دور ہی میں یہاں کے ایک عالم صفی الدین محمد بن عبدالرحیم الارموی الشافعی الہندی (م ۔ ۱۳۱۵ء/۷۱۵ھ) ، جنہوں نے علم الکلام اور اصول فقہ میں بڑا نام پیدا کیا ، ۱۲۶۸ء/۶۶۷ھ میں عرب ممالک میں چلے گئے ۔ نومبر ۱۳۱۲ء/رجب

---

۱ ۔ نزہۃ الخواطر ، ۲ ص ۱۲۳ ۔ ۱۲۴ ؛ نزہۃ الخواطر ۱ ص ۱۹۲ ۔ ۱۹۳ ۔

۲ ۔ نزہۃ الخواطر ، ۲ ؛ ص ۱۵۲ ۔

۳ ۔ نزہۃ الخواطر ، ۲ ؛ ص ۱۲۳ ۔ ۱۲۴ ۔

۷۱۲ھ میں امام ابن تیمیۃ سے دمشق میں مناظرہ کیا اور غالب رہے[1] - ہمیں ان کی مندرجہ ذیل تالیفات کا پتا چلا ہے :

(۱) 'الفائق فی اصول الدین' جس کا ایک نسخہ تونس میں بتایا جاتا ہے[2] -

(۲) 'الرسالة التسعینیة فی الاصول الدینیة ، جس کے قلمی نسخے تونس اور قاہرہ میں محفوظ ہیں[3] -

(۳) 'نہایة الوصول' فی (الی) 'علم الاصول' نادرالوجود ہے - اسی عنوان سے ایک کتاب جمال الدین ابن مطہر الحلی (م - ۱۳۲۵ء/۷۲۶ھ) کی تالیف ہے جو شیعی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے[4] -

(۴) 'الزبدة' (یا 'زبدة الکلام) فی علم الکلام' نایاب ہے[5] -

کہا جاتا ہے کہ علاءالدین خلجی کے عہد میں ایک محدّث شمس الدین ہند میں آئے اور اپنے ساتھ ۴۰۰ کتابیں بھی لائے (؟) اس دور میں فخرِ ہند امیر خسرو شاعر کا نام خاص طور پر مشہور ہے - اس نے عربی ، فارسی ، ترکی اور بھاشا میں شعر کہے ہیں -

دسمبر ۱۳۱۶ء/شوال ۷۱۶ھ کے بعد ہندوستان میں ایک بار پھر سیاسی اضطراب پیدا ہوا - دہلی کی فضا دن بدن مکدّر ہوتی گئی - دہلی اجڑی تو جونپور ، بدایوں ، بیدر اور حیدر آباد کے علمی مرکزوں کو فروغ ملا - بہرحال خلجیوں کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا جسے دیکھ کر آس پاس کے ہندو راجے دہلی پر امڈ پڑے - شہر میں خون خرابہ ہوا - ہندو اور مسلم آپس میں الجھ گئے[6] - بالآخر ۱۳۲۰ء/۷۲۰ھ میں ملک غیاث الدین غازی تغلق خان حاکم ملتان اسلامی فوج لے کر دہلی میں داخل ہوا ، امراء ، علماء ، سادات اور افواج نے اسے بادشاہ تسلیم کر لیا[7] - اس طرح سلطنت خلجیوں کے ہاتھوں سے نکل کر خاندانِ تغلق میں چلی گئی - تغلقوں کی عدل‌گستری اور معارف‌پروری

---

۱ - تفصیل کے لیے دیکھیے : السبکی ، ص طبقات ، ۵ : ص ۲۴۰ الدار الکامنة ، ۵ : ص ۱۴ - ۱۵ : البدر الطالع ، ۱ : ص ۶۶ ، ۲ : ص ۱۸۷ -

۲ - بروکلمن ، تکملہ ، ۲ : ص ۱۴۳ -

۳ - بروکلمن ، تکملہ ، ۲ : ص ۱۴۳ -

۴ - بانکی پور ، فہرست کتب ، ۲۱ : ۱ : ص ۱۵۶۷ -

۵ - حاجی خلیفہ ، کشف الظنون ، ۲ : ص ۶ -

۶ - قلیج مرزا ، ص ۱۷ - ۱۸ -

۷ - قلیج مرزا - ۱۸ -

نے علم و ادب کے میدان کو پھر سے لالہ زار کر دیا ۔ فیروز تغلق کا عہد تو بالخصوص سنہری دور کہلانے کا مستحق ہے ۔

غازی غیاث الدین تغلق (۱۳۲۱ء-۱۳۲۵ء/۷۲۰ھ-۷۲۵ھ) نے ملک میں بہت جلد امن و امان قائم کر دیا ۔ اس نے تاتار کا ۲۹ بار مقابلہ کیا اور ہر مہم میں ظفریاب رہا[1] ۔ اس کے بعد رفاہ عامہ کی طرف توجہ دی ۔ غیاث الدین عالم تھا ، قدرشناس تھا اور تاریخ کا دلدادہ تھا ۔

'سیر الاولیاء' میں لکھا ہے[2] کہ ایک بار شیخ زادہ جام حسام الدین نے سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد سلطنت میں "سماع" کے مسئلہ پر بحث چھیڑی اور دعویٰ کیا کہ سماع بدون مزامیر بھی حرام ہے ۔ چنانچہ دہلی کے اکابر علماء کو بلوایا گیا ۔ ان میں سلطان المشائخؒ کو بھی تشریف لانے کی زحمت دی گئی ۔ قاضی جلال الدین الوالوالجی نے حرمت سماع پر دلائل پیش کیے اور سلطان المشائخؒ نے تمام دلائل بطریق احسن رد کر دیے ۔ مولانا علم الدین بھی وہاں موجود تھے ۔ یہ بہاء الدین زکریا ملتانی کے نواسے تھے اور عراق ، شام اور روم سے بھی ہو آئے تھے ۔ سلطان ان کا معتقد تھا ۔ سلطان نے پوچھا : "مشائخ آں دیار سماع می‌شنوند ؟" ۔ مولانا علم الدین نے جواب دیا : "در ہمہ شہرہا بزرگاں و مشائخ سماع می شنوند" ۔ سلطان غیاث الدین خاموش ہو گیا ۔ جلال الدین الوالوالجی نے اصرار کیا اور کہا کہ مخالفت سماع کا فرمان جاری کیا جائے ۔ سلطان المشائخ نے فرمایا: "ان کُنْتَ تخاصمنی بسطوۃ الحکومۃ فانت معزولٌ عنہا" (ترجمہ : اگر تو مجھ سے اقتدار حکومت کے بل بوتے پر جھگڑتا ہے تو اس سے تو تو معزول ہو چکا ہے) اور اتفاق کی بات ہے کہ چند دنوں کے بعد وہ قاضی معزول کردیا گیا ۔

ربیع الاوّل فروری ۱۳۲۵ء/۷۲۵ھ میں اس کا بیٹا محمد عادل تغلق تخت نشین ہوا ۔ محمد تغلق نہ صرف 'قرآن حکیم' کا حافظ تھا بلکہ اسے 'ہدایۃ' بھی از بر تھی[3] ۔ چنانچہ وہ علوم دینیہ سے خوب واقف تھا اور شریعت کا سختی سے پابند تھا ۔ یہاں تک کہ عامۃ المسلمین کے لیے اقامۃ الصلوٰۃ کو اس نے حکماً نافذ کر رکھا تھا ۔ چونکہ محمد تغلق نے منطق اور حکمت کے ماہر عالم عضدالدین دہلوی سے تعلیم پائی تھی ، اس لیے منطق اور فلسفہ سے اسے آغاز ہی سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور اسی نسبت سے حکیم علم الدین شیرازی جو علاءالدین خلجی کے عہد ہی سے دہلی میں درس دیا کرتا تھا

---

۱ - نزہۃ الخواطر ، ۲ ص ۱۰۰ -

۲ - نزہۃ الخواطر ، ۲ ص ۱۰۰ -

۳ - سیر الاولیاء ، ۲ ص ۲۳ -

محمد تغلق کا مقرب بن گیا اور سلطان اس سے متعلقہ علوم میں مذاکرہ کیا کرتا تھا[۱]۔ اسی طرح مولانا حکیم سعدالمنطقی نے ، جو جلال‌الدین خلجی کے مقربین میں سے تھا ، سلطان غیاث‌الدین تغلق اور اس کے بیٹے محمد تغلق کے ہاں بھی اثر پیدا کر لیا ۔ چنانچہ وہ بھی سلطان محمد تغلق سے اپنے خاص علوم میں بحث کیا کرتا تھا[۲] ۔

قاضی شوکانی نے 'البدرالطالع[۳]' میں نقل کیا ہے کہ ایک بارکسی اعجمی نے ابن سیناء کی 'کتاب‌الشفاء' کا ایک نسخہ جو یاقوت الحموی (م - ۱۲۲۹ء/۶۲۶ھ) کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا ، سلطان محمد تغلق کو پیش کیا ۔ سلطان نے اس ہدیہ کو بہت پسند کیا اور اسے مال کثیر سے نوازا ۔

بہرحال سلطان وقت کے ذوق کو دیکھ کر علماء نے بھی معقولات کی طرف زیادہ توجہ دینی شروع کر دی ۔

ذیل میں عہد تغلق کے ممتاز علماء کا ذکر کیا جاتا ہے

'ابوبکر اسحاق بن تاج‌الدین الملتانی الحنفی الصوفی (م - بعد ۱۳۳۵ء/۷۳۶ھ) اپنی کنیت ''ابن التاج'' سے معروف ہیں ۔ ان کی تالیفات میں سے کچھ ہم تک پہنچی ہیں جن کے قلمی نسخوں کی تفصیل آلورٹ (Ahlwardt) نے اپنی فہرست میں دی ہے[۴] ۔

'خلاصة جواہر القرآن' (فی بیان معانی الفرقان[۵]) ۔ تفسیر القرآن کے باب میں یہ 'خلاصہ' ہندوستان کے علماء کی پہلی کوشش ہے ۔ اس نسخے میں بین السطور بعض اہم الفاظ کے معانی فارسی زبان میں بھی درج کیے گئے ہیں[۶] ۔ اس کتاب کے مقدمے میں ابن التاج نے اپنی ایک اور تصنیف 'جواہر القرآن' کا ذکر کیا ہے جو اب نایاب ہے ۔

شیخ ابوبکر ابن التاج البکری الملتانی کی نادر کتاب 'خلاصة جواھر القرآن فی بیان معانی لغات القرآن' زیادہ تر امام غزالی رحمة اللہ علیہ کی کتاب[۷] 'جواھر القرآن' کے مواد پر مبنی ہے جو انہوں نے اپنی کتاب 'خلاصة الدین' کی تصنیف سے فراغت کے بعد لکھی ۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کتاب میں قرآن کریم کے مشکل الفاظ کے معنی کی تشریح کی گئی ہے ، مصنف نے عربی میں تشریح کرنے کے علاوہ اکثر فارسی

---

۱ - نزھة الخواطر ، ۲ ص ۸۵ ، ۸۶ ۔
۲ - نزھة الخواطر ، ۲ : ص ۳۸ ، ۳۹ ۔
۳ - ایضاً ۲ : ۱۳۵ ۔
۴ - آلورٹ ، رقم ۸۴۶ ، ۱۴۹۸ ، ۱۴۹۹ ، ۳۳۴۸ ، ۳۳۴۹ ، ۳۰۹۴ ۔
۵ - بروکلمن ، ۲ : ص ۳۱۰ ۔
۶ - زبید احمد ، ۲۴۰ حاشیہ ۔
۷ - کشف الظنون ۱ : ۶۱۱ ۔

میں بھی مفردات قرآن کے معنی بیان کر دیے ہیں تاکہ اس دور کے فارسی داں اہل علم استفادہ کر سکیں ، بلکہ اسے اگر قرآن کا فارسی ترجمہ کہا جائے تو بعید نہ ہوگا ۔ شیخ ابوبکر نے معانی الفاظ کے علاوہ فضائل آیات پر بھی کلام کیا ہے ۔ مثلاً وہ بسملہ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے یہ حدیث نقل کرتے ہیں : من قال بسم اللہ الرحمن الرحیم مرۃ لم یبق من ذنوبہ ذرۃ (جس نے ایک بار بسم اللہ الرحمن الرحیم کہا اس کا کوئی گناہ باقی نہیں رہے گا[1] ۔

'خلاصۃ الاحکام بشرائط الایمان والاسلام' کے دو نسخے برلن لائبریری میں بتائے جاتے ہیں[2] ۔ یہ کتاب در حقیقت شیخ ابوبکر ابن التاج البکری الحنفی الملتانی کی ایک اہم تصنیف ہے جس میں انہوں نے ارکان اسلام (شہادت توحید و رسالت صلوٰۃ ، زکوٰۃ، صوم اور حج) کی تفصیل بیان کی ہے اور ان کے رموز و اسرار سے بحث کی ہے ۔ کتاب کا موضوع اور مضمون امام غزالی کی 'احیاء علوم‌الدین' کے موضوع اور مضمون سے ملتا جلتا ہے ۔ اگرچہ شیخ ملتانی نے صرف ارکان اسلام سے بحث کی ہے اور غزالی نے تمام امور دین اور لوازمات ایمان کے بارے میں حکیمانہ معارف جمع کر دیے ہیں ۔ شیخ ملتانی نے 'خلاصۃ الدین' کے نام سے اس کتاب کا خلاصہ لکھا اور بعد میں 'خلاصۃ الدین' کا بھی خلاصہ تحریر فرمایا جس کا نام خلاصۃ خلاصۃ الدین بشرائط الایمان والیقین' رکھا ، اس مؤخر الذکر کا جو نسخہ برلین کی لائبریری میں موجود ہے اس کا متن عربی و فارسی دونوں زبانوں میں ہے ، کتاب کا زیادہ تر متن اگرچہ عربی میں ہی ہے لیکن مصنف نے سہولت کے لیے مسائل کی تشریح فارسی میں بھی کی ہے ، مخطوطے کے سرورق کی عبارت کتاب کے مضمون اور مندرجات پر پوری روشنی ڈالتی ہے جو یوں ہے :

"خلاصۃ خلاصۃ الدین بشرائط الایمان والیقین ، الملمع بالعربیۃ والعجمیۃ ، الملخص من خلاصۃ الاحکام بشرائط الاسلام ، الحاوی للارکان الخمس التی بنی علیہا الاسلام : علم التوحید وعلم الصلوۃ وعلم الزکوۃ وعلم الصیام وعلم حجۃ الاسلام"[3] ۔

فقہ کے باب میں ابن التاج کی کتاب 'الحج و المناسک' بھی محفوظ ہے[4] ۔ تصوف سے

---

۱ ۔ آلورٹ نمبر ۸۲۶ ۔
۲ ۔ بروکلمن ، ۲ : ص ۲۱۰ ۔
۳ ۔ آلورٹ نمبر ۱۴۹۸ ، ۱۴۹۹ ۔
۴ ۔ آلورٹ ، رقم ۴۰۶۴ ۔

متعلق ابن التاج کی دو کتابیں برلین لائبریری میں محفوظ ہیں : 'نسبة خرقة التصوف' اور 'ذکرالذکرالاکبر' (جسے 'الذکرالاکبر' بھی کہتے ہیں)۔ ابن التاج کی ابھی تک کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی ۔

شیخ ابوبکر ابن التاج الملتانی کے نام کے ساتھ اکثر کتب تذکرہ میں ''الحنفی الصوفی'' کا بھی اضافہ ملتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ فقہ میں حنفی مسلک پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحبِ حال صوفی اور زاہد بھی تھے ، اس بات کی تصدیق ان کی دو کتابوں سے بخوبی ہوجاتی ہے جو انہوں نے تصوف کے موضوع پر تصنیف فرمائی ہیں ان میں سے ایک تو 'ذکرالذکر الاکبر' ہے جس میں انہوں نے افضل الذکر لاالہ الا اللہ کی تشریح کرتے ہوئے ذکرِ الٰہی کی صورتوں اور فوائد سے بحث کی ہے اور دوسری کتاب 'نسبة خرقة التصوف' ہے اس کتاب میں انہوں نے اپنے مسلکِ تصوف پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کے علاوہ بیعت اور طریقت کے مسائل سے بھی بحث کی ہے، شیخ ملتانی نے خرقہ صوفیانہ کی تشریح کرتے ہوئے اس کی بڑی دلچسپ تقسیم بیان کی ہے ، ان کے نزدیک خرقہ کی چار قسمیں ہیں (۱) خلة یعنی دوستی و مودت ، (۲) رأفت یعنی شفقت ، مہربانی اور عاجزی (۳) قربة یعنی قریب ہونا (۴) تجرید ، اور یہ چار اقسام لفظ خرقة کے چار حروف سے مشتق ہیں یعنی خ سے خلہ ، ر سے رافت ، ق سے قربت اور ت سے تجرید ۔ شیخ کے اپنے الفاظ ہیں :''اعلموا اخوانی ان الخرقة اربعة اقسام : خلة و رأفة و قربةو تجرید ، اخذتہا من لفظة الخرقة فہی اربعة احرف : خاء و راء و قاف و تاء''[1]۔

ترجمہ : میرے بھائیو ! جان لو کہ خرقہ کی چار قسمیں ہیں خلت (دوستی) رأفة (مہربانی) ، قربت اور تجرید (تصفیہ و تجرد) یہ اقسام میں نے لفظ خرقة کے چار حروف سے نکالی ہیں ، خ ، ر ، ق ، ت ۔

معین الدین العمرانی الدہلوی کی مندرجہ ذیل کتابیں جو اکثر و بیشتر مفقود ہو چکی ہیں ، قابلِ ذکر ہیں : فقہ کے باب میں العمرانی کی کتاب ' حاشیة علی التلویح ' کا ایک قلمی نسخہ نواب صدیق حسن خان کے مجموعے میں بیان کیا جاتا ہے[2] ۔

'حاشیة علی الحسامی'[3] ، 'حاشیة علی کنزالدقائق'[4] اور 'حاشیة علی المنار'[5] ۔ العمرانی نے علومِ عربیہ سے متعلق السکا کی کتاب 'مفتاح العلوم ' پر بھی ایک حاشیہ لکھا ،

---

۱ ۔ آلورث نمبر ۳۴۴۸ ، ۳۴۴۹ ۔

۲ ۔ زبید احمد ، بمدد اشارية ۔

۳ ۔ مآثر الکرام ، ۱۸۴ ۔

۴ ۔ ایضاً ۔

۵ ۔ اخبار الاخیار ، ص ۱۴۲ ۔

اور اسی 'مفتاح العلوم' کی 'تلخیص' جو جلال الدین القزوینی نے مرتب کی پر بھی حاشیہ لکھا[1] - یہ دونوں کتابیں اب بظاہر ناپید ہیں -

قاضی عالم (علیم) بن علاءالدین الاندپتی سلطان فیروز تغلق کے عہد میں ایک مشہور عالم اور فقیہ ہو گزرے ہیں - ان کا ذکر کر دینا یہاں اس لیے ضروری ہے کہ انہوں نے 'فتاوی تاتار خانیہ' کی تالیف میں مدد دی - یہ کتاب بہت مقبول ہوئی - اس کے قلمی نسخے بڑی کثرت سے ملتے ہیں[2] - اس اہم کتاب کا انتساب انہوں نے خان اعظم تاتار خان (م-۱۳۸۴ء/۷۸۶ھ) کے نام کیا ہے- حاجی خلیفہ نے اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ 'الفتاوی التاتارخانیة' جو امام عالم بن علا حنفی کی تصنیف ہے ایک عظیم کارنامہ ہے جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے - فاضل فقیہ نے اس کتاب میں 'المحیط البرھانی'، 'الذخیرة'، 'الخانیة' اور 'الفتاوی الظهیریة' کے تمام مسائل کو یک جا کر دیا ہے - کتاب کے متن میں 'المحیط' کے علاوہ دوسری تینوں کتابوں کے نام ذکر کیے ہیں مگر 'المحیط' کا نام لکھنے کے بجائے ''م'' بطور علامت استعمال کیا ہے اور نام صراحت سے نہیں لکھا ، خلیفہ کے بیان کے مطابق ''الفتاوی التاتارخانیة' کی ترتیب فقہ کی مشہور کتاب 'الهدایة' کے مطابق ہے - البتہ فاضل مصنف نے کتاب کے شروع میں فضیلتِ علم کے موضوع پر ایک مستقل باب باندھا ہے ، بقول خلیفہ کتاب کا اصل نام 'زاد المسافر' تھا مگر خان اعظم تاتار خان کے نام سے معنون ہونے کے باعث 'الفتاوی التاتارخانیة' کے نام سے مشہور ہوئی - شیخ ابراہیم بن محمد الحلبی (م-۱۵۴۹ء/۹۵۶ھ) نے اس کا خلاصہ مرتب کیا تھا[3] - کتب خانہ خدیویہ کے فہرست ساز کے قول کے مطابق اس کا ایک نسخہ اس کتاب خانے میں موجود ہے جو ۱۴۵۷ء/۸۶۲ھ میں لکھا گیا اور ۵ جلدوں پر مشتمل ہے[4] -

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم کے کتب خانے میں ایک نادر کتاب بعنوان 'تفسیر تاتار خانی' موجود ہے - مؤلف کا نام درج نہیں ہے - ممکن ہے کہ یہ وہی 'تفسیر تاتار خانی' ہو جو امیر تاتار خان نے تصنیف کی اور جس کا ذکر عبدالحیؒ لکھنوی نے 'نزھة الخواطر[5]' میں کیا ہے اور گمان یہ بھی ہے کہ یہ تفسیر محمد بن عبدالملک البغدادی کی تصنیف ہے[6] - یہ دوسرے پارے کی تفسیر ہے اور بظاہر

---

۱ - نزھة الخواطر ۱ ص ۱۶۵ -

۲ - زبید احمد ، ص ۳۱۵ -

۳ - کشف الظنون ۲ : ۲۱۱ -

۴ - ایضاً ۳ : ۶۵۳ -

۵ - نزھة الخواطر ، ۲ ص ۱۹ -

۶ - حدائق الحنفیة ، ص ۳۹۷ -

'تفسیر البیضاوی' پر تعلیق ہے۔

مخلص بن عبداللہ الدہلوی (م - ۱۳۶۲ء/۷۶۴ھ) نے ایک تفسیر مرتب کی جسے 'کشف الکشاف' کا عنوان دیا۔ نیز 'الھدایۃ' پر ایک نہایت عمدہ شرح لکھی جو مکمل نہ ہو سکی۔ یہ دونوں کتابیں اب نادرالوجود ہیں[1]۔

قاضی حمیدالدین (م-۱۳۶۲ء/۷۶۴ھ) نے بھی 'الہدایۃ' پر ایک شرح لکھی۔ اس کا ایک نسخہ برلین لائبریری میں پایا جاتا ہے[2]۔ حاجی خلیفہ نے بیان کیا ہے کہ قاضی حمید الدین کی یہ 'شرح الھدایۃ' ایک بہت عمدہ شرح (شرحاً حسناً) تھی مگر وہ اسے مکمل نہیں کر سکے تھے، خلیفہ نے قاضی صاحب کے نام کا یوں ذکر کیا ہے: 'الشیخ حمیدالدین المتخلص بابن عبداللہ الھندی الدھلوی'[3]۔

سراج الدین عمر بن اسحاق (م-۱۳۷۱ء/۷۷۳ھ) جو عام طور سے "سراج ہندی" کے لقب سے معروف ہیں، دہلی میں علم حاصل کرنے کے بعد حجاز اور وہاں سے قاہرہ چلے گئے اور وہاں ایک طویل مدت تک قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رہے۔ فقہ اور بالخصوص فقہ حنفی پر ان کی متعدد تصانیف ہم تک پہنچی ہیں[4]، مثلاً: 'زبدۃ الاحکام فی اختلاف الائمۃ الاعلام'۔ 'الغرۃ المنیفۃ' (فی ترجیح مذھب أبی حنیفۃ) 'الفتاوی السراجیۃ'۔ (فہرست 'الکتب خانہ الخدیویہ' میں مذکور ہے کہ 'الفتاوی السراجیۃ' شیخ ابو حفص سراج الدین عمر بن اسحاق الغزنوی الحنفی کی تصنیف ہے جو "قاری الھدایۃ" (یعنی ہدایہ کو پڑھنے والا) کے لقب سے مشہور تھے، یہ فتاوی شیخ محمد بن عبداللہ الغزنوی التمرتاشی (م-۱۵۹۵ء/۱۰۰۴ھ) نے کئی ایک کتب فقہ کی ترتیب کو نمونہ بنا کر بعد میں مرتب کیے تھے اور اس کا آغاز نحمدك اللهم یا جامع الشتات (منتشرات کو جمع کرنے والے اللہ ہم تیری حمد بیان کرتے ہیں) سے ہوتا ہے۔ شیخ تمرتاشی نے بعض اضافے بھی کیے اس لیے انہوں نے آغاز میں یہ صراحت کر دی ہے کہ جہاں کہیں 'قلت' (میں نے کہا) کا لفظ آئے گا اس کے بعد آنے والی عبارات میری اضافہ کردہ[5] ہوں گی۔ 'فتاوی قاری الھدایۃ'، 'شرح الھدایۃ الصغیر'، 'شرح الھدایۃ الکبیر' (=التوشیح) جو غیر مکمل رہی۔ 'ہدایہ' کی ان دو شرحوں کا ذکر کرتے ہوئے حاجی خلیفہ نے لکھا ہے

---

۱ - نزھۃ الخواطر، ۲ ص ۱۶۲ -
۲ - زبید احمد، ۳۰۳ -
۳ - فہرست ۳ : ۸۷ -
۴ - زبید احمد، ۳۰۳، ۳۱۴، بروکلمن ۱ : ۸۰ تکملہ، ۲ : ۸۹ -
۵ - 'فہرست' ۳ : ۱۱۲ -

کہ یہ شیخ سراج الدین عمر بن اسحاق غزنوی ہندی (م ۱۳۷۱ء/۷۷۳ھ) کی تصنیف ہیں۔ شرح کبیر کا نام 'التوشیح' ہے۔ شرح صغیر چھ جلدوں میں ہے اور اس میں جدل و مناظرے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے[1]۔ 'شرح الجامع الصغیر'۔ 'شرح الجامع الکبیر'۔ 'شرح المنار'۔ شرح المختار۔ 'شرح الزیادات'۔ 'عدة الناسک فی المناسك'۔

اصول فقہ کے باب میں سراج ہندی کی 'شرح المغنی'، یعنی جلال الدین الخجندی الخبازی (م - ۱۲۹۲ء/۶۹۱ھ) کی کتاب 'المغنی فی اصول الفقہ' پر ایک عمدہ اور مقبول شرح ہے۔ اس کتاب کے درجنوں قلمی نسخے دریافت ہو چکے ہیں[2]۔ یہ شرح ۱۳۴۴ء/۷۴۶ھ میں تالیف ہوئی۔ اس کے علاوہ سراج ہندی نے ظفرالدین ابن الساعاتی (م - ۱۲۹۶ء/۶۹۶ھ) کی کتاب 'بدایئع النظام' (فی اصول الفقہ) پر بھی ایک شرح لکھی جسے 'کاشف' (یا 'کشف') 'معانی البدیع' (فی بیان مشکلات المعانی) کا عنوان دیا۔ اس کتاب کے بھی کئی قلمی نسخے دنیا میں موجود ہیں[3]۔

حدیث کے فن میں ہمیں سراج ہندی کی دو کتابوں کا ذکر ملتا ہے: شرح صحیح البخاری بعنوان 'التوضیح' اس کا ایک نسخہ آصفیہ لائبریری میں بتایا جاتا ہے[4] اور دوسری 'الاربعین' پر ایک شرح[5]۔

عقائد پر سراج ہندی کا ایک حاشیہ بعنوان 'شرح عقیدة 'أهل السنة و الجماعة' ہے یہ ابوجعفر احمد بن محمد الطحاوی (م - ۹۳۳ء/۳۲۱ھ) کے رسالہ عقیدة أهل السنة والجماعة[6] کے متعلق ہے۔

اسی زمانے میں امیر کبیر سید علی ہمدانی کشمیری (م - ۱۳۸۴ء/۷۸۶ھ) بھی ہو گزرے ہیں۔ وہ خاندان سادات کے سات سو افراد کے ساتھ ۱۳۷۹ء/۷۸۱ھ میں کشمیر میں وارد ہوئے اور وہاں کے حاکم قطب الدین شاہ کے ہاں بہت اثر و رسوخ پیدا کرلیا۔ ان کے فیض اور حسن سلوک سے ایک خلق کثیر نے اسلام قبول کیا۔ ان کی علمی خدمات کا بیشتر حصہ تصوّف سے متعلق ہے۔ ان کی کتاب 'الاوراد الفتحیة' بہت مقبول ہوئی۔ یہ کئی بار زیور طباعت سے آراستہ ہوچکی ہے۔ اسی طرح ان کی کتاب

---

۱ - کشف 'الظنون' ۲ : ۶۵

۲ - ایضاً

۳ - زبید احمد، ۳۱۴ : بروکلمن : تکملہ، ۱ : ۶۵۷، ۲، ۸۹ -

۴ - آصفیہ، ۴ : ۲۴۸ -

۵ - اشرف علی : فہرست کتب، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۲ ص ۵۱۴ -

۶ - زبید احمد، ص ۳۷۱ : بروکلمن تکملہ، ۱ ص ۲۹۴ -

'المودة فی القربی' بھی مقبول ہوئی جو محمد جعفر جعفری کے حاشیے کے ساتھ لکھنؤ سے ۱۸۷۲ء/۱۲۸۹ھ میں شائع ہوئی ۔ پھر ۱۸۷۶ء/۱۲۹۳ھ میں کانپور میں بھی چھپی۔ 'الرسالة القدسیة' (فی أسرار النقطة الحسیة المشیرة الی أسرار الهویة الغیبیة) بھی بہت مقبول ہے[1] اس کے کئی نسخے ملتے ہیں ۔ 'الرسالة القدوسیه ، الامیة' ایک الگ تصنیف ہے[2] ۔ انڈیا آفس لائبریری کے فہرست ساز نے ذکر کیا ہے کہ اس نام کے دو رسالے یعنی 'الرسالة القدسیة فی اسرار النقطة الحسیة' اور 'الرسالة القدوسیة الامیة' علی ابن شہاب الدین الحسینی الہمدانی (متوفی ۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء) کی تصنیف ہیں اول الذکر کا خاتمہ ان الفاظ میں ہوتا ہے : ''و هذا غایة طیران سیرالسائرین و نهایة درجات کمال العارفین المحققین و بهاختم الرسالة القدسیة فی اسرار النقطة الحسیة المشیرة الی اسرار الهویة الغیبیة ، و الحمدلله وحده والسلام علی من اتبع الهدی'' ۔ (یہ نقطہ چلنے والوں کی سیر کی اڑان کا آخر اور محققین عارفین کے درجات کمال کی انتہا ہے اور اسی پر ہم یہ رسالہ ختم کرتے ہیں ...) ۔

ثانی الذکر رسالے کا آغاز مصنف نے اس حدیث نبوی سے کیا ہے کہ ''انا من الله والمؤمنون منی'' (میں اللہ کا ہوں اور مؤمنین میرے ہیں) اور اس میں آفرینش عالم اور کائنات ہستی میں انسان کے مقام سے بحث کی ہے ۔ لاہوت و ملکوت کی صوفیانہ مصطلحات کی حیثیت سے تشریح کی ہے اور فارسی شعراء کا کلام بطور استدلال پیش کیا ہے اور خاتمے پر ایک جگہ لکھا ہے : ''واعلم ان الشیطان المطلق الذی هو مظهر الجلال المطلق لایوصف بالقبح الزلق و اما الشیطان الذی هو وکیل السیئات فهوموصوف بالمقبحات'' (جان لے کہ شیطان مطلق جو جلال مطلق کا مظہر ہے اسے گمراہ کن قباحت سے موصوف نہیں کیا جاتا مگر وہ شیطان جو برائیوں کا کارساز ہے وہ گمراہ کن قباحتوں سے موصوف ہے) ۔ ان کا 'رسالة فی الناسخ و المنسوخ' بھی بہت معروف ہے[3] ۔

سید یوسف بن جمال الحسینی الملتانی (م - ۱۳۸۸ء/۷۹۰ھ) کی شہرت بھی فیروز تغلق کے عہد میں پھیلی ۔ یوسف بن جمال کی 'کتاب یوسفی' جو البیضاوی' کی 'لب الالباب فی علم الاعراب' کی شرح بتائی جاتی ہے[4] اب نادرالوجود ہے ۔ انہوں نے النسفی کی 'المنار' پر بھی ایک شرح لکھی تھی اور اسے 'توجیه الکلام' کا نام دیا تھا[5] ۔

---

۱ - زبید احمد ، ۳۴۳ : بروکلمن : تکملہ ، ۲ : ۳۱۱ -
۲ - انڈیا آفس لائبریری ، ۳۵۲ ؛ (نیز زبید احمد ، ۳۴۳) ۔
۳ - زبید احمد ، ۲۷۱ ، انڈیا آفس ، ۱۱۸۱ -
۴ - نزهة الخواطر ۲ : ۱۷۸ -
۵ - ایضاً ، ۲ : ۱۷۸ ، زبید احمد ۳۱۴ -

ان علماء کے علاوہ دو شاعروں کا ذکر بھی کر دینا مناسب ہوگا۔ اگرچہ ان شاعروں نے عربی زبان میں اتنے قصائد نہیں کہے کہ ان کا مستقل دیوان مرتب کیا جا سکے لیکن ان کا کلام فصاحت اور بلاغت کے اعتبار سے وقیع المنزلت ہے۔ قاضی عبدالمقتدر بن محمود الکندی الشریحی جو تھانیسر سے تعلق رکھتے تھے (۱۳۸۸ء/ ۷۹۱ھ) اپنے نعتیہ قصیدۃ (اللامیۃ) کی بنا پر مشہور ہوئے۔ یہ قصیدہ بحر بسیط میں ہے اور اس کے تقریباً پچاس ابیات عبدالحی لکھنوی نے 'نزہۃ الخواطر' میں نقل کیے ہیں[1]۔

قاضی عبدالمقتدر کے اس لامیہ کا مطلع یہ ہے :

یا سائق الظعن فی الأسحار والأصل سلم علی دار سلمی وابلك ثم سل

ترجمہ : اے شام و سحر کو کوچ کرنے والے ، دیار سلمی کو سلام کہنا ، پھر رونا اور پھر حال پوچھنا۔

اور اس میں کہیں کہیں قرآن کریم کی آیات کا اثر نظر آتا ہے مثلاً :

و اہل بیتك فینا رحمة نزلت اہل الطہارة عن رجس وعن وحل

ترجمہ : آپ کے اصل بیت ہم میں باعث رحمت ہیں جن کے بارے میں آیۂ تطہیر نازل ہوئی ہے۔

اور کہیں ابوتمام کے انتخاب دیوان الحماسہ کا اثر بھی نمایاں نظر آتا ہے جو شروع سے آج تک اہل علم و ادب کے لیے مقبول ہے ، مثلاً وہ کہتے ہیں :

ما قال قائلهم یوماً لواحدهم لو کنت من مازن لم تستبح ابل

ترجمہ : ان میں سے کسی نے کسی سے کبھی یہ نہیں کہا کہ اگر میں بنومازن میں سے ہوتا تو میرے اونٹ نہ لوٹے جاتے۔

انہیں کا ایک شاگرد شیخ احمد تھانیسری بھی اس دور کا ایک نامور شاعر گزرا ہے۔ امیر تیمور نے جب ۱۳۸۹ء/۸۰۱ھ میں دہلی پر حملہ کیا تو چاہا کہ شیخ احمد تھانیسری کو اپنے ساتھ سمرقند لے جائے ، مگر یہ پہلے ہی کالپی جا چکے تھے

---

۱ - نزہۃ الخواطر ، ۲ : ۷۱ ، ۷۶ -

اور وہیں مقیم ہو گئے ۔ شیخ احمد کا بھی ایک نعتیہ قصیدہ جو دالیہ ہے مقبول ہوا ۔ یہ بھی بحر بسیط میں ہے اسکے تقریباً چالیس ابیات 'نزھۃ' میں منقول ہیں[1] ۔

شیخ احمد تھانیسری کے اس دالیہ کا مطلع ہے :

اطار لبی حنین الطائر الغرد   وھاج لوعۃ قلبی التائہ الکمد

ترجمہ :

چہچہانے والے پرندے کی سوز خوانی نے مجھے بے ہوش کر دیا
اور میرے حیران و سوزاں دل کی جلن کو اور تیز کر دیا ۔

شیخ تھانیسری کا دالیہ اور ان کے استاد قاضی عبدالمقتدر کا لامیہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی مدح میں ہیں لیکن لفظی فصاحت و بلاغت اور معنوی محاسن کے اعتبار سے شاگرد اپنے استاد سے آگے نظر آتا ہے ، قاضی کے قصیدے میں تصنع اور آورد ہے لیکن تھانیسری کے ہاں بیساختگی اور آمد معلوم ہوتی ہے ، مثلاً وہ کہتا ہے :

یا افضل الناس من ماض و مؤتنف   و اکرم الخلق من حرو من عبد

أفدیك بالروح والقلب المشوق معا   و النفس والمال والاھلین والولد

قد عاقنی البعد عن مرمای یا سکنی   وطال شوقی الی لقیاك یاسندی

ترجمہ :

۱ - اے وہ جو گزشتہ و آئندہ تمام انسانوں سے افضل ہے اور تمام آزاد و غلام مخلوق میں بزرگترین ہے ۔

۲ - میں پر اشتیاق دل و جان سے آپ پر قربان ہوں ، اور میرا نفس و دولت اور اہل و اولاد بھی آپ پر فدا ہیں ۔

۳ - مجھے مقصد سے دوری نے روک دیا ہے اے میرے دل کے سکون اور اے میرے سہارے ! آپ کی زیارت کا مدت سے مشتاق ہوں ۔

* * *

---

۱ - نزھۃ الخواطر ، ۲ : ۹ ۔

چوتھا باب

فصل دوم

(۱۳۹۹ء - ۱۵۲۶ء/۸۰۲ھ - ۹۳۲ھ)

ہمارے اس مقالے کا دائرۂ کار تقریباً ڈیڑھ صدی تک پھیلا ہوا ہے - یہ زمانہ جو نویں اور دسویں صدی ہجری (پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی) کا زمانہ ہے ، عالم اسلام کے سیاسی ابتلا اور علمی تنزل کا دور ہے ، کیونکہ ہلاکو خان اور اس کے پیروکاروں کے ہاتھوں خلافت بغداد کے خاتمے کو ایک مدت گذر چکی ہے - مرکزیت کا خاتمہ ہو چکا ہے - اندلس سے مسلمانوں کے اخراج کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور ایک وسیع سلطنت کے مالک سمٹ سمٹا کر غرناطہ میں آ گئے ہیں - مگر ۱۴۹۲ء/۸۹۷ھ میں یہ آخری مورچہ بھی ٹوٹ جاتا ہے اور مسلمان آٹھ سو سالہ دور حکومت کے بعد ہمیشہ کے لیے اندلس سے نکال دیے جاتے ہیں - عراق و خراسان میں ملوک الطوائف کا دور دورہ ہے مصر و شام پر ممالیک سلاطین (۱۲۵۰ء - ۱۵۱۷ء/۶۴۸ھ - ۹۲۳ھ) حکمران ہیں[1]- دہلی کی اسلامی سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور صوبے خود مختار ہو چکے ہیں - صرف یہی نہیں بلکہ دہلی میں فرزندان ملت اسلامیہ کے لیے دائرہ حیات تنگ کر دیا جاتا ہے ، سلطان غیاث الدین تغلق صورت حال کو سنبھالنے کی کامیاب کوشش کرتا ہے - مگر ایک مختصر مدت کے لیے ، امیر تیمور نے دارالملک دہلی کو ایسی کاری ضرب لگائی کہ مغلوں کی آمد تک اسے بمشکل سنبھلنے کا موقع مل سکا[2]-

دہلی کچھ دیر کے لیے ویران ہوگئی ، مگر اس کی اس ہنگامی ویرانی کی کمی اس دور کے دوسرے صوبائی علمی اور سیاسی و ثقافتی مراکز نے پوری کر دی - بنگال ، جونپور ، مالوہ ، گجرات ، گلبرگہ اور آگرہ نے اسلامی علوم و ثقافت کی شمع سنبھال لی اور اس کی روشنی کو عام کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا - جس طرح اندلس میں اموی سلطنت کے زوال کے بعد موحدین کے دور میں عربی علوم اور اسلامی تہذیب کی شمع روشن رہی اور اس کی روشنی ماند نہ پڑنے پائی[3] ، اسی طرح دہلی کی سلطنت کے سیاسی ادبار کے بعد برِ صغیر کے مختلف خطوں میں جو صوبجاتی مسلم حکومتیں قائم ہوئیں،

---

۱ - تاریخ آداب اللغة العربية ، ۳ : ۱۲۱ ، جرجی زیدان ، مطبوعہ قاہرہ -

۲ - آب کوثر ، ص ۳۹۰ ، ۴۴۳ ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء -

۳ - الادب الاندلسی ، ص ۱۸ از ڈاکٹر احسان عباس ، مطبوعہ بیروت ۱۹۶۶ء -

انہوں نے جہاں مختصر رقبہ کے باعث سیاسی نظم و نسق میں استحکام پیدا کیا[۱] وہاں علوم و آداب کی ترقی میں بھی بڑا اہم کردار ادا کیا اور علم پروری اور اہلِ علم کی سرپرستی میں قابلِ فخر روایات قائم کیں -

محمد بن تغلق کے عہد میں دہلی کی اسلامی سلطنت سارے شمالی ہندوستان ، دکن اور تلنگانہ پر مشتمل تھی لیکن اس کی وفات سے پہلے مختلف صوبے خود مختار ہونے لگے ، حتٰی کہ ہندو ریاستوں کے علاوہ سنت مسلمان شاہی خاندانوں کی بنیاد پڑ چکی تھی - پھر تیمور کے حملے کے بعد دہلی کی برائے نام تغلق سلطنت بھی ختم ہوگئی اور اس کی جگہ لودھی سلطنت کی بنیاد پڑی[۲] - ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حکمرانوں میں بعض بادشاہ تو بلا شبہ بغداد اور اندلس کے علم پرور مسلمان حکمرانوں کی یاد کو تازہ کرتے ہیں جن میں سلطان سکندر لودھی(۱۴۸۹ء - ۱۵۱۷ء/۸۹۵ھ - ۹۱۵ھ) ، سلطان ابراہیم شرقی (۱۴۰۲ء - ۱۴۴۰ء/۸۰۴ھ - ۸۴۴ھ) - احمد شاہ اول گجراتی (۱۴۱۰ - ۱۴۴۳ء/۸۱۳ھ - ۸۴۷ھ) اور فیروز شاہ بہمنی (۱۳۹۷ء - ۱۴۲۱ء) ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ، سکندر لودھی کے عہد میں علم اور علماء کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور مولانا عبداللہ تلنبی اور ان کے عزیز مولانا عزیز اللہ تلنبی وغیرہ علماء نے معقولات و منقولات کی تدریس کو فروغ دیا اور سرکاری دفاتر کی زبان فارسی قرار پائی ، جس سے ہندو اہل کار بھی فارسی سیکھنے پر مجبور ہوگئے"[۳] - سلطان ابراہیم شرقی کے عہد میں جونپور اسلامی و عربی علوم کا نمایاں مرکز بن گیا اور تیمور کے ہاتھوں دلی" کی ویرانی کے بعد اہلِ علم نے اسی مرکز کا رخ کیا - قاضی شہاب الدین دولت آبادی ، ابوالفتح شریحی اسکندری اور نظام الدین احمد جیلانی ایسے علماء نے اپنی تصانیف اس علم پرور بادشاہ سے منسوب کیں - زندگی میں رعایا اور اہلِ علم اس سے بے حد محبت کرتے تھے اور جب وہ فوت ہوا تو سب نے تاسف کے آنسو بہائے[۴] - اسی طرح احمد شاہ اول گجراتی بھی ایک علم دوست اور اہلِ علم کا قدردان بادشاہ تھا[۵] -

اس دور کی علمی و ثقافتی سرگرمیوں کے ممتاز خدوخال میں سے ایک تو یہ ہے کہ طریقت، کا عہد زرین ختم ہو گیا اور اس کی جگہ پابندِ شرع تصوّف کے ساتھ فقہی سرگرمیاں زور پکڑ گئیں ، چنانچہ فتاویٰ کی کئی ایک اہم کتب اور مجموعے اس دور

---

۱ - آب کوثر ، ص ۲۹۰ ببعد -

۲ - مسلمان شاہی خاندان ، ص ۳۱۹ ، ۳۲۱ ، لین پول ، اردو ترجمہ مطبوعہ حیدر آباد دکن -

۳ - منتخب التواریخ ، ۲ : ۳۳۳ ببعد Oriental Biographical Dictionary p..260

۴ - نزھۃ الخواطر ، ۳ : ۱ ببعد ، Oriental Biographical Dictionary pp. 116

۵ - النور السافر ، ص ۱۹۲ -

میں تیار ہوئے ، دوسری نمایاں بات یہ نظر آتی ہے کہ سقوطِ بغداد اور اندلس سے مسلمانوں کے اخراج کے بعد اب دیارِ عرب کے اہلِ علم کی نظریں برِّ صغیر کے ان علم پرور حکمرانوں پر پڑیں اور جس طرح کسی زمانے میں اہلِ علم و فضل بغداد کا رخ کرتے یا اندلس کے علم دوست حکمرانوں کے چرچے سن کر مغرب کی طرف ہجرت کرتے تھے ، اسی طرح کئی ایک اہلِ علم ہمیں ہند کی ان اسلامی ریاستوں کے دارالحکومتوں کی طرف ہجرت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں[1] ۔ اگرچہ اس ہجرت میں وہ قوت اور تسلسل نہیں تھا جو بغداد یا اندلس کی طرف اہلِ علم کی ہجرت میں نظر آتا ہے ، تاہم اس ہجرت کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ یہاں کے عربی و اسلامی علوم کے ماہرین کو اہلِ زبان کے ساتھ ملنے اور ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملا اور اس طرح اس عہد میں جو عربی ادب تیار ہوا ، اس میں وہ فارسیت نہیں پائی جاتی جو مغلیہ دور کے عربی دانوں کے ہاں ایک روگ کی حیثیت رکھتی ہے ۔

اس دور کے ممتاز علماء عربی

شیخ بدر بن تاج لاہوری

نویں اور دسویں صدی ہجری (یعنی ۱۳۹۹ء سے لیکر ۱۵۲۶ء تک) کے عرصہ میں برِّ صغیر پاک و ہند کی خاک نے عربی و اسلامی علوم کے جن باکمال اہلِ علم و فضل کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا ، ان میں سے ایک شیخ بدر الدین بن تاج الدین بن عبدالرحیم لاہوری ہیں جو فقہ اسلامی کے ایک مستند عالم تھے[2] ، مگر افسوس اس بات کا ہے کہ اس مردِ فاضل کے نہ تو سوانح حیات دستیاب ہیں اور نہ تاریخ وفات کا علم ہوسکا ہے ۔ تاہم اندازہ یہ ہے کہ وہ پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں موجود تھے ، کیونکہ وہ قاضی ضیاءالدین سنامی کے شاگرد تھے جو اغلباً ۱۳۰۹ء/۷۰۹ھ میں فوت ہوئے۔ یہ قاضی سنامی سلطان المشائخ نظام الدین (م - ۱۳۲۴ء/۷۲۵ھ) کے معاصر تھے[3] ۔ بہرحال شیخ بدر لاہوری کی تصنیف 'مطالب المؤمنین' محفوظ ہے اور اس کے کئی خطی نسخے دنیا میں موجود ہیں ، جن سے ان کا نام زندہ رہے گا[4] ۔

---

۱ - نزہۃ الخواطر ، ۳ : ۲۵ ، ۴ : ۳۰۶ ۔
۲ - ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۳۱۵ ۔
۳ - تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۵ - نزہۃ الخواطر ، ۲ : ۹۵ ، اخبار الاخیار ، ص ۲۳۴ ۔
۴ - ڈاکٹر زبیدہ احمد ، ص ۳۱۵ ۔

شیخ بدرالدین بن تاج الدین لاہوری کی اس مفید اور مختصر تصنیف کے تین نسخے بتائے جاتے ہیں جن میں سے ایک بانکی پور کی لائبریری میں ہے اور دو رام پور کی لائبریری میں ، کتاب حنفی فقہ کے اہم دینی مسائل سے بحث کرتی ہے اور تیسری صدی ہجری سے لے کر ساتویں صدی ہجری یعنی نویں صدی عیسوی سے لیکر تیرھویں صدی عیسوی تک حنفی فقہ پر جو کتابیں تصنیف کی گئیں تقریباً ان سب سے شیخ بدر الدین نے استفادہ کیا ہے ۔ مطالب المؤمنین کے متن سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ کا تعلق آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) کے علماء سے ہے ، کیونکہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں : ''قال العبداصلحہ اللہ تعالی سمعت شیخی و استاذی الامام العامل الکامل ضیاء الدین السنامی'' ۔ یہ شیخ سنامی نظام الدین اولیاء کے معاصر تھے جو آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) کے نصف اول میں یعنی ۱۳۲۴ء/۷۲۵ھ میں فوت ہوئے ہیں ، اس لحاظ سے شیخ بدر الدین بھی یقیناً آٹھوین صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) کے اہلِ علم میں سے ہوئے[1]۔

سید محمد گیسو دراز الحسینی

برِّ صغیر پاک و ہند میں اشاعتِ اسلام اور روحانی ہدایت کے ساتھ ساتھ عربی زبان اور اسلامی علوم کی شاندار خدمات انجام دینے والے متشرع صوفیوں میں سید محمد بن یوسف بن علی بن محمد بن یوسف بن حسین بن محمد بن علی بن، حمزہ بن داؤد بن ابی الحسن زید الجندی ابوالفتح صدر الدین دہلوی ثم گلبرگوی عرف سید بندہ نواز گیسودراز کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا[2] ۔ اشاعتِ اسلام اور روحانی تعلیم عام کرنے کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کے میدان میں جو ناقابلِ فراموش علمی کارنامے انہوں نے انجام دیے ہیں ان کی مثال اور کسی متشرع صوفی و عالم کے ہاں شاید ہی مل سکے ۔ تصوّف اور تبلیغ کے ساتھ ایک سو پچیس سے زائد کتابیں تصنیف کرنا یقیناً ایک غیر معمولی کارنامہ ہے اور خصوصاً اس دور میں جب مسلمان صوفیوں کےلیے اوراد و وظائف اور غیر مسلموں میں تبلیغِ اسلام کے علاوہ کسی کام کے لیے وقت نکالنا ایک مشکل کام تھا[3] ۔

سید محمد گیسودراز ۱۳۲۱ء/۷۲۱ھ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے اور آپ ابھی چار سال کے تھے کہ والدین کے ہمراہ دولت آباد چلے گئے ۔ یہیں آپ نے اپنے والد اور دادا سے علومِ متداولہ کی تحصیل کا آغاز کیا اور پھر سولہ سال کی عمر میں اپنی والدہ اور ایک

---

۱ ۔ فہرست بانکی پور نمبر ۱۷۲۰ ۔
۲ ۔ نزھۃ الخواطر ، ۳ : ۱۵۲ ، اخبار الاخیار ص ۲۸۳ بعدہ ۔
۳ ۔ نزھۃ الخواطر ، ۳ : ۱۵۵ ، آب کوثر ، ص ۲۷۰ ۔

بھائی حسین بن یوسف کے ہمراہ دہلی ، آ گئے[۱] ۔ اس زمانے میں دہلی میں شیخ نصیرالدین محمود اودھی عرف چراغ دہلی ، خلیفہ حضرت سلطان المشائخ کا حلقہ ارادت بڑی شہرت رکھتا تھا ، آپ نے شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہونے کی خواہش ظاہر کی ، لیکن آپ نے آپ کی ذہانت و فطانت اور حسنِ گفتار کی تعریف کے ساتھ علمِ باطنی سے قبل علومِ ظاہری کی تکمیل کا مشورہ دیا ۔ چنانچہ وہ باقی ماندہ کتبِ درسیہ کی تعلیم کے لیے مولانا سید شرف الدین کیتھلی اور مولانا تاج الدین المقدم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ کے بعد اس وقت کے ممتاز فقیہ اور عالم قاضی عبدالمقتدر بن رکن الدین الشریحی الکندی کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے اور ان سے 'الشمسیہ' ، 'الصحائف' 'مفتاح العلوم' ، 'ھدایة' ، 'اصول البزدوی' ، 'تفسیر الکشاف' اور دوسری درسی کتبِ متداولہ کی تکمیل کی اور علم و فضل کے ساتھ زہد و تقوی میں بھی کامل ہوگئے[۲] ۔

علوم کی تکمیل کے بعد وہ اپنے مرشد چراغِ دہلی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے علم و فضل اور تقوی و صلاح کے طفیل جلد ہی ان کے مقرّب بن گئے اور اجازتِ بیعت حاصل ہوگئی ۔ جب ۱۳۵۶ء/۷۵۷ھ میں شیخ چراغِ دہلی وفات پا گئے تو ان کے جانشین قرار پائے اور شیخ احمد بن جمال الدین الحسینی المغربی کی بیٹی سے آپکا عقدِ نکاح ہوا جب کہ آپ کی عمر چالیس سال ہوگئی تھی[۳] ۔

۱۳۹۸ء/۸۰۱ھ میں حملۂ تیمور کے باعث آپ دہلی سے دکن روانہ ہوگئے ۔ گوالیار ، چندیری ، بڑودہ اور کھنبائت ہوتے ہوئے گجرات آئے اور پھر دولت آباد کے راستہ گلبرگہ تشریف لے گئے جہاں بادشاہ فیرور شاہ بہمنی نے آپ کا استقبال کیا ، اور آپ وہیں مقیم ہوگئے[۴] ۔

اس کے بعد آپ گلبرگہ میں ہی مقیم رہے اور اشاعتِ اسلام ، روحانی تلقین و ارشاد اور زہد و عبادت کے ساتھ ساتھ آپ تصنیف میں بھی مشغول رہے ، آپ نے غیر مسلموں کو حلقہ بگوشِ اسلام کرنے کے لیے تمام عمدہ طریقے اختیار کئے ، انہیں حکمت و تدبیر کے ساتھ دعوتِ اسلام دی اور پھر احسن طریق سے ان کے ساتھ مباحثہ و مناظرہ بھی کیا ۔

---

۱ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۲۷ ببعد ، اخبار الاخیار ص ۲۸۴ ببعدہ ، نزھة الخواطر ، ۲ : ۱۵۲ ، آب کوثر ، ص ۲۶۶ ببعدہ ۔

۲ ۔ آب کوثر ، ص ۲۶۷ ، نزھة الخواطر ۲ : ۱۵۳ ۔

۳ ۔ نزھة الخواطر ، ۲ : ۱۵۳ ۔

۴ ۔ اخبار الاخیار ، ص ۲۸۶ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۲۷ ، نزھة الخواطر ، ۲ : ۱۵۳ ، آب کوثر ، ص ۳۶۷ ۔

بسا اوقات آپ جب کسی پنڈت سے مباحثہ کرنے لگتے تو یہ طے پاتا کہ جو ہار گیا وہ جیتنے والے کا مذہب اختیار کر لے گا ۔ فتح و کامیابی ہمیشہ آپ کے حصے میں آتی اور ہندو پنڈت یا حلقہ بگوش اسلام ہوئے یا بعض وعدہ خلافی کر کے روپوش ہوگئے[1] ۔

گیسودراز کے لقب سے مشہور ہونے کا واقعہ جہاں دلچسپ ہے ، وہاں ان کے صبر و استقلال، اور اطاعت مرشد کی بھی عمدہ مثال ہے ۔ ایک دن اپنے مرشد کی پالکی اٹھائے جاتے تھے کہ بال پالکی کے ساتھ الجھ گئے ، ازراہ ادب و تعظیم تمام راستہ یونہی چلتے گئے اور بال چھڑانے کی کوشش نہ کی ، مرشد کامل چراغ دہلی کو یہ ادا بہت پسند آئی اور برجستہ یہ شعر کہہ دیا[2] :

ہر کہ مرید گیسو دراز شد　　　　واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

حضرت سید گیسودراز کی وفات ۱۴۲۲ء/۸۲۶ھ میں ہوئی آپ اور گلبرگہ میں دفن ہوئے ، جہاں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے اور اس شہر کی شہرت کا سبب بھی ہے[3] ۔

تذکرہ نگاروں نے آپ کی بہت تعریف کی ہے ۔ مولانا عبدالحئی لکھنوی لکھتے ہیں ''آپ ایک بہت بڑے عالم ، صوفی و عارف ، قوی النفس ، عظیم الهیبت ، جلیل الوقار تھے اور شریعت و طریقت کے جامع تھے ، بڑے پرہیزگار ، متقی ، زاہد اور حقائق و معارف کے سمندروں میں غوطہ زنی کرنے والے تھے ، فقہ ، تصوف ، تفسیر اور دیگر فنون میں آپ نے اہم کام کیا ہے[4]'' ۔ مولوی رحمان علی لکھتے ہیں 'آپ سیادت ، علم اور ولایت کے جامع تھے ، نیز شان رفیع ، استوار طبیعت اور عالی کلام کے مالک تھے[5]'' ۔

آپ نے عربی زبان میں بلند پایہ تصانیف کے علاوہ فارسی اور دکنی زبان میں بھی کئی ایک کتابیں تصنیف کیں ۔ آپ فارسی کے پختہ فکر صاحب دیوان شاعر بھی تھے اور آپ کا دیوان شائع ہو چکا ہے[6] ۔ آپ کی اہم تصانیف میں سے 'تفسیر القرآن الکریم'

---

۱ ۔ آب کوثر ، ص ۳۶۸ : تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۲۷ ۔
۲ ۔ اخبار الاخیار ، ص ۲۸۷ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۲۷ ۔
۳ ۔ نزهة الخواطر ، ۳ : ۱۵۶ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۲۷ ، اخبار الاخیار ، ص ۲۸۵ ، آب کوثر ، ص ۳۶۶ ۔
۴ ۔ نزهة الخواطر ، ۳ ص ۱۵۳ ۔
۵ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۲۷ ۔
۶ ۔ آب کوثر ، ص ۳۱۷ ۔

تصوف و معرفت کے رنگ میں ، 'تفسیر القرآن' (ز مخشری کی 'الکشاف' کے طرز پر) ، 'حواشی علی الکشاف' (صرف پہلے پانچ سپاروں کی تفسیر پر) 'شرح مشارق الانوار' (تصوّف کے رنگ میں) ، فارسی 'ترجمہ مشارق الانوار' ، 'المعارف شرح العوارف للشیخ شہاب الدین السہروردی (عربی میں) ، فارسی ترجمہ 'العوارف' شرح التعرف ، شرح الفصوص ، شرح آداب المریدین' (عربی اور فارسی میں) 'شرح التمہیدات لعین القضاۃ الہمدانی ، 'شرح الرسائل القشیریۃ' ، 'شرح رسالۃ ابن العربی' ، 'شرح الفقہ الاکبر' ، 'شرح بدء الامالی 'شرح العقیدۃ الحافظیۃ' ، رسالۃ فی سیرۃ النبی'' ، 'اسماء الاسرار' ، 'حدائق الانس' ، 'ضرب الامثال'، 'آداب السلوک'، 'کتاب الاربعین' ، تعلیقات علی قوت القلوب للمکی اور دیگر رسائل ، آپ کے ایک مرید (محمد نام تھا) نے آپ کے ملفوظات کو 'جوامع الکلم' کے نام سے جمع کیا ہے ۔ 'سیر محمدی'' کے نام سے آپ کی سیرت مرتب و شائع ہو چکی ہے[1] ۔

شیخ محمد گیسو دراز رحمہ اللہ کی ان تصانیف کے اسماء پر ایک نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں زیادہ تر متقدمین کی تصانیف کی شروح اور حواشی ہیں ۔ ان میں سے اکثر کا موضوع تصوف کے مسائل ہیں ، بعض کا تعلق علم کلام اور عقائد سے بھی ہے ۔ تصوف کے رنگ میں قرآن کریم کی تفسیر ہندی علماء کا دلچسپ موضوع رہا ہے ۔ تازہ ترین مثالیں مولانا اشرف علی تھانوی کی 'بیان القرآن' اور مولانا عبد الماجد دریا بادی کی 'تفسیر ماجدی' ہے ۔ شیخ گیسو دراز کی تفسیر قرآن کا پتہ نہیں چل سکا ورنہ اس کا موازنہ اس موضوع کی دوسری تفاسیر سے کیا جاتا ، اسی طرح 'الکشاف' کی شروح اور حواشی بھی ہمارے علماء کے ہاں مقبول موضوع رہا ہے ۔ جو شیخ گیسو دراز کی شرح و حواشی کی طرح اکثر ناپید ہیں ، شیخ کی دیگر تصانیف میں سے بھی کسی کا تذکرہ کہیں نہیں مل سکا ۔

بدر الدین الدمامینی

شیخ بدرالدین محمد بن ابی بکر ابن محمد القرشی المخزومی الاسکندری ثم الھندی المعروف ابن الدمامینی نحو ، لغت ، فقہ اور حدیث کے آئمہ میں سے تھے اور ان علماء میں سب سے زیادہ ممتاز اور اہم مقام رکھتے ہیں جو دیار عرب سے ہجرت کر کے برّ صغیر پاک و ہند میں وارد ہوئے اور یہاں عربی زبان و ادب اور اسلامی علوم کی شاندار خدمات انجام دیں ۔ ابن الدمامینی ۱۳۶۲ء/۷۶۳ھ میں اسکندریہ کے مقام پر پیدا ہوئے ۔

---

۱ ۔ مفصل دیکھئے ، نزھۃ الخواطر ، ۳ ص ۱۵۳ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۲۷ ، اخبار الاخیار صفحہ ۲۸۶ بعد آب کوثر ، ص ۳۶۶ بعد ۔

ابتدائی تعلیم اپنے ایک رشتہ دار شیخ بہاءالدین ابن الدمامینی اور عبدالوہاب القروی وغیرہ سے حاصل کی ۔ پھر قاہرہ میں السراج ابن الملقن وغیرہ سے اور مکہ میں قاضی ابوالفضل الشوبری سے علم حاصل کیا[1] ۔

ابن الدمامینی کی ابتدائی زندگی اکثر حوادث اور اسفار کا شکار رہی ہے ۔ حتٰی کہ وہ تمام اطراف سے مایوس ہو کر جب سرزمینِ اسکندریہ میں وارد ہوئے تو انہیں امن و خوشحالی کے ساتھ عزت و شہرت بھی حاصل ہوگئی[2] ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ علوم عربیہ میں کمال حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے شہر میں تدریس میں مشغول ہو جاتے ہیں ۔ کچھ عرصہ بعد قاہرہ پہنچتے ہیں جہاں علم و فضل کی شہرت کے باعث جامع ازھر میں نحو کی تدریس کے لیے انہیں کرسیٔ صدارت پیش کی جاتی ہے ۔ پھر اپنے شہر اسکندریہ واپس آ جاتے ہیں جہاں تدریس کے ساتھ تجارت میں بھی مشغول رہتے ہیں ۔ بعد ازاں دوبارہ قاھرہ چلے جاتے ہیں جہاں انہیں منصبِ قضا پیش کیا جاتا ہے ، مگر ناموافق حالات کے باعث مستعفی ہو کر اپنے ایک چچازاد بھائی کے ہمراہ دمشق چلے جاتے ہیں اور وہاں سے حج کے لیے حجاز اور پھر اپنے شہر اسکندریہ میں لوٹ آتے ہیں ۔ مسجد کی خطابت کے ساتھ پارچہ بافی کا کاروبار بھی شروع کر دیتے ہیں جو خوب چمکتا ہے ۔ مگر بدقسمتی سے آتشزدگی کے باعث گھر جل کر راکھ ہو جاتا ہے اور تمام سرمایہ بھی برباد ہو جاتا ہے اور وہ اپنے قرض خواہوں سے جان بچا کر مصر کے بالائی علاقے (الصعید) کی طرف بھاگتے ہیں ۔ قرض خواہ بڑی ذلت کے ساتھ پکڑ کر قاھرہ میں لاتے ہیں جہاں شیخ تقی الدین ابن حجہ اور ناصرالدین البارزی کی معاونت سے چھٹکارا حاصل کرتے ہیں ۔ اس کے بعد الملک المؤید کے دربار میں باریاب ہو کر منصب قضا پر فائز ہوتے ہیں مگر نامعلوم اسباب کی بنا پر چھوڑ کر (۱۴۱۶ء/۸۱۹ھ)حج بیت اللہ کے لیے جاتے ہیں اور ۱۴۱۷ء/ ۸۲۰ھ میں یمن کے مشہور شہر زبید میں پہنچتے ہیں ، مگر وہاں کی فضا بھی موافق نہیں آتی ۔ بالآخر سرزمینِ ہند کا رخ کرتے ہیں اور سلطان احمد شاہ بن محمد بن مظفر گجراتی کے دورِ حکومت میں بلادِ گجرات میں وارد ہوتے ہیں[3] ۔

۱۴۱۷ء/۸۲۰ھ کے اواخر میں جب وہ گجرات میں وارد ہوئے تو یہاں انہیں بڑی

---

۱ ۔ بغیة الوعاة ، ۱ ص ٦٦ ، مطبوعہ قاہرہ ۱۹٦۴ء ، الضوء اللامع (مطبوعہ قاھرہ تاریخ ندارد) ۷ : ۱۸۴ ببعد ، نزھة الخواطر ، ۳ ص ۱۲۵ ، الاعلام ، ٦ ص ۲۸۲ ، تاریخ آداب اللغة العربیة ، ۳ ص ۱۵۵ ۔

۲ ۔ الضوء اللامع ، ۷ ص ۱۸۲ ، بغیة الوعاة ۱ ص ٦۷ ۔

۳ ۔ الضوء اللامع ، ۷ ص ۱۸۲ ، بغیة الوعاة ، ۱ ص ٦۷ ۔

عزت اور اقبالمندی نصیب ہوئی اور علماء و فضلا نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی ، تعظیم و تکریم سے پیش آئے اور بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا ۔ اب ابن الدمامینی کو امن و خوشحالی کی زندگی کے ساتھ عزت و شہرت کی ایک وسیع دنیا بھی میسر آگئی ۔ وہ تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے ۔ دکن و گجرات کے شہزادوں نے ان کی بہت عزت افزائی کی اور انعامات سے نوازا[1] ، مگر افسوس کہ امن و خوشحالی اور عزت و اقبال کا یہ دور بھی مختصر ثابت ہوا اور وہ ۱۴۲۳ء/۸۲۷ھ[2] میں حیدرآباد دکن کے مشہور شہر گلبرگہ میں وفات پاگئے ۔ بقول ابن فہد انہیں زہر دیا گیا تھا[3] ۔

ابن الدمامینی لغت و نحو اور فقہ و حدیث کے امام ہونے کے علاوہ ایک اچھے شاعر بھی تھے اور ان کے اشعار مختلف کتب تراجم میں بکھرے پڑے ہیں ۔ ایک رباعی میں وہ زمانے کا یوں شکوہ کرتے ہیں :

رمانی زمانی بما ساءنی فجاءت نحوس و غابت سعود

و اصبحت بین الوری بالمشیب علیلا فلیت الشباب یعود

ترجمہ :

۱ ۔ میرے زمانے نے مجھے ایسے تیر مارے ہیں جو مجھے بہت ناگوار گزرے ہیں اور جن کے باعث نحوستیں آگئیں اور خوش بختیاں غائب ہوگئی ہیں ۔

۲ ۔ اب میں دنیا والوں میں بڑھاپے میں تشنہ لب پھرتا ہوں ، کاش جوانی لوٹ آتی !

شیخ بدر الدین ابن الدمامینی کی شہرت کا سب سے بڑا سبب ان کی تین کتابیں ہیں اور یہ تینوں علم نحو کی تین مشہور کتابوں کی شروح ہیں ، ان میں سے ایک تو 'تعلیق الفرائد' ہے جو ابن مالک کی کتاب 'تسہیل (=تحصیل) الفوائد و تکمیل المقاصد' کی شرح ہے ۔ یہ کتاب انہوں نے سلطان احمد شاہ گجراتی (۱۴۱۱ء - ۱۴۵۹ء/۸۱۳ھ - ۸۶۳ھ) ۔

---

۱ ۔ بغیة الوعاة ، ۱ ص ۶۷ ، شذرات الذهب ، ۷ ; ۱۸۱ نزهة الخواطر ، ۳ ص ۱۲۶ ببعد ۔

۲ ۔ سیوطی نے بغیة الوعاة (۱ : ۶۷) میں سنہ وفات ۱۴۳۳ء/۸۳۷ھ بتایا ہے ۔ مگر صحیح یہ ہے کہ وہ ۱۴۲۳ء/۸۲۷ھ میں فوت ہوئے (دیکھئے الاعلام ، ۶ : ۲۸۲ ، نزهة الخواطر ۳ : ۱۳۱ ، شذرات الذهب ۷ : ۱۸۱ ۔

۳ ۔ الضوء اللامع ، ۷ ص ۱۸۵ ، قاہرہ ۱۳۵۴ھ ۔

سے منسوب کی ہے۔ 'تعلیق الفرائد' جس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے ، ابن الدمامینی کی علم النحو میں ایک عمدہ تصنیف ہے ۔ کتاب کے مقدمے میں ابن مالك کے سوانح اور سلطان احمد شاہ کی مدح وستائش کے علاوہ مصنف نے کتاب کی اہمیت اور سند کا بھی ذکر کیا ہے جس کے ذریعہ یہ ابن الدمامینی تک پہنچی۔ چنانچہ وہ ذکر کرتے ہیں کہ میں نے کتاب التسہیل اپنے شیخ برہان الدین ابراہیم الشامی سے ، انہوں نے شیخ اثیرالدین ابوحیان سے ، انہوں نے ابوالفتح بعلبکی سے اور انہوں نے خود ابن مالك سے سنی اور روایت کی ۔ حاجی خلیفہ نے ذکر کیا ہے کہ ابن الدمامینی اپنے قیامِ مصر کے دوران اس کتاب کی دو شرحیں پہلے لکھ چکے تھے ۔ جب بلادِ گجرات میں وارد ہوئے تو پتہ چلا کہ یہاں کے علمی حلقے اس اہم کتاب سے آشنا نہیں ، چنانچہ بعض احباب کے التماس پر انہوں نے اس کی شرح بھی لکھی اور اسے علمی حلقوں میں متعارف بھی کرایا[1]۔

دوسری کتاب 'المنہل الصافی' ہے جو محمد بن عثمان البلخی کی 'کتاب الوافی' کی شرح ہے ، ابن الدمامینی نے یہ کتاب احمد شاہ اول بہمنی والئی دکن (۱۴۲۱ء - ۱۴۳۴ء/ ۸۲۵ھ - ۸۳۸ھ) کو پیش کی تھی ۔ ابن الدمامینی نے یہ شرح بھی ہندوستان وارد ہونے کے بعد لکھی، 'المنہل الصافی' کے سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اسے انہوں نے صرف تین ماہ کے قلیل عرصے میں تصنیف کیا اور احمد شاہ کی خدمت میں پیش کی ، کتاب کے مقدمے میں البلخی کے تعارف اور علم النحو کی اہمیت سے بحث کی ہے اور پھر 'الوافی فی النحو' کے حسنِ ترتیب اور افادیت کا تذکرہ[2] ہے ۔

تیسری کتاب کا نام ہے 'تحفۃ الغریب' جو ابن ہشام کی معرکۃ الآراء کتاب 'مغنی اللبیب' کی شرح ہے ۔ ابن ہشام (۱۳۶۰ء/۷۶۲ھ) کی کتاب 'مغنی اللبیب عن کتب الاعاریب' علم النحو کی امہات الکتب میں سے ہے اور ہر زمانے کے اہلِ علم نے اس کے درس ومطالعہ اور شرح و تعلیق پر توجہ دی ہے ۔ حاجی خلیفہ نے اس کی پچاس سے زائد شروح کا ذکر کیا ہے جن میں سے ایک شرح ابن الدمامینی کی بھی ہے ، جس کا نام ہے 'تحفۃ الغریب بشرح مغنی اللبیب' ، قیامِ مصر کے دوران ابن الدمامینی نے 'مغنی اللبیب' پر ایک تعلیق لکھی تھی ، سر زمینِ ہند میں وارد ہو کر انہوں نے یہ شرح تصنیف کی ۔ حاجی خلیفہ کی نظر سے یہ دونوں گزری تھیں اور ابن الدمامینی کی ان دو شرحوں پر اہلِ نقد نے جو اعتراض کیے تھے ان کا بھی حاجی خلیفہ نے جواب دیا اور اسے المنصف من الکلام علی مغنی ابن ہشام کا نام دیا[3] ۔ یہ شرح ۱۴۲۱ء/۸۲۴ھ میں اس وقت مکمل

---

۱ - 'کشف الظنون' ۱: ۲۸۴، 'فہرست انڈیا آفس لائبریری' نمبر ۹۶۴ -
۲ - 'کشف الظنون' ۲ : ۶۲۶ -
۳ - ایضاً ، ۲ : ۴۵۴ -

ہوئی جب مصنف نہروالہ میں مقیم تھے ، اس شرح میں مصنف نے جدید اضافات کے ساتھ 'مغنی اللبیب' کا وہ حاشیہ بھی شامل کر دیا جو انہوں نے قیام یمن کے دوران میں لکھا تھا[1]۔ برِّ صغیر میں عربی نحو پر یہ پہلی قابلِ ذکر اور اہم تالیفات ہیں ۔

ان کے علاوہ ابن الدمامینی کی تصانیف میں سے 'مصابیح الجامع' (جو 'صحیح بخاری' کی شرح ہے[2]) ، 'الفتح الربانی' ، 'عین الحیاة' (جو 'حیاة الحیوان للدمیری کی کی تلخیص ہے) ، شرح القصیدة الخزرجیة' ، 'مقاطع الشرب' ، 'شمس المغرب فی المرقص و المطرب' ، 'جواهر البحور فی العروض' ، 'اظهار التعلیل المغلق فی النحو' 'نزول الغیث الذی انسجم فی شرح لامیة العجم للصفدی' اور 'مجموعہ اشعار الفواکہ البدریة' قابلِ ذکر ہیں ''ابن العماد ، سیوطی اور السخاوی وغیرہ نے ابن الدمامینی کی بڑی تعریف کی ہے ، السخاوی نے ایک جگہ قصائد و قطعات میں تعریف کی ہے ، اور لکھا ہے : "وہ فنون ادب پر کلام کرنے والوں میں سے ایک تھے ، ادباء نے ان کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے اور قصائد و قطعات میں تعریف و مدح کی ہے ۔ وہ بڑے خوشخط تھے اور دستاویز نویسی میں بڑی پختگی حاصل تھی[3] ۔"

علی بن احمد المہائمی

شیخ علاء الدین ابوالحسن بن احمد المہائمی الشافعی النائطی (النوائطی) الدکنی جو مخدوم مہائمی کے نام سے مشہور ہیں ۱۳۷۴ء/۷۷۶ھ میں پیدا ہوئے ، آپ کا تعلق قوم نوائط (یا نوائت) سے ہے جو قریش میں سے ہیں اور حجاج بن یوسف ثقفی کے ڈر سے مدینہ سے بھاگ کر بلادِ دکن و گجرات میں آ کر آباد ہوگئے تھے ۔ شیخ علی المہائمی ایک متشرع صوفی اور مفسّرِ قرآن تھے، آپ نے اپنی عمر کا اکثر حصہ مہائم میں گزارا جو دکن کے قرب و جوار میں ایک بندرگاہ ہے اور یہیں ۱۴۳۱ء/۸۳۵ھ میں آپ نے وفات پائی ۔ آپ کا مزار بہت مشہور ہے[4] ۔

المہائمی ابن العربی کے عقیدت مندوں میں سے تھے اور ان کے نظریہ وحدت الوجود کی تائید میں کئی ایک رسائل لکھے اور دلائل سے اس کی صحت کو ثابت کیا ۔ اس کے

---

۱ ۔ نزهة الخواطر، ۳ ص ۱۲۷، الضوء اللامع، ۷ ص ۱۸۵ ، ڈاکٹر زبید احمد ص ۱۹۵ ببعد ۔

۲ ۔ اتحاف النبلاء ، ص ۵۳ ۔

۳ ۔ الضوء اللامع، ۷ص ۱۸۵ ، نیز دیکھیے بغیة الوعاة ، ص ۶۶ ببعد ، شذرات الذهب، ۷ص ۱۸۱ ۔

۴ ۔ الاعلام ، ۵ ص ۶۳ ، نزهة الخواطر، ۳ ص ۱۰۵ ، ابجد العلوم، ص ۸۹۴ ، سبحة المرجان ، ص ۴۰ ببعد ۔

علاوہ انہیں قرآن کریم اور اس کے علوم پر بھی بڑا عبور حاصل تھا ۔ اس کی تائید انکی تفسیر سے ہوتی ہے جو 'تبصیر الرحمان و تیسیرالمنان فی تفسیر القرآن' کے نام سے مشہور ہے[1] ۔

علی المہائی کی یہ تفسیر ہندی علماء اسلام کی بہترین عربی تصانیف میں سے ایک ہے ، فیضی کی 'سواطع الالہام' کو چھوڑ کر برصغیر کے مسلم مفسرین کی کتب تفسیر میں سے تین کو بہت ممتاز حیثیت حاصل ہے اور اہل علم ان کی افادیت اور ثقاہت کے معترف ہیں ۔ ان میں سے ایک قاضی ثناءاللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی 'التفسیر المظہری' دوسری نواب صدیق حسن خان علیہ الرحمۃ کی 'فتح البیان' اور تیسری تفسیر شیخ علی بن احمد المہائمی کی 'تبصیر الرحمٰن و تیسیرالمنان' ہے ۔ ان تینوں کتب تفسیر میں سے یہ مؤخرالذکر اگرچہ حجم میں کم ہے (یہ دو جلد اور سابق الذکر دونو تفسیریں دس دس جلد پر مشتمل ہیں) لیکن فوائد کے لحاظ سے کسی طرح کم نہیں ۔ المہائمی کی تفسیر کی بے شمار خصوصیات میں سے چند اہم اور قابل ذکر خصوصیات یہ ہیں :

۱ ۔ جس طرح نواب صدیق حسن خان نے اپنی تفسیر میں اپنے عہد تک کے جدید و قدیم مفسرین سے استفادہ کیا اسی طرح المہائمی نے بھی اپنی تفسیر میں متاخرین و متقدمین علماء تفسیر کی آراء و اقوال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے ۔ لیکن نواب صاحب کے برعکس المہائمی ان اقوال کی تنقیح و تصویب پر بھی خصوصی توجہ صرف کرتے ہیں ۔ وہ امام رازی اور زمخشری کے مکتب فکر کے علماء تفسیر کی آراء کو جوں کا توں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ۔

۲ ۔ قرآن کریم کی سورتوں کے اسماء کے بارے میں علماء کے متعدد اقوال کتب تفسیر میں ملتے ہیں ۔ جس سے ان سورتوں کے نام متعین کرنے میں مدد ملتی ہے ، اکثر سُوَر قرآنی ایک سے زائد ناموں کی حامل ہیں مثلاً ۔ سورہ الفاتحہ کے بیس[2] سے زائد نام بتائے جاتے ہیں لیکن عموماً مفسرین چند ایک نام کا ذکر کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں ، مگر المہائمی اس بات میں منفرد نظر آتے ہیں کہ وہ کتب تفسیر کو کھنگال کر حتی الامکان سورتوں کے تمام نام ذکر کر دیتے ہیں ۔

۳ ۔ اسی طرح آیات قرآنی کا باہمی ربط بھی ایک کامل فن کی حیثیت رکھتا ہے لیکن المہائمی نے اس میدان میں قابل قدر کام کر کے اہل علم سے خراج تحسین وصول کیا ہے ۔ مثلاً سورۃ بقرہ کے شروع میں مومن ، کافر اور منافق کے اوصاف

---

۱ ۔ نزہۃ الخواطر، ۳ ص ۱۰۵ ۔
۲ ۔ روح المعانی ، ۱ ; ۳۰ بعد ۔

اور خصائص بیان کرنے کے بعد تمام انسانوں کو رب وحدہ لاشریک کی عبادت کا حکم دیا گیا ، چنانچہ ان آیات کا ربط بیان کرتے ہوئے المہائمی لکھتے ہیں :

"ثم اشاربان هذا تمثيل لايفيد علما فلا يعارض الدليل القاطع على وجوب عبادة الله بالاسلام له و الانقياد لاحكامه فقال يا ايها الناس الآية" ۔

(پھر اللہ تعالیٰ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مومن و کافر اور منافق کا قصہ ایک تمثیل ہے جو نہ تو علمی افادے کے لیے کافی ہے اور نہ اسلام لا کر اور احکام ربانی مان کر اللہ کی عبادت کے وجوب کے خلاف دلیل قاطع بن سکتی ہے۔ اسی لیے اس تمثیل کے بعد تمام انسانیت کو عبادت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا : اے انسانو ! اپنے رب کی عبادت کرو[1] ۔ الخ) پھر عبادت و توحید کے بیان کے بعد قرآن کی صداقت و اعجاز کا ذکر آتا ہے اس کا ما سبق سے ربط بیان کرتے ہوئے المہائمی لکھتے ہیں :

ولماكانت العبادة مقتضى ذات الرب والعبد و مقتضى انعامه عليه لم يكن بد منها في الحكمة و لما كانت امتثال الامر وهو اما بالكتاب والسنة او بالاجماع او بالقياس و اصل الكل الكتاب لم يكن منه بد ولما لم يتم شأن هذا الابنفى الريب نفى عنه باعجازه فقال : وان كنتم في ريب مما نزلنا على عبدنا الآية ۔

(چونکہ عبادت ذات باری تعالیٰ کا بھی مقتضی و مقصود ہے اور بندے کا بھی مقتضی و مقصود ہے ۔ نیز یہی عبادت ہی بندے پر انعامات ربانی کا باعث ہے ، اس لیے حکمت کا تقاضا تھا کہ اس عبادت کا تذکرہ ضرور ہو ۔ پھر عبادت چونکہ امتثال امر (حکم ماننے) کا دوسرا نام ہے اور امتثال امر کتاب و سنت ، یا اجماع اور یا قیاس کے طفیل ممکن ہے اور ان سب کی اصل چونکہ کتاب اللہ ہے اس لیے اس کے بغیر بھی چارہ نہ تھا اور چونکہ کتاب اللہ کی شان و عظمت صرف اس سے شک اور شبہ کی نفی سے ثابت ہوتی تھی ۔ اس لیے کتاب اللہ کا اعجاز بیان کر کے اس شک اور ریب کی نفی کرتے ہوئے فرمایا :

"اور اگر تمہیں اس میں کچھ شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے . . . . الخ[2]" ۔

یہ تفسیر جمال الدین وزیر بھوپال کے خرچ پر دو جلدوں میں قاہرہ سے چھپ چکی ہے[3] ۔

---

۱ - تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان ، ۱ : ۳٦ ببعد ۔

۲ - تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان ، ۱ : ۳۷ ۔

۳ - نزهة الخواطر ، ۳ : ۱۰۵ ۔

غلام علی آزاد بلگرامی نے ان کے ایک عجیب و غریب رسالے کا تذکرہ کیا ہے، جس میں انہوں نے الم ! ذلک الکتاب لاریب فیه هدی للمتقین کی وجوہ اعراب سے بحث کی ہے، ان سے پہلے خسرو دهلوی دولاکھ اناسی ہزار ستر وجوہ دریافت کر چکے تھے[1]، مگر انہوں نے اس رسالے میں بارہ کروڑ تراسی لاکھ چوالیس ہزار پانچسو چوبیس وجوہ اعراب بیان کی ہیں۔ آزاد نے مثال کے طور پر اس رسالے کا ایک مفصل اقتباس اپنی کتاب 'سبحة المرجان فی آثار ہندوستان' میں دیا ہے، ان دو کتابوں کے علاوہ علی المہائمی کی اہم قابل ذکر تصانیف یہ ہیں: 'الـزوارف فی شرح العوارف'، 'مشرع الخصوص فی شرح الفصوص'، 'استجلاء البصر فی الرد علی استقصاء النظر لابن مطهر الحلّی'، 'النور الاظهر فی کشف سر القضاء والقدر'، 'الضوء الأزهر فی شرح النور الاظهر'، 'أجلة التائید فی شرح أدلة التوحید'، 'شرح النصوص للقونوی'، 'خصوص النعم فی شرح فصوص الحکم'، ['تجلیات (=تجلیة) الفصوص'] ۔ 'انعام الملك العلام باحکام حکم الاحکام' جو اسرار فقه اور محاسن شریعت پر ایک لاجواب کتاب ہے، 'اراءة الدقائق فی شرح مرآة الحقائق' (جام جہاں نما کا ترجمہ ہے) اور 'رسالہ فی الفقه الشافعی'[2] (فقه مخدومی مشتمل بر عبادات) بمبئی میں اردو ترجمہ سمیت شائع ہو چکی ہے۔

قاضی شہاب الدین دولت آبادی

شیخ شہاب الدین احمد بن شمس الدین عمر الزاولی دولت آبادی برّ صغیر کے ممتاز علماء النحو اور فقہاء میں سے ہیں، آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) کے آخری نصف میں دولت آباد (دکن) میں پیدا ہوئے[3]۔ بقول صاحب 'تاریخ فرشتہ' آپ کے آباء و اجداد غزنہ کے رہنے والے تھے اور قاضی صاحب نے دولت آباد میں نشوونما پائی تھی[4] اور علوم متداولہ قاضی عبدالمقتدر دہلوی اور مولانا خواجگی کالپوی سے حاصل کیے تھے۔ قاضی عبدالمقتدر مذکور ان کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ میرے پاس ایک ایسا آدمی آیا ہے جس کی کھال، گوشت اور ہڈیاں، علم ہی علم ہیں (اتانی رجل جلده علم ولحمه علم و عظمه علم)۔ امیر تیمور کے حملے کے وقت قاضی شہاب الدین صاحب اپنے استاذ مولانا خواجگی کے ہمراہ کالپی چلے گئے۔ استاد تو کالپی میں مقیم ہو گئے مگر قاضی

---

۱ - ابجد العلوم، ص ۸۹۴؛ سبحة المرجان، ص ۴۰ ببعده؛ ڈاکٹر زبید احمد ص ۲۰۱ -
۲ - نزهة الخواطر، ۳ ص ۱۰۶؛ الاعلام ۵ ص ۶۳؛ ابجد العلوم، ص ۸۹۴ -
۳ - نزهة الخواطر، ۳ ص ۱۹؛ مآثر الکرام، ص ۱۸۸؛ سبحة المرجان ص ۳۹ -
۴ - تاریخ فرشته، ۱ ص ۵۹۵؛ تذکره علمائے ہند، ص ۲۳۹ -

شہاب الدین وہاں سے جونپور چلے گئے جو سلاطین شرقیہ کا دارالسلطنت اور علم و ثقافت کا ممتاز مرکز تھا[1] ۔ اس وقت سلطان ابراہیم شاہ شرقی حکمران تھا جس نے قاضی صاحب کی آمد کو غنیمت جانا اور تعظیم و تکریم میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور 'ملک العلماء' کے خطاب کے ساتھ قاضی کا منصب بھی عطا کیا ۔ بعد ازاں ترقی پا کر وہ جونپور کے قاضی القضاۃ بن گئے ، حتیٰ کہ دربار شاہی میں ان کے لیے چاندی کی کرسی رکھی جاتی جس پر وہ فروکش ہوتے تھے[2] ۔

قاضی شہاب الدین نے ایک طویل مدت تک جونپور میں سرکاری مناصب کے ساتھ ساتھ تدریس کو بھی رونق بخشی اور تصنیف کتب میں مصروف رہے[3] ۔ سلطان ابراہیم شرقی قاضی موصوف کا بڑا احترام کرتا تھا حتیٰ کہ ایک دفعہ ان کی عیادت کے لیے گیا اور پانی کا بھرا ہوا پیالہ ان کے سر کے گرد گھما کر پی گیا کہ ان کا مرض اسے لگ جائے اور انہیں خدا شفا عطا فرمائے[4] ۔ بقول آزاد بلگرامی قاضی شہاب الدین عمدہ دانش مندان ہند و شہرۂ بلاد عرب و عجم[5] تھے اور بقول مولانا عبدالحی لکھنوی ، "ذکاء و ذہانت ، سرعت ادراک، قوت حافظہ ، مطالعہ ، شدت انہماک اور کتابوں پر نظر رکھنے میں انتہائی کمال کو پہنچے ہوئے تھے ، نہ تو وہ علم سے سیر ہوتے ، نہ مطالعہ سے انکی تشنگی زائل ہوتی ، نہ مشغولیت سے اکتاتے اور نہ بحث و تحقیق سے تھکتے تھے[6] ۔"

قاضی شہاب الدین نے علم نحو میں اپنی دو کتابوں کے باعث بڑی شہرت پائی ۔ ان میں سے ایک تو 'ارشاد النحو' ہے جو اس لحاظ سے علم نحو پر ایک انوکھی کتاب ہے کہ اس میں ہر مسئلہ کی مثال ضمنی طور پر عبارت ہی میں ادا کر دی گئی ہے[7] اور ہندی علماء کے نقطۂ نظر سے 'کافیہ ابن حاجب' پر فوقیت رکھتی ہے[8] ۔ دوسری کتاب 'کافیہ ابن حاجب کی شرح ہے جو 'الشرح الهندی' کے نام سے مشہور ہے اور اختصار ، جامعیت اور واضح طریق استدلال کے باعث بعض لوگوں کے نزدیک 'شرح جامی' سے بہتر ہے ۔

---

۱ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۳۹ ، سبحة المرجان ، ص ۳۹ ۔

۲ ۔ نزهة الخواطر ، ۳ ص ۱۹ ۔

۳ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۳۹ ، مآثر الکرام ، ص ۱۸۸ ، سبحة المرجان ، ص ۳۹ ۔

۴ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۳۹ ۔

۵ ۔ مآثر الکرام ، ص ۱۸۸ ۔

۶ ۔ نزهة الخواطر ، ۳ ص ۱۹ ۔

۷ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۳۹ ۔

۸ ۔ ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۱۹۶ ۔

کعب بن زہیر عہد نبوت کے ممتاز شعراء میں سے ہے اس نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اپنی گستاخیوں کی معافی چاہتے ہوئے ، ایک لامیہ قصیدہ پیش کیا تھا جسے بعد میں بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اور متعدد اہلِ علم نے اس کی شروح لکھی ہیں۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے بھی اس قصیدے کی ایک شرح لکھی ہے۔ جس کا نام 'مصدّق الفضل' ہے۔ یہ ضخیم شرح ۲۳۶ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی ہے ، شرح کے مقدمے میں قاضی صاحب نے مفید اور متنوع معلومات جمع کی ہیں۔ اگرچہ شرح کا اسلوب بیان سادہ اور سلیس ہے مگر کتاب کا خطبہ مسجع اور مقفیٰ ہے ، ایک جگہ لکھتے ہیں :

"ان من اعظم القرائح و اعجب الطبائع قرائح الشعراء و طبائع البلغاء ینظمون القرائد المتناثرة فی نظام الانتظام و یصوغون من الفوائد المتکاثرة فی قوالب صیاغة الکلام و یسوون الکلام بمعیار الاعتدال و یجعلونه منسوجا علی احسن منوال و یخرجون و جوه الوجوه الغامضة عن حجب الغموض یدخلون بحور المعانی فی بحور العروض"

(عجیب و غریب طبائع اور عظیم ترین قوت تخلیق شعراء و بلغاء کی ہے ، کیونکہ یہ بکھرے ہوئے موتیوں کو نظم کی لڑی میں پرو دیتے ہیں اور کثیر التعداد فوائد کو کلام کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں ، یہ لوگ کلام کو معیار اعتدال پر برابر کرتے ہیں اور اسے عمدہ ترین نہج پر تیار کرتے ہیں۔ یہ نہایت گہرے مسائل کے اسباب کو غموض کے پردوں سے نکال لاتے ہیں اور معانی کے سمندروں (بحور المعانی) کو علم عروض کی بحروں (بحور العروض) میں داخل کر دیتے ہیں[1])۔

ان کتابوں کے علاوہ قاضی شہاب الدین نے ادب ، فقہ ، تفسیر اور علم الکلام کے موضوعات پر کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے 'شرح اصول البزدوی' جو اصول فقہ کے موضوع پر رسالہ اصول البزدوی کی شرح ہے۔ یہ شیخ محمد عیسیٰ جونپوری کے لیے لکھی گئی ، رسالۃ فی تقسیم العلوم' ، 'مناقب السادات' ، (فارسی) ، 'ھدایۃ السعداء' (فارسی) ، 'العقیدة الاسلامیة' ، قرآن کریم کی فارسی تفسیر 'البحر المواج' (جس میں تراکیب نحویہ اور وجوہ فصل و وصل سے خصوصی بحث ہے مگر مسجع عبارت کی وجہ سے بھرتی کے الفاظ کی بھر مار ہے) 'بدائع المیزان' جو فن بلاغت میں ایک مفید رسالہ ہے اور 'فتاوی ابراہیم شاہی' قابلِ ذکر ہیں[2]۔

۱۔ مصدّق الفضل ، ص ۳۔

۲۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳۹ ، نزھة الخواطر ، ۳ ص ۲۰ ، ابجد العلوم ، ص ۸۹۲ ، سبحة المرجان ص ۳۹ ، حدائق الحنفیة ص ۳۱۹ ۔ مآثر الکرام ص ۱۸۹ ۔

قاضی شہاب‌الدین دولت آبادی کی وفات ۸۴۹ھ/۱۴۴۵ء کے قریب جونپور میں ہوئی اور سلطان ابراہیم کی مسجد میں جنوبی جانب دفن ہوئے۔

سعدالدین خیرآبادی

شیخ علامہ سعدالدین بن قاضی بڈھن بن شیخ محمد قدوائی انامی ثم خیرآبادی ادب غزل ، نحو ، فقہ ، اصول فقہ اور تصوف کے ممتاز علماء میں سے تھے ، آپ خیرآباد میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد قاضی تھے ۔ بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ، مگر وہ بڑے ذہین اور محنتی تھے ، پہلے قرآن کریم حفظ کیا ، پھر شیخ محمد اعظم بن ابی البقاء لکھنوی سے علوم متداولہ کی تحصیل کی ، آپ شیخ مینا لکھنوی کے مرید تھے ، جن کی صحبت میں بیس سال کا عرصہ گزارا ، اور ان کی وفات کے بعد کچھ عرصہ لکھنو میں مسند ارشاد پر متمکن رہے[1] ۔ پھر خیرآباد واپس آ گئے اور تدریس و ارشاد کا کام شروع کر دیا ۔ شیخ عبدالصمد بن علم‌الدین سانپوری اور الہداد رضوی وغیرہ نے ان سے علم حاصل کیا ۔ شیخ صاحب کی وفات ۸۸۲ھ/۱۴۷۷ء میں خیرآباد میں ہوئی جہاں آپ کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے[2] ۔

شیخ سعدالدین خیرآبادی کی تصانیف میں سے 'شرح اصول البزدوی' ، 'شرح الحسامی' 'شرح الجامی' 'شرح کافیۃ ابن حاجب' ، 'شرح المصباح' ، اور 'شرح الرسالۃ المکیۃ' ہے ۔ اس مؤخرالذکر شرح میں انہوں نے اپنے مرشد شیخ محمد مینا بن قطب‌الدین لکھنوی کے ملفوظات بھی درج کر دیے ہیں اور ان کے ملفوظ کو یوں کہہ کر نقل کیا ہے : ہیں : "قال شیخی شیخ مینا ادامہ اللہ فینا"[3] (میرے مرشد شیخ مینا نے یوں کہا ہے خدا انہیں ہمارے درمیان ہمیشہ باقی رکھے) ۔ افسوس کہ ان سب میں سے کوئی بھی دستیاب نہیں اور بظاہر سب ناپید ہیں ۔

ابوالفضائل سعدالدین دہلوی

ملا ابوالفضائل سعدالدین بن عبداللہ بن عبدالکریم دہلوی ، ایک ممتاز عالم اور

---

۱ ۔ نزہۃ الخواطر، ۳ : ۷۸، سبحۃالمرجان ، ص۴۲ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۷۱ ۲ ۔ ابجدالعلوم ص ۸۹۴ ۔

۲ ۔ ابجدالعلوم، ص ۸۹۴ ، سبحۃالمرجان ، ص ۴۲ ، حدائق الحنفیۃ ، ص۳۳۶ ۔ مآثر الکرام ، ۱۹۰ ببعدہ ، نزہۃ الخواطر ۳ : ۷۹ ۔

۳ ۔ نزہۃ الخواطر ، ۳ : ۷۹ ۔

فقیہ تھے ، آپ کی وفات ۱۴۸۶ء/۸۹۱ھ میں ہوئی ۔ تفصیلی سوانح ناپید ہیں مگر ان کی دو اہم تصانیف کا تذکرہ ملتا ہے اور ان کے خطی نسخے بھی پائے جاتے ہیں ۔ ان میں سے ایک 'افاضۃ المنار شرح المنار' اور دوسری کتاب 'شرح کنز الدقائق' ہے[1] ۔

"منارالانوار" امام ابوالبرکات حافظ الدین عبداللہ بن احمد النسفی (متوفی ۱۳۱۰ء/۷۱۰ھ) کی تصنیف ہے جو حنفی اصول فقہ پر بہترین اور مقبول ترین کتاب ہے ۔ حاجی خلیفہ نے اس کے سو سے زائد شروح بتائی ہیں ، شیخ ابوالفضائل دہلوی کی کتاب 'افاضۃ الانوار فی اضاءۃ اصول المنار' بھی حاجی خلیفہ کی نظر سے گزری تھی ، کتاب کا ایک نسخہ قاہرہ کے کتب خانہ خدیویہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے جو ایک شخص سلیمان بن یوسف الطوسیوی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے[2] ۔

خواجہ حسین ناگوری

خواجہ حسین ناگوری ایک عالم با عمل اور صاحب علم و دانش صوفی تھے اور شریعت و طریقت اور تصوّف کا حسین امتزاج تھے[3] ۔ آپ قاضی حمیدالدین ناگوری (م۔ ۱۲۰۸ء/۶۰۵ھ) کی نسل سے تھے جو بادشاہ شمس الدین التمش کے زمانے کے متشرع صوفی اور عالم دین تھے[4] ۔ خواجہ حسین ناگوری شیخ کبیر گجراتی کے مرید تھے اور انہوں نے طویل مدت تک ان کی خدمت میں رہ کر کسبی و وہبی علوم حاصل کئے ۔ جس زمانے میں اجمیر غیرآباد تھا اس زمانے میں خواجہ حسین ناگوری نے خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر گنبد کی ابتدا کی ، پھر خواجہ چشتی کے اشارے سے اپنے وطن ناگور میں آ گئے اور علوم دین کی تعلیم اور ارباب یقین کی تلقین میں مشغول ہوگئے[5] ۔ خواجہ ناگوری کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم سے بے پناہ محبت تھی ، حتیٰ کہ اپنا سب کچھ آپ کے نام پر وقف کر دیا[6] ۔ بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی مولانا خواجہ حسین ناگوری 'بڑے ولی اللہ اور صاحب کرامات و مقامات عالیہ تھے ، علم شریعت ، طریقت ، حقیقت میں جامع بزرگ تھے ، ذوق میں کامل ، شوق میں اکمل اور علم میں اتم ۔ زہد و تقویٰ

---

۱ ۔ کشف الظنون ۲ : ۵۱۹ ، فہرست الکتبخانہ الخدیویہ ۲ : ۲۳۸ ۔
۲ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۱۷ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۳۱۷ ۔
۳ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۶۵ ۔
۴ ۔ اخبارالاخیار ، ص ۸۵ بعدہ ، تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۹ بعدہ ۔
۵ ۔ اخبارالاخیار ، ص ۳۹۴ ۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۵ ۔
۶ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۶۵ ۔

میں عارف تھے"[۱] ۔ خواجہ صاحب نے ۱۴۹۵ء/۹۰۱ھ میں وفات پائی[۲] ۔

خواجہ صاحب نے کئی ایک تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے تفسیر 'نورالنبی' (یا 'نورالٰہی' ؟) ، جو قرآن کے تیس سپاروں کی الگ الگ تفسیر ہے اور جس میں حل تراکیب اور معانی قرآن کو جو تفسیروں میں بیان ہوئے ہیں ، تفصیل کے ساتھ آسان انداز میں پیش کیا گیا ہے[۳] ۔ 'شرح القسم الثالث من المفتاح' اور 'شرح سوانح شیخ احمد غزالی' بھی قابلِ ذکر ہیں ۔

ابوالفتح رکن الدین ناگوری

مفتی ابوالفتح رکن‌الدین بن حسام‌الدین الحنفی ناگوری اپنے عہد کے ممتاز فقہاء میں سے تھے اور علومِ شرعیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے ۔ ایک مدت تک نہروالہ (صوبہ گجرات) کے مفتی رہے ۔ مفتی صاحب کا عظیم‌الشان کارنامہ 'الفتاوی الحمادیہ' ہے جو آپ نے اپنے بیٹے مفتی داؤد بن رکن‌الدین ناگوری جو اپنے باپ کے جانشین بنے اور فقہ و اصول کے جید عالم تھے[۴] ؛ کی امداد سے قاضی حمادالدین بن محمد گجراتی قاضی القضاۃ صوبہ گجرات کے حکم سے مرتب کئے ۔ اس کتاب کی تدوین کے وقت دو سو چار امہات کتب فقہ کو پیش‌نظر رکھ کر فقہی مسائل کا انتخاب کیا گیا[۵] ۔

'الفتاوی الحمادیۃ' (جو قاضی حماد الدین گجراتی مذکور سے معنون ہے) حنفی فقہ کے ان اہم اور مشہور مجموعات میں سے ہے جو بلادِ پاک و ہند میں مدوّن ہوئے ، اس کے خطی نسخے قاہرہ ، انڈیا آفس لائبریری اور ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری میں موجود ہیں ، کتاب کی ترتیب وہی ہے جو عام کتبِ فقہ اور فتاویٰ کی ہے ۔ مصنف کے عہد تک جو مشہور کتبِ فقہ حنفی متداول تھیں ان سب سے استفادہ کیا گیا اور معتبر و مستند اقوال ائمہ احناف کی بنیاد پر متاخرین اہلِ علم کی توجیہات و استدلال کے مطابق ہر فقہی مسئلے کی مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے ، ایشیاٹک سوسائٹی اور انڈیا آفس کے نسخوں کے سرورق پر شیخ ناگوری کا نام یوں مذکور ہے : ("ابوالفتح رکن الدین بن حسام الدین المفتی الناگوری") یہ فتاویٰ چونکہ قاضی حماد الدین احمد بن

---

۱ ۔ اخبارالاخیار ، ص ۲۹۳ ۔

۲ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۶۵ ، اخبارالاخیار.ص ۲۹۳ ، ڈاکٹر زبید احمد ص ۲۷۱ ۔

۳ ۔ دیکھیے اخبارالاخیار ، ص ۲۹۳ ؛ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۶۵ ، ڈاکٹر زبید احمد ص ۲۷۲ ۔

۴ ۔ نزہۃ الخواطر، ۳ ص ۷۱ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۷۰ ۔

۵ ۔ نزہۃ الخواطر ، ۳ : ۶۸ ۔

قاضی القضاۃ محمد اکرم نہروالی گجراتی کے حکم سے مدوّن ہوئے اور انہی کے نام سے معنون ہیں : فتاوی کے مقدمے میں شیخ ابوالفتح نے ان تمام کتب فقہ کی تفصیل دی ہے جن سے استفادہ کیا گیا ۔ شیخ کے فرزند داؤد بن رکن الدین نے بھی اپنے فاضل باپ کا ہاتھ بٹایا ، چنانچہ شیخ فتاوی کے مقدمے میں اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں : لمافوض المولی القاضی جمال الملۃ و الدین احمد بن القاضی اکرم الیّ والی ابنی العلامۃ داؤد الافتاء فی القضاء شرعت اناوابنی فی تتبع الروایات وماعلیہ الاعتماد (جب مولانا قاضی احمد بن قاضی اکرم نے میرے اور میرے بیٹے علامہ داؤد کے سپرد افتاء کا کام کیا تو ہم دونوں باپ بیٹوں نے روایات کا تتبع اور معتمدعلیہ اقوال کا تتبع شروع کر دیا[۱]) ۔

اس نادر کتاب کے مخطوطے بانکی پور ؛ رام پور ، دہلی کلکتہ ، قاہرہ ، انڈیا آفس لائبریری اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں پائے جاتے ہیں[۲] ۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ مفتی رکن الدین کے سوانح حیات کہیں نہیں ملتے اور نہ ان کی تاریخِ وفات کا علم ہو سکا ہے ۔ تاہم اندازہ یہ ہے کہ آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) کے آخر میں یا نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) میں ان کی وفات ہوئی ہوگی[۳] ۔

ملا محمد جونپوری

سید محمد جونپوری بن سید خان اویسی ایک بڑے ذہین و فطین آدمی تھے ۔ سات سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کر لیا اور بارہ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فارغ ہو گئے ۔ مسائل علمیہ میں بڑی جرأت و دلیری سے بحث و تحقیق کرتے تھے جس کی وجہ سے شیخ دانیال جونپوری اور علمائے دانا پور انہیں 'اسد العلماء' کے لقب سے یاد کرتے تھے[۴] ۔ ملا محمد جونپوری چونکہ روحانیت کی فراوانی سے فیض یاب تھے اور صوری و معنوی علوم پر پورا عبور رکھتے تھے اس لیے شوریدگیٔ سر کے جذبے سے مہدویت کا دعویٰ کیا ۔ بہت سے لوگ ان کے معتقد ہو گئے اور ان سے بہت سی کرامات ظہور میں آئیں[۵] ۔ سب سے پہلی کرامت ایک ہندو راجہ دلیپ راؤ کا ان کے ہاتھوں

۱ ۔ انڈیا آفس نمبر ۱۶۸۹ ، فہرست الکتب خانہ الخدیویۃ ۳ : ۸۸ ، فہرست ایشیاٹک سوسائٹی ص ۲۵۵ ۔

۲ ۔ ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۳۱۵ ۔

۳ ۔ ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۳۱۵ ۔ نیز دیکھیے رسالہ المعارف لاہور بابت از محمد اسحاق ۔

۴ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۲۴ بعدہ ۔

۵ ۔ ایضاً ۔

تلوار سے دو ٹکڑے ہوتا ہے جو تھوڑی دیر پہلے سلطان حسین حاکم داناپور کے ایک لشکر جرّار کو شکست دے چکا تھا ۔ اس کے بعد وہ داناپور کے جنگل سے ہوتے ہوئے جہاں گیری کے لیے چل دیے اور اپنے متبعین کے سامنے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ۔ پھر حج کے دوران رکن یمانی و مقام ابراہیم میں اپنی مہدویت کا اعلان کیا ۔ جب احمدآباد گجرات میں واپسی پر اپنے دعوے کو دہرایا تو جلاوطن ہونا پڑا ۔ پھر شہر نہروالہ آئے ۔ وہاں سے بھی نکالے گئے پھر قصبہ بدلی (صوبہ گجرات)میں پہنچے جہاں تیسری بار مہدویت کا دعویٰ کیا ۔ جس کے باعث وہاں سے بھی نکلنا پڑا ۔ اس کے بعد ٹھٹھہ (صوبہ سندھ) میں آئے تو یہاں کے حاکم نے قتل کا حکم صادر کیا ، چنانچہ جان بچاتے ہوئے خراسان چلے گئے اور بالآخر ۱۵۰۵ء/۹۱۰ھ میں وفات پائی[1] ۔

سید محمد کے فرزند سید محمود بن محمد جونپوری ، جو اپنے باپ کے مذہب کے زبردست مبلغ اور خلیفۂ اوّل تھے ۱۵۲۴ء/۹۳۰ھ تک زندہ رہے[2] ۔ ان کے بعد شیخ علائی نے طریقہ مہدّویت کو قبول کر کے اسے بڑا فروغ دیا[3] ۔ گجرات اور دکن (بھارت) میں آج بھی ان کے پیروکار مل جاتے ہیں ۔

ظہورِ مہدی کا عقیدہ بعض احادیث و روایات سے ثابت ہے ۔ ان سب روایات اور احادیث کا مقصود یہ ہے کہ جب ملت اسلامیہ کی زبوں حالی حد سے گزر جائے گی اور دنیا میں دجل و فریب اور شر و فساد انتہا کو پہنچ جائے گا تو اللہ تعالیٰ ملت اسلامیہ کی عظمت رفتہ کو واپس لانے اور انسانی اقدار کا بول بالا کرنے کے لیے ایک شخصیت پیدا کرے گا جسے امام مہدیؑ یا مہدیؑ آخر الزمان کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ۔ قرب قیامت کی جو علامات احادیث میں مذکور ہیں ان میں سے حضرت مسیح کا نزول ، دجال کا فتنہ اور مہدی کا ظہور بھی ہے ۔ اہلِ علم و فکر کے ہاں یہ عقیدۂ مہدویت ایک اہم موضوع رہا ہے اور اس عقیدے کے نتیجے میں کئی اسلامی ملکوں میں مختلف ادوار میں مہدویت کے بہت سے مدعی بھی پیدا ہوتے رہے ہیں ۔ خود سر زمین ہند میں ایک سے زیادہ اشخاص نے اس کا دعویٰ کیا ہے جن میں ایک ملا محمد جونپوری بھی تھے ، ملا کا علم و فضل ، روحانی صلاحیت اور شخصی جاذبیت اس درجے کی تھی کہ ان کو یہ دعویٰ بظاہر سزا وار تھا ۔

ملا محمد جونپوری کی وفات کے بعد ان کے عقائد نہ صرف باقی رہے بلکہ مقبول بھی ہوئے اور تجدید و اصلاحِ امت کے نام پر ایک زور دار تحریک الٰہی جسے تحریک مہدویت

---

۱ ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۲۴ ببعدہ رود کوثر ، ص ۱۳ ببعدہ ۔
۲ ۔ نزہۃ الخواطر ، ۴ : ۳۴۷ ببعدہ ۔
۳ ۔ منتخب التواریخ ، ص ۱۶۵ ببعدہ ۔

اور اس کے پیروکاروں کو فرقہ مہدویہ کا نام دیا گیا ۔ تحریک مہدویت کی قوت وتاثیر کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس سے شیخ علی متقی جیسے جلیل القدر مفسر و محدث اور صاحبِ حال اہلِ علم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ، اگرچہ ان کا یہ تاثر عارضی اور وقتی ثابت ہوا ۔ بعد کے آنے والے ادوار میں فرقہ مہدویہ یا تحریک مہدویت ایک مستقل مسئلہ بن گیا جس کے موافق و مخالف لوگوں کی کسی دور میں کمی نہیں رہی ، حتیٰ کہ تحریک آزادی برّ صغیر کا شعلہ نوا خطیب نواب بہادریار جنگ بھی مہدی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتا تھا ۔

مہدوی عقائد کی بنیاد پابندی شرع ، ذکر قیامت ، توکل ، زہد ، یاد خدا ، ترک دنیا اور اصلاحِ عامہ پر ہے ۔ اس تحریک کی ابتدا بلاشبہ نیک مقاصد کی خاطر ہوئی لیکن بعد میں اس تحریک کے پیروکار تشدد ، انتہا پسندی اور ظاہر بینی کا شکار ہو گئے اور وہ مقصد پس منظر میں چلا گیا جس کی خاطر یہ تحریک اٹھی تھی یعنی اصلاحِ امت کے بجائے افسادِ احوال کی صورت پیدا ہو گئی اور یوں یہ تحریک نا کام ہوگئی ۔

قاضی چکن حنفی

قاضی چکن الہندی برّ صغیر کے ممتاز حنفی فقہاء میں سے تھے۔ وہ صوبۂ گجرات کے ایک قصبہ کن کے رہنے والے تھے[1] ، تمام عمر فقہ کی تعلیم اور قدیم فقہائے حنفیہ کی مشہور تصانیف کے مطالعہ میں صرف کر دی ۔ وہ گجرات کے مستند اور مشہور فقہاء اور علماء میں شمار ہوتے تھے[2] ۔ قاضی صاحب نے بڑے طویل مطالعہ اور عرق ریزی کے بعد فقہ حنفی کے موضوع پر فتاویٰ کی ایک کتاب مرتب کی جو 'خزانۃ الروایات' کے نام سے مشہور ہے ۔ قاضی چکن حنفی الہندی کی وفات ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء میں ہوئی[3] ۔

قاضی چکن کی کتاب 'خزانۃ الروایات' عام مسائل اور غریب روایات کا ایک مستند اور مدلّل مجموعہ ہے جس کی تدوین و ترتیب میں انہوں نے اپنی عمر صرف کردی[4] ۔ کتاب کی ترتیب کا انداز ہندوستان میں مرتب ہونے والی دیگر کتب فتاویٰ سے مختلف نہیں ، لیکن مصنف نے اپنی کتاب میں ایک خصوصیت یہ پیدا کی ہے کہ اس کا

---

۱ ۔ مفید المفتی ، ۲ : ۳۲ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۳۱۷ ۔

۲ ۔ کشف الظنون ، ۳ : ۱۲۵ ۔

۳ ۔ ایضاً ۔ ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۷۱ ، ۳۱۷ ، بروکلمان ، ۲ : ۲۲۱ ، تکملۂ بروکلمان ۲ : ۳۱۱ ۔

۴ ۔ مفید المفتی ، ۲ : ۳۲ ۔

آغاز 'کتاب العلم' سے کیا ہے جس میں علم اور علماء کے فضائل بیان کر کے بتایا ہے کہ علم اشرف العبادات ہے[1]۔

مصنفؒ نے اس کتاب میں امام ابوحنیفہ کے فضائل بھی بیان کئے ہیں اور مفتی کے اصول و آداب بھی بتائے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر فقہی مسئلے کی تائید قرآن اور صحیح حدیث سے ہونی چاہیے اور اس کے بعد امام ابوحنیفہ اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد) کے اقوال و آراء کے مطابق فیصلہ دینا چاہیے، بشرطیکہ یہ قرآن و حدیث سے متعارض نہ ہوں[2]۔

شیخ عبداللہ عثمانی تلنبی

نویں اور دسویں صدی ہجری (پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی) کے ممتاز اور سرکردہ علماء میں سے ایک شیخ عبداللہ بن اللہ داد عثمانی تلنبی ملتانی ثم دہلوی بھی ہیں جو ملتان کے قریب ایک قصبہ تلنبہ (بضم تا، بفتح لام بسکون نون و بفتح با[3]) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ اللہ داد بھی ایک عالمِ دین تھے۔ شیخ تلنبی نے خط و حساب اور ابتدائی علوم اپنے علاقے میں پڑھے اور پھر منطق و فلسفہ اور دیگر معقولات کی تحصیل کے لیے عراق و عجم میں تشریف لے گئے، جہاں آپ نے اس زمانے کے مشہور فاضل علّامہ عبداللہ یزدی[4] سے ایک طویل مدت تک استفادہ کیا اور عین عنفوانِ شباب میں اپنے وطن کو لوٹ آئے اور ایک مدت تک ملتان میں درس و تدریس اور افاضہ و افادہ میں مشغول رہے۔ حتیٰ کہ ملتان کی تباہی کے وقت وہاں سے چلکر دہلی آ گئے۔ یہ شہر اس زمانے میں علوم و آداب کے سرپرست بادشاہ سکندر لودھی کے زیر نگیں تھا، بادشاہ نے شیخ کی آمد کو غنیمت سمجھا اور آپ کا شاندار استقبال کیا اور 'ملک العلماء' کے خطاب سے نوازا[5] اور ان سے استفادہ بھی کیا۔

ملک العلماء شیخ عبداللہ تلنبی سے پہلے دیارِ ہند میں 'شرح الشمسیة' اور 'شرح الصحائف' کے سوا معقولات کی اور کوئی کتاب مدارسِ عربیہ میں متداول نہ تھی، وہ جب عراق عجم کے فضلاء سے معقولات پڑھکر واپس آئے تو اس فن کی کئی کتابیں بھی

---

١ - مفید المفتی، ٢ : ٣٢ - ڈاکٹر زبید احمد، ص ٤٧ بعدہ -

٢ - ڈاکٹر زبید احمد، ص ٤٧ -

٣ - سبحة المرجان، ص ٣٤ - تذکرہ علمائے ہند، ص ٢٦٢ -

٤ - نزهة الخواطر، ٤ : ٣٠٤ -

٥ - منتخب التواریخ، ٢ : ٢٢٣ بعدہ، نزهة الخواطر، ٤ : ٣٠٤، مآثر الکرام، ص ١٩١ بعدہ -

اور اس کے پیروکاروں کو فرقہ مہدویہ کا نام دیا گیا ۔ تحریک مہدویت کی قوت و تاثیر کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس سے شیخ علی متقی جیسے جلیل القدر مفسر و محدث اور صاحب حال اہل علم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ، اگرچہ ان کا یہ تاثر عارضی اور وقتی ثابت ہوا ۔ بعد کے آنے والے ادوار میں فرقہ مہدویہ یا تحریک مہدویت ایک مستقل مسئلہ بن گیا جس کے موافق و مخالف لوگوں کی کسی دور میں کمی نہیں رہی ۔ حتیٰ کہ تحریک آزادی برّ صغیر کا شعلہ نوا خطیب نواب بہادریار جنگ بھی مہدی مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا ۔

مہدوی عقائد کی بنیاد پابندی شرع ، ذکر قیامت ، توکل ، زہد ، یاد خدا ، ترک دنیا اور اصلاح عامہ پر ہے ۔ اس تحریک کی ابتدا بلاشبہ نیک مقاصد کی خاطر ہوئی لیکن بعد میں اس تحریک کے پیروکار تشدد ، انتہا پسندی اور ظاہر بینی کا شکار ہو گئے اور وہ مقصد پس منظر میں چلا گیا جس کی خاطر یہ تحریک اٹھی تھی یعنی اصلاح امت کے بجائے افساد احوال کی صورت پیدا ہو گئی اور یوں یہ تحریک نا کام ہو گئی ۔

قاضی چکن حنفی

قاضی چکن الہندی برّ صغیر کے ممتاز حنفی فقہاء میں سے تھے ۔ وہ صوبۂ گجرات کے ایک قصبہ کن کے رہنے والے تھے[1] ، تمام عمر فقہ کی تعلیم اور قدیم فقہائے حنفیہ کی مشہور تصانیف کے مطالعہ میں صرف کر دی ۔ وہ گجرات کے مستند اور مشہور فقہاء اور علماء میں شمار ہوتے تھے[2] ۔ قاضی صاحب نے بڑے طویل مطالعہ اور عرق ریزی کے بعد فقۂ حنفی کے موضوع پر فتاویٰ کی ایک کتاب مرتب کی جو 'خزانۃ الروایات' کے نام سے مشہور ہے ۔ قاضی چکن حنفی الہندی کی وفات ۱۵۱۴ء/ ۹۲۰ھ میں ہوئی[3] ۔

قاضی چکن کی کتاب 'خزانۃ الروایات' عام مسائل اور غریب روایات کا ایک مستند اور مدلّل مجموعہ ہے جس کی تدوین و ترتیب میں انہوں نے اپنی عمر صرف کردی[4] ۔ کتاب کی ترتیب کا انداز ہندوستان میں مرتّب ہونے والی دیگر کتب فتاویٰ سے مختلف نہیں ، لیکن مصنف نے اپنی کتاب میں ایک خصوصیّت یہ پیدا کی ہے کہ اس کا

---

۱ ۔ مفید المفتی ، ۲ : ۳۲ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۳۱۷ ۔

۲ ۔ کشف الظنون ، ۳ : ۱۳۵ ۔

۳ ۔ ایضاً ۔ ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۱۰۷ ، ۳۱۷ ، بروکلمان ، ۲ : ۲۲۱ ، تکملۂ بروکلمان ۲ : ۳۱۱ ۔

۴ ۔ مفید المفتی ، ۲ : ۳۲ ۔

آغاز 'کتاب العلم' سے کیا ہے جس میں علم اور علماء کے فضائل بیان کر کے بتایا ہے کہ علم اشرف العبادات ہے[1]۔

مصنّف نے اس کتاب میں امام ابوحنیفہ کے فضائل بھی بیان کئے ہیں اور مفتی کے اصول و آداب بھی بتائے ہیں ۔ ان کے نزدیک ہر فقہی مسئلے کی تائید قرآن اور صحیح حدیث سے ہونی چاہیے اور اس کے بعد امام ابوحنیفہ اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد) کے اقوال و آراء کے مطابق فیصلہ دینا چاہیے ، بشرطیکہ یہ قرآن و حدیث سے متعارض نہ ہوں[2] ۔

شیخ عبداللہ عثمانی تلنبی

نویں اور دسویں صدی ہجری (پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی) کے ممتاز اور سرکردہ علماء میں سے ایک شیخ عبداللہ بن اللہ داد عثمانی تلنبی ملتانی ثم دھلوی بھی ہیں جو ملتان کے قریب ایک قصبہ تلنبہ (بضم تا ، بفتح لام بسکون نون و بفتح با[3]) میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد شیخ اللہ داد بھی ایک عالمِ دین تھے ، شیخ تلنبی نے خط و حساب اور ابتدائی علوم اپنے علاقے میں پڑھے اور پھر منطق و فلسفہ اور دیگر معقولات کی تحصیل کے لیے عراق و عجم میں تشریف لے گئے ، جہاں آپ نے اس زمانے کے مشہور فاضل علّامہ عبداللہ یزدی[4] سے ایک طویل مدت تک استفادہ کیا اور عین عنفوانِ شباب میں اپنے وطن کو لوٹ آئے اور ایک مدت تک ملتان میں درس و تدریس اور افاضہ و افادہ میں مشغول رہے ۔ حتیٰ کہ ملتان کی تباہی کے وقت وہاں سے چلکر دہلی آ گئے ۔ یہ شہر اس زمانے میں علوم و آداب کے سرپرست بادشاہ سکندر لودھی کے زیرِ نگیں تھا ، بادشاہ نے شیخ کی آمد کو غنیمت سمجھا اور آپ کا شاندار استقبال کیا اور 'ملک العلماء' کے خطاب سے نوازا[5] اور ان سے استفادہ بھی کیا ۔

ملک العلماء شیخ عبداللہ تلنبی سے پہلے دیارِ ہند میں 'شرح الشمسیة' اور 'شرح الصحائف' کے سوا معقولات کی اور کوئی کتاب مدارسِ عربیہ میں متداول نہ تھی ، وہ جب عراق عجم کے فضلاء سے معقولات پڑھکر واپس آئے تو اس فن کی کئی کتابیں بھی

---

۱ ۔ مفید المفتی ، ۲ : ۳۲ ۔ ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۱۷ ببعد ۔

۲ ۔ ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۲۷ ۔

۳ ۔ سبحة المرجان ، ص ۴۲ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۶۲ ۔

۴ ۔ نزهة الخواطر ، ۴ : ۳۰۴ ۔

۵ ۔ منتخب التواریخ ، ۲ : ۲۲۳ ببعد ، نزهة الخواطر ، ۴ : ۳۰۴ ، مآثر الکرام ، ص ۱۹۱ ببعد ۔

ساتھ لائے اور انہیں نصاب تعلیم میں شامل کر دیا اور معقولات کی تدریس میں مصروف ہوگئے[۱] ۔ سلطان سکندر لودھی شیخ صاحب کی بڑی عزت کرتا تھا اور بغرض ملاقات و استفادہ جب مسجد میں داخل ہوتا تو مجلس کے ایک گوشے میں چپکے سے بیٹھ جاتا مبادا طلبہ کے سبق میں کسی قسم کا خلل یا رکاوٹ واقع ہو جائے اور جب شیخ درس سے فارغ ہوتے تو سلام کے بعد گفتگو ہوتی اور صحبت کا یہ سلسلہ کافی دیر جاری رہتا[۲] ۔

شیخ کے ہم عصر اور ہم وطن عالم مولانا عزیزاللہ تلنبی تھے وہ بھی ملتان کی تباہی کے بعد دہلی کی طرف ہجرت کر گئے تھے اور سنبھل میں ایک مدت تک درس وتدریس میں مشغول رہے ۔ ایک مرتبہ سلطان سکندر لودھی کے دربار میں علماء کے دو گروہوں کے درمیان مناظرہ ہوا ، ایک طرف شیخ عبداللہ تلنبی اور عزیزاللہ تلنبی تھے اور دوسری جانب شیخ اللہ داد جونپوری اور ان کے فرزند مولانا شیخ بھکاری جونپوری تھے ۔ اس بحث و مناظرے کے بعد سلطان نے یہ فیصلہ دیا کہ تقریر میں اوّل الذکر بزرگوں کا پلّہ بھاری ہے اس لیے وہ مناظرہ جیت گئے مگر تحریر میں مؤخرالذکر باپ بیٹے کا پلّہ بھاری ہے[۳]۔

شیخ تلنبی کے علم و فضل کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ بقول بدایونی چالیس سے زیادہ متبحر علماء نے شیخ سے استفادہ کیا جن میں میاں لاڈن عبدالغفور بن نصیرالدین دہلوی ، شیخ جمال‌الدین خان دہلوی ، میاں شیخ گوالیاری اور میراں سید جلال الدین بدایونی بھی شامل ہیں[۴] ۔

شیخ زین العابدین عرف شیخ اڈھن (م ـ ۱۵۲۷ء) دہلوی بھی جو شیخ عبدالحق محدّث دہلوی کے نانا اور ایک متبحّر عالم و فاضل تھے ، مولانا عبداللہ تلنبی کے شاگرد تھے[۵] ۔

شیخ عبداللہ تلنبی کو مؤرخین نے شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے ۔ بقول مولوی رحمان علی :

> 'وہ عالموں کے سرتاج ، فاضلوں کے چراغ ، علومِ معقول و منقول میں یگانۂ عصر اور فروع و اصول میں یکتائے دھر تھے[۶] ۔'

---

۱ ۔ منتخب التواریخ ، ۲ : ۳۲۴ نزھۃ الخواطر ، ۴ : ۲۰۴ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۶۲ بیعلہ ۔
۲ ۔ ایضاً ، و آب کوثر ،
۳ ۔ منتخب التواریخ ، ۲ : ۳۲۵ ، تذکرہ علمائے ہند
۴ ۔ منتخب التواریخ ، ۲ : ۳۲۴ ، نزھۃ الخواطر ، ۴ : ۱۰۵ ۔
۵ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۰۵ ۔
۶ ۔ ایضاً ۔ص ۲۶۲ ۔

آزاد بلگرامی کے الفاظ میں :

'تاج العلماء و سراج الفضلاء ووحید عصرہ تھے[1] ۔'

نواب صدیق حسن خان انہیں رأس العلوم العقلیة والنقلیة قرار دیتے ہیں[2] اور بقول عبدالحئی لکھنوی وہ فرط ذکاء ، ذہانت ، قوّت حافظہ اور سرعت ادراک میں سب پر فوقیت رکھتے تھے[3] ۔

شیخ عبداللہ تلنبی کی وفات ۱۵۱۶ء/۹۲۲ھ میں ہوئی ۔ بقول مولوی رحمان علی اور فقیر جہلمی 'اولئك لهم الدرجات العلی' سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے[4] ۔

شیخ تلنبی برّ صغیر کے پہلے عالم ہیں جنہوں نے معقولات پر قلم اٹھایا ، آپ نے علم منطق کے موضوع پر سب سے پہلے 'میزان المنطق' کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا تھا جو ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اور مطبع احمدی دہلی میں طبع ہوا تھا ۔ اس کے بعد خود ہی اس کی شرح بھی لکھی اور اس کا نام 'بدیع المیزان' رکھا ۔ جو ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۸۴۵ء/۱۲۶۱ھ میں دہلی میں چھپی ہے ، شرح کے مقدمے میں علم منطق کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"قد اتفقت الآراء علی أن حكمة ذی الجلال فی إيجاد العقلاء هی معرفة الذات والصفات بالاستدلال عليها بالآثار والآيات وهی متوقفة علی العلم المسمی بالمنطق ولهذا حكم الفحول من العلماء والنحارير من العظماء بفرضية معرفته علينا" ۔

(سب اہل رائے اس بات پر متفق ہیں کہ اہل عقل کی تخلیق میں اللہ ذوالجلال کی حکمت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ آثار و نشانات سے استدلال کرتے ہوئے اللہ کی ذات و صفات کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور یہ بات علم منطق کی تحصیل پر موقوف ہے یہی وجہ ہے کہ بزرگ علماء اور بلند مرتبہ محققین نے اس کی معرفت کو فرض قرار دیا ہے[5] ۔

---

۱ ۔ سبحة المرجان ، ص ۴۲ ۔

۲ ۔ ابجد العلوم ، ص ۸۹۳ ۔

۳ ۔ نزهة الخواطر ، ۴ : ۲۰۴ ۔

۴ ۔ منتخب التواریخ ، ۲ : ۳۲۵ ، نزهة الخواطر ، ۴ : ۲۰۵ ، سبحة المرجان ، ص ۴۲ ۔ ابجد العلوم ، ص ۸۹۳ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۶۲ ، مآثرالکرام ، ص ۱۹۲ ۔ حدائق الحنفیہ ص ۳۶۳ ۔

۵ ۔ بدیع المیزان ، ص ۲ تا ۳ ۔

'بدیع المیزان' منطق' کی ایک معیاری کتاب سمجھی جاتی ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا فضل امام خیرآبادی جیسے فاضل فلسفی نے 'تشحیذ الاذھان' کے نام سے اس کی شرح لکھی[1] ۔

شیخ عبداللہ تلنبی رحمۃ اللہ علیہ علم و فضل میں یکتائے روزگار ہونے کے ساتھ ساتھ جرأت و حق گوئی اور قلندرانہ بیباکی بھی رکھتے تھے ۔ ایک دفعہ سکندر لودھی کو پتہ چلا کہ کوروکھشیتر میں ہندو جمع ہیں اور تالاب میں نہانے اور مندر میں پرستش کرنے کے علاوہ انہوں نے وہاں ایک ہنگامہ برپا کر رکھا ہے ، سکندر کا مذہبی جوش بھڑک اٹھا اور اس نے ان سب کو تہہ تیغ کرنے اور مندر کو مسمار کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن ملک العلماء مولانا عبداللہ تلنبی نے جرأت ایمانی سے کام لیتے ہوئے بادشاہ کو اس سے منع کیا اور بتایا کہ اہل ذمہ کی حفاظت سلطان اسلام کا فرض ہے اور ان کے دینی معاملات میں دخل دینا قرآن و تعلیمات نبوی[ؐ] کے خلاف ہے ، سکندر یہ سن کر آگ بگولا ہوگیا اور اس نے اپنے ہاتھ پر خنجر رکھا اور کہا کہ تم بھی کفار کے ساتھ ہو ، میں پہلے تمہارا خاتمہ کروں گا اور پھر کفار کا ! ملک العلماء نے جواب دیا :

"ہر ایک کی زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس کے حکم کے بغیر کسی کو موت نہیں آ سکتی ۔ جب کوئی شخص کسی ظالم کے سامنے آئے تو پہلے اسے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنا چاہیے ۔ تم نے جو کچھ مجھ سے پوچھا میں نے احکام نبوی[ؐ] کے مطابق اس کا جواب دیا ، اگر تمہیں اس کی قدر منظور نہ تھی تو تم نے مجھ سے پوچھا ہی کیوں ؟ اس جرأت کی وجہ سے سکندر کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ اپنے ارادے سے در گزرا[2]" ۔

شیخ اللہ داد جونپوری

شیخ علاء الدین اللہ (الہٰ) داد بن عبداللہ حنفی صوفی جونپوری ہند کے مشہور علماء و فضلاء میں سے تھے ۔ آپ جونپور میں پیدا ہوئے جو اس وقت علم کا مرکز تھا اور شیخ شہاب الدین دولت آبادی کے شاگرد مولانا شیخ عبدالملک عادل جونپوری سے علوم متداولہ کی تحصیل کی[3] ۔ اسی وجہ سے صاحب 'اخبارالاخیار' نے لکھا ہے "بیک

---

۱ ۔ ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۱۲۹ ، ۱۵۳ ۔
۲ ۔ آب کوثر ، ص ۵۵۴ ببعد ۔
۳ ۔ نزھۃ الخواطر ، ۴ : ۲۱ ۔

واسطہ شاگرد قاضی شہاب الدین است ۔" اس کے علاوہ عبداللہ بن اللہ داد تلنبی ثم ملتانی اور شیخ یحییٰ بن الامین الہ آبادی سے بھی علم اخذ کیا[1]۔ آپ سید حامد شاہ مانکپوری کے مرید اور شیخ حسن بن طاہر کے ہم عصر اور پیر بھائی تھے[2] ۔ آپ کے فرزند مولانا بھکاری جونپوری بھی بلند پایہ عالم تھے ۔ شیخ عبداللہ تلنبی اور عزیز اللہ تلنبی کے ساتھ سلطان سکندر لودھی کے دربار میں ان باپ بیٹے کا مناظرہ ہوا جس کی تفصیل عبدالقادر بدایونی نے درج کی ہے[3] ۔ شیخ اللہ داد جونپوری نے اپنی تمام عمر علوم کی اشاعت اور تصنیف کی نذر کر دی اور آپ تحریر و تقریر اور مطالب علمیہ کی تنقیح و تحقیق میں بڑی قدرت اور ملکہ رکھتے تھے[4] اور عالم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب حال متشرع صوفی بھی تھے[5] ۔ آپ کی وفات ۹۲۳ھ/۱۵۱۸ء میں ہوئی (۹۳۲ھ درست نہیں[6]) ۔

آپ کی تصانیف میں سے 'شرح الکافیہ' (حاشیہ علی شرح الجامی) 'الحواشی علی الحواشی الھندیۃ' شرح اصول البزدوی ، 'حاشیہ علی مدارک التنزیل' اور مرغینانی کی 'الھدایۃ' کی شرح ، ہے جو کئی جلدوں میں ہے اور علماء نے پسند کی ہے ۔ شیخ اللہ داد جونپوری کی تصانیف میں سے صرف دو کے نسخے پائے جاتے ہیں ۔ 'شرح الھدایۃ' کے نسخے ترکی میں کتب خانہ عاطف آفندی اور پشاور میں موجود ہیں ، شیخ کی یہ شرح اگرچہ ھدایۃ کی دوسری شروح جیسی شہرت و مقبولیت تو حاصل نہ کر سکی مگر علمی حلقوں نے اسے پسند کیا اور مصنف کو خراج تحسین پیش کیا ۔ شیخ جونپوری کی دوسری محفوظ تصنیف 'حاشیہ علی مدارک التنزیل' ہے جس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے ، 'مدارک التنزیل' امام ابوالبرکات حافظ الدین عبداللہ بن احمد النسفی کی تصنیف ہے جس پر علماء نے بہت سے حواشی لکھے ہیں ۔ شیخ جونپوری نے اپنے حواشی میں کتاب کے مشکل الفاظ کی لغوی تشریح ، معقد عبارات کی توضیح اور سورتوں کے احکام و فضائل سے بحث کی ہے ۔ وہ اپنے حواشی میں ایک جگہ سورہ بقرہ کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

---

۱ ۔ سبحۃ المرجان ، ص ۴۳ ۔

۲ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۱۵ ۔ سبحۃ المرجان ، ص ۴۳ ۔ نزھۃ الخواطر : ۴ : ۳۱ ۔

۳ ۔ منتخب التواریخ ۲ : ۳۲۴ نیز دیکھئے گزشتہ ص ۱۸۸ ۔

۴ ۔ تذکرہ علمائے ہند ۔ ص ۱۱۵ ۔

۵ ۔ اخبار الاخیار ، ص ۲۰۴ ۔ بیعدہ ۔

۶ ۔ حدائق الحنفیہ ، ص ۳۶۵ ۔ نزھۃ الخواطر ، ۴ : ۴۲ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۱۶ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۲۷۲ ۔

سُمِّيَتْ بِالْبَقَرة مَعَ اشْتِمَالِهَا عَلَى كَثِيرٍ مِنَ الْأُمُورِ الْعَجِيبَةِ سِوَى قِصَّةِ الْبَقَرَةِ لِأَنَّ قِصَّةَ الْبَقَرَةِ مَخْصُوصَةٌ بِهَا" (سورہ بقرہ کو بقرہ اس لیے کہتے ہیں کہ گائے کے قصے کے علاوہ دیگر عجیب امور پر مشتمل ہونے کے باوجود یہ قصہ اسی سورۃ سے مختص ہے) ۔

شیخ زین الدین المعبری

شیخ ابویحیٰی زین الدین بن علی بن احمد الشافعی المعبری الملیباری (=مالا باری) ایک عالم باعمل اور بحث و تحقیق کے امام تھے ، آپ ۱۳۶۸ء/۸۷۳ھ میں کوشن (کوچین) علاقہ ملیبار میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد علی بن احمد المعبری معبر کے رہنے والے تھے اور وہاں کے مشاہیر علماء میں شمار ہوتے تھے۔ شیخ ابویحیٰی زین الدین اپنے چچا و ہمنام قاضی زین الدین بن احمد المعبری کے ہمراہ ملیبار کے شہر فونان میں منتقل ہوگئے[1] ۔ یہ معبری خاندان ملیبار کا بڑا علمی اور معزز گھرانہ تھا اور زہد و تقویٰ میں بڑی شہرت رکھتا تھا ۔ اس خاندان کے چند افراد نے وہاں ایک مدرسہ اور خانقاہ بھی تعمیر کی جو اسلامی علوم کا مرکز ہونے کے علاوہ ملیبار میں آنے والے عرب و عجم کے مسلمان مہمانوں کی قیام گاہ بھی تھی ۔ شیخ شہاب الدین ابن حجر الھیتمی (۱۵۰۳ - ۱۵٦٦ء/۹۰۹ - ۹۷۴ھ) جب ملیبار آئے تھے تو اسی خانقاہ میں ٹھہرے تھے اور یہیں انہوں نے تفسیر و حدیث کا درس بھی دیا تھا[2] ۔

شیخ زین الدین ابو یحیٰی نے جن شیوخ سے استفادہ کیا ان میں سے شہاب الدین احمد بن عثمان الیمنی بھی ہیں جن سے آپ نے فقہ و حدیث کے علاوہ 'الکافی فی علم الفرائض للصبروفی' بھی پڑھی ۔ اس کے علاوہ شیخ ابوبکر فخر الدین بن قاضی رمضان شالیاتی ملیباری سے آپ نے فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم حاصل کی جو شیخ شمس الدین الجوجری، شیخ ذکریا انصاری اور شیخ کمال الدین محمد بن ابی شریف کے شاگرد تھے[3] ۔

شیخ زین الدین ابویحیٰی قطب الدین بن عزالدین اجودھنی اور شیخ ثابت بن عین

---

۱ - نزھۃ الخواطر ، ۳ : ۱۱۸ - ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۳۲۵ -
۲ - رسالہ زمانہ کانپور ، جنوری ۱۹۲۳ء -
۳ - نزھۃ الخواطر ، ۳ : ۱۱۸ -

بن محمود الزاہدی کے مرید تھے اور تحصیلِ علم اور معرفت طریقت کے مراحل طے کرنے کے بعد آپ علم کی اشاعت اور یادِ الٰہی میں مشغول ہو گئے اور بالآخر ۹۲۸ھ/۱۵۲۱ء میں ملیبار کے شہر فونان میں وفات پائی[۱] ۔

شیخ زین الدین ابویحیٰی المعبری نے بہت سی مفید تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے قابل ذکر یہ ہیں :

۱ ۔ 'تحفة الاحبّاء' (اوقاتِ پیغبر میں)

۲ ۔ 'مرشد الطلاب'، (تصوّف)

۳ ۔ 'شمس الھدیٰ'

۴ ۔ 'ارشاد القاصدین' (جو امام غزالی کی 'منہاج العابدین' کا اختصار ہے)

۵ ۔ 'شعب الایمان' (علامہ سید نور الدین کی تصنیف 'شعب الایمان' فارسی کا عربی ترجمہ)

۶ ۔ 'کتاب الصفاء من الشفاء' (جو عباس قاسمی کی الشفاء کا خلاصہ ہے)

۷ ۔ 'تسہیل الکافیہ' (کافیہ ابن حاجب کی شرح)

۸ ۔ کفایة الفرائض' (جو الصبروفی کی کتاب 'الکافی فی الفرائض کی شرح ہے)

۹ ۔ حاشیہ الفیہ ابن مالک'

۱۰ ۔ حاشیہ 'تحفة ابن الوردی'

۱۱ ۔ حاشیہ، ارشاد ابن مقری'

۱۲ ۔ 'قصص الانبیاء' (از آدم تا داؤد)

۱۳ ۔ '(تحریض اھل الایمان علی جہاد عبدة الصلبان)'

۱۴ ۔ سیرة النبی' (جو آپ ادھوری چھوڑ کر وفات پاگئے تھے[۲] ۔

المعبری کی تصانیف کی اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ زیادہ تر قدماء کی تصانیف کے خلاصے، تراجم یا حواشی پر مشتمل ہیں اور ان میں سے اکثر ناپید ہیں ۔

---

۱ ۔ نزھة الخواطر، ۴ : ۱۸ ؛ بحوالہ، زمانہ جنوری ۱۹۳۳ء، ڈاکٹر زبید احمد ص ۳۴۶ ۔

۲ ۔ ایضاً ۔

شیخ المعبری عربی زبان کے ایک اچھے شاعر بھی تھے ، آپ کی منظومات کے کئی ایک قصائد کا ذکر ملتا ہے جن میں سے اہم یہ ہیں :

۲ - 'ھدایة الاذکیاء أو جوزة فی التصوّف'

۳ - تحریض اھل الایمان علی جھاد عبدة الصلبان اور(۴)أرجوزة فیا یورث البرکة وینفی الفقر'

شیخ زین الدین ابویحیٰی المعبری کے یہ قصائد و منظومات اس لحاظ سے تو بڑا قیمتی علمی سرمایہ ہیں کہ بیّر صغیر کے ایک عربی دان عالم کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہیں جو عربی زبان کے وطن اصلی سے کوسوں دور ، شعر و شاعری کے عربی ماحول سے الگ تھلگ ہے لیکن یہ قصائد جہاں تصنّع و تکلّف سے خالی نہیں وہاں بعض مقامات پر بے مزگی اور خشک مزاجی کا بھی عکس پیش کرتے ہیں ۔ علوم و فنون کے اصول کو نظم میں قلمبند کرنے کا رواج تقریباً ہر زبان میں ہوتا ہے ۔ خود عربی زبان میں نحو ، قراءة و تجوید ، اصول فقہ ، علم الکلام و العقائد ، اور دیگر فنون کو عرب علماء نے نظم کی شکل میں پیش کیا ہے ۔ زین الدین المعبری کے علاوہ دیگر علماء مثلاً عبداللہ بن اسعد الیافعی وغیرہ نے تصوف کے لوازمات کو منظوم کیا ہے یہ منظومات بھی اگرچہ تصنع و تکلف سے خالی نہیں کیونکہ شعر جیسی لطیف چیز خشک موضوعات کی متحمل نہیں ۔ تاہم المعبری کی نسبت ان کے ہاں تکلّف اور بے مزگی کا احساس ذرا کم ہوتا ہے ۔ المعبری کا منظومہ 'ھدایة الازکیاء یوں شروع ہوتا ہے :

الحمدُ للهِ الموفقِ للعُلا — حَمْداً يُوافِقُ بِرَّهُ المتكاملا

ثُمَّ الصلوةُ على الرسولِ المصطفى — وَالآلِ مَعَ صَحْبٍ وَتَبَاعٍ وِلا

تَقْوَى الالهِ مَدَارُ كُلِّ سعادةٍ — وَتِبَاعُ اهوا رأسُ شَرِّ حَبَائلا

إنَّ الطريقَ شريعةٌ وطريقةٌ — وَحَقِيقَةٌ فَاسْمَعْ لَهَا مَا مُثِّلا

فَشَرِيعَةٌ أَخْذٌ بِدِينِ الخَالِقِ — وَقِيَامُهُ بِالأَمْرِ وَالنَّهْيِ انْجَلا

وَطَرِيقَةٌ أَخْذٌ بِأَحْوَطَ كَالوَرَعِ — وَعَزِيمَةٌ كَرِيَاضَةٍ مُتَبَتِّلا

فَشَرِیعَۃٌ کَسَفِینَۃٍ وَطَرِیقَۃٌ   کَالْبَحْرِ ثُمَّ حَقِیقَۃٌ دُرٌّ غَلَا

وَحَقِیقَۃٌ لِوُصُولِہٖ لِلْمَقْصَدِ   وَمُشَاھَدُ نُورِ التَّجَلِّی بِانْجَلَا

ترجمہ :

۱ - حمد اللہ کے لیے جو بلندی کی توفیق دینے والا ہے ، ایسی حمد جو اس کے احسان کامل کے برابر ہو سکے -

۲ - پھر سب رسولِ مصطفیٰؐ اور آپ کی آلِ صحابہؓ اور تابعینؒ پر درود ہو -

۳ - ہر سعادت کا مدار اللہ کے تقویٰ پر ہے اور نفسانی خواہشات کا اِتباع بدترین قسم کا پھندا ہے -

۴ - طریقِ دین تین چیزیں ہیں ، شریعت ، طریقت اور حقیقت جو بزرگوں نے ان کی مثالیں دی ہیں انہیں سن لے -

۵ - شریعت مثل کشتی کے ہے - طریقت مثل سمندر کے ہے اور حقیقت ایک قیمتی موتی کی مانند ہے -

۶ - پھر شریعت اللہ کے دین پر عمل پیرا ہونے کا نام ہے - واضح اوامر و نواہی کے ذریعہ شریعت کو قائم رکھنا ہے -

۷ - طریقت نام ہے محتاط ترین راستہ اختیار کرنے کا جیسے ورع ہے اور عزیمت جیسے خلوص کے ساتھ یادِ الٰہی -

۸ - حقیقت ،قصد تک رسائی اور واضح طور پر نورِ تجلی کے مشاہدہ کا نام ہے -

ان قصائد کی مقبولیت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف پہلے قصیدے کی تین مطبوعہ شروحات موجود ہیں جن میں سے ایک شرح سید ابوبکر دمیاطی مصری کی ہے جو 'کفایۃ الاتقیاء فی منہاج الاصفیاء' کے نام سے ۱۸۸۱ء/۱۳۰۲ھ میں مصر میں چھپی ، دوسری شرح محمد نووی الجاوی (انڈونیشیا) کی ہے جو ۱۸۸۰ء/۱۳۰۱ھ میں قاھرہ سے 'سالم الفضلاء' کے نام سے چھپی اور تیسری شرح مصنف کے بیٹے 'عبدالعزیز المعبری' کی ہے جو ۳ جنوری ۱۵۸۵ء/ یکم محرم ۹۹۳ھ میں فونان میں لکھی گئی اور مسلک الاتقیاء کے نام سے ۱۸۷۰ء/۱۲۹۲ھ میں بولاق سے چھپ چکی ہے[۱] -

---

۱ - تفصیل کے لیے دیکھیے : رسالہ زمانہ کانپور، جنوری ۱۹۳۳ء ، نزھۃ الخواطر ۳ : ۲۱۹ ، ڈاکٹر زبید احمد ص ۴۳۶ -

ان کے خاندان میں کئی اہلِ علم و فضل پیدا ہوئے - ان کے بیٹے عبدالعزیز اور پوتے زین الدین معبری بن عبدالعزیز (م - بعد ۱۵۸۳ء/۹۹۱ھ) کا تذکرہ آئندہ صفحات میں ملے گا -

شاہ احمد شرعی چندیری

شیخ شاہ احمد شرعی چندیری نویں اور دسویں صدی ہجری (پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی) کے ممتاز علماء میں سے تھے - سلطان محمود والیٔ مالوہ ایسے علم پرور حکمران کے دربار سے جو علمائے وقت وابستہ رہے ان میں سے ایک شیخ چندیری بھی ہیں[1] - شاہ احمد ایک فاضل متبحّر ، درویش کامل ، شیخ بزرگ اور علوم عقلیہ و نقلیہ کے مستند عالم تھے - چندیری ریاست مالوہ کا ایک شہر ہے ، مولانا شرعی اسی شہر کے رہنے والے تھے - شیخ عبدالغنی سونی پتی جو ایک متشرع فاضل اور زاہد تھے ان کے شاگرد تھے - شیخ شرعی کی وفات ۱۵۲۱ء/۹۲۸ھ میں ہوئی -

شیخ شاہ احمد شرعی ایک عالمِ دین ہونے کے علاوہ ممتاز ادیب[2] اور شاعر بھی تھے ، انہوں نے علامہ زمخشری صاحب 'الکشاف' کے ان اشعار کا اسی وزن اور قافیہ میں جواب لکھا ہے جو اہلِ السنة کے طعن میں کہے گئے ہیں[3] :

وَجَمَاعَةٌ سَمُّوا هَوَاهُمْ سُنَّةً   وَجَمَاعَةٌ حُمُرٌ لَعَمْرِی مُوکَفَه

قَدْ شَبَّهُوهُ بِخَلْقِهِ فَتَخَوَّفُوا   شُنَعَ الْوَرَی فَتَسَتَّرُوا بِالْکَلْفَه

ترجمہ :

۱ - ایک ایسا گروہ جس نے اپنی خواہشات کو سنت کا نام دے دیا ہے ، بخدا یہ لوگ گروہِ خران ہے -

۲ - جس نے خدا کو مخلوق کے مشابہ کہا اور پھر مخلوق کے لعن طعن سے ڈر کر تاویلات میں پڑ گئے -

---

۱ - ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۲۴۲ -

۲ - نزهة الخواطر ، ۴ : ۱۳۲ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۳ - اخبارالاخیار ، ص ۲۲۰ -

۳ - ایضاً -

عَجَباً لِقَوْمِ ظَالِمِینَ تَلَقَّبُوا — بِالْعَدْلِ مَا فِیهِمْ لَعَمْرِی مَعْرِفَه

قَدْ مَاهُمْ مِنْ حَیْثُ لَایَدْرُونَه — تَعْطِیلِ ذَاتِ اللّٰهِ مَعَ نَفْیِ الصِّفَه

ترجمہ :

۱ - تعجب ہے ان ظالموں پر جنھوں نے ''اہلِ عدل'' کا لقب اختیار کیا ، بخدا ان میں کوئی علم و معرفت نہیں -

۲ - ان لوگوں نے صفات باری تعالیٰ کی نفی کی اور جہالت و لاعلمی سے اللہ کی ذات کو معطّل و مجرّد بنا دیا -

بحرق الحضرمی

مولانا شیخ جمال الدین محمد بن عمر بن مبارک بن عبداللہ بن علی الحمیری الشافعی المعروف بحرق الحضرمی علماء کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو دیار عرب سے سرزمین ہند میں وارد ہوئے اور عربی و اسلامی علوم کے سلسلے میں یہاں اپنا فیض عام کیا اور شہرت پائی - وہ نہ صرف یہ کہ حضرموت کے علماء میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں[۱] ، بلکہ دیارِ عرب سے سرزمین برّصغیرِ پاک و ہند میں آنے والے علماء میں بھی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں - شیخ بحرق الحضرمی ۱۴۶۴ء/شعبان ۸۶۹ھ میں حضرموت میں پیدا ہوئے اور وہاں کے علماء سے علوم متداولہ کی تعلیم کا آغاز کیا - سب سے پہلے قرآن کریم حفظ کیا ''پھر فقہ کی کتاب 'الحاوی' ، 'منظومة البرماوی' اور پورا 'الفیہ ابن مالک' زبانی یاد کیا اور حضرموت میں اس زمانے کے مشہور فقیہ محمد بن احمد باجرفیل سے استفادہ کیا اور پھر تلاشِ علم کے لیے سفر پر نکلے -

سب سے پہلے وہ عدن پہنچے جہاں اس وقت کے امام عبداللہ بن احمد مخرم سے فقہ ، اصول فقہ - اور عربی ادب و لغت کی تعلیم حاصل کی اور الفیہ ابن مالک کا اعادہ کیا اور 'سیرت ابن ہشام' کی سند بھی لی[۳] - اس کے علاوہ وہاں کے ایک اور مشہورعالم اور فقیہ محمد بن احمد بافضل سے بھی استفادہ کیا[۴] - پھر وہ یمن کے مشہور شہر زبید میں پہنچے جو اس زمانے میں علمی و ثقافتی مرکز تھا اور وہاں کے جلیل القدر علماء اور

---

۱ - النور السافر ، ص ۱۳۶ ، نزهة الخواطر ، ۴ : ۳۰۶ -
۲ - ایضاً -
۳ - ظفر الوالہ ، ۱ : ۱۹۹ ، النورالسافر ، ص ۱۳۶ -
۴ - ایضاً -

آئمہؓ فن سے سند حاصل کی ۔ چنانچہ شیخ زین الدین محمد بن عبداللطیف الشرجی سے حدیث کی سند لی ، فقیہ دوراں شیخ جمال الدین محمد بن ابی بکر الصائغ سے اصول فقہ ، تفسیر ، حدیث اور نحو کی تحصیل کے علاوہ 'شرح البہجة الوردیة لابی زرعہ' بھی پڑھی[1] ۔

تحصیل علم سے فراغت کے بعد شیخ بحرق الحضرمی نے روحانی تربیت اور طریقت و تصوف کی طرف توجہ دی اور زبید کے مشہور بزرگ السید الشریف الحسین بن عبدالرحمٰن الاہدل سے بیعت ہوئے ۔ پھر طریقۂ عیدروسیة کے امام شمس الشموش شیخ ابوبکر بن عفیف العیدروس کی صحبت سے مستفیض ہوئے اور ان کے فیض و برکت کے آثار ان کی شخصیت پر نمایاں ہوئے[2] ۔

۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء میں زیارت حرمین اور حج بیت اللہ کے لیے جب مکہ گئے تو اس دور کے عظیم مؤرخ و محدث امام شمس الدین الحافظ السخاوی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور ان سے سماع کیا اور سند لی اور تصوف کے روحانی مدارج طے کیے[3] ۔

شیخ بحرق الحضرمی شیخ حسین بن عبداللہ العیدروس کی طرف سے سلطان عامر بن عبدالوہاب والئی یمن کے قصائد و رسائل کا جواب دیتے تھے ۔ اس لیے سلطان سے قلبی لگاؤ پیدا ہو گیا اور جب اس نے زبید کی درسگاہوں پر توجہ مبذول کی اور نئے نئے مدارس قائم کرنا شروع کیے تو شیخ بحرق نے سلطان کی مدح کی[4] ۔ وہ کچھ عرصہ الشحر کے قاضی بھی رہے مگر کچھ مدت بعد طبیعت اکتا گئی اور شہزادہ مرجان العامری والئی عدن کے پاس چلے گئے اور اس کی وفات کے بعد برّ صغیر پاک و ہند میں وارد ہوئے اور ۹۳۰ھ/۱۵۲۴ء میں سلطان مظفر والئی گجرات کے دربار میں پہنچ گئے جہاں بڑی قدرومنزلت ہوئی اور بادشاہ کے اتنے مقرب بن گئے کہ وزراء حسد کرنے لگے اور یہی بات ان کی موت کا سبب بن گئی ۔ چنانچہ اسی سال ۱۵۲۴ء/ بیس شعبان ۹۳۰ھ میں انہیں زہر دے کر مار دیا گیا ۔ شیخ بحرق الحضرمی ایک نادرۂ روزگار شخصیت تھے مگر حیرت ہے کہ اسلامی ہند کے مسلمان مؤرخین اور تذکرہ نگار ان کے بارے میں بالکل خاموش ہیں ، حتیٰ کہ آزاد بلگرامی اور نواب بھوپال ایسے متاخرین آئمہؓ تاریخ و تذکرہ نگاری نے بھی ان کا ذکر نہیں کیا ۔ حالانکہ مؤخرالذکر نے 'ابجد العلوم'

---

۱ ۔ نزھة الخواطر، ۴ : ۳۰۶ ، ظفر الوالہ، ۱ : ۱۱۹ ، النور السافر ، ص ۱۳۶ ، الضوء اللامع، ۸ : ۲۵۳ ۔

۲ ۔ النور السافر ، ص ۱۳۶ ۔

۳ ۔ الضوء اللامع ، ۸ : ۲۵۳ ۔ النور السافر ، ص ۱۳۶ ، نزھة الخواطر، ۴ : ۳۰۶ ۔ ظفر الوالہ، ۱ : ۱۱۹ ۔

۴ ۔ نزھة الخواطر ، ۴ : ۳۰۸ ، الضوء اللامع ، ۸ : ۲۵۳ ۔

میں علماء عرب اور علماء یمن پر بھی الگ الگ باب باندھے ہیں ، مگر ان کے ضمن میں کہیں ذکر نہیں کیا ، صرف محمد بن عمر المکی الآصفی نے 'ظفر الوالہ' میں ان کا اجمالی تذکرہ کیا ہے اور پھر دور جدید کے امام العربیۃ مولانا عبدالحی لکھنوی نے 'نزھۃ الخواطر' میں ذکر کیا ہے ، مگر یہ تذکرہ بھی 'ظفر الوالہ' کے علاوہ سخاوی کی 'الضوء اللامع' اور العیدروسی کی 'النورا لسافر' سے ماخوذ ہے ۔ بہرحال شیخ بحرق الحضرمی کی عظمت میں اس سے کوئی فرق نہیں آتا ۔ کیونکہ سخاوی جیسا ثقہ نقاد اور محدّث بھی اپنے اس شاگرد کی تعریف کرتا ہے[1] اور العیدروسی[2] انہیں علماء حضرموت میں سب سے ممتاز اور بہتر قرار دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ شیخ الحضرمی اللہ کی آیات میں سے ایک آیت تھے ۔ ان کی کتابیں ان کے تبحرِ علمی اور کثرتِ مطالعہ پر دلالت کرتی ہیں اور وہ تحقیق ، جودتِ فکر اور باریک بینی میں بلندیوں پر پہنچے ہوئے تھے[3] ۔

مولانا شیخ جمال الدین بحرق الحضرمی نے تاریخ ، سیرت نبوی[4] ، عقائد ، علم الکلام فقہ ، ادب ، موسیقی ، نحو ، لغت ، تفسیر اور حدیث کے مختلف موضوعات پر کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں ۔ وہ ایک عمدہ ادیب اور نثرنگار تھے ، شیخ عیدروس کی طرف سے انہوں نے والئی یمن عامر بن عبدالوہاب کو جو رسائل لکھے تھے وہ اس کی شہادت دیتے ہیں[3] ۔ اس کے علاوہ وہ ایک فصیح اللسان اور قادرالکلام شاعر بھی تھے اور ان کے قصائد کتب تراجم میں بکھرے پڑے ہیں ۔

شیخ بحرق الحضرمی کی جو نظم و نثر دستیاب ہے اس سے ان کے علمی مرتبہ کا یقین مشکل نہیں ۔ وہ دیگر ہندی علماء کے برعکس اہلِ زبان تھے ، لغت ، ادب ، نحو اور بلاغت پر کامل عبور تھا اور تمام عمر ان موضوعات پر لکھتے پڑھاتے صرف کی تھی ، اس لیے ان کا اسلوب نظم و نثر دلکش اور سلیس ہے ۔ گو انہوں نے کہیں کہیں اپنے عہد کے پر تکلّف اسلوب قافیہ و سجع کو بھی اپنایا ہے مگر اس میں تصنّع اور بناوٹ کا عنصر نہیں ہے ۔ ان کے منتشر اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے عربی شاعری کے مروّجہ اصناف میں سے اکثر پر طبع آزمائی کی ہے ۔ مدح ، ہجو ، غزل اور دیگر اصناف کے نمونے ان کے ہاں پائے جاتے ہیں ۔ وہ ایک موقع پر کہتے ہیں :

---

۱ - الضوء اللامع، ۸ : ۲۵۳ -
۲ - النور السافر، ص ۱۴۴ -
۳ - ایضاً ، ص ۱۴۶ -
۴ - النور السافر ، ص ۱۴۹ -

أَظَنَنْتَ أَنَّ الشِّعْرَ يَصْعَبُ صَوْغُهُ عِنْدِي وَقَدْ أَضْحَى لَدَيَّ مُذَلَّلَا

أُبْدِي الْعَجَائِبَ إِنْ بَرَزْتُ مُفَاخِراً أَوْ مَادِحاً لِلْقَوْمِ أَوْ مُتَغَزِّلَا

ترجمہ :

۱ - کیا تیرا خیال یہ ہے کہ شعر کا ڈھالنا میرے لیے مشکل ہے - حالانکہ وہ تو میرا مطیع و فرمان بردار ہو چکا ہے -

۲ - میں جب فخر کرنے لگوں ، یا کسی کی مدح کروں یا حدیث حسن و عشق کی ترجمانی کے لیے غزل کہوں تو بڑے عجائب کا اظہار کرتا ہوں !

شیخ بحرق کے کمالِ علم اور ذہانت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ گجرات آنے کے بعد ایک سال کے مختصر عرصے کے دوران میں نہ صرف یہ کہ انہوں نے سیرت نبویؐ پر ایک عمدہ کتاب لکھ کر اپنی قابلیت کا سکہ منوایا بلکہ بادشاہ کی نظروں میں وہ مقام بھی حاصل کر لیا جس پر وزراء گجرات کو بھی حسد آنے لگا اور ان کی جان لے کر چھوڑی !

شیخ الحضرمی ایک بسیار نویس مصنف تھے اور چھوٹے رسائل سے لیکر بڑی علمی تصانیف ان سے یادگار ہیں - شیخ کے مختصر رسائل میں سے ایک 'رسالۃ فی إثبات رسالۃ ہارون علیہ السلام و کفر فرعون' بھی ہے جس میں انہوں نے دو اہم سوالات یعنی حضرت ہارون کی رسالت اور فرعون کا کفر کی حالت میں مرنا کے جوابات دیے ہیں - آپ لکھتے ہیں کہ بعض خود ساختہ علماء کا دعویٰ ہے کہ حضرت ہارون کو رسالت کا مرتبہ حاصل نہ تھا اسی طرح بعض متصوّفین کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ کا مدِّ مقابل فرعون ایمان لا کر مرا ، لیکن یہ قرآن کریم کی آیات سے لاعلمی یا بعض آیات سے صرفِ نظر کا نتیجہ ہے ، ورنہ خود آیات قرآنی سے یہ صراحۃً ثابت ہے کہ حضرت ہارون کو رسالت کا مرتبہ حاصل تھا اور یہ کہ فرعون کفر کی حالت میں مرا تھا - شیخ کے الفاظ ہیں[1] :

"اعلم أن القرآن كله كسورة واحدة يصدق بعضه بعضاً و يفسر الآية منه الآية الأخرى فمن استدل بمفهوم آية معارضاً به صريح آية أخرى فقد آمن ببعضه وكفر ببعضه ويقولون نؤمن ببعض ونكفر ببعض ويريدون أن يتخذوا

---

۱ - رسالۃ فی اثبات رسالۃ ہارون علیہ السلام و کفر فرعون - ورق ۲۹ الف -

بین ذلك سبیلاً أولئك هم الکافرون حقا ، فلا بد من الجمع بین آیاته ورد متشابہاته إلی محکماته کل من عند ربنا (سن لے کہ سارے کا سارا قرآن ایک سورت کی مانند ہے جس کے بعض حصے دوسرے حصوں کی تصدیق و تفسیر کرتے ہیں ۔ پس جس نے ایک آیت کے مفہوم سے استدلال کرتے ہوئے دوسری آیت کی مخالفت کی تو وہ گویا بعض آیات پر ایمان لایا اور بعض سے کفر کیا ، . . . یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائے اور بعض سے کفر کیا اور وہ چاہتے یہ ہیں کہ ایک بین بین راستہ اختیار کریں ، یہ لوگ بلاشبہ کافر ہیں ۔ پس ضروری ہے کہ تمام آیات قرآنی پر مجموعی نظر ہو اور متشابہات کو محکمات کے حوالے سے سمجھا جائے کیونکہ سب آیات ہمارے پروردگار کا کلام ہے") ۔

شیخ بحرق الحضرمی کی تصانیف میں سے یہ قابل ذکر ہیں :

۱ ۔ 'تبصرة الحضرة الشاهیة الاحمدیة بسیرة الحضرة النبویة' الاحمدیة سیرت نبوی ؐ کے موضوع پر یہی وہ نادر کتاب ہے جو انہوں نے احمد المظفر بن محمود گجراتی کے لیے تصنیف کی تھی[1] ۔ شیخ بحرق الحضرمی کی یہ کتاب سیرت نبوی کے موضوع پر متقدمین کی کتب سیرت کا ملخص اور نچوڑ ہے ۔ مصنف نے چونکہ یہ کتاب احمد شاہ گجراتی کے لیے لکھی اور اسی کے نام سے معنون ہے اس لیے قدرتی طور پر انہوں نے بادشاہ کو سیرت رسول ؐ پر عمل کر کے اسم بامسمی بننے کی تلقین بھی کی ہے ۔

۲ ۔ 'الاسرار النبویة فی اختصار الاذکار النوویة ، مختصر الترغیب والترهیب للمنذری ، ابو محمد عبدالعظیم بن عبدالقوی المنذری الشافعی (م ۔ ۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ) کی مشہور 'کتاب الترغیب و الترهیب' کا خلاصہ ہے جس میں نیک اعمال کی ترغیب دلانے اور برے اعمال سے اجتناب دلانے کے لیے احادیث نبوی ؐ کا انتخاب کیا گیا ہے ۔

۳ ۔ الحدیقة الانقیة فی شرح العروة الوثیقه ۔ (یہ ان کے اپنے ایک قصیدے کی شرح ہے جس میں انہوں نے شریعت و حقیقت کے درمیان موافقت و تطبیق میں کمال کر دیا ہے[2])

۴ ۔ عقد الدرر فی الایمان بالقضاء و القدر (جو مسئلہ قضا و قدر کے موضوع پر ہے)

۵ ۔ العقد الثمین فی ابطال القول بالتبقیح والتحسین

---

۱ ۔ نزهة الخواطر ، ۴ : ۳۰۶ ، ظفر الواله ، ۱ : ۱۱۹ ، النور السافر ، ص ۱۹۱ ۔
۲ ۔ ایضاً ۔

۶ - الحسام المسلول علی مبغضی (منتقصی) الرسول ؐ (اس میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ؐ سے نفرت کرنے والا مرتد ہے) -
۷ - العقیدة الشافعیة
۸ - مختصر المقاصد الحسنة
۹ - حلیة البنات
۱۰ - ذخیرة الاخوان
۱۱ - النبذة المنتخبة۔ من کتاب الاوائل للعسکری (ابو ہلال العلوی کی کتاب الاوائل کا خلاصہ ہے)
۱۲ - ترتیب السلوک الی ملک الملوک
۱۳ - متعة الاسماع باحکام السماع (موسیقی کی شرعی حیثیت کے بارے میں ہے)
۱۴ - السماع
۱۵ - مواهب القدوس
۱۶ - شرح الملحة للحریری
۱۷ - شرح لامیة ابن مالک مختصر شرح الصفدی علی لامیة العجم
۱۷ - رسالة فی الحساب
۱۸ - رسالة فی الفلاح
۱۹ - ارجوزة فی الطلب
۲۰ - فتح الرؤف فی معانی الحروف[1]

شیخ عزیز اللہ تلنبی

مولانا شیخ عزیز اللہ تلنبی ملتانی ثم سنبھلی ، جو مولانا عبداللہ تلنبی کے معاصر ، ہم وطن اور غالباً عزیز بھی تھے[2] ، اپنے وقت کے عالم باعمل ، بلند پایہ محقق، صاحب رشد و ہدایت اور دانشمند فاضل تھے[3] ، وہ بھی مولانا عبداللہ کی طرح ملتان کی تباہی کے بعد دہلی میں آ گئے تھے اور پھر سنبھل کو اپنی مستقل جائے سکونت اور درس و تدریس

---

۱ - مفصل دیکھیے : الاعلام للزرکلی ، ۷ : ۲۰۷ - النورالسافر ، ص ۱۴۷ ببعد ، نزهة الخواطر ، ۴ : ۳۰۷ -
۲ - منتخب التواریخ ، ۲ : ۲۲۳ -
۳ - تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۳۷ نزهة الخواطر ، ۴ : ۲۲۵ -

اور ارشاد و تلقین کا مرکز قرار دیا ، شیخ عزیز اللہ جب ملتان سے دہلی آئے تو اس وقت سلطان سکندر لودھی حکمران تھا جس نے ان کے ساتھی مولانا عبداللہ تلنبی کی بڑی قدرو منزلت کی تھی ۔ شیخ عزیز اللہ بھی اس کے دربار میں حاضر ہوئے اور اس درباری مناظرے میں حصہ لیا جس میں شیخ عزیز اللہ اور مولانا عبداللہ ایک طرف تھے اور مولانا اللہ داد جونپوری اور ان کے فرزند مولانا بھکاری ایک طرف تھے[1] ۔ شیخ عزیز اللہ بڑے ذہین تھے اور مشکل کتابیں منتہی طلبہ کو پڑھاتے تھے اور مشکل سے مشکل سوال کا تسلی بخش اور فوری جواب دیتے تھے ۔ آپ کے تلامذہ میں سے شیخ نظام الدین حیدر آبادی اور شیخ حاتم سنبھلی کا نام قابلِ ذکر ہے[2] ۔

شیخ عزیز اللہ بڑے متقی ، عبادت گزار ، خلوت پسند ، خود دار اور معقولات کے عظیم عالم تھے ، ۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ میں انتقال ہوا[3] ۔ آپ کی تصانیف میں سے 'رسالہ عینیة' قابلِ ذکر ہے جو آپ نے شیخ امان اللہ پانی پتی کے 'رسالہ غیریہ' کے جواب میں تحریر کیا تھا ۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے شیخ امان اللہ پانی پتی (م ۔ ۱۵۵۰ء/۹۵۷ھ) کا رسالہ عینیہ اور شیخ عزیز اللہ تلنبی کا جوابی رسالہ غیریة دونوں ناپید ہیں اس لیے ان کے مندرجات کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ، بظاہر دونوں کا تعلق فلسفہ و تصوّف سے معلوم ہوتا ہے ۔

شیخ عبدالعزیز المعبری

شیخ عبدالعزیز بن زین الدین ابی یحیٰی بن علی بن احمد المعبری ثم الملیباری ، ملیبار کے علمی و دینی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جو کئی پشتوں تک علم و فضل کا سرچشمہ رہا ۔ 'تحفة المجاہدین' کا مصنف زین الدین المعبری جو ایک مؤرخ اور عالم تھا ، آپ ہی کا فرزند ہے ('تحفة المجاہدین' ملیبار پر پرتگالیوں کے حملے کی داستان ہے جو چھپ چکی ہے[4]) ۔

شیخ عبدالعزیز المعبری کی تاریخ پیدائش کہیں مذکور نہیں ، البتہ وہ ۱۵۸۵ء/۹۹۳ھ تک زندہ تھے کیونکہ اسی سال آپ نے اپنے والد کے قصیدہ 'ھدایة الاذکیاء الیٰ طریق الاولیاء' کی ایک مفصل شرح لکھی جو 'مسلک الاتقیاء فی شرح ھدایة الاذکیاء' کے

---

۱ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۳۳ ، منتخب التواریخ ، ۲ : ۲۲۳ ۔
۲ ۔ نزھة الخواطر ، ۴ : ۲۲۵ ۔
۳ ۔ نزھة الخواطر ، ۴ : ۲۲۶ ۔
۴ ۔ رسالہ زمانہ کانپور ، جنوری ۱۹۳۳ء ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۸۰ ، ۹۳ ۔

نام سے ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ میں بولاق سے طبع ہوئی[1]۔ اس لحاظ سے آپ کی وفات دسویں صدی ہجری (سولھویں صدی عیسوی) کے آخر میں ہوئی ہوگی ۔ آپ کے بیٹے زین الدین کی وفات ۱۵۸۴ء/ ۹۹۱ھ میں ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے گویا 'تحفۃ المجاہدین' کا مصنف اپنے باپ سے کئی برس پہلے فوت ہوگیا تھا[2]، شیخ عبدالعزیز نے اپنے والد کے اس قصیدے کی ایک مختصر شرح بھی لکھی ہے جس کا خطی نسخہ ارشاد 'الالباء الی ہدایۃ الاذکیاء' کے نام سے کتب خانہ آصفیہ (دکن) میں موجود ہے[3] ۔ اول الذکر شرح 'یعنی مسلک الاتقیاء و منہج الاصفیاء علی ہدایۃ الاذکیاء الی طریق الاولیاء' سے شیخ المعبری مذکور کے علم وفضل کا خوب اندازہ ہو جاتا ہے ، یہ شرح بڑی تقطیع کے تقریباً پونے دو سو صفحات پر مشتمل ہے ۔ شارح نے اس شرح میں علوم و معارف اور طریقت کے بارے میں قیمتی معلومات کے ذخائر جمع کر دئے ہیں ، لغت ، حدیث ، تفسیر ، نحو ، عقائد ، کلام اور اقوالِ صوفیہ کے نمونے جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں ۔ عبارت بڑی سلیس و شستہ اور اسلوب بڑا سہل اور دلچسپ ہے ۔ اپنے والد کے اس منظومے کی اہمیت اور شرح کی ضرورت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ولما و جدت النصيدة المسماة 'بهداية الاذكياء الى طريق الاولياء' لوالدى و شيخى وعمدتى الشيخ زين الدين المعبرى رحمه الله رحمة واسعة من أنفع كتب السالكين و أقربها الى الراغبين المسترشدين لكثرة فوائدها مع اختصارها و غزارة علمها مع قلة حجمها ؛ ورأيت جاعة من أصحابنا وفقهم الله للخيرات راغبين فى الاشتغال بها و متعطشين الى كشف فوائدها أردت أن أكتب لها شرحاً يحل انفاظها ويكمل فوائدها"۔ (میں نے جب دیکھا کہ میرے والد ، شیخ زین الدین المعبری کا قصیدۃ بعنوان 'ہدایۃ الاذکیاء الی طریق الاولیاء' کثرت فوائد ، اختصار ، غزارت علم اور قلت حجم کے باعث اہلِ تصوّف کی کتابوں میں سب سے زیادہ نفع بخش اور رہنمائی کی رغبت رکھنے والوں کے قریب تر ہے اور پھر ہماری جماعت کے لوگ بھی اس کتاب کی مصروفیت کے لیے راغب اور اس کے فوائد معلوم کرنے کے پیاسے نظر آئے چنانچہ میں نے اس قصیدے کی ایسی شرح لکھنے کا ارادہ کر لیا جس میں اس کے الفاظ کا حل اور فوائد کی تکمیل ہو)[4] ۔

---

۱ ـ زمانہ کانپور ۔

۲ ـ ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۸۰ ، ۱۳ ، رسالہ زمانہ کانپور جنوری ۱۹۳۳ء ۔

۳ ـ زمانہ و ڈاکٹر زبید احمد ص ۳۷ ۔

۴ ـ 'مسلک الاتقیاء' ص ۳ ، طبع قاہرہ ، ۱۲۹۲ھ ۔

شیخ رفیع الدین محدث الشیرازی

دہلی کے لودھی سلاطین کے عہد میں جو اہلِ علم و فضل پیدا ہوئے ان میں سے ایک شیخ رفیع الدین بن مرشد الدین الحسینی الصفویؒ الشیرازی ثم الہندی ، اکبر آبادی بھی ہیں[1] ۔ ان کی جاہ و تمکنت کا یہ عالم تھا کہ سلطان سکندر لودھی انہیں 'حضرت عالی' کہہ کر خطاب کرتا تھا[2] ۔ شیخ رفیع الدین شیرازی نے علامہ جلال الدین محمد بن اسعد صدیقی عرف بہ محقق دوانی سے علوم متداولہ کی تحصیل کی[3] ۔ پھر حرمین شریفین کی زیارت اور حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے جہاں حج و زیارت سے فراغت کے بعد اس دور کے جلیل القدر مصری محدث شیخ شمس الدین محمد بن عبدالرحمان السخاوی سے علم الحدیث کی سند لی اور پھر برِ صغیر پاک و ہند کا رخ کیا[4] ۔

شیخ رفیع الدین صفوی شیرازی کا خاندان شیراز کے علمی خانوادوں میں سے تھا جو تمام علماء واتقیاء اور صلحاء تھے ، ان کے خاندانی جاہ و جلال کا یہ عالم تھا کہ محقق دوانی جیسے نادرۂ روزگار فاضل احتراماً انہیں گھر پر پڑھانے جاتے تھے[5] ۔ وہ جب شیراز سے حجاز گئے تو ان کی شہرت پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھی، حتیٰ کہ امام سخاوی نے از خود بعض کتابوں کی روایت کی سندِ اجازت لکھ کر بھیج دی ، تاکہ بالمشافہ حدیث سننے کی رغبت پیدا ہو ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور شیرازی نے سخاوی سے بڑی مدت تک تلمذ کیا اور جب ہندوستان آئے اور آگرہ میں سلطان سکندر کے دربار میں پہنچے تو بڑی عزت و تکریم پائی ۔ یہاں ایک مدت تک درس و تدریس میں مشغول رہنے کے بعد ۱۵۴۷ء/۹۵۴ھ میں فوت ہوئے ۔ ابوالفتح محدث تھانیسری آپ کے شاگرد تھے[6] ۔

شہاب الدین احمد الملقب بہ نظام الجیلانی

ہماری یہ فصل نامکمل رہے گی اگر ہم نے سلطنت شرقیہ کے دو عظیم اور ممتاز اہلِ علم

---

۱ ۔ ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۲۰ ۔ حدائق الحنفیۃ ، ص ۳۷۵ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۹۵ ۔
۲ ۔ نزہۃ الخواطر ، ۴ : ۱۱۵ ، حدائق الحنفیۃ ، ص ۳۷۶ ۔
۳ ۔ ایضاً ۔
۴ ۔ حدائق الحنفیۃ ، ص ۳۷۶ ۔ نزہۃ الخواطر ، ۴ : ۱۱۵ ۔
۵ ۔ ایضاً ۔
۶ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۹۵ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۲۰ ۔

و فضل کا تذکرہ نہ کیا اور یہ ہیں قاضی شہاب الدین احمد بن محمد جونپوری الملقب بہ نظام الجیلانی اور شیخ ابوالفتح بن عبدالحئی بن عبدالمقتدر الشریحی الکندی جو قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی طرح سلطان ابراہیم شرقی کے دورِ حکومت کے ممتاز فقہائے احناف اور اہلِ علم میں سے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی وفات بہت بعد میں ہوئی لیکن ان کے علمی کارنامے اور تذکرۂ محاسن اسی علم پرور بادشاہ کے دور کی علمی تاریخ کی زینت ہیں ۔

قاضی نظام الدین جونپوری کے آباء و اجداد بلادِ عرب سے آ کر گجرات میں آباد ہو گئے تھے جہاں وہ پیدا ہوئے ، علوم متداولہ میں قدم راسخ پیدا کرنے کے بعد وہ جونپور آ گئے جو اس زمانے میں ایک عظیم علمی مرکز بن گیا تھا ۔ سلطان ابراہیم نے قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی طرح ان پر بھی خصوصی نظرِ عنایت رکھی اور انہیں منصبِ قضا پر فائز کیا[1] ۔ قاضی نظام الجیلانی نے ایک سو ساٹھ کتبِ فقہ کی امداد سے ایک عظیم الشان فتاویٰ مرتب کیا ، جو 'فتاویٰ ابراہیم شاہیہ' کے نام سے مشہور ہے اور بقول حاجی خلیفہ[2] یہ عظیم کتاب 'فتاویٰ قاضی خان' کی ہم پلہ ہے ۔ قاضی نظام الجیلانی نے ۱۵۴۸ء/۹۵۵ھ میں وفات پائی اور چاچک پور نواح جون پور میں دفن ہوئے[3] ۔

شیخ ابوالفتح بھی فقہ ، اصولِ فقہ ، علمِ کلام ، لغت اور شعر و نثر کے بہت بڑے عالم تھے ۔ آپ کے دادا عبدالمقتدر دہلی میں قاضی تھے[4] جن سے آپ نے علوم متداولہ حاصل کیے ۔ تیمور کے حملے کے بعد وہ جونپور میں آ گئے اور ابراہیم شرقی کے دربار میں انہیں عزت حاصل ہوئی اور ایک مدت تک درس و افادہ میں مشغول رہے ۔ ۱۵۵۱ء/۹۵۸ھ میں وفات پائی[4] ۔

سلطان ابراہیم عادل شاہ بیجاپوری (۱۵۳۵ء/۹۴۱ھ - ۱۵۵۸ء/۹۶۵ھ) کی سرپرستی میں علم و ادب اور حنفی فقہ کے جو عظیم کارنامے انجام پائے ان میں سے ایک یہ عظیم فتاویٰ بھی ہے ، حاجی خلیفہ نے کتاب کا نام 'ابراہیم شاهیة فی فتاوی الحنفیة' بتایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ کتاب مرتب کرتے وقت ایک سو ساٹھ اہم کتبِ فقہ حنفی کو سامنے رکھا گیا تھا ۔ وہ کتاب کی اہمیت اور خوبی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے :

---

۱ ۔ نزهة الخواطر ، ۳ : ۱ ، ۳۱ ۔
۲ ۔ کشف الظنون ، ۲ : ۶۱۲ ، نزهة الخواطر ۳ : ۲۱ ۔
۳ ۔ ایضاً ۔
۴ ۔ اخبار الاخیار ، ص ۳۷۷ بعده ، نزهة الخواطر ، ۳ : ۲۱ ۔

''وهو كتاب كبير من أفحز الكتب كقاضيخان'' (یہ ایک کتاب بہت بڑی کتاب ہے جو فتاویٰ قاضی خان کی طرح قابلِ فخر کارناموں میں[1] سے ہے)۔

فتاوی 'ابراہیم شاہیہ کی ترتیب و تبویب فقۂ حنفی کی دیگر مستند کتب اور فتاویٰ کی ترتیب کے مطابق ہے اور اس میں عبادات ، مناکحات اور معاملات کے علاوہ عقائد و توحید کے مسائل سے بھی بحث کی گئی ہے اور ان موضوعات پر متقدمین کی ہر موضوع کی اہم تصانیف سے فائدہ اٹھایا گیا ہے ، حتیٰ کہ فارسی میں لکھی جانے والی کتابوں اور متصوّفین اور علمائے علم الکلام کی تصانیف سے بھی استفادہ کیا گیا ہے ۔ ایک مقام پر روح کی کیفیت پر بحث کرتے ہوئے قرآن و حدیث ، آئمہ اور صوفیہ کے اقوال سے پوری پوری مدد لی گئی ہے ، امام القشیری کے رسالے سے یہ قول نقل کیا گیا ہے: الارواح مخلوقة ومن قال بعدمها فهو مخطی خطأ عظيماً (کہ ارواح بھی نوپید مخلوق ہیں اور جس نے انہیں قدیم اور ازلی کہا تو اس نے بہت بڑی غلطی کی) ۔

* * *

---

۱ ۔ 'کشف الظنون' ۱ : ۵۳ ؛ نیز دیکھیے 'فہرست انڈیا آفس لائبریری' نمبر ۴۰۷۱ ، 'فہرست' کتب خانہ مدرسہ کلکتہ نمبر ۳۰ ، 'فہرست' رام پور ص ۲۲۱ ، فہرست آصفیہ ص ۱۰۵۲ ۔

مآخذ

۱ - عبدالحیؒ لکھنوی ، الثقافة الاسلامیة فی الهند ، طبع دمشق ۱۹۵۶ء -

۲ - وہی مصنف ، نزهة الخواطر ج ۳ ، ۴ ، طبع حیدرآباد (دکن) ۱۹۵۱ء ، ۱۹۵۴ء -

۳ - غلام علی آزاد بلگرامی ، 'سبحة المرجان فی آثار ہندوستان' ، طبع بمبئی تاریخ ندارد -

۴ - " " مآثر الکرام ، طبع آگرہ ، ۱۹۱۰ء -

۵ - " " 'خزانہ عامرہ' ، طبع کانپور تاریخ ندارد -

۶ - نواب صدیق حسن خان ، 'ابجد العلوم' ، طبع بھوپال ۱۲۹۶ھ -

۷ - " " اتحاف النبلاء ، طبع کانپور ، ۱۲۸۸ھ -

۸ - " " التاج المکلل ، طبع بمبئی ۱۹۶۶ء -

۹ - جرجی زیدان ، 'تاریخ آداب اللغة العربیة' ، طبع قاہرہ ، تاریخ ندارد .

۱۰ - محمد بن عمرالمکی ، ظفر الوالہ بمظفر و آلہ -

۱۱ - خیرالدین الزرکلی ، 'الاعلام' ، طبع قاہرہ ، ۱۹۶۶ء -

۱۲ - عبدالقادر العید روس ، النور السافر ، طبع بغداد ۱۹۳۴ء -

۱۳ - سید محمد عابد میاں ، انوارالعارفین ، طبع دہلی ۱۹۳۶ء -

۱۴ - شمس الدین محمد السخاوی ، الضوء اللامع ، طبع قاہرہ ، ۱۳۵۴ھ -

۱۵ - مناظر احسن گیلانی ، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ، حیدر آباد (دکن) ۱۹۴۴ء -

۱۶ - مرزا محمد حسن الملقب بہ علی محمد خان بہادر ، 'مرآة احمدی' ، طبع کلکتہ ، ۱۹۳۰ء -

۱۷ - عبداللہ بن سالم البصری ، 'کتاب الامداد بمعرفة علوالاسناد' ، حیدرآباد (دکن) ، ۱۳۲۸ھ -

۱۸ - شیخ عبدالاول جونپوری ، مفید المفتی ، طبع لکھنؤ ، ۱۳۲۶ھ -

۱۹ - شیخ عبدالحق محدث دہلوی ، 'اخبار الاخیار' ، طبع دہلی ، ۱۲۷۰ھ و اردو ترجمہ مطبوعہ کراچی ۱۹۷۰ء -

۲۰ - محمد بن علی الشوکانی ، 'البدر الطالع' ، طبع قاہرہ ، ۱۳۴۸ھ -

۲۱ - مولوی رحمان علی ، 'اردو ترجمہ تذکرہ علمائے ہند' ، طبع کراچی ۱۹۶۱ء -

۲۲ - خواجہ نظام‌الدین احمد ، 'طبقات اکبری' ، طبع کلکتہ ، ۱۹۳۱ء -

۲۳ - عبدالقادر بدایونی ، 'منتخب التواریخ' ، طبع کلکتہ ، ۱۸۶۹ء -

۲۴ - فقیر محمد جہلمی ، 'حدائق الحنفیہ' ، طبع لکھنؤ ۱۳۲۴ھ -

۲۵ - جلال‌الدین السیوطی ، 'بغیة الوعاة' ، طبع قاہرہ ، ۱۹۶۵ء -

۲۶ - ابن العماد الحنبلی ، 'شذرات الذھب' ، طبع بمبئی ، ۱۳۵۱ھ -

۲۷ - حاجی خلیفہ ، 'کشف الظنون' استمبول -

۲۸ - رسالہ 'زمانہ' ، کانپور ، جنوری ۱۹۳۳ء -

۲۹ - ڈاکٹر زبید احمد ، The Contribution of India to Arabic Literature, Lahore, 1967,

۳۰ - ڈاکٹر محمد اسحاق ، India's Contribution to the study of Hadith Literature, Dacca, 1955;

۳۱ - T. W. Beale : Oriental Biographical Dictionary, Calcutta, 1881.

۳۲ - ڈاکٹر ایس ایم اکرام ، آب کوثر ، طبع لاہور ، ۱۹۶۸ء -

۳۳ - رسالہ معارف لاہور -

پانچواں باب

فصل اول

مغلوں کا دورِ عروج

پانی پت کی پہلی لڑائی میں ابراہیم لودھی کی شکست کے وقت (۱۵۲۶ء) لودھیوں کے زیرِ نگیں علاقہ شمالی ہند پر مشتمل تھا اور اس میں پاکستان کا موجودہ صوبۂ پنجاب (جس کے کچھ حصے پر بابر پہلے قبضہ کر چکا تھا) ، ہریانہ ، دہلی ، صوبہجات متحدہ آگرہ ، اودھ اور بہار کے کچھ علاقے شامل تھے - رقبہ کے لحاظ سے یہ علاقہ بمشکل پورے برِ صغیر کا ایک چوتھائی حصہ ہوگا - بقیہ برِ صغیر خود مختار ریاستوں میں بہ تفصیلِ ذیل منقسم تھا -

شمال مغرب میں کشمیر، جنوب مغرب میں سندھ، مغرب میں ملتان، مشرق میں بنگال جنوب میں مالوہ ، اس کے جنوب میں گجرات اور جنوب مشرق میں دکن کی بہمنی حکومت، جو اس وقت پانچ سلطنتوں میں تقسیم ہو چکی تھی- دکن کے انتہائی جنوب میں بیجا نگر اور شمالی ہند کے جنوب مشرق میں گوڈوانہ کی ریاستیں ہندو راجاؤں کے قبضہ میں تھیں - راجپوتانہ میں بھی متعدد ہندو راجپوت حکمرانوں نے اپنی اپنی راجدھانیاں قائم کر رکھی تھیں -

افغانوں کو شکست دینے کے باوجود بھی بابر کو اپنی وفات (۱۵۳۰ء/۹۳۷ھ) تک بعض افغان سرداروں اور راجپوتوں سے بر سر پیکار رہنا پڑا ، پھر چوبیس سالہ ہمایوں نے اپنے باپ کا جانشین بننے کے بعد سلطنت کی توسیع و استحکام کی کئی ایک کوششیں کیں ، لیکن ۱۵۴۰ء میں بہار میں شیرخان سوری کے خروج کے باعث اسے سلطنت سے محروم ہو کر ایران میں پناہ لینا پڑی -

شیر شاہ کی پنج سالہ حکومت برِ صغیر کے لیے بڑی نعمت ثابت ہوئی - اس کی طرف جو اصلاحات منسوب ہیں ، ان کی فہرست کافی طویل ہے - یہ اصلاحات مغلوں کو بطورِ ورثہ ملیں - شیر شاہ سوری بیک وقت ایک بہادر جنگجو ، ایک کامیاب فاتح اور ایک شاندار نظامِ حکومت کا مؤسس تھا -

سوری نے اپنے پانچ سالہ عہدِ حکومت میں مفید انتظامی اصلاحات کے علاوہ ہندو راجپوتوں کے خلاف کامیاب جہاد بھی کیا مگر وہ کالنجر کے محاصرے کے دوران

زخمی ہو کر فوت ہو گیا اور نوزائیدہ سلطنت کی باگ ڈور اس کے نو عمر بیٹے اسلام شاہ کے ہاتھ میں آ گئی جو اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود سرکش افغانوں کو قابو میں نہ رکھ سکا ۔ ۱۵۵۴ء/۹۶۱ھ میں اس کی وفات کے بعد سوری سلطنت نہ سنبھل سکی اور دسمبر ۱۵۵۴ء/محرم ۹۶۲ھ میں ہمایوں دوبارہ اپنی چھنی ہوئی سلطنت کو بزورِ شمشیر قبضہ میں لینے کے لیے کابل سے پشاور اور لاہور ہوتا ہوا جولائی ۱۵۵۵ء/۹۶۲ھ میں دہلی میں فاتحانہ داخل ہوا ، مگر اسے حکمرانی کے لیے زیادہ مہلت نہ ملی اور جب جنوری ۱۵۵۶ء میں وہ فوت ہوا تو مغلیہ سلطنت کی باگ ڈور جلال الدین اکبر کے قبضے میں آئی جو فروری ۱۵۵۶ء میں اپنے باپ کا جانشین بنا ۔

اکبر نے اپنے دور کی ابتدا ہی میں دیکھ لیا تھا کہ لودھی ، لوہانی اور سوری پٹھان اس کے خاندان کے زبردست حریف ہیں ، اس لیے اس نے ہندو راجپوتوں کے ساتھ روابط خوب مضبوط کیے ۔ ہندو مؤرخین کا دعویٰ ہے کہ اکبر کی عظیم سلطنت مغل سیاست اور راجپوت شجاعت کی متحدہ قوت کا نتیجہ تھی[1] ۔ ۱۵۶۲ء/۹۶۹ھ میں جے پور کے راجا نے اطاعت قبول کر لی ۔ ۱۵۶۸ء/۹۷۵ھ تک میواڑ کا اکثر علاقہ فتح ہو چکا تھا ۔ ۱۵۷۳ء/۹۸۰ھ میں اکبر نے گجرات پر ، اگلے سال بہار پر اور ۱۵۷۶ء/۹۸۴ھ میں بنگال پر قبضہ کر لیا اور جب وہ فوت ہوا (۱۶۰۵ء) تو اس وقت تک پورا شمالی ہند ، گجرات اور خاندیش اس کی وسیع سلطنت کے جزو بن چکے تھے ۔

یورپین طاقتیں اور برِّصغیر پاکستان و ہند

سولھویں صدی عیسوی میں پرتگیز اور ولندیزی ساحل کے علاقوں میں اپنی بحری طاقت مضبوط کر رہے تھے ۔ یہاں تک کہ ان کی وجہ سے خود حاجیوں کے جہاز بھی محفوظ نہ تھے ۔ سلاطینِ گجرات نے ان کی طاقت کی مدافعت کی کوشش کی مگر گوناگوں مشکلات کی بنا پر (جن میں اہم ترین شمالی ہند کی مضبوط حکومتوں کی جوع الارض کی بیاری تھی)' وہ اپنی تدابیر میں کامیاب نہ ہو سکے ۔ مغلوں کو سمندر میں جہاز رانی کے فن کا تجربہ نہیں تھا ۔ اکبر نے گجرات پر حملہ کرنے کے بعد پہلی بار سمندر دیکھا ۔ اس وقت اسے پتہ چلا کہ دیو ، دمن اور بسین پر پرتگیزوں کا قبضہ ہو چکا ہے اور ساتھ ساتھ اس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ سمندری جہاز بنانے میں وہ سلاطینِ گجرات جتنا

---

۱ - موجمدار وغیرہ کی انگریزی تاریخ ہند ، ص ۴۴۴ ۔

تجربہ بھی نہیں رکھتا[1] - چہ جائیکہ وہ پرتگالیوں کا بحری محاذ پر مقابلہ کر سکے - اس لیے اس نے پرتگالیوں سے مصالحت آمیز برتاؤ کیا اور بحری آمد و رفت کے وسائل سے غافل رہا -

سلاطین کا علمی و دینی ماحول

شہنشاہ بابر تیموری سلاطین میں ادب (نظم و نثر) کے لحاظ سے ممتاز نظر آتے ہیں - ان کی دلچسپ توزک ، ترکی زبان کا دیوان ، دو ہزار اشعار کی مثنوی ، خواجہ عبیداللہ احرار کے رسالہ 'والدیہ' کا منظوم ترکی ترجمہ اور ترکی شاعری کے عروج پر تصنیف اس کے ادبی ذوق کی واضح علامت اور بیّن ثبوت ہے - اس نے فارسی میں بھی اشعار کہے - ایک خاص قسم کا خط ایجاد کیا جسے خطِ بابری کہتے ہیں - اس خط میں قرآنِ کریم لکھ کر بغرضِ ثواب مکّہ معظمہ بھیجا تھا اور ایک دلچسپ بات یہ کہ اس دور میں اپنی توزک میں ہندی الفاظ استعمال کر کے اردو کے ارتقاء میں اپنا نام ثبت کر دیا -

مذہبی لحاظ سے وہ ایک خوش عقیدہ مسلمان اور خواجہ عبیداللہ احرار کے سلسلہ سے وابستہ تھا- سخت موقع آتا تو اولیاء کے مزارات پر جانا اور دعائیں مانگتا - راناسانگا سے معرکہ پڑا تو عقیدۂ جہاد کے ساتھ لڑا - دہلی پر قبضہ کیا تو مولانا محمود سے جامع مسجد میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا - اپنا روزنامچہ لکھتے وقت نماز ادا کرنے کا ذکر اس طرح کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز پڑھنا اس کے عام معمولات میں سے ہے - علم اور علماء کی سرپرستی میں خاندانی روایات کا اثر اس کی زندگی پر بھی نمایاں تھا - شاعروں کی طرح علماء بھی دربار کی زینت تھے - ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی ساتھ لیے پھرتا تھا اور مالِ غنیمت میں کتابیں حاصل کرتا تو مناسب طور پر تقسیم کیا کرتا تھا[2] -

---

۱ - اس موضوع کی تفصیل کے لیے دیکھیے : کیمبرج ہسٹری آف انڈیا ، جلد ۵ - مور لینڈ انڈیا آن دی ڈیتھ آف اکبر ۲۲ - ۲۴ ، ۵۵ ، ۱۶۰ / ۱۸۴ - ۲۰۳ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام - ابن ماجد -

۲ - مزید تفصیلات کے لیے توزک بابری اور بزم تیموریہ ، صفحہ ۱ تا ۲۳ ملاحظہ ہوں - وہیں حوالے بھی درج ہیں - فارسی شاعری کے بارے میں روایات مشکوک ہیں -

ہمایوں بھی علوم و فنون سے بے بہرہ نہ رہا ۔ اس کے فارسی دیوان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی شعر و شاعری سے اسے خوب دلچسپی تھی ۔ اس کے علاوہ وہ اہلِ علم کا قدردان تھا ۔ بقول نظام الدین، صاحبِ 'طبقاتِ اکبری' ''در صحبت آن مقتدائے جہان ہمہ وقت فضلاء و علماء اکابر بودند . . . . اربابِ فضل و ہنر را در عہدش رونق تمام پدید آمد''[1] ۔

کتابوں سے اسے بہت دلچسپی تھی اور ایک مختصر کتاب خانہ سفر و حضر میں اس کے ساتھ رہتا تھا ۔ قلعہ شہر منڈل میں اس کا ایک کتب خانہ تھا اور اس کے ایک برج میں اس نے رصد خانہ قائم کیا تھا ۔ علومِ عقلیہ کے ساتھ خصوصی لگاؤ رکھتا تھا ۔ قطب الدین شیرازی کی کتاب 'درۃ التاج' کا مذاکرہ مولانا الیاس اردبیلی اور شیخ ابوالقاسم جرجانی سے کرتا تھا ۔ مولانا نورالدین سفیدونی نے بیس سال ہمایوں کی صحبت میں گزارے ۔ کبھی بادشاہ ان سے استفادۂ علمی کرتا تھا اور کبھی وہ علمِ ریاضی خاص طور سے اصطرلاب میں ہمایوں بادشاہ کی مہارتِ کاملہ سے استفادہ کرتے تھے ۔ ایک اور عالم مولانا چاند منجّم دہلوی تھےجو ہمیشہ ہمایوں کے ساتھ وابستہ رہے ۔ ہمایوں کی طرف ایک خاص اصطرلاب 'اصطرلاب ہمایونی' کےنام سے منسوب ہے اور کہتے ہیں کہ مدارس میں اس نے کرّوں اور اصطرلابوں کو رواج بھی دیا ۔ انتہا یہ کہ اس کی موت بھی اسی وارفتگی میں ہوئی کہ وہ اپنے اسی مذکورہ بالا رصد خانہ میں ستارۂ زہرا کے طلوع کے انتظار میں مصروف تھا ، مگر مغرب کی اذان سن کر نماز کے لیے اترنا چاہا تھا کہ زینہ سے گر پڑا[2] ۔

اس واقعہ سے مذہب کی پابندی کے بارے میں بادشاہ کے تقشف کا پتہ بھی لگایا جا سکتا ہے ۔ تمام مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ مذہب و اخلاق میں ہمایوں کی تربیت اعلیٰ قسم کی ہوئی تھی ۔ وہ صوم و صلوٰۃ کا سخت پابند تھا ۔ کبھی وہ قسم نہ کھاتا تھا اور نہ کبھی فحش لفظ زبان پر لاتا ۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت کبھی پہلے بایاں پاؤں اندر نہ رکھتا ۔ بے وضو خدائے عزّ و جل کا کبھی نام نہ لیتا ۔

ہمایوں کے تذکرہ کے ساتھ ہی شیر شاہ کا تذکرہ بھی مناسب ہے ۔ اس کی تربیت بچپن میں جیسے بھی ہوئی ، بہرحال اس نے جونپور (جو اس زمانے کا شیراز کہلاتا تھا) کے ایک مدرسہ میں ابتدائی فارسی اور عربی کا درس حاصل کیا ۔ 'گلستان' ، 'بوستان' اور

---

۱ ۔ بحوالہ بزم تیموریہ ، ص ۴۳ ۔

۲ ۔ بزم تیموریہ میں علم نجوم سے بادشاہ کی دلچسپیوں کی مزید تفصیلات دی گئی ہیں ۔

'سکندر نامہ' اسے زبانی یاد تھے اور کافیہ ابنِ حاجب کو درساً پڑھ لیا تھا[1] ۔ بقول ڈاکٹر صوفی اس نے فلسفہ کا درس بھی لیا تھا ۔ بعد میں تاریخ سے اس کی دلچسپی بڑھ گئی تھی اور گزشتہ سلاطین کی تاریخ کا مطالعہ اس کا مشغلہ تھا ۔ وہ پابندِ مذہب تھا اور احکامِ شرع میں اسلامی فقہ کی پابندی پر زور دیتا تھا ۔ اس نے علماء کو پہلے سے بھی زیادہ اقتدار بخشا ۔ اسلام شاہ کا زمانہ آیا تو اگرچہ اس نے علماء کے اثر اور اقتدارمیں کوئی کمی نہ کی اور رعایا پر ان کی ہیبت اور احترام کو برقرار رکھا ، لیکن خود وہ سلطنت اور اقتدارکے نشہ میں مغرور ہو چکا تھا اور اسے اس وقت خدا یاد آیا جب ایک پھوڑے نے اسے اتنا بے قرار کر دیا کہ وہ زندگی سے مایوس ہونے لگا ۔

اکبر نوشت و نخواند میں اپنے خاندان کے معیار کے لحاظ سے بے بہرہ رہا تھا اور اگرچہ اس وقت کی درباری زبان یعنی فارسی میں وہ خوب گفتگو کر سکتا تھا ، اساتذہ کے اشعار سے لطف اندوز بھی ہو سکتا تھا ، اسے بہت سے فارسی اشعار زبانی بھی یاد تھے اور کہا جاتا ہے کہ وہ فارسی میں اچھے شعر کہہ سکتا تھا ، تاہم اصطلاحی طور پر نہ اس کے پاس علم تھا اور نہ فن ۔ اس کم سوادی کا نتیجہ تھا کہ وہ نیک و بد میں تمیز کرنے سے قاصر تھا اور جو چرب زبان اس کے سامنے اپنے کمالات کی تعریف کر لیتا وہ اس کا دلدادہ ہو جاتا ۔ اس نے اپنے دربار میں بہت سے علماء و فضلاء اکھٹے کیے مگر ان سے بہتر خدمت نہ لے سکا ۔ اس نے 'رامائن' ، 'مہابھارت' ، 'انجیل' 'جامع رشیدی' اور 'معجم البلدان' وغیرہ کتابوں کے ترجمے مختلف زبانوں سے فارسی میں کرائے ، لیکن وہ علمی حلقوں میں مقبول نہ ہو سکے اور اب ناپید ہیں ۔ اس کی ان علمی خدمات کو سراہنے والوں نے سراہا ہے ، لیکن جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے اکبر کی سرپرستی کا رجحان فارسی کی طرف تھا اور وہ بھی ان معدودے چند علماء تک محدود رہی جو اس کے جذبۂ ہمہ دانی اور شوقِ مطلق العنانی کو تسکین دے سکتے تھے ۔ ہاں اس کا یہ کارنامہ بہرحال یاد رکھنے کے قابل ہے کہ غالباً وہ سب سے پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے سنسکرت کی قدردانی کی ۔ نہ صرف یہ کہ سنسکرت کی کتابیں فارسی میں ترجمہ کرائیں بلکہ "عربی و فارسی کی کتابوں کو بھی سنسکرت کے قالب میں ڈھالا" ۔ بہرحال یہ کہنا بجا ہے کہ عربی اس کی سرپرستی سے محروم نہیں رہی ۔ اس نے 'معجم البلدان' اور 'حیٰوۃ الحیوان' کے ترجمے کرائے ۔ حافظ تاشقندی کو تفسیر 'سورۂ ھد' پیش کرنے پر بے بہا انعام دیا ۔ تلاش کرنے پر اس کی تاریخ میں علوم کی سرپرستی کی مزید مثالیں بھی مل سکتی ہیں ۔

---

۱ ۔ تاریخ داؤدی میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے ۔ جہاں ایک طالب علم کو کافیہ کا امتحان اچھا دینے پر شیر شاہ نے ڈیڑھ ہزار بیگھہ زمین کی جاگیر بخش دی ۔

شاہی کتب خانہ ترتیب دینے میں اس نے بابر اور ہمایوں کی روایات کو نہ صرف برقرار رکھا ، بلکہ خوش ذوق کے ساتھ اسے خوب ترقی دی اور اس کےلیے مختلف ذرائع و وسائل سے بہترین کتابیں حاصل کیں ۔ کتابوں کے نقل کرنے کے لیے خوش نویس ، مصحح اور ان کی 'تزئین کے لیے نقّاش' جدوَل ساز اور مصور رکھے ۔ تجلید کا کام اس کے علاوہ تھا ۔

ابتدائی برسوں کے علاوہ غالباً اپنی عمر کے چالیسویں سال تک اکبر اپنے بزرگوں کی طرح مذہب کا پابند تھا ۔ شاہانِ سور نے علماء کو جو رسوخ و اقتدار سونپ رکھا تھا ، اکبر نے اس میں اور اضافہ کر دیا اور جا بجا مفتی و قاضی مقرر کردیے۔ مخدوم الملک کی قدر و منزلت بڑھا دی اور شیخ عبدالنبی کو صدر الصدور کا عہدہ بخشا ۔ وہ کبھی کبھی صدر الصدور کے گھر پر پہنچ کر ان سے حدیث سنتا ۔ شہزادہ سلیم کو ان کی شاگردی سے مشرّف کرایا ۔ نہ صرف یہ کہ وہ نماز با جماعت ادا کرتا تھا ، بلکہ خود اذان دیتا ، امامت کرتا اور مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا تھا ۔ خواجہ اجمیری کے ساتھ عقیدت ہوگئی تو سال بسال بلکہ اس سے بھی زیادہ اجمیر جانا شروع کیا اور کبھی ایک منزل اور کبھی اس سے زیادہ پاپیادہ گیا ۔ پہروں مراقبے میں بیٹھا رہتا اور شاہانہ چڑھاوے چڑھاتا ۔

اسی قسم کی عقیدت انہیں شیخ سلیم سے پیدا ہوئی ۔ اپنے بیٹے (جہانگیر) کا نام انہیں کے نام پر سلیم رکھا ۔ پھر اس وجہ سے فتح پور سیکری کو فروغ دے کر ہند کا پایۂ تخت بنایا ۔ تا آنکہ اس نے ۱۵۷۸ء / ۹۸۶ھ میں 'عبادت خانہ' کے نام سے عمارت بنوائی اور وہاں علماء و مشائخ کا دربار منعقد کرنے لگا ۔ یہیں سے شہنشاہ اکبر کی بے اعتدالیاں بڑھنے لگیں جن کے اسباب متعدد تھے ۔

معقولات کا رواج

اکبر کے عہد میں ذہنی آزادی بلکہ آوارگی کے کئی اسباب تھے ، جن میں سے ایک یہ تھا کہ اس دور میں شاہی دربار کے تقرب کے لیے منقولات (تفسیر ، حدیث اورفقہ) کے بجائے معقولات (منطق ، کلام اور فلسفہ) میں مہارت زیادہ کار آمد ثابت ہوئی ۔ معقولات کی جو معتدبہ اہمیت سکندر لودھی کے زمانے میں پیدا ہوئی تھی وہ اکبری دور میں حد سے تجاوز کر گئی اور فلسفیانہ موشگافیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اذہان پر کسی ایک طرزِ فکر کی گرفت نہ رہی اور فکری آزادی بے راہ روی اورگمراہی کا موجب بنی۔

مسلمانوں کے مختلف فرقے - مہدویہ

اس سے بھی زیادہ اہم وہ فکری انتشار تھا جو مختلف فرقوں کی شکل میں اس قرن کے مسلمانوں میں پیدا ہونے لگا تھا - ان فرقوں میں سے چند کا ذکر یہاں مناسب ہے - ان میں سب سے اہم فرقہ 'مہدویہ' تھا - اس فرقہ کے بانی سید محمد بن یوسف جونپوری تھے - ان کا وعظ مؤثر ہوتا تھا - وہ لوگوں کو ترک دنیا اور زہد کی ترغیب دیا کرتے تھے - اس لیے جب وہ وعظ کہتے تو سننے والوں کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں - اس اثر انگیزی کی بنا پر روز بروز ان کے مریدوں کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا - دوسری طرف ان کی مہدویت کا دعویٰ بھی انوکھا تھا اور ان کے دعاوی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بعض اہل تشیع کی طرح اپنے فرقے کے اصحاب کو مومن سمجھتے تھے - اس لیے ان کی مخالفت بھی شدت سے ہونے لگی - آخر کار وہ سر زمین ہند کو چھوڑ کر خراسان پہنچے اور وہاں 'فراہ' کے قریب ۱۵۰۴ء/۹۱۰ھ میں وفات پائی -

مہدویہ کو شیر شاہ سوری اور ان کے جانشینوں کی سخت گیر سیاست کی بنا پر شمالی ہند میں تو فروغ حاصل نہ ہو سکا ، تاہم دکن کے مختلف گوشوں میں یہ تحریک زوروں پر رہی اور اب تک اس کے پیرو وہاں پائے جاتے ہیں[1] -

شطاریہ

شیخ نجم الدین الکبری (م- ۱۵۱۲ء/۹۱۸ھ) اپنے رسالہ 'الاصول النجمیة العشرة'[2] میں فرماتے ہیں کہ (سلوک کے) طریق تین انواع پر منحصر ہیں :

طریق الاخیار ، طریق الابرار اور طریق الشطار - پھر اس آخری طریقہ کے دس اصول بیان فرماتے ہیں یعنی توبہ ، زہد ، توکل ، قناعت ، عزلت ، ذکر ، توجہ الی اللہ ، صبر ، مراقبہ اور رضا - یہ اصول شیخ بہاء الدین (م - ۱۵۱۵ء/۹۲۱ھ) کے رسالہ شطاریہ[3] کے مطابق ہیں - شطاریہ سلسہ کی بنیاد تو یہی ہے تاہم کچھ بزرگوں نے ان بنیادی اصولوں کے ساتھ کچھ اضافے کیے ہیں ، جن کی بناء پر وہ کہیں کہیں شریعت کے جادۂ مستقیم سے ہٹ گئے ہیں اور علماء و مشائخ کو ان کے بارے میں انکار یا تأمل کرنا پڑا ہے -

---

۱ - مزید تفصیلات کے لیے رود کوثر ، ص ۲۳ تا ۳۲ ، نزهة الخواطر ۴ : ص ۳۲۲ تا ۳۲۶ و تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد ص ۳۷ تا ۴۵ اور ص ۵۲ تا ۵۳ ملاحظہ ہوں -

۲ - مخطوطۂ پشاور مع شرح عبدالغفور لاری -

۳ - دیکھیے اقتباسات مندرجہ اخبار الاخیار حالات شیخ بہاء الدین -

اس سلسلہ کے مشہور بزرگ شیخ خطیر الدین المعروف بہ شیخ محمد غوث گوالیاری ہیں ۔ انہوں نے پہلے کوہ چنار کے جنگلات میں خوب ریاضتیں کیں اور بعد میں گوالیار میں مقیم ہوئے ۔ جب بابری فوجیں گوالیار فتح کرنے آئیں تو شیخ نے جو ان دنوں قلعہ ہی میں تھے ، ان کو قلعہ فتح کرنے کی ترکیب بتائی اور قلعہ بآسانی فتح ہو گیا ۔ شیخ مغلوں کے طرفدار تھے ۔

شیخ کے قلم سے جو رسالے نکلے ہیں ان میں کچھ باتیں خلافِ اصولِ شرع بھی پائی جاتی تھیں ۔ مثلاً 'رسالہ معراجیہ' میں اپنے لیے معراج کا ثبوت (جس کی تاویل بعد میں یہ کی گئی کہ یہ مقامی یا روحانی تھی) یا رسالہ 'بحرالحیات' (ترجمہ امرت کنڈ) میں ہندو سنیاسیوں اور جوگیوں کے اطوار و اشغال ۔ ادھر شیخ موسیقی کے بھی رسیا تھے اور اس ضمن میں انہوں نے رسالے بھی لکھے تھے ۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے حلقۂ ارادت میں ہندو بھی شامل ہوتے تھے ۔ سوریوں کی خالص فقہی سلطنت میں ان باتوں کی گنجائش نہ تھی ۔ اس لیے ان کے عہد میں شیخ محمد غوث کو گجرات جانا پڑا ۔ وہاں شیخ علی متقی نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا ، مگر اس وقت کے ایک با اثر عالم شیخ وجیہ الدین علوی نے شیخ محمد غوث سے بیعت کر لی اس لیے شیخ علی متقی کے فتویٰ کا اثر کمزور پڑ گیا ۔ جب مغل دوبارہ دہلی پر قابض ہوئے تو اکبری دربار سے ان کی بیش قیمت جاگیر مقرر ہوئی جس کی آمدنی سے شیخ نے خانقاہ بنوائی اور محفلِ سرود و سماع کو خوب گرم رکھا ۔ ان کی وفات ۱۵۶۲ء/۹۷۰ھ میں آگرہ میں ہوئی ۔ روضہ گوالیار میں ہے ۔ ان کی تصانیف میں سے 'جواہرِ خمسہ' بہت مشہور ہے جس کا ترجمہ صبغۃ اللہ نے 'الجواہر الخمس' کے نام سے عربی میں کیا ، جس کی بدولت ان کی شہرت بھی ہوئی اور یہ سلسلۂ تصوف علماء میں مقبول بھی ہوا[1] ۔

مداریہ

نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) ہی میں ایک اور عجیب و غریب سلسلہ مداریہ کی بنیاد شاہ بدیع الدین مدار (م - ۱۴۳۴ء/۸۳۸ھ) نے ڈالی ۔ ان کی شخصیت میں کچھ جاذبیت تھی ۔ عوام میں ان کی بڑی شہرت ہوئی ۔

بہرحال ان کے بارے میں بہت اختلافِ رائے رہا ۔ صاحبِ 'نزھۃ الخواطر' ان کے حالات بیان کر کے 'حدیقۃ الانساب' سے نقل کرتے ہیں :

---

۱ - رود کوثر ، ص ۳۵ تا ۴۱ ، نزھۃ الخواطر ۴ : ۲۹۳ ؛ بروکلمن ۲ : ۴۱۸ ؛ تکملہ ۲ : ۶۱۶ ۔

"شاہ مدار کی شخصیت پر بحث کرنے والوں میں سے کچھ لوگ تو اسے مجذوب اور مرفوع القلم سمجھتے ہیں اور بعض اسے صاحبِ مقاماتِ عالیہ سمجھتے ہیں۔ اس کے پیروکاروں میں سے اکثر الحاد کی طرف مائل ہیں اور کچھ خواص محقق اور صوفیہ کے اخلاق سے آراستہ ہیں"[1]۔

نقطویہ

نقطوی تحریک کا بانی محمود پسیخوانی تھا جس نے ۱۳۹۷ء/۸۰۰ھ میں اس فرقہ کی بنیاد رکھی اور الحاد کی راہ اختیار کی۔ بقول صاحبِ 'مآثر الامراء':

"علم نقطہ الحاد و صدقہ و اباحت و توسیع مشرب است مثل حکماء بقدم عالم گردند و انکار حشروقیامت نمایند و مکافات حسن قبح اعمال و جنت و نار در عافیت و مذلت دنیا قرار دہند"[2]۔

خواجہ عبید اللہ المعروف بہ خواجہ کلاں نے 'مبلغ الرجال' میں ان کے عقائد کی وہ تصویر کشی کی ہے جسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں میں زندگی کیسے بسر کر سکتے تھے۔

اس فرقہ کے چند اشخاص نے شہنشاہ اکبر تک رسائی حاصل کی تھی اور 'تاریخ عالم آرائے عباسی' کا بیان ہے[3] کہ ابو الفضل بھی نقطوی فرقہ کا پیرو تھا[4]۔

روشنیہ

روشنیہ فرقہ کا بانی بایزید بن عبد اللہ انصاری جالندھر میں پیدا ہوا۔ مغلوں کے تسلّط کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ وزیرستان پہنچا۔گونا گوں مشکلات کی وجہ سے بایزید کی تربیت باپ کے ہاں رہتے ہوئے بھی خاطر خواہ نہ ہوسکی اور اس میں یک گونہ سرکشی کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔

ناقص تعلیم کے علی الرغم بایزید کی ذہانت اور عبقریت اس کے کام آئی اور اس

۱۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو رود کوثر، صفحہ ۱۴ : ۴۲ اور نزھۃ الخواطر (۴ : ۳۶ تا ۴۲)۔

۲۔ مآثر الأمراء، ۱ : ۶۱۹ بحوالہ بالا۔

۳۔ مآثر الامراء، ۲ : ۳۲۵۔

۴۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے "اکبر کا دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر" از پروفیسر محمد اسلم۔

نے ریاضتیں کر کے اپنی شخصیت خود بنا لی اور مسندِ مشیخت سنبھال لی ۔ یہ زمانہ تقریباً وہی تھا جب ہمایوں ہند پر دوبارہ قابض ہوا تھا۔

اس نے اپنی دعوت کی بنیاد اس پر رکھی تھی کہ مرید کو 'پیرِ کامل' (یا اس کے خلفاء) کے زیرِ نگرانی سلوک کے آٹھ مقامات طے کرنا چاہییں ۔ ان مقاماتِ ہشتگانہ میں سے ساتواں مقام مقامِ وحدت تھا جو وحدۃ الوجودی صوفیہ سے بھی زیادہ غلو کا حامل تھا ۔وہ اپنے آپ کو اپنے دور کا 'پیرِ کامل' سمجھتا تھا ۔

'حالنامہ' کی رو سے بایزید نے اپنی کتاب 'صراط التوحید' کا ایک نسخہ دعوت کے طور پر شہنشاہ اکبر کے پاس اپنے ایک خلیفہ دولت کے ہاتھ بھیجا تھا اور اکبر نے اس کے جواب میں کہلا بھیجا تھا کہ ہم نے حضرت کی پیروی قبول کر لی ہے ۔ اس غیر مصدقہ بیان کو اس مفروضہ پر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ بایزید اس وقت میرزا محمد حکیم کے زیرِ اثر علاقہ میں رہتا تھا اور اس علاقہ پر شور و شر کا پیدا ہونا خود اکبر کے حق میں مفید تھا ۔ بایزید کی یہ مذہبی دعوت جلد ہی سیاسی تحریک میں بدل گئی اور بایزید اور میرزا حکیم کی فوجوں میں جھڑپ شروع ہو گئی ، جس کے دوران ۱۵۷۳ء - ۱۵۷۴ء/۹۸۱ھ - ۹۸۲ھ کے لگ بھگ بایزید فوت ہوا ۔

ایک سیاسی تحریک کے لحاظ سے روشنیہ بایزید کی اولاد کی سرکردگی میں مغل حکومت کے لیے پچاس ساٹھ برس تک کوہستانی علاقوں میں دردِ سر بنے رہے ۔ آخر شاہجہان کے عہد میں یہ تحریک بالکل ختم ہو گئی[1] ۔

ایک طرف ان مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات تھے ، دوسری طرف ہندوؤں میں بھگتی تحریک کی وجہ سے کبیر اور نانک جیسے مسلمان نما ہندو راہنما پیدا ہونے لگے تھے ۔ ان تمام متصادم آراء کی وجہ سے اس وقت کا نظامِ فکر متزلزل ہو گیا ۔

مغل سلاطین کے ہاں اہلِ سنت اور اہلِ تشیع دونوں فرقوں کے علماء کو بازیابی حاصل تھی ۔ ان علماء کے لیے اپنے افکار کے اظہار کی مشترک جولانگاہ معقولات میں ہاتھ آئی ۔ اسی وجہ سے ایران اور ماوراءالنہر میں معقولات کی دھوم دھام رہی ۔ مغل ہندوستان

---

۱ - تفصیل کے لیے دیکھیے اردو دائرہ معارف اسلامیہ ، مقالہ بایزید انصاری ، انگریزی انسائکلوپیڈیا آف اسلام مقالہ بایزید (دونوں مقالے ڈاکٹر محمد شفیع کے قلم سے ہیں ۔ مگر اردو دائرہ معارف اسلام میں ڈاکٹر میر ولی خان کے اضافات بھی شامل ہیں) ۔ حالنامہ قلمی ، دانشگاہ پنجاب از علی محمد مخلص ، مقدمہ مخزن افغانی از سید محمد تقریم الحق (مخالفانہ) ، مقدمۂ مقصود المومنین قلمی از ڈاکٹر میر ولی خان (حمایت میں)، مقدمہ خیر البیان از محمد عبدالقدوس (نسبۃً معتدل) ۔

آئے تو یہ تحفہ بھی اپنے ساتھ لائے اور ہمایونی اور اکبری دور میں جو علماء ایران و توران سے ہند آئے ان کی اکثریت معقولیوں کی تھی ، جن میں تورانی فقیہوں کی طرح عقیدہ کی پختگی نہیں پائی جاتی تھی -

علماء سوء کا اثر

اکبر نے عبادت خانہ بنوایا اور مختلف الخیال علماء کو وہاں بلا کر بحث و مناظرہ کا بازار گرم کیا - ان اہلِ علم کی باہمی کشمکش نے ان کا وقار اکبر کی نظروں میں گرا دیا اور شیخ ابو الفضل اور فیضی کی تنقیدوں نے بہت سے اہلِ علم و دانش کی بے حرمتی کر دی -

شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک اپنے منصب کی ذمہ داریوں سے شرعاً عہدہ برآ ہونے میں بہت متصلب تھے - مگر ان کی باہمی چشمک کی وجہ سے درباریوں کو ان کا وقار ختم کرنے کا بہانہ ہاتھ آیا - ادھر شیخ ابو الفضل اور شیخ فیضی، جن کے بارے میں شیخ عبدالحق محدثؒ کی رائے یہ تھی کہ :

"زبان اہل دین و ملت جناب نبوت را از بردن نام وے و نام جماعت وے پاک است" -

اپنے ملحدانہ خیالات کی بنا پر دین میں رخنہ اندازی کے لیے راہیں ہموار کر رہے تھے - بہت سے علماء سوء بھی شاہی مزاج کو دیکھ کر نئے نئے مسائل گھڑتے اور تقرب حاصل کرنے کی کوششیں کر رہے تھے - الغرض معقولیوں کی کثرت ، فرقہ ہائے مختلفہ کی نشو و نما، غیرمسلموں کی پاسداری اور درباری علماء سوء کی بے اعتدالی نے اکبر جیسی خود رو شخصیت پر یہ اثر کیا کہ اس کی فکری آزادی بے لگام ہوگئی - 'خذ ما صفا' کے شوق میں اس نے اسلام کی بہت سی روایات کو خیر باد کہہ کر دوسرے مذاہب کی کئی رسومِ عبادت اختیار کر لیں - ۱۵۷۹ء/۹۸۷ھ میں ایک محضر نامہ پر علماء (خصوصاً درباری علماء) کے دستخط کرائے گئے جس میں اکبر کو اجتہادی امور میں اپنا فیصلہ نافذ کرنے کا اہل تسلیم کیا گیا - اکبر کو خلیفة الزّمان کے لقب سے ملقّب کیا گیا - اسلامی عبادات میں تقلیدات کو خلافِ عقل قرار دیا گیا - پھر آتش خانہ کی تیاری ، سورج کی تعظیم ، گائے کے گوشت پر پابندی، بچوں کے ختنہ پر پابندی ، بادشاہ کو سجدۂ تعظیمی وغیرہ خلافِ شرع احکام جاری ہوئے[1] - آہستہ آہستہ مرید بنانے کا سلسلہ بھی شروع ہوا - بااخلاص مریدوں کے زمرہ میں شمولیت کے لیے امیدوار کو

---

۱ - مقدمہ اثبات النبوة بحوالہ بدایونی -

اس مضمون کی ایک تحریر بھی بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنی پڑتی تھی کہ بندہ خوشی سے مجازی اور تقلیدی دینِ اسلام کو چھوڑ کر اکبر شاہی دین الٰہی میں شامل ہوتا ہے اور ترکِ جان و مال و ناموس و دین کے مراتب چہارگانہ کو قبول کرتا ہے[1]۔

رفتہ رفتہ وہ حالت پیدا ہوئی جس کی تصویر کشی شیخ مجددؒ نے یوں کی ہے :

"مسلمانان از اظہارِ احکامِ اسلام عاجز بودند و اگر میکردند بقتل مے رسیدند"۔

جب حالات حد سے بڑھ گئے تو بعض نرم طبیعت بزرگ مثلاً شیخ بدرالدین چشتی ہجرت کر گئے اور جن میں ہمت زیادہ تھی انہوں نے اکبر کے خلاف کھلم کھلا نعرۂ جہاد بلند کر دیا ۔ جونپور کے قاضی ملا محمد یزدی شیعی نے اکبر کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا ۔ اس فتویٰ کی تائید بنگال کے قاضی یعقوب نے کی ، جس کے نتیجے میں محمد معصوم کابلی ، میر معزالملک وغیرہ نے اکبر سے بغاوت کر دی ۔ یہ بغاوت فرو کی گئی اور ان علماء کو پوری سزا دی گئی، جن کی جرأت نے باغیوں کو بغاوت پر آمادہ کیا تھا۔ ملا سید محمد یزدی اور قاضی یعقوب اور میر معزالملک کو دریا میں پھینکا گیا ۔ لاہور کے کئی علماء نے سختیاں جھیلیں اور کئی ایک جلا وطن کر دیے گئے[2]۔

بہرحال ملک سے بے چینی دور نہ ہوئی تو حضرت موسیٰ پاک شہید ملتانی اور حضرت ایشاں لاہوری وغیرہ چند مقتدر بزرگوں نے ایک دوسرے طریقہ سے اس کا علاج شروع کیا ، کہ دربار اور درباریوں سے وابستہ ہو کر اصلاح کی کوشش نرمی سے کی جائے[3]۔ انہی دنوں سلسلہؒ نقشبندیہ کے سرتاج حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے دہلی میں اپنی اصلاحی سرگرمیاں تیز کر دیں ۔ حضرت خواجہ ۱۵۹۷ء/۱۰۰۶ھ کے لگ بھگ لاہور آئے ۔ اگلے سال دہلی تشریف لے گئے اور ۱۶۰۳ء میں آپ نے وصال فرمایا ۔ حضرات نقشبندیہ کا اصول یہ ہے کہ خرابیوں کی اصلاح کے لیے اربابِ اقتدار سے الگ تھلگ رہنے

---

۱ ۔ اس مضمون کے لیے تفصیلاً ملاحظہ ہوں ۔ منتخب التواریخ (حوادث سال ۹۸۲ھ اما بعد) آئین اکبری ج ۱ ۔ صفحات ۱۶ ۔ ۲۶ ۔ ۱۰۶ ۔ ۱۰۷ ۔ ۱۰۸ ۔ ۱۱۲ ۔ ۱۴۲ ۔ ۱۴۳ ۔ ۱۵۴ ۔ ۱۹۵ ۔ ۱۹۷ ۔ جلد سوئم صفحہ ۱۷۸ ۔ پروفیسر محمد اسلم کی کتاب اکبر کا دین الٰہی اور اس کا پس منظر ۔ تذکرہ مجدد الف ثانیؒ (مکتبہ الفرقان) معاشرتی و علمی تاریخ ڈاکٹر معین ، رود کوثر از شیخ محمد اکرام ۔ المعارف جنوری ۱۹۶۹ء کا شمارہ از پروفیسر محمد اسلم ۔

۲ ۔ رود کوثر ، ص ۱۰۶ ۔ معاشرتی و علمی تاریخ ، ص ۲۲۶ ، ۲۲۷ ۔

۳ ۔ ایضاً ، ص ۳۵۰ ۔ ۱۳۹ ۔ ۱۴۰ ۔

کی بجائے ان سے ربط وضبط پیدا کریں ۔ خواجہ عبیداللہ احرار کا مقولہ ہے کہ :

''اگر ما شیخی می کردیم درین روزگار ہیچ شیخ مرید نمی یافت ، لیکن ما را کار دیگر فرمودہ اند ۔ کہ مسلمانان را از شر ظلم نگاھداریم بواسطہ این بپادشاہان بایست اختلاط کردن و نفوس ایشان را مسخر گردانیدن و بتوسط ایں عمل مقصود مسلمین بر آوردن''۔

اس راہنما اصول کے پیشِ نظر خواجہ باقی باللہؒ نے اپنا خوانِ دعوت و ارشاد پھیلایا اور ان کے فیضِ باطن سے نقشبندیہ سلسلہ نے اتنا فروغ حاصل کیا کہ بقول خواجہ بدرالدین :

''علماء وفضلاء و مشائخ و سجادہ نشینان از راہ دور و نزدیک بہ درگاہ ولایت او چون مور و ملخ می ریختند''۔

ان علماء و مشائخ میں سرِ فہرست شیخ مجدّد الف ثانیؒ اور شیخ عبدالحق محدثؒ دہلوی ہیں ۔

شیخ محدثؒ اور شیخ مجددؒ

سترھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی اصلاح و تربیت کا سہرا حضرت مجددالف ثانیؒ اور شیخ عبدالحق محدثؒ دہلوی کے سر ہے ۔ ان حضرات کی علمی سرگرمیوں کی ابتدا اکبری دور میں ہوئی تھی اور عروج جہانگیر اور شاہجہان کے دور میں ہوا ۔ یہاں صرف اکبری دور سے متعلق سرگرمیوں کا سرسری جائزہ لیا جاتا ہے ۔ شیخ عبدالحق محدثؒ دہلوی ۱۵۵۱ء/محرم ۹۵۸ھ میں دہلی کے ایک علمی خاندان میں پیدا ہوئے ۔ علوم کی تحصیل سے فراغت حاصل کرنے کے بعد حضرت موسیٰ پاک شہید کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے ۔ پھر دربار تک رسائی ہوئی اور وہاں کا رنگ ڈھنگ بھی دیکھ لیا ۔ فیضی کے ساتھ ذاتی مراسم تھے ، اس لیے بھی انقلابِ احوال کی گہرائی ان کے پیشِ نظر رہی ۔ ''ابتر حالات سے کبیدہ خاطر ہو کر'' ۱۵۸۵ء/۹۹۳ھ میں حرمین کا سفر اختیار کیا ۔ وہاں شیخ عبدالوہاب متقی سے علومِ ظاہری و باطنی دونوں میں فیض حاصل کیا اور پھر مرشد کے حکم سے منکر کا مقابلہ کرنے کا عزم لیے کر ہندوستان واپس ہوئے ۔ مسندِ درس و ارشاد بچھا دی اور قرآن و حدیث کی تعلیم دینے لگے ۔ ان ہی ایام میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ دہلی پہنچے ۔ شیخ محدثؒ عمر میں بڑے ہونے کے باوجود ان کے ارادتمند ہوئے ۔ شیخ کے مجموعۂ مکاتیب میں خواجہ صاحب کے نام سات مکتوب ہیں جن میں اکبری عہد کے تمام فتنوں کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں ۔ اکبری عہد کے جن

امراء کے ساتھ شیخ محدثؒ دہلوی کے مراسم تھے۔ان میں شیخ عبداللہ نیازی ، نواب مرتضیٰ خان فرید ، عبدالرحیم خان خانان ، بدایونی اور میرزا نظام الدین احمد بخشی مشہور شخصیتیں ہیں ۔ان مراسم کی کیفیت ہی سے یہ واضح ہے کہ شیخ محدثؒ ہر قدم پر ماحول کی اصلاح چاہتے ہیں اور ایسی چاہتے ہیں کہ خود ان کا دامن اہلِ ہوا کی آلائشوں سے بالکل محفوظ رہے ۔ یہ احتیاط ملحوظ رہی کہ :

"سخن مبالغہ گفتہ نہ شود و از حیطہ احتیاط کہ روش این فقیر است بیرون نیفتم"[1] ۔

شیخ احمد بن عبدالاحد سرہندی المعروف بہ شیخ مجدد الفؒ ثانی ۲۹ جون ۱۵۶۳ء/۴ شوال ۱۷۱ھ کو بمقام سرہند پیدا ہوئے ۔ تحصیلِ علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد کچھ مدت سرہند میں تدریس کی ۔ پھر اکبر آبادؔ تشریف لے گئے ، جہاں ابوالفضل سے بھی ملاقاتیں رہیں ۔ شیخ اسے برابر بے راہ روی پر ٹوکتے رہے ۔ اس دور کی یادگار آپ کا رسالہ 'اثبات النبوۃ' ہے جس کی تمہید ہی میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ مقالہ بعض ان معاصرین کے ردّ میں لکھا جا رہا ہے جو نبوّت کے منکر اور نبیؐ کو صرف ایک اخلاق مصلح سمجھتے ہیں ۔ اکبری دور کا لکھا ہوا دوسرا 'رسالہ تہلیلیہ' ہے ۔ اس رسالہ میں کلمۂ طیّبہ کے دونوں اجزا کی تشریح کی گئی ہے ۔ 'اثبات النبوۃ' اور 'رسالہ تہلیلیہ' دونوں عربی میں ہیں ۔

سلسلہ ہائے تصوف

زیرِ نظر دور کے سلسلہ ہائے طریقت میں سے شطّاریہ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ۔ سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ تھے ۔ آپ پہلے ردولی میں رہتے تھے ۔ پھر گنگوہ ضلع سہارنپور میں چلے آئے ۔ لودھیوں کے ساتھ وابستگی تھی ، اس لیے شروع شروع میں بابر کے ہاتھوں اذیت بھی اٹھائی ، مگر بعد میں حالات سدھر گئے[2] ۔ وہ کئی کتابوں کے مصنّف ہیں ۔ جن میں مشہور 'انوار العلوم' ہے ۔ شیخ عبدالحقؒ نے 'اخبار الاخیار' میں ان کے 'رسالۂ قدسیہ' سے کچھ اقتباسات دیے ہیں ۔ اس کے علاوہ صاحبِ 'نزھۃ الخواطر' نے ان کی مندرجہ ذیل تصانیف کے نام گنوائے ہیں :

---

۱ - 'اخبار الاخیار' ، ص ۳۰۰ ، مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے ۔ حیات شیخ عبدالحق اور 'رود کوثر' ۔

۲ - مغلوں کے عارضی زوال کے وقت بھی شیخ کے مریدوں کی ہمدردیاں سوریوں کے ساتھ تھیں ۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ لودھی اور سوری شعائر اسلام کی حفاظت کا اہتمام کرتے تھے ۔ مغلوں میں یہ سعادت اورنگ زیب عالم گیر کے حصہ میں آئی تھی ۔

”علم کلام کی شرح صحائف پر تعلیقات۔ علم تصوف میں عوارف المعارف کی مبسوط شرح معارف[۱]۔ تصوف کلاباذی کا حاشیہ اور مکتوبات[۲]“۔

آپ نے ۱۵۳۷ء/۹۴۴ھ میں وفات پائی ۔ سہروردیہ سلسلہ میں اس دور کے مشہور بزرگ حاجی عبدالوہاب بخاری دہلوی (م ۔ ۱۵۲۵ء/۹۳۲ھ) گزرے ہیں ۔ انہوں نے قرآن کریم کی تفسیر صوفیانہ رنگ میں ایسی لکھی ہے کہ تمام قرآن کریم نعت رسولؐ نظر آتا ہے ۔ 'اخبار الاخیار' میں (عربی زبان کی) اس تفسیر کے نمونے دیے گئے ہیں ۔ اس کے علاوہ شرح شمائل اور قصائد نعتیہ بھی لکھے تھے ۔ ان کے برادر خورد اور خلیفہ سید جمال الدین کے خلفاءؒ میں مخدوم شیخ حمزہ کشمیری تھے۔ لاہور میں محمد شاہ موج دریا بخاریؒ نے سہروردیہ کا نام زندہ رکھا تھا ۔ سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ایک مشہور بزرگ شیخ عبدالعزیزؒ دہلوی (م ۔ ۱۵۶۷ء/۹۷۵ھ) تھے ۔ 'عرائس البیان'، 'فصوص الحکم' اور 'عوارف' وغیرہ تصوف کی کتابوں کا درس دیا کرتے تھے ۔ 'عمدۃ الاسلام' (فقہ میں بزبان فارسی) 'رسالہ عزیزیہ' (ورد و اذکار میں) اور شیخ وجیہہ الدین گجراتی کی کتاب 'حقیقۃ محمدیۃ' کی شرح لکھی ۔ ان کی سب سے مشہور تصنیف 'رسالہ عینیہ' ہے جو شیخ امان (عبدالملک بن عبدالغفور) پانی پتی کے 'رسالہ غیریہ' کے جواب میں لکھا گیا تھا ۔ شیخ عبدالعزیز کے صاحبزادہ شیخ قطب عالم کے ہاں خواجہ باقی باللہؒ نے تربیت پائی تھی ۔ نقشبندیہ سلسلہ کے دو بزرگوں (خواجہ باقی باللہؒ اور شیخ مجددؒ) کا ذکر ہو چکا ہے ۔

کشمیر میں سلسلۂ کبرویہ کا بھی رواج تھا ۔ یہ سلسلہ شیخ نجم الدین کبری صاحب 'رسالۃ الاصول النجمیۃ' سے منسوب ہے ۔ اس سلسلہ کے ایک مشہور بزرگ شیخ مجدد کے استاد شیخ یعقوب صرف تھے ۔ احمد آباد کے حضارمہ میں عیدروسی سلسلہ کا رواج تھا ، جس کے مشہور بزرگ شیخ بن عبداللہ عیدروسی (م ۔ ۱۵۸۲ء/۹۹۰ھ) تھے۔ سلسلۂ قادریہ کو مشہور بزرگ مخدوم عبدالقادرؒ ثانی (م ۔ ۱۵۳۳ء/۹۴۰ھ) نے فروغ بخشا ، جن کی پر تاثیر نگاہ کی برکت سے کفار و فساق کی بڑی تعداد کو سچی توبہ کی توفیق نصیب ہوئی ۔ ان کے جانشین ان کے صاحبزادے عبدالرزاق (م۔۱۵۳۵ء/۹۴۲ھ) ہوئے ہیں ۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ حامد گیلانی (م ۔ ۱۵۷۰ء/۹۷۸ھ) مسند نشین ہوئے ۔ پھر ان کے جانشین ان کے صاحبزادے مخدوم سید موسیٰ پاک شہید (مدفون پاک دروازہ ملتان) ہوئے ۔ مخدوم شیخ حامد کے خلفاء میں سب سے زیادہ صاحب شہرت بزرگ

---

۱ ۔ اس کا ایک نسخہ تہران کی نیشنل لائبریری میں ہے ۔

۲ ۔ آپ کے مکتوبات شاہان وقت اور امراء کے نام ہیں ، جن میں انہیں پابندیٔ شرع اور علم اور علماء کی توقیر کی تاکید کی گئی ہے ۔

شیخ داؤد کرمانی شیر گڑھی ہیں ۔ انہوں نے علومِ ظاہری مولانا اسماعیل لاہوری (تلمیذ مولانا جامی) سے حاصل کیے ۔ پھر مخدوم شیخ حامد سے خلافت حاصل کی اور ملتان سے آ کر شیر گڑھ (ضلع ساہیوال) میں قیام پذیر ہوئے۔ ان کے دستِ حق پرست پر لاتعداد ہندو مشرف بہ اسلام ہوئے۔

مغلیہ دور میں تعلیم اور علوم

سکندر لودھی کے زمانے میں یہ خاص تبدیلی ہوئی کہ ہندوؤں کے لیے فارسی تعلیم کا انتظام ہوا اور مسلمانوں اور ہندوؤں کی جداگانہ تعلیم کے ساتھ ساتھ باہم یکجا تعلیم کا بھی موقع فراہم کیا گیا ۔ قیاس یہ ہے کہ اس کا اثر عربی علوم پر تو نہیں ہوا مگر فارسی کے مکاتیب میں ہندو طالب علم بھی شامل ہوگئے۔ یہ صورتِ حال مغلیہ دور کی ابتدا میں بھی رہی ہوگی ۔ ہندوؤں کے اپنے علوم کے پاٹھ شالے الگ قائم تھے اور علومِ سنسکرت کے مراکز کا اہتمام ہندو اپنے طور پر کرتے تھے ۔ شیر شاہ سوری نے ہندوؤں کے علوم کی سرپرستی کی اور اس کے لیے مخصوص مدارس قائم کیے اور اوقاف بھی مقرر کیے۔ بہ ظاہر یہ انتظام عہدِ اکبری تک باقی رہا ہوگا ۔ بہرحال مغلیہ دور میں بھی آج کی طرح سنسکرت کی اعلیٰ تعلیم ہندوؤں تک اور عربی کی اعلیٰ تعلیم مسلمانوں تک محدود رہی ۔ اکبر نے عام مکاتیب کے لیے ایک قانون نافذ کیا جس کی رو سے ابجد خوانی کے کچھ خاص اصول مقرر کیے گئے اور یہ اہتمام کیا گیا کہ طالب علم کی عمر کا زیادہ حصہ مکتب میں فضول نہ گزرنے پائے۔ جس کے نتیجہ میں بقول ابوالفضل ''سالوں کا کام مہینہ بلکہ دن میں ہونے لگا اور لوگ تعجب کرنے لگے'' ۔ اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہوا کہ :

> ''اخلاق ، حساب ، سیاق ، فلاحت ، مساحت ، ہندسہ ، نجوم و رمل ، تدبیرِ منزل ، سیاستدانی ، طبیعی ، ریاضی ، الٰہی ، تاریخ مرتبہ مرتبہ اندوزد و ازہندی علوم بیاکرن نیائے بیدانست پاتنجل برخواند[1]'' ۔

طریقۂ تعلیم کے بارے میں ان احکام پر عمل ہوا تو بقول ابوالفضل :

> ''مکتبہا رونق دیگر گرفت و مدرسہا فروغ تازہ یافت''![1]

صاحبِ 'ماثر الامراء' اس نتیجے کو دوسرے پیرایہ میں ادا کر کے لکھتا ہے :

---

۱ ۔ آئین اکبری ، جلد اول ، ص ۱۴۳ - ۱۴۴ -

"علومِ شرعیہ و نقلیہ را اصلاً وقع و اعتبارے نماند ، مردم رغبتے بحکمت و حساب و طب و نجوم و تاریخ نمودند"[1] ۔

اس آئین کے اثرات کے متعلق ان سرسری جملوں کے سوا ہمارے پاس تفصیلی جائزہ لینے کے لیے کوئی مواد نہیں ۔ ہمارا خیال ہے کہ علومِ شرعیہ سے بے رغبتی اور مکاتب و مدارس کی جدید سرگرمیاں صرف ان اداروں تک محدود رہی ہوں گی جو ابتدائی تعلیم کے لیے سرکاری سرپرستی میں جاری تھے۔ ملک کے طول و عرض میں جو رواج عربی علوم کا تھا اس پر اثر کم پڑا ہوگا اور علماء اسی طرح حسبۃً للہ اشاعتِ تعلیمِ دین میں مصروف رہے ہوں گے جس طرح پہلے سے معمول چلا آ رہا تھا ۔[2] ہاں یہ ضرور ہے کہ اس صدی کی ابتدا ہی سے علومِ منقول کی نسبت علومِ معقول کی طرف جو رجحان بڑھ رہا تھا وہ اکبری دور کی قدر دانی کی وجہ سے مزید ترقی پذیر ہوا ۔

نصابِ تعلیم

ہمارے سامنے کوئی واضح بیان ایسا نہیں جس سے اس زمانے کے نصابِ تعلیم کو متعیّن کیا جا سکے ۔ سیر و سوانح کی کتابوں میں علماء کے جو حالات مندرج ہیں ان سے ایک سرسری اندازہ لگایا جا سکتا ہے ، مگر سوانح میں بھی شاہ ولی اللہؒ کی طرح نصاب کا واضح اور تفصیلی تذکرہ نہیں ملتا ۔ اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ ابتدائی کتاب 'میزان الصرف' تھی اور 'ہدایہ' کا شمار منتہیانہ کتابوں میں تھا ۔ اس کے درمیان یا 'ہدایہ' سے اوپر کون سی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں ان کی تفصیل نہیں ملتی ۔ بہرحال اتنا واضح ہے کہ عموماً ابتدائی کتابوں کے لیے مدرس ہر جگہ مہیا تھے اور انتہائی مدارج میں عموماً کوئی مقتدر عالم ایک فن یا کئی فنون کا متخصّص ہوا کرتا تھا ۔ اس لیے طلبہ (ابتدائی نصاب گھر کے قریب پڑھ کر) اس متخصّص عالم کے پاس پہنچتے تھے اور عموماً ایک فن کی ایک گونہ تکمیل کے بعد دوسرے فن کی طرف توجہ دیتے ۔ اس لیے علماء کے تذکروں میں اس طرح کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں ، اخذ الفقہ عن فلان و التفسیر و الحدیث عن فلان و علوم المنطق و الحکمۃ عن فلان' وغیرہ وغیرہ ، 'نزھۃ الخواطر' کے مطالعہ سے مجھے جن جن کتابوں کے زیرِ درس ہونے کا پتہ چلا وہ مندرجہ ذیل ہیں[3] ۔

---

۱ ۔ مآثر الامراء ، ج ۲ ، ص ۳۸۶ (بحوالہ تمدنی کارنامے ، دارالمصنفین ، ص ۱۹۹) ۔

۲ ۔ دیکھیے : رود کوثر ، ص ۱۶۱ - ۱۶۲ ۔

۳ ۔ یہ فہرست جس میں بہت سے نام رہ بھی گئے ہیں مختلف مقامات سے لی گئی ہے خصوصاً ترجمہ مجدد الف ثانیؒ شیخ محدثؒ اور شیخ محمد رشید جونپوری ۔

صرف و نحو میں : 'میزان الصرف' ، قاضی بیضاوی کی 'لب الالباب' ، دولت آبادی کی 'ارشاد و شرح کافیہ ابن حاجب' ، کافیہ کی شرح از عبدالرحمان جامی ۔

فقہ میں : 'کنزالدقائق' ، 'شرح وقایہ' ، 'ہدایہ' ۔

اصول فقہ میں : 'حسامی' ، 'منار' ، 'کشف بزدوی' اور تفتازانی کی 'تلویح علی التوضیح' ۔

عقائد میں : سمرقندی کی 'صحائف' اور اس کی شرح کی جگہ رفتہ رفتہ تفتازانی کی 'شرح عقائد نسفیہ' نے لے لی اور اس کے علاوہ عضدالدین ایجی کی 'عقائد عضدیہ' اور اس کے حاشیہ سید 'جرجانی' اور 'شرح مواقف جرجانی' کا رواج ہوا ۔

علم معانی میں : تلخیص کی ہر دو شروح 'مختصر المعانی' اور 'مطول' اور 'شرح مفتاح' ۔

منطق میں : 'شرح شمسیہ' کے ساتھ تہذیب اور اس کی شرح بزدوی اور حاشیہ دوانی شرح مطالع اور اس کا حاشیہ از میر سید جرجانی ۔

حدیث میں : 'مشکوٰۃ' صحیح بخاری شمائل ترمذی' اور کسی جگہ شفاء قاضی عیاض اربعین نووی اور کہیں کہیں صحاح ستہ کی بقیہ کتب ۔

تفسیر میں : 'بیضاوی' (مکمل) ۔

ہیئت میں : 'بست باب و شرح چغمینی' ۔

ریاضی میں : 'تحریر اقلیدس' ۔

مناظرہ میں : 'رسالہ شریفیہ' ۔

تصوف میں : 'تعرف' ، 'عوارف' اور 'فصوص الحکم' (تفسیر میں کشاف کا رواج اس میں نہیں رہا ۔ یہی حال حدیث میں مشارق اوو مصابیح کا ہوا) ۔ ادب کے نصاب میں 'قصیدہ بردہ' کے سوا اور کسی کتاب کا نام نظر سے نہیں گزرا ۔ مگر غالباً 'مقامات حریری' پہلے کی طرح شامل رہی ہوگی کہ فیضی کی 'سواطع' اس کی غمازی کرتی ہے ۔

یہ اس دور کے نصاب تعلیم کی ایک ناتمام سی فہرست ہے ۔ نصاب تعلیم کے متعلق مولانا گیلانی نے غلام علی آزاد بلگرامی کی سند پر یہ رائے قائم کی ہے کہ دو دفعہ اس نصاب میں عظیم تغیّر رونما ہوا ۔ ایک دفعہ وہ جب سکندر لودھی کے عہد میں مولانا عبداللہ اور مولانا عزیزاللہ ملتان سے نواح دہلی میں آئے اور معقولات کو یہاں رواج دیا اور دوسری دفعہ وہ جب میر فتح اللہ شیرازی پہنچے اور علماء متاخرین کی کتابیں یہاں رائج ہوئیں ۔ میر فتح اللہ شیرازی کے علم و فضل کے اعتراف کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ یہاں کے نصاب میں تغیّر صرف میر صاحب کی وجہ سے رونما نہیں ہوا ۔

معقولات کی ترویج میں فتح اللہ شیرازی کا کیا حصہ ہے ، اسے متعین نہیں دیا سکتا ۔ وہ مولانا جلال الدین دوانی کے شاگرد جمال الدین محمود کے تلمیذِ رشید اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے ۔ اس ہمہ دانی کی بنا پر علی عادل شاہ بیجاپوری نے ان کو اپنے دربار سے وابستہ کر دیا تھا ۔ اس کی وفات پر شہنشاہ اکبر نے انہیں اپنے ہاں بلا لیا ۔ انہوں نے شاہی دربار سے وابستگی کے بعد بھی اپنے شیعہ مسلک پر پختگی دکھائی ۔ اکبر نے ان کے علم کی خوب قدردانی کی ۔ صدرالصدور بنایا ۔ تین ہزاری کا منصب اور عضدالدولہ خطاب دیا ۔ اس نے ان معاشی علوم میں یہ مہارت دکھائی کہ کبھی تو موازنہ آمد و خرچ کا اندازہ بادشاہ کے سامنے پیش کیا ، کبھی راجہ ٹوڈرمل کو بندوبست میں مدد دی ۔ کبھی بندوق و بارود سے شہنشاہ اکبر کے رکاب میں دوڑا ۔ بارہ فائر والی بندوق اور دوسری ایجادات کیں ۔ امراء کے اطفال کو پڑھایا ۔ مقربانِ دربارِ اکبری کے مکانوں پر جا کر انہیں معقول کی کتابیں پڑھائیں اور ساتھ ہی ساتھ منقول و معقول میں تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی جاری رکھا ۔ معقول میں ان کی خدمت کی اہمیت آزاد بلگرامی نے ان الفاظ میں واضح کر دی ہے کہ :

"تصانیف علماء متاخرین ولایت مثل محقق دوانی و میر صدرالدین و میر غیاث منصور و میرزا جان میر در ہندوستان آورد و داخل می کرد"[۱] ۔

ہندوستان میں ان کے شاگرد بے شمار تھے ۔ ان میں سے ملا عبدالسلام لاہوری کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ ان کے شاگرد شیخ محمد افضل جونپوری (استاد ملا محمود جونپوری مصنف شمس بازغہ) اور مفتی عبدالسلام دیوی (استاذ الاساتذہ ملا نظام الدین سہالوی) نے ان کے سلسلہ کو ہندوستان بھر میں پھیلا دیا[۲] ۔ میر صاحب کی وفات ۱۵۸۸ء/ ۹۹۷ھ میں کشمیر میں ہوئی ۔ قرآن کریم کی فارسی تفسیر 'منہج الصادقین' اور 'شرح تہذیبِ جلالی' کا حاشیہ اور تکملہ ان کی تصنیفات میں سے ہیں ۔

مولانا آزاد بلگرامی کے بیان کے تکملہ کے طور پر اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ علومِ عقلیہ کے ماہرین میر فتح اللہ سے پہلے بھی ایران سے ہند آتے رہے ہیں ۔ ان میں ایک نمایاں عالم شیخ طاہر بن رضی الہمدانی اسماعیلی تھے جو ایران سے جلاوطن ہو کر احمد نگر پہنچے ۔ وہاں نظام شاہ نے ان کی قدردانی کی ۔ ان کی تصنیفات کچھ شیعہ

---

۱ ۔ مآثر الکرام ، ص ۲۲۸ ۔

۲ ۔ المعارف جون ۱۹۶۸ء ۔ مزید حالات کے لیے دیکھیے نزہۃ الخواطر ، ۴ : ۲۵۴ - ۲۵۵ - ترجمہ منتخب التواریخ ، ص ۶۴۵ ۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ، ۱ : ۱۹۱ - ۲۳۱ اور دربار اکبری ۔

مذہب کے علمِ کلام اور علمِ فقہ سے بھی متعلق ہیں ۔ 'تفسیرِ بیضاوی' اور 'مطول' پر بھی حواشی ہیں اور علومِ عقلیہ میں اشارات 'محاکمات'، 'شفاء' اور 'مجسطی' پر حواشی ہیں ۔ انہی کی تلقین سے برہان نظام شاہ نے شیعہ مذہب اختیار کیا اور پوری ریاست میں اہلِ تشیع کا غلبہ ہوا ۔ شیخ طاہر کی وفات ۱۵۴۹ء/۹۵۶ھ میں ہوئی ۔

غالباً ان سے بھی پہلے مولانا جلال‌الدین دوانی کے شاگرد عماد الدین محمد بن محمود طارمی (مولانا وجیہ‌الدین علوی گجراتی کے استاد) (م - ۱۵۷۶ء/۹۸۴ھ) ۱۵۲۴ء/۹۳۱ھ میں برِّ عظیم پہنچے تھے ۔ عہدِ اکبری کے دوسرے ایرانی علماء میں سے ایک جمال الدین حنفی شیرازی ہیں ، جو دوانی کے شاگرد تھے اور ان کے حاشیہ قدیم پر حاشیہ لکھا تھا ۔ شیخ رفیع الدین محدث شیرازی متوفی ۱۵۰۰ء/۹۰۷ھ بھی علامہ دوانی کےشاگرد تھے ۔ ایک اورشاگرد مولانا علاءالدین لاری تھے ، جن کا مدرسہ آگرہ میں 'مدرسۂ خس' کے نام سے مشہورتھا ۔ غالباً اس دور میں تفتازانی میرسید شریف اور دوانی کی کتابوں کوفروغ علامہ دوانی کے انہی تلامذہ کی وجہ سے ہوا[1] ۔

مراکزِ علم

اس دور کے مراکزِ علم میں دہلی ، لاہور ، ملتان ، جونپور ، اکبر آباد ، احمد آباد ، بیجاپور ، بدایوں ، برہانپور ، ٹھٹھہ ، کشمیر اور منگلوٹ کے علاوہ دوسرے بہت سے قصبات مثلاً امروھہ ، سہسوان ، سنبھل ، سرہند ، احمد نگر ، بلگرام ، نارنول ، ناگور ، بیانہ ، چندیری ، گلبرگہ ، گولکنڈہ ، بیدر ، مانکپور ، منیر ، مند سور ، ردولی بنارس ، سہارنپور ، گنگوہ ، کڑہ ، خیر آباد وغیرہ شامل ہیں[2] ۔ درحقیقت جہاں بھی کسی پرگنہ کا مرکز تھا وہاں اہلِ علم میں سے بھی کوئی نہ کوئی خاندان ضرور رہ رہا تھا ، جس کا شغل درس و تدریس تھا ۔ حکومت کی طرف سے ان میں سے بعض کی مدد جاگیر اور معاف کی شکل میں ہو جایا کرتی تھی ۔ لیکن بہت سے ایسے مرد درویش تھے جو حکومت کی طرف سے بے نیاز ہو کر لباسِ فقر میں علم کی خدمت کو سرمایۂ سعادت سمجھتے تھے ۔ دورِ زیرِ بحث کے نقطۂ نظر سے ان مراکز میں سے دارالخلافہ کے علاوہ احمد آباد ، برہانپور اور بیجاپور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ، کہ 'کنز العمال'،

---

۱ - اس بارے میں بہتر معلومات مولانا حکیم عبدالحئی مرحوم نے معارف العوارف کی ابتدا میں دی ہیں ۔

۲ - یہ فہرست جس میں بہت سے نام چھوڑے بھی گئے ہیں ۔ سرسری نظر میں نزھۃ الخواطر سے اکٹھی کی گئی ہے ۔

'مجمع البحار'، 'تحفۃ المجاہدین'، 'عقائدِ سنیہ'، وغیرہ اس دور کی مقبول کتابیں ان ہی مقامات پر لکھی گئیں ۔

مدارس

بابر نے توزک میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں مدارس نہیں ۔ غالباً اس کی مراد اس خاص طرز کی عمارت سے تھی جو ماوراء النہر میں پائی جاتی تھی ۔ جس کا رواج بہت کم تھا اور جس کی طرف خود بابر نے بھی توجہ نہیں دی ۔ بہرحال جہاں تک تدریس کے مراکز کا تعلق ہے ہر عالم کی قریب کی مسجد یا اس کا مکان اور ہر صاحبِ علم بزرگ کی خانقاہ اس کا مدرسہ تھا ، جہاں سے تشنگانِ علم سیراب ہوتے تھے ۔ قدیم جامع مسجدوں اور خانقاہوں کے ساتھ جو حجرے متّصل نظر آتے ہیں ان کی تعمیر کا مقصد طلبہ کے لیے قیام‌گاہ مہیا کرنا تھا ۔ ان کے علاوہ کچھ مدارس ایسے بھی ہیں جن کے نام استطراداً تاریخ کی کتابوں میں آئے ہیں جن میں سے اس دور سے متعلق مدارس یہ ہیں : دہلی میں ہمایوں کا مدرسہ ، ماہم بیگم کا مدرسہ ، خیر المنازل اور وہ مدرسہ (اگر وہ ان کے علاوہ کوئی اور تھا) جس میں شیخ عبدالحق صاحبؒ درس لیا کرتے تھے ، نارنول میں شیر شاہی مدرسہ اور مدرسہ نظام‌الدین ، لاہور میں شیخ اسحاق کاکو کا مدرسہ اور وہ مدرسہ جس میں قلیچ خان حاکم لاہور درس دیا کرتے تھے ۔ آگرہ میں شیخ خوافی کا مدرسہ ، مولانا علاءالدین لاری کا مدرسۂ خس اور وہ مدرسہ جس کے لیے اکبر نے چلپی بیگ کو شیراز سے بلایا تھا ۔ فتح پور سیکری میں شہنشاہ اکبر کا مدرسہ ، چریاکوٹ میں شیخ محمد بن عاشق کا مدرسہ ، سہالی میں شیخ حافظ کی درسگاہ ، احمد آباد میں شیخ وجیہ الدین گجراتی کا مدرسہ ، نہروالہ میں شیخ حسام الدین ملتانی کا مدرسہ اور مدرسۂ ابوالفضل ، احمد نگر میں مدرسۂ اثنا عشری و مدرسۂ بغداد ۔ خاندیش میں برہانپور اور دولت آباد کے مدرسے ، حیدرآباد میں مدرسہ چہار مینار اور دیگر مدارس اور بیجاپور کے عربی و فارسی مدرسے[۱] ۔

اس دور میں عالمِ اسلام کے مشاہیر علماء

اس دور کے مشاہیر میں سے چند مندرجۂ ذیل ہیں :

---

۱ ۔ ان مدرسوں کی تفصیل ''ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں'' میں دی گئی ہے ۔ ان میں سے دکن کی ریاستوں کے مدارس کا حال قابل رشک تھا ۔

ایران و توران میں

۱ - عصام الدین ابراہیم بن محمد بن عربشاہ اسفرائنی - (تلمیذ جامی) متوفی ۱۵۳۷ء/۹۴۳ھ -
۲ - غیاث الدین منصور بن محمد الحسینی شیرازی متوفی ۱۵۴۲ء/۹۴۹ھ -
۳ - محمد امین بن محمود البخاری المعروف بامیر بادشاہ متوفی ۱۵۷۹ء/۹۸۷ھ -
۴ - حبیب اللہ میرزا خان شیرازی یافندی متوفی ۱۵۸۵ء/۹۹۳ھ -
۵ - حسین الحسینی الخلخالی متوفی ۱۶۰۵ء/۱۰۱۴ھ -

حجاز میں

۱ - علی بن محمد بن عراق متوفی ۱۵۵۵ء/۹۶۳ھ -
۲ - عفیف الدین عبد اللہ بن احمد الفاکہی متوفی ۱۵۶۴ء/۹۷۲ھ -
۳ - شہاب الدین احمد بن محمد ابن حجر المکی الہیتمی متوفی ۱۵٦۵ء/۹۷۳ھ -
۴ - شیخ عبد العزیز متوفی ۱۵٦۸ء/۹۷٦ھ -
۵ - حسین بن محمد الدیار بکری متوفی ۱۵۸۲ء/۹۹۰ھ -
٦ - سنان الدین یوسف الواعظ المکیؒ متوفی ۱۵۹۱ء/۱۰۰۰ھ اور
۷ - مولانا علی بن سلطان القاری الہروی متوفی ۱٦۰۵ء/۱۰۱۴ھ -

روم اور اناطولیہ میں

۱ - احمد بن سلیمان الشہیر بابن کمال پاشا متوفی ۱۵۳۳ء/۹۴۰ھ -
۲ - محمد بن مصلح الدین مصطفی القوجوی محی الدین المعروف بہ شیخ زادہ متوفی ۱۵۴۳ء/ ۹۵۰ھ -
۳ - برہان الدین ابراہیم بن محمد الحلبی متوفی ۱۵۴۹ء/۹۵٦ھ -
۴ - احمد بن مصطفیٰ الشہیر بطاش کبری زادہ متوفی ۱۵٦۰ء/۹٦۸ھ -
۵ - محمد بن پیر علی البرکوی متوفی ۱۵۷۳ء/۹۸۱ھ -
٦ - ابو السعود (محمد بن محمد بن مصطفیٰ) العمادی متوفی ۱۵۷۴ء/۹۸۲ھ -
۷ - محمود بن سلیمان الکفوی متوفی ۱۵۸۲ء/۹۹۰ھ -

مصر و شام میں

۱ - محمد بن محمد سبط ماردینی متوفی ۱۵۲۶ء/۹۳۳ھ -
۲ - شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن یوسف الصالحی دمشقی متوفی ۱۵۳۵ء/۹۴۲ھ -
۳ - شیخ الاسلام شہاب الدین احمد بن عبد الحق السنباطی متوفی ۱۵۴۳ء/۹۵۰ھ -
۴ - شیخ الاسلام ابوالحسن (علی بن محمد) البکری متوفی ۱۵۴۵ء/۹۵۲ھ -
۵ - زین الدین ابن ابراہیم الشہیر بابن نجیم الحنفی متوفی ۱۵۶۲ء/۹۷۰ھ -
۶ - شیخ عبد الوہاب الشعرانی متوفی ۱۵۶۵ء/۹۷۳ھ -
۷ - شیخ الاسلام نجم الدین (محمد بن احمد) الغیطی متوفی ۱۵۷۶ء/۹۸۴ھ -

حصہ دوم

۱۵۲۵ء تا ۱۶۰۵ء (بابر تا اکبر) کے مشہور علماء بہ ترتیب سنین وفات

۱ - شیخ امان اللہ پانی پتی

علاّمہ عبدالملک بن عبد الغفور الحنفی الشہیر بالشیخ امان‌اللہ پانی پتی نے مولود لاری سے 'فصوص الحکم' پڑھی - وحدۃالوجود کے قائل تھے - مگر عبدالرزاق جھنجھانوی کی طرح ممکنات کو عین واجب نہیں سمجھتے تھے - 'رسالہ غیریہ'، 'رسالہ فی اثبات الاحدیہ'، 'مرآۃ الحقیقۃ' اور 'شرح لوائح جامی' ان کی تصنیفات ہیں - (شیخ امان اللہ کی یہ تصانیف اب ناپید ہیں صرف ایک رسالہ 'فی اثبات الاحدیۃ' کا ایک نسخہ آصفیہ لائبریری میں موجود ہے) رسالے کے نام سے مترشح ہوتا ہے کہ اس کا موضوع توحید باری تعالے کا اثبات ہے اور مصنّف نے احادیثِ نبویؐ کی بنیاد پر متصوفانہ رنگ میں اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے - ۱۵۵۰ء/۹۵۷ھ میں وفات پائی - (نزھۃ الخواطر، ۴ : ۲۱۶) 'اخبار الاخیار'، ۲۳۱ - ۲۳۳ - تذکرہ (اردو ترجمہ) صفحہ ۱۲ - زبید احمد، صفحہ ۲۹۸ -

۲ - ابوالفضل خطیب گازرونی

شیراز میں پیدا ہوئے - علومِ عربیہ کی تکمیل مولانا جلال‌الدین دوّانی وغیرہ اکابر علماء سے کی - سلطان محمود گجراتی کے عہد (۱۴۶۲ء - ۱۵۱۱ء/۸۶۲ھ - ۹۱۷ھ) میں گجرات آئے - شیخ مبارک کے استادِ خصوصی تھے - اس نے انہی کے نام پر اپنے بیٹے کا

نام ابوالفضل رکھا تھا ۔ 'حاشیہ بیضاوی'(مطبوعہ) اور 'حاشیہ شرحِ مواقف' اور 'شرحِ ارشاد' (قلمی) ان کی تصنیفات میں شامل ہیں ۔

شیخ ابوالفضل محمد القرشی الصدیقی الشیرازی الخطیب الشہیر بالکازرونی کی تصانیف ہیں سے تین کتابیں موجود ہیں ، جن میں سے ایک تو 'حاشیہ تفسیر البیضاوی' ہے ۔ بیضاوی کی تفسیر ہر دور اور ہر ملک کے اہلِ علم میں مقبول رہی ہے اور اس پرسینکڑوں علماء نے حواشی لکھے ہیں ، خطیب کازرونی بھی ان اہلِ علم میں شامل ہیں ۔ خطیب نے اپنے حواشی میں بیضاوی کے مشکل مقامات کا حل پیش کیا ہے اور عقلی و نقلی علوم کی بنیاد پر توحید ، عقائد اور عبادات کے مسائل بیان کرنے کے علاوہ لغت ، نحو اور بلاغت کے مسائل سے بھی تعرض کیا ہے ۔ کازرونی کے یہ حواشی حاجی خلیفہ کی نظر سے گزرے تھے ۔ وہ مصنف کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں : 'هی حاشیة لطیفة فی مجلد اورد فیها من الدقائق و الحقائق مالا یحصی'(یہ ایک عمدہ حاشیہ ہے جو ایک جلد میں ہے ، مصنف نے اس میں بڑے باریک حقائق بکثرت جمع کر دیے ہیں) ۔ خطیب کے ان حواشی سے ترکی عالمِ دین حسن آفندی قاضی رشید نے اپنی کتاب 'لوائح الفرح بالطالع السعید المشتملة علی الذکر و المدح و البسملة و التحمید' میں بڑی مدد لی اور علمِ کلام کے مسائل اور معانی القرآن کے اسرار بیان کیے ہیں[1] ۔

خطیب کازرونی کی دوسری کتاب 'حاشیہ شرح المواقف' ہے ، جو قاضی عبدالرحمٰن بن احمد الایجی کی کتاب 'مواقف فی علم الکلام' کی بہترین 'شرح المواقف' للسید الشریف علی بن محمد الجرجانی (۱۴۱۳ء/۸۱۶ھ) پر حواشی ہیں ، حاجی خلیفہ نے اس کتاب کا بھی تذکرہ کیا ہے[2] ۔

شیخ ابوالفضل کازرونی کی تیسری کتاب 'شرح الارشاد فی النحو' ہے ۔ 'الارشاد فی النحو' قاضی شہاب الدین احمد دولت آبادی (۱۴۴۵ء/۸۴۹ھ) کی تصنیف ہے جو ہندی علماء کے ہاں بہت مقبول رہی ہے ۔ کازرونی کے حواشی تمام کتاب کو حاوی نہیں بلکہ صرف اہم چیدہ چیدہ مقامات اور مسائل کو لیا گیا ہے ۔ وہ ہر مسئلہ کا آغاز ''قولہ'' کے ساتھ کرتے ہیں اور اس پر تفصیل سے کلام کرتے ہیں ۔ مثلاً قولہ : الکلمة اسم ان استقلت دَلَالَةً کی وضاحت یوں کرتے ہیں : اَیْ یمکن تصور معناه من غیر ان یکون آلة لملاحظة شیٔ آخر ۔ یہ کتاب بھی حاجی خلیفہ کی نظر سے گزری تھی اور اس نے اس کی تعریف کی ہے[3] ۔ ۱۵۵۵ء/۹۵۹ھ میں فوت ہوئے ۔

---

۱ - کشف الظنون ، ۱ : ۱۶۳ ، آلورٹ ۹۹۸ ۔
۲ - کشف الظنون ، ۲ : ۵۶۳ ۔
۳ - ایضاً ، ۱ : ۲۵۵ ، فہرست کتب خانہ بانکی پور ، نمبر ۲۱۳۲ ۔

۳ - عبدالاول بن العلاء الحسینی

فقیہ اور محدث تھے ۔ ان کے اجداد میں سے کوئی صاحب زید پور (جونپور) سے دکن گئے ، اس لیے شیخ عبدالاول زید پوری کہلاتے ہیں ۔ وہ خود دکن (گجرات) میں پیدا ہوئے اور احمد آباد میں حدیث کا درس دیا ۔ آخر عمر میں احمد آباد سے دہلی آئے اور وہیں فوت ہوئے ۔ 'فیض الباری شرح صحیح بخاری' ، 'منظومہ فی علم المیراث' اور اس کی مبسوط شرح ، 'رسالہ فی تحقیق النفس' ، 'مختصر السیرت النبویۃ' ، ابن عربی کی 'فتوحات مکیہ' کے حواشی، 'مطول' (علم بلاغہ) کے حواشی وغیرہ ان کی تصنیفات ہیں ۔ افسوس کہ شیخ عبدالاول الحسینی کی ان تمام تصانیف کے صرف نام باقی رہ گئے ہیں اور کسی تذکرہ نگار نے ان کے بارے میں تفصیلی یا وضاحتی جملہ نہیں لکھا ۔ بہر حال شیخ مذکور چونکہ ایک مستند محدث اور فقیہ اجل تھے اس لیے ان کی تصانیف کے یہ نام ہی ان کے علم و فضل کا پتہ دیتے ہیں ۔ بحیثیت محدث انہوں نے صحاح ستہ کی اہم ترین کتاب کی شرح لکھی جو 'فیض الباری' کے نام سے مشہور ہے ۔ اس کے علاوہ سیرت نبوی ؐ پر بھی قلم اٹھایا ۔ بحیثیت فقیہہ انہوں نے علم الفرائض اور علم العقائد کے مسائل سے بحث کی اور اس سلسلے میں 'منظومہ فی علم المیراث' مع شرح اور 'رسالہ فی تحقیق النفس' تصنیف کیا ۔ ۱۵۶۰ء/۹۶۸ھ میں وفات پائی ۔ (نزھۃ الخواطر، ۴ : ۱۶۷-۱۶۸ ، اخبار الاخیار ، صفحہ ۲۳۵ ۔ تذکرہ ، صفحہ ۲۷۰) ۔

۴ - علاء الدین لاری

علاء الدین لاری آگرہ میں خان زمان کے پاس پہنچے اور درس علوم میں مشغول ہوئے ۔ پھوش سے ایک مدرسہ بنایا جس کی تاریخ 'مدرسہ' خس ہے ۔ ۱۵۶۱ء/۹۶۹ھ میں حج کو گئے اور وہیں انتقال کیا ۔ 'عقائد نسفی' پر حاشیہ لکھا ہے ۔ شیخ علاء الدین لاری کی تصنیف 'حاشیہ علی عقائد النسفی' ناپید ہے ۔ یہ علم العقائد کی مقبول ترین کتاب پر حاشیہ ہے جو شیخ نجم الدین ابو حفص عمر بن محمد النسفی متوفی ۱۱۴۲ء/۵۳۷ھ کی تصنیف ہے ۔ (بدایونی ۱۵۷۷ء/۹۸۵ھ و تذکرہ صفحہ ۳۴۰) ۔

۵ - محمد غوث گوالیاری

متوفی ۱۵۶۲ء/۹۷۰ھ کے حالات فرقہ شطاریہ کے ضمن میں گزر چکے ہیں ۔ شیخ محمد بن خطیر المعروف محمد غوث گوالیاری کی متعدد تصانیف میں سے 'الجواہرالخمسۃ' بڑی معرکے کی تصنیف ہے ، جس کے عربی اور فارسی میں متعدد نسخے مختلف لائبریریوں میں

موجود ہیں ۔ شیخ نے اس نادر کتاب میں تصوف کے پانچ اہم مسائل پر کلام کیا ہے اور ہر مسئلے کو ایک جوہر کا نام دیا ہے ۔ مثلاً الجوہر الاول فی عبادۃ العابدین وطریقہا ، الجوہر الثانی فی زھد الزاہدین و طریقہ ، الجوہر الثالث فی دعوۃ الداعین وطریقہا ، الجوہر الخامس فی ورثۃ الحق وعمل المحققین و طریقہ (یعنی جوہر اول میں عبادت گذاروں کی عبادت اور اس کا طریقہ ، جوہر دوم میں زاہدوں کے زہد اور اس کا طریقہ ، جوہر سوم میں دعوت دینے والوں کی دعوت اور اس کا طریقہ، جوہر چہارم میں شطاری صوفیوں کے ذکر خدا کے طریقوں اور جوہر پنجم میں حق کی وراثت اور محققین اہل تصوف کے طریقۂ عمل کا بیان ہے[1] ۔

۶۔ شیخ عبدالعزیز دہلوی

عبدالعزیز بن حسن بن طاہر دہلوی جیسا کہ پہلے گذرچکا ، سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ گذرے ہیں ۔ لقب بحر مواج تھا اور اپنے آپ کو ذرۂ ناچیز لکھتے تھے ۔ ۱۵۶۷ء/۹۷۵ھ میں انتقال ہوا ۔ شیخ عبدالعزیز مذکور کی تمام تصانیف ناپید ہیں جن میں سے ایک 'رسالہ عینیہ' ہے جو شیخ امان پانی پتی کے 'رسالہ غیریہ' کا جواب ہے ۔ اس کے علاوہ شیخ وجیہ‌الدین علوی کی 'الحقیقۃ المحمدیہ'[۶] کی شرح ہے ، جس کا موضوع دینی عقائد اور اہل علم الکلام اور اہل تصوف کے درمیان تطابق کی کوشش ہے ۔ (نزھۃالخواطر ۴ : ۱۸۳-۱۸۴ ، تذکرہ صفحہ ۱۰۳ ۔ رود کوثر، صفحہ ۷۰ ۔ بدایونی اردو ترجمہ ، ۵۶۷ - ۵۶۸) ۔

۷۔ علاءالدین علی بن حسام الدین متقی برہانپوری محدث کبیر

اس دور کے علماء کے واسطۃ العقد تھے ۔ برہانپور میں ۱۴۸۰ء/۸۸۵ھ میں پیدا ہوئے ۔ گھر پر شریعت و طریقت میں تربیت پانے کے بعد ملتان پہنچے اور شیخ حسام‌الدین متقی ملتانی سے 'تفسیر بیضاوی' اور 'عین العلم' پڑھی ۔ وہاں سے حجاز گئے ۔ ابوالحسن بکری اور ابن حجر مکی سے علوم حدیث کی تکمیل کی اور بقیہ زندگی حجاز ہی میں گزاری ۔ اس دوران میں دو دفعہ ہندوستان بھی آئے اور سلطان محمود صغیر گجراتی نے ان کی بڑی قدر کی ۔ وہ حجاز میں زائرین اور محتاجین کی امداد کرتے تھے ۔ جس کا بہت سا حصہ گجرات کے شاہی خانہ سے وصول ہوتا تھا ۔ علامہ فاکہی نے ان کے مناقب میں ایک 'رسالہ القول النقی فی مناقب المتقی' لکھا ہے ۔ ان کی مشہور تصنیف 'کنزالعمال' ہے ۔ جس کی تفصیل انہوں نے خود یہ دی ہے کہ امام سیوطی نے احادیث کا سب سے بڑا مجموعہ

---

۱ ۔ کشف الظنون ، ۱ : ۶۰۹ ، انڈیا آفس لائبریری نمبر ۱۶۷۱ ، ۲۶۷۲ ، آلورٹ ۳۰۳۱ ، سٹیوارٹ (Stewart) نمبر ۳۸ ۔

'جمع الجوامع' (مشہور بہ 'جامع کبیر') تیار کیا تھا - پھر خود ہی اس کی قولی حدیثوں کا انتخاب ایک دوسری تالیف 'جامع صغیر' اور اس کے تکملہ (زوائد الجامع الصغیر) کو ترتیب دے کر اس کا نام 'منہج العمال فی سنن الاقوال' رکھا - پھر 'جمع الجوامع' کی بقیہ قولی حدیثوں کو 'الاکمال' کے نام سے مبّوب کیا - پھر ان دونوں کتابوں کو جمع کرکے نئی تالیف کا نام 'غایۃ العمال فی سنن الاقوال' رکھا - پھر 'جمع الجوامع' کی فعلی حدیثوں کو مبّوب کیا اور اس کا نام 'مستدرک الاقوال بسنن الافعال' رکھا - پھر 'غایۃ العمال اور مستدرک الاقوال' کو جمع کر کے اس کا نام 'کنزالعمال فی سنن الاقوال والافعال' رکھا - کنز العمال حیدر آباد سے آٹھ ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے - اور 'منتخب' مصر میں مسند احمد کے حاشیہ پر -

امام علاءالدین علی المتقی الہندی کی کتاب 'کنز العمال فی سنن الاقوال و الافعال' در حقیقت احادیث نبویہ کا دائرۂ معارف (انسائکلیو پیڈیا) ہے - جلال الدین سیوطی نے احادیث نبوی کے جو ذخائر مختلف مجموعات کی شکل میں مرتّب کیے تھے انہیں علی متقی نے یک جا کر کے اس خوش اسلوبی سے مرتّب کر دیا کہ ان سے استفادہ بہت آسان ہو گیا ، تمام احادیث کو حروف تہجی کی ترتیب سے مختلف فقہی ابواب کے تحت مرتّب کیا ہے -'کنز العمال' کے متعلق شیخ ابوالحسن البکری کہا کرتے تھے کہ سیوطی نے اگر حدیث کے مجموعات مرتّب کر کے دنیا پر احسان کیا ہے تو علی متقی نے ان مجموعات کو یکجا کر کے حروف تہجی کے مطابق فقہی ابواب کے تحت انہیں ترتیب دے کر خود سیوطی پر بڑا احسان کیا ہے[1] -

علی متقی نے ترتیب و تبویب میں جس امانت علمی کا مظاہرہ کیا ہے وہ صرف اہل تقویٰ و کمال ہی کی شان ہے - کسی قسم کی کمی یا اضافہ تو کجا انہوں نے تو سیوطی کے ان تمام مجموعات کے خطبے اور دیباچے بھی جوں کے توں شروع میں نقل کر دیے ہیں ، وہ اپنی 'کنزالعمال' کی افادیت ، جامعیت اور اپنی دیانت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں : فمن ظفر ہذا التالیف فقد ظفر بجمع الجوامع مبوباً مع احادیث کثیرۃ لیست فی جمع الجوامع لان المؤلف رحمۃاللہ زاد فی الجامع الصغیر وذیلہ احادیث لم تکن فی جمع الجوامع وھا انا اذکر دیباجۃ المولف رحمہ‌اللہ‌تعالی‌من الجامع الصغیروذیلہ‌وعن الجامع الکبیر حتی لاأکون تارکا ولا مغیراً الفاظہ ان شاء اللہ تعالیٰ (پس جسے یہ کتاب میسّر آ گئی تو گویا اسے ترتیب ابواب سمیت 'جمع‌الجوامع' بھی میسّر آ گئی اور اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث بھی میسّر آجائیں گی جو 'جمع الجوامع' میں نہیں، کیونکہ مصنف

۱- کنز العمال ۱ : ۱ -

رحمۃ اللہ نے 'جامع صغیر' اور اس کے ضمیمے میں کچھ ایسی احادیث کا اضافہ کیا ہے جو 'جمع الجوامع' میں موجود نہ تھیں ، اب میں وہ دیباچے بھی پیش کرتا ہوں جو مصنف نے 'جامع صغیر' ، اس کے ضمیمے اور جامع کبیر یعنی 'جمع الجوامع' کے شروع میں لکھے تھے تاکہ میں نہ تو کسی چیز کے ترک کرنے کا مرتکب ٹھہروں اور نہ مصنف کے الفاظ میں سے کسی چیز کے تبدیل کرنے کا ۔ ان شاء اللہ ۔)[۲] ان کتابوں کے علاوہ شیخ کے اور بھی بہت سے چھوٹے بڑے رسالے ہیں ۔ جن کی تعداد سو تک پہنچتی ہے ۔ ان میں سے 'البرھان فی علامات المھدی' آخرالزمان (مہدیوں کی تردید) 'شئون المنزلات'(تفسیر) 'الفصول شرح جامع الاصول اور شمائلِ نبوی' (حدیث) اور مندرجہ ذیل تصوف کی کتابوں کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں کی زینت ہیں : 'البرھان الجلی فی معرفة الولی' ۔ 'العنوان فی سلوک النسوان' ۔ 'المواھب العلیة فی الجمع بین الحکم القرآنیة و الحدیثیة' ۔ 'جوامع الکلم فی المواعظ والحکم' ، 'تبویب الحکم العطائیة' ۔ 'زاد الطالبین' ۔ 'اسرار العارفین' ۔ 'نعم میعار القیاس لمعرفة مراتب الناس' ، 'فتح الجواد' ۔ 'نظم الدور' ۔ 'الوسیلة الفاخرة فی سلطة الدنیا والاخرة' ۔ 'غایة الکمال' ۔ 'ھدایة ربی عند فقد المربی' ۔ 'خلاصة الحقائق فی الحکم الدقائق' ۔ 'عمدة الوسائل' ۔ ۱۵۶۷ء/۹۷۵ھ میں وفات پائی ۔ (نزھة الخواطر ۴ : ۲۷۲ ، بروکلمن تاریخ ۲ : ۳۸۴-۳۸۵ ، و ذیل ۲ : ۵۱۸-۵۱۹ ۔ تذکرہ صفحہ ۲۴۸ ۔ رود کوثر ۳۴۳-۳۴۴ ۔ زبید احمد بحسب الفہرس) ۔

مولانا مصلح الدین لاری

علومِ عربیہ اور حکمیہ کے ماہر حنفی عالم تھے ۔ مرزا شاہ حسین سلطانِ سندھ نے بھی ان سے استفادہ کیا تھا ۔ ہمایوں کے زیرِ سرپرستی بھی رہے تھے ۔ ۱۵۵۲ء/۹۶۰ھ میں حجاز کی طرف ہجرت کی اور قسطنطنیہ پہنچ کر علماء سے مناظرے کیے ۔ سب پر غالب آئے ، مگر مفتی ابوالسعود کے سامنے ان کی نہ چل سکی ۔ پھر وہاں سے آمد (دیار بکر) آئے اور بڑی قدر و منزلت سے رہے ۔ ۱۵۶۳ء/۹۷۱ھ میں وفات پائی ۔

ان کی تصانیف میں تین کتابیں ممتاز ہیں 'حواشی بیضاوی' حدیث میں 'شرح شمائل ترمذی' اور 'شرح اربعین نووی' ۔ مولانا محمد مصلح الدین لاری کی یہ شرح 'الاربعین النوویة' کی بہترین شروح میں سے ایک ہے ۔ یہ کتاب انہوں نے ترکیہ میں اپنے قیام کے دوران لکھی تھی ۔ چہل حدیث کے موضوع سے ترک اہلِ علم کو بڑا گہرا شغف رہا ہے اور اس پر جتنا کام ترکوں نے کیا ہے اتنا شاید اور کسی اسلامی ملک میں شاذ و نادر

ہی ہوا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع کی مقبولیت نے ہی مولانا لاری کو اس کام پر آمادہ کیا تھا۔ چہل حدیث کے موضوع پر چونکہ بہترین کتاب نووی کی ہے اس لیے شرح کے لیے اسی کو منتخب کیا گیا۔ یہ کتاب انہوں نے ایک ترک وزیر اعظم علی پاشا کے لیے تصنیف کی تھی جیسا کہ انہوں اس کی خود بھی صراحت کی ہے۔

مولانا لاری کی یہ شرح مفصّل بھی ہے اور جامع بھی۔کتاب کے ابتدائی اٹھائیس صفحات صرف اربعین نووی کے خطبے اور مقدمے کی شرح پر مشتمل ہیں۔ اسی سے باقی تفاصیل کا اندازہ ممکن ہے۔ اسی طرح اس شرح کی جامعیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ وہ سب سے پہلے الفاظ حدیث کی لغوی تشریح کرتے ہیں اس کے بعد متقدمین و متاخرین علمائے حدیث کے اقوال نقل کرتے ہیں اور ان کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اور سب سے آخر میں اپنی رائے دیتے ہیں۔ صرف چالیس احادیث نبویہ کی یہ شرح پورے سوا دو سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جس کا ایک نادر نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔

وہ حدیث نبوی جو چہل حدیث کے فن کو عام کرنے کی بنیاد بنی (یعنی من حفظ علی أمتی أربعین حدیثاً فی أمر دینها بعثه الله تعالی یوم القیامة فی زمرة الفقهاء ۔ کہ جس نے امور دین کے بارے میں چالیس حدیثیں میری امت کے لیے محفوظ کردیں ، اسے اللہ تعالی قیامت کے دن فقہاء کے زمرے میں اٹھائے گا) ، اسے علماء اصول حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے ، لیکن امام نووی نے اسی ضعیف حدیث پر عمل پیرا ہو کر یہ کتاب تصنیف کی تھی اس لیے وہ اس کے جواز میں علماء کا اجماع نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں : وقد اتفق العلماء علی جواز العمل بالحدیث الضعیف فی فضائل الاعمال (یعنی علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اعمال کے فضائل کے ضمن میں ضعیف حدیث پر بھی عمل جائز ہے) ۔ مولانا لاری اس قول کی تشریح یوں کرتے ہیں: لعل مراد القائل أنه یجوز روایة الحدیث للعمل بمقتضاه و حاصله أنه اذا ثبت فضیلة نوع من العمل بحدیث حسن أو صحیح یجوز العمل فی ذلک الباب أی فی عمل خاص من ذلک النوع بمقتضی الحدیث الضعیف بل یستحب کما ثبت مشروعیة ابلاغ الحدیث بالصحاح فجمع العلماء الاربعین بمقتضی الحدیث الضعیف (یعنی اس سے قائل کی مراد یہ ہے کہ ضعیف حدیث کے مطابق بھی عمل جائز ہے ، اور اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کسی قسم کے عمل کی فضیلت کسی دوسری حسن یا صحیح حدیث سے ثابت ہو جائے تو اس خاص نوع کے اعمال کے سلسلے میں ضعیف حدیث پر بھی عمل جائز بلکہ مستحب ہو گا ۔ مثلاً حدیث کی اشاعت و تبلیغ تو صحاح سے ثابت ہے ۔ اب اسی اشاعت و تبلیغ کی ایک خاص نوع یعنی چہل حدیث کے مجموعے تیار کر کے عام کرنا بھی

جائز ہوگا) - یہی وجہ ہے کہ علماء امت نے اس مذکورہ بالا ضعیف حدیث پر بھی عمل کیا اور چہل حدیث کے مجموعے تیار کیے[1]۔ ان کے علاوہ فقہ شافعی میں 'شرح ارشاد'۔ علم میراث میں 'شرح سراجیہ' - نحو میں 'حاشیہ شرح جامی' - علم بلاغہ میں 'حاشیہ مطول' - عقائد میں 'شرح مواقف' - 'رسالہ اثبات معاد جسمانی' (رسالہ فی القدرة و الارادة) فلسفہ میں 'حواشی شرح ھدایة الحکمة' - 'رسالہ فی بحث الحرکة' - 'رسالہ فی تحقیق المعاد و المبداء' - منطق میں 'شرح تہذیب المنطق' اور 'رسالہ فی بحث تمام المشترک' - ہیئت میں 'شرح تذکرہ' اور کئی اور کتابیں ان کی تصنیف ہیں - نزھة الخواطر ۴ : ۳۵۴ - شذرات الذھب ۸ : ۳۷۰ - زبید احمد صفحہ ۳۴۶ - بروکلمن تاریخ ۲ : ۳۲ و ذیل ۲ : ۶۲ العقد المنظوم پر حاشیہ وفیات ج دوم ص ۲۴۴—۲۷۳) -

۹ - محمد بن احمد میانجی

ابوصالح شیخ محمد بن احمد المیانجی کی التفسیر المحمدی مسمّی بہ 'کاشف الحقائق' کے نسخے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور انڈیا آفس لائبریری میں ہیں - ان کے والد میانجی بن شیخ نصیرالدین یگانۂ روزگار عالم اور صوفی تھے - شیخ محمد نے احمد آباد میں ایک لاکھ کے خرچ سے مسجد بنوائی - جس کی تاریخ بنائے شیخ سے نکلتی ہے - تفسیر محمدی[2] کے علاوہ انہوں نے بیضاوی کا حاشیہ بھی لکھا ہے جو ناپید ہے -

شیخ محمد بن احمد المیانجی الشریحی الکندی تھانیسری گجراتی کی تفسیر قرآن کریم جو 'التفسیر المحمدی'[2] یا 'کاشف الحقائق' و 'قاموس الدقائق' کے نام سے مشہور ہے، ایک منفرد تفسیر ہے - شیخ نے اس تفسیر کا آغاز شعبان ۱۵۷۳ء/۹۸۱ھ میں کیا اور رمضان ۱۵۷۴ء/۹۸۲ھ میں اس کی تکمیل سے فارغ ہوئے - یہ تفسیر دو لحاظ سے ممتاز ہے - ایک تو یہ کہ مفسّر نے ہر آیت کا آگے اور پیچھے والی آیت سے تعلق اور ربط بیان کیا ہے ۔ دوسرے یہ صوفیانہ تفسیر ہے - مصنف نے کتاب کے مقدمہ میں دعویٰ کیا ہے کہ یہ ان کی اچھوتی اور اوّلین کوشش ہے - مسائل تصوّف کی تشریح کے سلسلے میں انہوں نے متقدمین اہل تصوّف مثلاً ابن عطاء ، حسن بصری ، القشیری ، جلال الدین رومی ، شمس تبریزی اور شیخ سعدی وغیرہ کے اقوال سے مدد لی ہے - ضمنی طور پر شیخ نے عقائد ، عبادات اور اعجاز القرآن کے علاوہ لغوی اور نحوی مسائل بھی اٹھائے ہیں اور ان سے بحث کی ہے - ۱۵۷۴ء/۹۸۲ھ میں وفات پائی - (تذکرہ ص ۳۷۴ - زبید احمد ص ۲۳۹ - فہرست ایشیاٹک سوسائٹی ، ص ۴۲) -

۱۰ ۔ محمد طاہر پٹنی

مولانا جمال الدین محمد طاہر بن علی ۱۵۰۷ء/۹۱۳ھ میں نہروالہ (پٹن) گجرات میں پیدا ہوئے ۔ ۱۵۳۷ء/۹۴۴ھ میں حجاز گئے اور وہاں شیخ ابوالحسن البکری شیخ ابن حجر مکی ، شیخ عبیداللہ سرہندی اور شیخ برخوردار سندی سے استفادہ کرکے شیخ علی متقی کی صحبت اختیار کی ۔ پھرگجرات آئے اور درس و افادہ میں مشغول رہے ۔ شہنشاہ اکبر کی سرپرستی اور میرزا عزیز کوکلتاش کی مدد سے رسوم بدعت کی خوب خبر لی ۔ جب وہ معزول ہوئے تو مخالفین ان کو تنگ کرنے لگے ۔ ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے انہوں نے آگرہ کی راہ لی ۔ دوران سفر میں بمقام اجین مہدویوں کے ہاتھوں شہید ہوئے سنہ وفات ۱۵۷۸ء/۹۸۶ھ ہے ۔

مطبوعہ تصنیفات میں ' مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل و لطائف الاخبار ' (لغات حدیث میں) بہت مشہور ہے . شیخ طاہر پٹنی کی یہ اہم اور مفید کتاب مطبوع اور متداول ہے ، غریب الحدیث کے موضوع پر لکھی جانے والی چند قابل اعتماد کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس موضوع پر پٹنی سے پہلے متأخر محدثین (ابن اثیر ، ابن حجر وغیرہ) کے علاوہ ابن قتیبہ الخطابی ، ابوعبید القاسم بن سلام الھروی صاحب 'شرح غریب الحدیث' اور اندلس کے مایۂ ناز محدث قاسم بن ثابت سرقسطی صاحب 'کتاب الدلائل فی شرح غریب الحدیث ' کی اہم اور ممتاز تصانیف موجود تھیں ۔ طاہر پٹنی کا خصوصی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے تبحر علمی اور مہارت لغوی سے کام لینے کے علاوہ متقدمین کی کتب فن غریب الحدیث سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور ایک لفظ یا موضوع کے بارے میں سب کے اقوال اور آراء کو یک جا کر دیا ہے اور اس کی وضاحت اس نے کتاب کے دیباچے میں کر دی ہے . وہ مصنف یا کتاب کا پورا نام ذکر کرنے کے بجائے ان کے مخففات کا ذکر کرتا ہے مثلاً 'نہ' سے مراد ابن الاثیر کی کتاب 'النہایة' ہے اور ' در ' سے مراد سیوطی کی 'الدرالمنثورة' ہے ، وغیرہ ۔

مولانا طاہر پٹنی اپنی اس کتاب کے خصائص اور اسلوب بیان کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں : اعلم أن خواص تراكيب الحديث و لطائفها والوجوه الغريبة فيها ان كانت فى لفظ غريب إذكرها عند حرفها و ان لم تكن فى لفظ غريب أذكرها عند غريب فيه فان الطالب حين يرجع الى الغريب يجدها عنده و ان لم يكن فى الحديث غريب اذكرها عند لفظها ان اختصت بلفظ ، ولا اذكرها عند ما يلائمها من الفاظ الحديث ، و مثل هذا يصعب على الطالب موضعه فلم يبلغه الا من جعل الكتاب نصب عينه ، وعمله واجب على كل طالب فانه يجده بحراً لا ينفد نفائسه فى كل مقام و كنزاً لا ينتهى

ذخائرہ فی کل مرام (اگر حدیث کے خواص ، تراکیب اور ان کی باریکیاں اور نامانوس ہونے کے اسباب کسی نامانوس لفظ کے اندر ہوں گے تو اسے حروفِ تہجی کی ترتیب کے ساتھ اپنی جگہ ذکر کروں گا) ۔

اس کے علاوہ حدیث میں 'تذکرة الموضوعات' اور اسماء الرجال میں 'المغنی' اور 'قانون الموضوعات' بھی چھپ چکی ہیں ۔ قلمی کتابوں میں 'اسماء الرجال' اور 'رسالہ فی لغات المشکاۃ' کا ذکر زبید احمد نے کیا ہے ۔ ان کی شرح شافیہ موسومہ بہ 'کفایة المفرطین' کا ایک بہت عمدہ قلمی نسخہ جو اورنگ زیب کو مرحوم کے پوتے قاضی عبدالوہاب نے پیش کیا تھا ، اسلامیہ کالج پشاور میں ہے ۔ (نزهةالخواطر ، ۴ : ۲۹۸ - ۳۰۱ ، زبید احمد ، صفحہ ۲۵۴ اور اس کے ذکر کردہ مصادر خصوصاً النور السافر،ص ۳۶۱ تذکرہ (اردو) صفحہ ۴۴ بروکلمن تاریخ ۲ : ۴۱۶ - ذیل ۲ : ۶۰۱ وحاشیة الفوائد البهیة ، ص ۴۴ اور رسالہ المعارف لاہور جنوری ۱۹۶۹ء) ۔

۱۱ - شیخ جلال الدین بن محمد العمری تھانیسری

شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے اجل خلفاء میں سے تھے ۔ آخری عمر میں بہت نڈھال ہو گئے تھے ۔ تکیہ پر لیٹے رہتے ۔ لیکن جونہی اذان سنتے فوراً اٹھ کھڑے ہوتے تھے ۔ ان کی تصنیفات میں سے ایک 'ارشاد اللطائف' (سلوک میں) اور دوسری 'تحقیق اراضی الهند' (فقہ میں) مشہور ہیں ۔ مؤخرالذکر چھپ چکی ہے اور چونکہ ہندوستان کی اراضی سے تعلق رکھتی ہے اس لیے مقبول ہے ۔

'تحقیق اراضی الهند' ایک نادر اور بہت ہی اہم رسالہ ہے ، اس رسالے میں مصنف نے حنفی اور شافعی فقہ کی رو سے زمین پر مالیہ یا عشرو جزیہ وغیرہ کے احکام بیان کیے ہیں ۔ کتاب کا خاص موضوع سرزمینِ ہند کی اراضی اور ان کے بارے میں فقہی احکام ہیں ۔ شیخ جلال الدین تھانیسری نے عام علماء کے اس قول کی تردید کی ہے کہ اگر ہند کی اراضی میں سے ایک قطعہ زمین امامِ وقت کی طرف سے کسی غیر مستحق مسلمان کو عطا کر دیا جائے تو نہ تو یہ زمین اس کی جائز ملکیت ہوگی اور نہ اسے یہ زمین آگے فروخت کرنے کا حق ہوگا ۔ وجہ یہ ہے کہ مصنف کے زمانے سے چار صدی قبل ہندوستان کو مسلم فاتحین نے بزورِ شمشیر فتح کیا تو یہاں کی زمینیں بھی ان کے قبضے میں آئیں ۔ اس لیے برِّ صغیر کی تمام اراضی مسلم ریاست کی ملکیت ہیں اور اگر کوئی غیر مسلم اپنے آباو اجداد کی زمین پر ابھی تک قابض ہے تو یہ قبضہ ناجائز ہے اور زمین اسلامی ریاست کی ملکیت ہے ۔ اسی بنیاد پر وہ کہتے ہیں کہ اگر اسلامی ہند کا امامِ وقت کسی مسلمان کو کوئی قطعہ زمین بخشتا ہے تو اسے پورا پورا حق حاصل ہے اور یہ زمین اس مسلمان

کی جائز ملکیت ہو گی ۔ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے ۔ پہلے باب میں دارالاسلام کے احکام کا بیان ہے اور تیسرا باب اراضی کی عام تقسیم اور احکام سے متعلق ہے ۔ انڈیا آفس لائبریری کے فہرست ساز نے یہ کتاب 'احکام الاراضی' کے نام سے درج کرتے ہوئے اسے شیخ محمد اعلیٰ تھانوی سے منسوب کیا ہے ، جو غلط ہے کیونکہ کتاب کی داخلی شہادت اس بیان کی تردید کرتی ہے اور وہ یہ کہ مصنف اپنی کتاب میں جب کہتا ہے کہ ہند میں اسلامی حکمرانی کو قائم ہوئے چار صدیاں بیت چکی ہیں تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے مصنف کا تعلق دسویں صدی ہجری یعنی سولہویں صدی عیسوی سے ہونا چاہیے نہ کہ گیارھویں صدی سے یا اس کے بعد کے زمانے سے ، اور شیخ محمد اعلیٰ تھانوی تو بعد کی شخصیت ہے ، مزید برآں اب تو اہلِ علم کے ہاں یہ بات مسلّم ہو چکی ہے کہ یہ شیخ تھانیسری ہی کی تصنیف ہے ۔

۱۵۸۱ء/۹۸۹ھ میں فوت ہوئے ۔ (نزھۃ الخواطر، ۴: ۷۲-۷۳ ، زبید احمد ص ۶۴ جہاں اس رسالہ کے مضمون کی تلخیص دی گئی ہے ۔ ایضاً ص ۲۷۲ ۔ تذکرہ ص ۱۴۶ مزید حوالے تذکرہ کے حاشیہ پر ہیں) ۔

۱۲ ۔ مولانا عبداللہ سلطان پوری

مخدوم الملک اپنے دور کے جلیل القدر فقہاء میں سے تھے ۔ ان کے دادا سندھ سے سلطان پور علاقہ جالندھر میں آئے تھے۔ مولانا عبداللہ سرہندی اور ابراہیم بن معین ایرجی سے علوم حاصل کیے اور پھر اپنے قصبہ میں تصنیف و تدریس اور وعظ میں مشغول ہوئے۔ قبولیّتِ عامہ کی بناء پر ہمایوں نے اسے شیخ الاسلام کا عہدہ دیا ۔ اس کے بعد شیر شاہ سوری اور سلیم شاہ کے زمانے میں بھی اس منصب پر فائز رہے ۔

دورِ اکبری میں بھی پچیس برس تک انہیں یہ منصب حاصل رہا ۔ آخر جب ابوالفضل کو دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور شہنشاہ اکبر نے اجتہاد کا منصب سنبھال لیا تو مخدوم الملک کی منزلت پر زد پڑی، معتوب ہوئے اور حجاز روانہ کیے گئے ۔ اور بقول بدایونی اکبر کی بےراہ روی کے لیے پاؤں کی بیڑیاں کٹ گئیں ۔ ۱۵۸۲ء/۹۹۰ھ میں حجاز سے واپس ہو کر احمد آباد گجرات آئے اور وہاں اسی سال ۱۵۸۲ء/۹۹۰ھ میں فوت ہوئے ۔ تصنیفات میں 'کشف الغمہ منہاج الدین' 'عصمۃ الانبیاء' ۔ 'شرح عقیدۃ الحافظیہ' (ہر چہار علم کلام میں) 'رسالہ فی الصباح' (فقہ میں) 'رسالہ فی تفضیل العمل علی العلم' (فلسفہ) اور شرح 'شرحِ جامی' (نحو میں) کے نام ملتے ہیں ۔ منہاج الدین کے کچھ اقتباسات ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم نے ('معارج الولایہ' کے قلمی نسخے سے) اورینٹل کالج میگزین کے ضمیمے میں شائع کیے ہیں ۔

مخدوم الملک سلطان پوری کے 'رسالہ عصمۃ الانبیاء' (جسے خود وہ 'کتاب عصمۃ الانبیاء' کا نام دیتے ہیں) کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ یہ نسخہ باریک خوشخط ہے اور فارسی خط میں لکھا گیا ہے۔ انیس صفحات پر مشتمل ہے، ہر صفحے پر انیس سطور اور ہر سطر میں اوسطاً ۱۵ الفاظ ہیں۔ خط صاف ہونے کے باوجود بھی اغلاط سے محفوظ نہیں۔

'عصمۃ الانبیاء' کے اسلوبِ نگارش سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخدوم الملک کو بھی عربی زبان میں اظہارِ خیال پر اچھی خاصی قدرت حاصل تھی البتہ عبارت کا تصنّع و تکلّف بہت کوفت کا باعث ہے۔ در اصل یہ دور مجموعی طور پر مسجّع و مقفیٰ عبارات کا تھا اور اس دور میں عالمِ اسلام کا کوئی صاحبِ قلم بھی اس بیماری سے نہیں بچ سکا۔ کتاب ایک مقدمے اور تین فصول پر مشتمل[1] ہے۔ مصنف نے اس سلسلے میں متقدمین مفسّرین کے علاوہ علم الکلام اور علم العقائد کی متداول کتابوں (جیسے 'شرح المواقف' 'شرح[2] الطوالع' وغیرہ) کا سہارا لیا ہے اور عصمت کے لفظی معنی بیان کرنے کے بعد 'عصمۃ الانبیاء' کے سلسلے میں مختلف فرقوں کے عقائد اور اہلِ علم کی آراء سے بحث کی ہے۔ 'عصمت انبیاء' کے سلسلے میں اجماعِ امت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اتفق أهل العلم انهم أی الانبیاء معصومون قبل البعثة و بعدها عن الکفرالحقیقی الاختیاری (و الاضطراری)، وفی شرح المواقف: اجتمعت الامة علی عصمتهم عنه ای الکفر قبل النبوة و بعدها ولا خلاف لاحد منهم فی ذلك غیرأن .... الخ (یعنی اہلِ علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انبیاء کرام بعثت سے پہلے اور بعد کفر سے پاک و محفوظ ہیں۔ خواہ یہ کفر اختیاری ہو یا اضطراری، شرح مواقف یہی ہے کہ انبیاء کے معصوم عن الکفر ہونے پر امت کا اجماع ہے، خواہ نبوت سے قبل ہو یا بعد، اس میں بعض باطل فرقوں کے سوا امت کے کسی اہلِ علم کو اختلاف[3] نہیں)۔

نزهۃالخواطر ۴: ۲۰۶-۲۰۸ - زبید احمد بحسب الفهرس تذکرہ ص ۲۶۵ - بدایونی صفحہ ۳۷۹ - ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین بابت اگست و نومبر ۱۹۶۲ء)۔

۱۳ - قطب الدین محمد بن علاءالدین احمد حنفی نہر والی لاہوری

۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء میں بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ ابتدائی علوم اپنے والد سے حاصل کیے۔ بعد میں مکہ اور مصر گئے اور وہاں کے علماء سے علم اخذ کیا۔ ان کی سندِ حدیث

۱ - عصمۃ الانبیاء، ورق ۳ الف۔
۲ - ایضاً، ورق ۴ الف۔
۳ - ایضاً، ورق ۶ الف۔

ابوالفتوح نورالدین احمد بن عبداللہ الطاؤسی کے واسطہ سے بہت عالی تھی، جو اہلِ حرمین کو بھی علمائے ہند جیسے شیخ عبداللہ بن سعد لاہوری وغیرہ کے ذریعہ سے حاصل ہوئی تھی۔
بقول مشہور ۱۵۸۲ء / ۹۹۰ھ میں وفات پائی ۔ مگر ظہور احمد اظہر صاحب نے 'المعارف' میں ۱۵۸۸ء / ۹۹۷ھ تاریخِ وفات بتائی ہے ۔

'الاعلام باعلام بیت‌اللہ الحرام' مفتی قطب‌الدین محمد لاہوری ثم مکی حنفی کی تمام تصانیف میں ممتاز اوراہم مقام رکھتی ہے اورمکہ مکرمہ اورخانہ کعبہ کی جامع اور مستند تاریخ متصور ہوتی ہے۔ حرم شریف کی تاریخ کے علاوہ مفتی صاحب نے اس کتاب میں دیگر معلومات کا ذخیرہ بھی جمع کر دیا ہے ۔ مثلاً وہ ضمنی طور پر مصر ، شام ، ترکی اور دیگر بلادِ اسلامیہ میں اپنے اسفار اور واقعاتِ سیاحت کو بھی قلمبند کرتے ہیں ۔ مصر کے قیام کے دوران انہیں مصر کے عباسی خلیفہ متوکل ثالث سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا اور مفتی صاحب نے خلیفہ سے علوم کی سند بھی حاصل کی تھی ، چنانچہ وہ خلیفہ مذکور کو اپنے شیوخ اور اساتذہ میں شمار کرتے تھے[۱] ۔ اسی طرح جب وہ بیت اللہ کی تعمیر میں حصہ لینے والے شاہی خاندانوں کا نام لیتے ہیں تو خاندان کی مکمل تاریخ کا ایک مختصر مگر جامع خاکہ بھی پیش کرتے ہیں ۔ پھر مفتی صاحب کا زمانہ ترک سلطان مراد خان عثمانی کا زمانہ ہے جو مفتی صاحب سے بہت ادب و احترام سے پیش آتا تھا اور ان کی بڑی قدر و منزلت اور مالی معاونت بھی کرتا تھا ۔ اس دور میں عثمانی ترک جہاں بلادِ اسلامیہ کے وارث ٹھہرے وہاں عیسائی یورپ کو پیچھے دھکیلتے ہوئے انہوں نے شاندار فتوحات کا بھی آغاز کیا ۔ مفتی صاحب نے ان تمام واقعات اور فتوحات کا مفصل ذکر کیا ہے ۔ اس کے علاوہ سلاطینِ گجرات کی خدمات حرمین کا بھی ذکر کیا اور اپنے دور کی علمی شخصیات اور ادباء و شعراء کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کے کلام کے نمونے بھی دیئے ہیں ۔ اس لحاظ سے 'الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام' معلومات و معارف کا ایک خزینہ ہے۔

مفتی قطب‌الدین سے پہلے مکہ مکرمہ کی تعمیر، تاریخ اورفضائل کےموضوع پر متقدمین علماء نے بھی بہت کچھ لکھا تھا ، جیسے امام ابوالولید محمد بن عبداللہ الازرقی صاحب کتاب 'اخبار مکۃ شرفہا اللہ تعالی و ماجاء فیہا من الآثار ، امام ابو عبد اللہ محمد بن اسحاق الفاکہی المکی مصنف کتاب المنتقیٰ فی اخبار ام القری، قاضی تقی الدین محمد بن احمد الفاسی صاحب کتاب شفاء الغرام باخبار البلد الحرام اور شیخ نجم الدین عمر بن محمد ابن فہد المکی مصنف اتحاف الوری باخبار ام القری وغیرہ ، مؤخر الذکر کے سوا باقی سب کتابیں مطبوع اورمتداول ہیں ۔ مفتی صاحب نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں اعتراف کیا ہے کہ

---

۱ ۔ الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام ، ص ۱۸۴ ببعد۔

انہوں نے ان سب سے استفادہ کیا بلکہ ان کی باقاعدہ اساتذہ سے سند حاصل[1] کی ۔

مفتی صاحب کی یہ کتاب ایک مقدمے ، دس ابواب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے ۔ مقدمے میں انہوں نے اپنی کتاب کے مآخذ اور مواد کا ذکر کیا ہے ، باب اول میں مکۃ مکرمہ کے محل وقوع اور دیگر احکام کا ذکر ہے ۔ دوسرا باب تعمیر کعبہ کے بارے میں ہے ۔ تیسرے باب میں اس کیفیت کا ذکر ہے جو بیت الحرام پر دور جاہلیت اور عصر اسلام میں طاری رہی ۔ چوتھا باب عباسی عہد میں کعبہ کی مرمت وغیرہ کے واقعات کے لیے مختص ہے ۔ پانچویں باب میں ان اضافات کا ذکر ہے جو عباسی خلیفہ کی توسیع و تغیّر کے بعد عمل میں آئے ۔ چھٹے باب میں مصری ممالیک کی خدمات حرمین کا بیان ہے ۔ ساتویں باب میں ظہور آل عثمان کا ذکر ہے ۔ آٹھواں باب سلطان سلیمان، نواں باب سلطان سلیم خان ثانی اور دسواں باب نوجوان سلطان مراد خان کے عہد کے واقعات کے لیے مختص ہے ۔ خاتمہ میں مفتی صاحب نے مکۃ مکرمہ کے ان مقامات مقدسہ کا ذکر کیا ہے جو عبادات اور دعاؤں کے لیے مختص ہیں[2] ۔

مفتی صاحب نے یہ کتاب سلطان مراد کے عہد میں مکمل اور اسی کے نام سے معنون کی ۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

"جمعت فی هذه الاوراق من اخبار ذلك عارق وراق ، تسیر به الرکبان الی سائر الآفاق وتنیر فی صفحات الدهر کالشمس فی الاشراق ، و تحفظ فی خزائن الملوك السلاطین کانفس الاعلاق فکان کتاباً حسناً فی بابه ممتعاً لمن تعلق بأسبابه أنیساً تجمل مؤانسته ، وجلیساً لا تمل مجالسته جمع بین لطائف تاریخیة و أحکام شرعیة و مواعظ نافعة و فوائد بارعة ، سمّیته کتاب الاعلام باعلام بیت الله الحرام ، و خدمت به خزائن کتب هذا السلطان الأعظم ، الشاب الاعدل الأکرم المطیع لأمر الله وأمر خیر الأنبیاء صلی الله علیه وسلم"[3] ۔

(میں نے ان اوراق میں وہ تاریخی واقعات جمع کر دیے ہیں جو دلچسپ اور مناسب تھے ، جو تمام گوشوں میں شہرت پائیں گے اور روشن سورج کی مانند زمانے کے صفحات پر فروزاں رہیں گے اور قیمتی اشیاء کی طرح بادشاہوں اور سلاطین کے خزانوں میں محفوظ ہوں گے ۔ یہ ایک اپنے موضوع کی اچھی کتاب بن گئی ہے جو بھی اس سے تعلق پیدا کرے فائدہ اٹھائے گا ۔ یہ ایک ایسی

---

۱ ۔ مقدمۃ الاعلام ۔

۲ ۔ مقدمۃ الاعلام ، ص ۹ ۔

۳ ۔ ایضاً ، ص ۷ ۔

غمگسار ہوگی جس کی صحبت اچھی لگے گی اور ایک ایسی ہم نشین ہوگی جس کی صحبت سے کوئی اکتائے گا نہیں ۔ یہ کتاب تاریخی لطائف ، شرعی احکام ، مفید مواعظ اور عمدہ فوائد پر مشتمل ہے ، میں نے اسے 'الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام' کا نام دیا ہے اور اس کے ذریعہ اسی سلطان اعظم ، اعدل و اکرم نوجوان ، اللہ اور خیر الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطیع یعنی سلطان مراد خان کے خزانے کی خدمت کی ہے) ۔

اس کتاب کے اب تک تین ایڈیشن چھپ چکے ہیں ۔ اس کے علاوہ البرق الیانی تاریخ یمن ۔ 'منتخب التاریخ' (تاریخ) ۔ 'تمثال الامثال السائرۃ' (نادر اشعار کا انتخاب) 'الکنز الاسمی فی فن المعمی' 'تحفۃالاصحاب'(ادب) ۔ 'الھدایۃ الرحانیۃ' الی طریقۃ السادۃ الخرقانیہ' (تصوف) ۔ 'الفوائد السنیہ' (سفر نامہ) کے نام بروکلمن نے تاریخ ۲ : ۳۸۲ اور ذیل ۲ : ۵۱۵ پر دیے ہیں ۔ (نزھۃ ۴ : ۲۸۵ - ۲۹۰ ، 'شذرات الذھب' ۸ : ۲۲ ۔ 'النور السافر' صفحہ ۳۸۵ - ۳۲۰ 'البدر الطالع' ۲ : ۵۷ - ۵۸ ۔ 'المعارف' لاہور ۔ جون ۱۹۷۰ء ۔ زبید احمد بحسب الفھرس) ۔

شیخ عبدالنبی ابن احمد بن عبدالقدوس الگنگوھی صدر الصدور

ان کا خاندان کئی پشتوں سے علم کا سرچشمہ چلا آرہا تھا ۔ شیخ عبد النبی نے اپنے علاقے میں علوم کی تحصیل کی ۔ کئی مرتبہ حجاز گئے اور وہاں شیخ الاسلام ابن حجر مکی اور دوسرے آئمۂ حدیث کی صحبت اختیار کی ۔ واپس آئے تو سماع اور وحدۃ الوجود وغیرہ مسائل کی مخالفت کی ۔ ۱۵۶۳ء/۹۷۱ھ میں شہنشاہ اکبر نے انہیں صدر الصدور کا عہدہ دیا ۔ مدتوں ان کا طوطی اکبر کے دربار میں بولتا رہا ۔ پھر ابوالفضل کی ریشہ دوانیوں سے یک دم حالات نے پلٹا کھایا اور مخدوم الملک کے ساتھ شیخ عبدالنبی کو بھی پہلے مناصب سے ہٹایا گیا اور پھر حجاز کے سفر پر بھیجا گیا ۔ ۱۵۸۲ء/۹۹۰ھ میں یہ وہاں سے واپس آئے تو مخدوم الملک کے برعکس سیدھے شاہی دربار میں پہنچے اور حسب سابق مذہبی امور میں اپنے سابقہ موقف کا اعادہ کیا ۔ بالآخر اکبر نے قید میں ڈال کر ابوالفضل کے حوالے کیا جس نے انہیں پھانسی دی ۔ سنہ وفات ۱۵۸۳ء/۹۹۱ھ ہے تصانیف میں 'وظائف النبی' (اوراد کا ایک رسالہ جس کی ایک خود نوشت کاپی علیگڑھ میں ہے) ، 'سنن الھدی' (فقہ الحدیث) 'رسالہ فی حرمۃ السماع' اور رسالہ 'فی ردطعن القفال' شامل ہیں ۔ (نزھۃ الخواطر ۴ : ۲۱۹ - ۲۲۲ ۔ رود کوثر ۹۱ - ۱۱۰ ۔ تذکرہ ۳۲۵ - ۳۲۷) ۔

۱۵ - زین الدین معبری

زین الدین ابن عبد العزیز شافعی معبری ۔ معبر (مالا بار) کی طرف منسوب ہے ، جہاں وہ رہتے تھے ۔ ان کے والد قاضی تھے اور ان کے دادا تصوّف کی ایک کتاب 'هدایة الاذکیاء' کے مصنف تھے۔ خود زین الدین بیجا پور کے علی عادل شاہ کے دربار سے وابستہ تھے ۔ ان کی وفات ۱۵۸۳ء/۹۹۱ھ کے بعد ہوئی ہے ۔ تصنیفات میں 'قرة العین' اور اس کی شرح 'فتح المعین' (فقہ شافعی) ، 'تحفۃ المجاهدین' (مالا بار میں پرتگیزوں کی آمد کی تاریخ ۱۴۹۸ء/۹۰۴ھ سے ۱۵۷۶ء/۹۸۴ھ تک) شیخ زین بن عبد العزیز بن زین الدین بن علی بن احمد المعبری کی نادر کتاب 'تاریخ مسمی تحفة المجاهدین فی بعض اخبار البرتکالیین' (جس کی تالیف سے وہ ۱۵۸۵ء/۹۹۳ھ میں فارغ ہوئے تھے) ہے، پہلی بار ۱۹۳۱ءمیں حیدر آباد دکن سے حکیم سید شمس اللہ قادری نے اسے شائع کیا اور یہ سلطان علی عادل شاہ والیٔ بیجاپور کے نام سے معنون کی گئی (جو ۱۵۵۷ء/۹۶۵ھ سے ۱۵۸۴ء/۹۹۴ھ تک حکمران رہا) ۔ یہ زمانہ جلال الدین اکبر شاہ (۱۵۵۶ء/۹۶۴ھ تا ۱۶۰۵ء/۱۰۱۴ھ) کا ہے ۔ کتاب کو مصنف نے چار ابواب میں تقسیم کیا ہے ۔ پہلا باب جہاد کے احکام ، ثواب اور اس کی تبلیغ پر مبنی ہے ، دوسرے باب میں ملیبار میں اسلام کے داخلے کے بارے میں تفاصیل دی گئی ہیں ۔ تیسرے باب میں ملیبار کے ہندوؤں کی عجیب وغریب عادات و رسوم کا ذکر ہے اور چوتھا باب جو کتاب کا اصل موضوع اور جان ہے،کتاب کے تقریباً ایک تہائی حصہ پر مشتمل ہے ، ملیبار میں پرتگالیوں کے داخلے اور داستانِ مظالم سے بحث کرتا ہے ۔ مصنف نے اس باب کو چودہ فصول میں تقسیم کر دیا ہے ۔

المعبری اپنی کتاب کے دیباچے میں مسلمانوں کی غفلت و بے عملی کے باعث ملیبار میں پرتگالیوں کی آمد اور قتل و غارتگری کا ذکر کرنے کے بعد اپنے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے لکھتا ہے :

> "اسروا منهم من لا یحصی کثرة و قتلوا منهم کثیرین و ردوا جملة منهم الی النصرانیة و استرقوا المسلمات المأسورات حتی خرج لهم منهم اولاد نصاری یقاتلون المسلمین ویؤذونهم ، فأردت ان أذکر تلك الواقعات و اسطر هذه الحادثات، وضعت کتابا و سمیته تحفة المجاهدین فی بعض أخبار البرتکالیین، ذکرت فیها بعض ما مضی من مساویهم و ظهور دین الاسلام فی دیار ملیبار و نبذة یسیرة من أحکام الجهاد و عظیم ثوابه و التحریض علیه بنص التنزیل و الآثار و شیئاً مما اختص به کفرتها من غرائب الاخبار" ۔

(یعنی ان پرتگالیوں نے لا تعداد مسلمانوں کو قید کیا ، بہت سوں کو قتل کیا اور کچھ کو عیسائی بنایا ، مسلمان قیدی عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا ۔ حتٰی کہ ان سے نصرانی بچے پیدا ہوئے جو مسلمانوں سے لڑنے اور انہیں اذیّت دینے لگے ۔ چنانچہ میں نے ان واقعات و حادثات کو ضبطِ تحریر میں لانا چاہا اور کتاب لکھی جس کا نام میں نے 'تحفۃ المجاھدین فی بعض أخبارالبرتکالیین' رکھا اور اس میں ان کے افعالِ بد کا ذکر کیا ۔ اس کے علاوہ دیارِ ملیبار میں ظہورِ اسلام ، جہاد کے احکام ، ثواب اور اس پر ابھارنے کے لیے آیات و احادیث کا ذکر اور اس علاقے کے کفار کے عجیب واقعات کا بھی بیان ہے)[1]۔

دیگر تصنیفات 'متضمن الاحادیث والاثار المتعلقة بالموت و ما بعده' (حدیث) 'ارشاد العباد الی سبیل الرشاد' (تصوف) ہیں ۔ مزید حالات کے لیے دیکھیے : زبید احمد بحسب الفہرس جہاں دوسرے مصادر کے حوالے بھی درج ہیں ۔ ان کے بھائی محمد بن عبدالعزیز نے ایک ساحلی معرکہ کے حالات ایک طویل رجز میں نظم کیے ہیں جس کا نام ہے ، 'الفتح المبین للسامری الذی یحب المسلمین ۔ اس میں جنوبی ہند کے مقامی راجہ زیمورین کے پرتگیزوں کے مقابلے میں فتح یاب ہونے کی داستان بیان کی ہے ۔ نسخہ انڈیا آفس میں ہے ۔

۱۶ ۔ قاضی علامہ نظام الدین حنفی بدخشی ملقب بہ نواب غازی خان

حسن بصری کی اولاد میں سے تھے ۔ خراسان میں پیدا ہوئے اور مولانا محمد سعید اور مولانا عصام الدین اسفرائنی وغیرہ علماء سے علوم حاصل کئے ۔ ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء میں پاک و ہند میں آئے تو اکبر کے ہاں مقرب ہوئے اور بڑے مناصب حاصل کئے ۔ پہلے قاضی خاں اور پھر غازی خاں کا خطاب پایا ۔ شہنشاہ کو سجدہ (تعظیمی) کا پہلے اسی نے رواج دیا ۔ 'شرح عقائد' پر ایک مبسوط حاشیہ اور علمِ کلام میں ایک رسالہ (فی اثبات الکلام و ایمان التحقیق و التصدیق) اور تصوف کے موضوع پر متعدّد رسالے اس کی تصنیفات تھیں ، جو ناپید ہیں ۔ قاضی نظام الدین حنفی بدخشی کو معقولات میں بلند مقام حاصل تھا ۔ اس دور میں الشریف الجرجانی کی 'شرح المواقف' کو اسلامی ہند کی درسگاہوں اور علمی حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ قاضی مذکور نے بھی اپنے عہد کے اہلِ علم کی طرح اس شرح پر حواشی تحریر کیے تھے جو اب ناپید ہیں ۔ علم الکلام پر 'فی اثبات الکلام وایمان التحقیق والتصدیق' کے نام سے ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا جس میں علم الکلام کی اہمیت و ضرورت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی عقائد پر

---

۱ ۔ تحفۃ المجاھدین ، ص ۱۰ ۔

متکلّمین کے انداز میں اپنے خیالات و افکار پیش کیے - اس کے علاوہ اپنے متصوّفانہ میلانات کے اظہار اور قلبی تسکین کے لیے ادعیہ ماثورہ پر مبنی اوراد و وظائف پر مختلف رسائل بھی تحریر کیے جو اب بظاہر نایاب ہیں[1] - ۱۵۸۵ء/۹۹۳ھ میں فوت ہوئے (نزهة الخواطر ۴ : ۳۸۱ - زبید احمد ۳۲۳ تذکرہ ص ۵۲۷ - بدایونی ص ۴۴۳ - ۴۴۵- موخر الذکر کتابوں میں سنہ وفات ۱۵۸۴ء/۹۹۲ھ درج ہے) -

۱۷ - مولانا رحمت اللہ سندھی

مولانا رحمت اللہ بن عبداللہ سندھی دریلہ سندھ میں پیدا ہوئے تھے - وہاں سے اپنے باپ کے ساتھ گجرات اور پھر حجاز چلے گئے۔ مدینہ منورہ میں شیخ علی بن محمد بن غریق مصنف 'تنزیة الشیعة' سے حدیث کی سند لی - مدتوں درس و افادہ میں مصروف رہے ہمیشہ زہد و عفاف کی زندگی بسر کی - ان کی تصنیفات میں مناسک حج پر کئی رسالے ہیں - ملا علی القاری نے ان کی 'منسک اوسط' کی شرح 'مسلک متقسط' کے نام سے اور 'منسک صغیر' کی 'شرح هدایة السالك' کے نام سے کی ہے - ایک اور تالیف 'تنزیه الشریعة' کی تلخیص ہے - (احادیث موضوعہ سے متعلق) - شیخ رحمة اللہ سندھی کی تصنیف 'مجمع المناسک و نفع الناسک' کے متعدد قلمی نسخے دنیا کے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں - اس کتاب میں انہوں نے اختصار اور جامعیت کے ساتھ فقہ حنفی کی رو سے فریضہ حج کے احکام اور مسائل بیان کیے ہیں - اس کتاب کی تصنیف سے وہ ۱۵۴۳ء/۲۲ صفر ۹۵۰ھ میں فارغ ہوئے - اپنی کتاب کی اہمیت اور موضوع کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں :

> "لما كان الحج من أعظم الطاعات تكثرت فى بابه المصنفات غير أن منها ما يمل ومنها ما يخل وقد قصرت الهمم عن المطولات فحدانى ذلك أن أجمع كتاباً وسطا ناقلا من الكتب المعتبرة المعتمدة" -
>
> (چونکہ حج بڑی عبادات میں سے ایک ہے اور اس کے بارے میں بہت سی کتابیں موجود ہیں، لیکن ان کتابوں میں بعض ملال اور خلل سے خالی نہیں، پھر طویل کتابوں سے لوگوں کی ہمتیں بھی قاصر ہوگئی ہیں - سو اسی بات نے مجھے آمادہ کیا کہ میں ایک درمیانہ حجم کی ایسی کتاب تصنیف کروں جس میں حج کے متعلق تمام معتبر اور معتمد علیہ کتابوں کا مواد نقل کر دیا جائے) -

۱۵۸۶ء/۹۹۴ھ میں مکہ معظمہ میں وفات پائی۔ (نزهة الخواطر ۴ : ۱۱۲، النور السافر ص ۴۳۹ ، زبید احمد ۲۷۳ - ۲۷۴ - بروکلمن تاریخ ۲ : ۴۱۶ - ذیل ۲ : ۵۲۳ - تذکرہ ص ۱۸۸) -

---

[1] - تفصیل کے لیے دیکھیے : ماہنامہ فکر و نظر ، اسلام آباد ، نومبر ۱۹۷۱ء -

۱۸ - مولانا وجیہ الدین ابن نصراللہ بن عماد الدین علوی گجراتی

۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء میں پیدا ہوئے - اپنے زمانے کے مشاہیر سے علوم حاصل کرنے کے بعد علامہ عماد الدین محمود طاری کی صحبت سے خوب استفادہ کیا اور منطق ، حکمت ، کلام، اصول وغیرہ علوم میں مہارت پیدا کی - پھر افتاء کا کام بھی کیا اور تدریس بھی جاری رکھی - بعد میں شیخ محمد غوث گوالیاری کے مرید ہو گئے - زندگی ہمیشہ زہد و قناعت سے بسر کی - لباس بھی سادہ پہنتے اور شغل بھی کتاب سے یا عبادت سے رکھتے - بقول صاحب 'نزہۃ الخواطر' ما رأی أحد فی بیتہ أو فی المسجد الامشتغلاً بالافادۃ (گھر یا مسجد میں وہ ہمیشہ تدریس میں نظر آتے تھے) - ان کی تصنیفات میں سے 'حاشیہ تفسیر بیضاوی'، 'حاشیہ بزدوی' (اصول فقہ) 'حاشیہ ہدایۃ و شرح وقایۃ' (فقہ) 'حاشیہ مختصر و مطول' (بلاغت) 'حاشیہ عضدیہ و شرح تجرید وشرح عقائد و حاشیہ قدیمہ و شرح مواقف و شرح مقاصد' (عقائد) 'حاشیہ ارشاد وشرح جامی' (نحو) 'حاشیہ قطبی' (منطق) 'حاشیہ شرح چغمینی' (ہیئت) 'حاشیہ شرح حکمت العینی' (حکمت) 'شرح رسالہ قوشجی' (ہیئت) 'شرح ابیات تسہیل' (نحو) 'شرح شرح نخبۃالفکر' (اصول حدیث) 'شرح' لوائح وشرح جام جہاں نما' (تصوف فارسی زبان میں) کے نام صاحب 'نزہۃالخواطر' نے گنائے ہیں - فہرست رامپور میں ان کی ایک کتاب 'البسیط فی الفرائض' کا نام بھی ملتا ہے -

شیخ وجیہ الدین علوی کو زمانے کے تمام متداول علوم و فنون میں یکساں فاضلانہ مہارت حاصل تھی اور انہوں نے بیشتر فنون کی کتابوں کی شروح لکھیں یا ان پر حواشی تحریر کیے - ان میں سے 'حاشیۃ علی تفسیر البیضاوی' کے ایک قلمی نسخہ کا ذکر فہرست آصفیہ میں ہے - 'شرح نخبۃ الفکر' پر ان کی مفید تعلیقات ہیں اور یہ قلمی نسخہ رامپور کی لائبریری میں موجود ہے - شیخ علوی کی متعدد تصانیف میں سے ایک 'الحقیقۃ المحمدیۃ' بھی ہے جو اپنے موضوع ، جامعیت اور افادیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے - اس کتاب میں انہوں نے اسلامی تصوف کے اصول بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ ایک راسخ العقیدہ صوفی شریعت اسلامی سے کبھی سر مو انحراف نہیں کرتا بلکہ اس کا قول و عمل عین شرع محمدیؐ کے مطابق ہوتا ہے - یہ کتاب ایک مقدمے، دو مقاصد اور ایک تکملے پر مشتمل ہے - چنانچہ شیخ اپنی کتاب کا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں: فھذہ رسالۃ فی التصوف مسماۃ بالحقیقۃ المحمدیۃ مرتبۃ علی مقدمۃ و مطلبین و تکملۃ - مقدمے میں ذات باری تعالیٰ کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے - مطلب اول میں یہ بتایا ہے کہ کس طرح حق سبحانہ و تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنے نور صمدیت کی تجلیات دکھاتا ہے - مطلب ثانی میں اہل السنۃ و الجماعۃ کے علمائے علم الکلام اور

صوفیوں کے نظریات کے درمیان موافقت و تطبیق کا بیان ہے ۔ اس تکملے میں مختلف النوع اور متفرق مسائل کا اجمالی ذکر ہے ۔ مثلاً یہ کہ ہر عقلِ انسانی میں اللہ کی ذات کا تصوّر راسخ ہوتا ہے ۔ اگرچہ بعض نادان ملحد اسے ضائع کر دیتے ہیں ۔ سب سے آخر میں ولایت کے درجات اور اولیاء اللہ کی اقسام بیان فرمائی ہیں[1]۔

۱۵۹۰ء/۹۹۸ھ میں وفات پائی ۔ (نزہۃ الخواطر ۴ : ۳۸۵ ۔ تذکرہ ص ۵۳۹ ، مآثر الکرام ص ۱۹۶ ۔ بروکلمن ۲ : ۶۰۵) ۔

۱۹ ۔ قاضی ابوالمعالی بخاری

عزیزانِ بخاری کے داماد ، شاگرد اور خلیفہ تھے ۔ ان کے خسر کو فقہ پر بڑا عبور حاصل تھا ۔ عبداللہ خان ازبک ان کا بہت احترام کرتا تھا ۔ بقول بدایونی عزیزان نے عصام الدین اسفرائنی اور ان کے طلبہ کو ان کی شرارت کی وجہ سے ملک بدر کیا تھا ۔ قاضی ابوالمعالی ۱۵۶۱/۹۶۹ھ میں آگرہ آئے ۔ ان کی ایک بہت قابلِ قدر کتاب 'حسب المفتین' ہے جو کافی ضخیم ہے اور اس میں نوادر فتاویٰ جمع ہیں ۔ اس کے نسخے متعدد مقامات پر پائے جاتے ہیں ۔ اسلامیہ کالج پشاور میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے جس کی ابتدائی سطور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب انہوں نے ابوالغازی پیر محمد بہادر خان کامران بادشاہ غازی (ماوراء النہر) کے نام معنون کی ہے ۔ کتاب کا کچھ حصہ مکہ معظمہ میں لکھا گیا ہے اور مکمل بھی مسجد حرام میں ہوئی ہے ۔ وہیں ہاتف نے آواز دی 'ویرا حسب المفتی (کذا) نام کنید'۔ یہ نسخہ اکوڑا خٹک ضلع پشاور کے کسی صاحب (سلیمان) نے اپنے بیٹے محمد محتشم کے لیے تحریر کیا ہے ۔ شیخ ابوالمعالی عامر بخاری کی نادر کتاب 'حسب المفتی' کے چھ خطی نسخے اس وقت تک دریافت ہو چکے ہیں جن میں سے ایک ایک نسخہ قاہرہ ، لندن ، پشاور ، بانکی پور ، رام پور میں اور ایک حیدرآباد دکن کے کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے ۔ بنیادی طور یہ کتاب حنفی فتاویٰ کا ایک مجموعہ ہے ۔ قاہرہ کے نسخے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شیخ ابوالمعالی نے یہ مجموعۂ فتاویٰ اپنے ایک ماموں اور استاد کے فتاویٰ سے مرتب کیا ہے جو سلطان بہادر خان کے عہد کے قاضی تھے ۔ یہ قیمتی مجموعہ تیار کر کے شیخ نے اسے خاقان ابوالغازی عبید اللہ خان الشیبانی (۱۵۳۳ء/۹۴۰ھ ۔ ۱۵۳۹ء/۹۴۶ھ) کی خدمت میں پیش کیا اور اسی کے نام سے معنون کیا ۔ کتاب کے دیباچے میں شیخ نے بیان کیا ہے کہ 'حسب المفتی' کا بیشتر حصہ حرمین شریفین میں مکمل ہوا اور مسجد الحرام میں

---

۱ ۔ فہرست انڈیا آفس لائبریری نمبر ۱۳۸۱ ، فہرست آصفیہ ۴ : ۱۰ ۲/۱ ، فہرست کتب خانہ رام پور نمبر ۱۸۶ ۔

قیام کے دوران ہاتفِ غیبی نے آواز دی کہ اس کا نام 'حسب المفتی' رکھا جائے ۔ کتاب کی ترتیب و تبویب عام حنفی فتاویٰ کے طریقے پر ہے اور بعض مقامات پر شیخ نے کچھ مسائل فارسی عبارات میں بھی نقل کیے ہیں[1] ۔ سالِ وفات حتماً معلوم نہ ہوسکا ، اندازاً ۱۵۶۲ء/ ۹۷۰ھ کے لگ بھگ ہوگا ۔ (نزھۃالخواطر۴: ۱۶ ، بدایونی ۶۴۳ ، بروکلمن ذیل ۲: ۶۰۵)۔

۲۰ ۔ علاءالدین لاہوری

مولانا منصور لاہوری کے فرزند ارجمند ہیں ۔ مولانا منصور مولانا سعداللہ لاہوری کے داماد تھے ، جو شیخ اسحاق کے فاضل تلامذہ میں سے تھے ۔ آپ مالوہ کے قاضی تھے ۔ بعد میں پرگنہ بجوارہ کے نظم و نسق پر مامور ہوئے ۔ مولانا علاءالدین کو شہنشاہ اکبر نے منصب دینا چاہا لیکن انہوں نے قبول نہ کیا اور جاگیر لے کر تدریس کو ترجیح دی ۔ وہ اپنی جاگیر کی آمدنی طلبہ پر خرچ کرتے تھے اور اس وصف میں بے نظیر تھے ۔ 'شرح عقائد' پر حاشیہ لکھا جو اب ناپید ہے ۔ پھر حج و زیارت کے لیے مکۂ مکرمہ تشریف لے گئے اور وہیں انتقال ہوا ۔ ڈاکٹر زبید احمد نے سال وفات ۱۵۶۱ء/۹۶۹ھ بتایا ہے جو علاءالدین لاری کے ساتھ اشتباہ کی بنا پر لکھا گیا ہے ۔ علاءالدین لاہوری کی وفات سولھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہوئی ہوگی ۔

۲۱ ۔ شیخ مبارک ناگوری

فیضی اور شیخ ابوالفضل کے والد شیخ مبارک اپنے دور کے نامی گرامی عالم تھے ۔ انہوں نے خطیب ابوالفضل گازرونی اور عمادالدین طارمی سے علوم حاصل کیے ۔ ابتداء میں تقویٰ اور صلاح کے لیے مشہور تھے ۔ سوری عہد میں شیخ علائی مہدوی کی طرف مائل ہوئے اور ان کی حمایت کرتے تھے ۔ اس وجہ سے کافی تکلیفیں اٹھائیں ۔ پھر اکبری دور آیا تو کچھ عرصہ نقشبندی صوفیوں کی طرف مائل ہوئے اور بقول بدایونی "آخر میں جب عراقیوں نے اپنا رنگ جما لیا تو انھی کے رنگ میں باتیں کرنے لگے"۔ زیادہ وقت تدریس میں گزارتے تھے ۔ ایک تفسیر 'منبع عیون المعانی' (چار ضخیم جلدوں پر مشتمل) لکھی ۔ شیخ مبارک ناگوری نے قرآن کریم کی چار جلدوں میں ایک تفسیر لکھی تھی جس کا نام بعض نے 'منبع نفائس العیون' بتایا ہے اور بعض نے 'منبع نفائس العلوم' اور بعض نے 'منبع عیون المعانی' لکھا ہے۔ شیخ کی یہ تفسیر بظاہر ناپید ہے ۔ صرف یہ معلوم ہو سکا ہے کہ آخری عمر میں جب مزید درس و تدریس اور مطالعہ و تحقیق

۱۔ فہرست الکتبخانہ الخدیویۃ ۳ : ۳۱ ، فہرست انڈیا آفس لائبریری ۳۰۲ ، ۱۷ ، فہرست آصفیہ ، ص ۱۰۴۸ ، فہرست رام پور نمبر ۱۲۷ ، بانکی پور نمبر ۱۷۵۲ ، لباب المعارف نمبر ۴۹۳ ۔

سے عاجز آ گئے تو یہ تفسیر لکھنا شروع کر دی تھی ۔ بعد میں تمام صلاح و تقویٰ دنیاداری، بے دینی اور روپیہ کے لالچ سے بدل گئی اور انہوں نے اپنے فرزندکی وساطت سے اکبر کے لیے مذہب میں تحریف و تنسیخ کا جال پھیلایا ۔ عفا اللہ عنہ ۱۵۹۲ء/ ۱۰۰۱ھ میں بمقام لاہور فوت ہوئے ۔ (بدایونی ص ۶۰۲ - ۶۰۳ ، زبید احمد ص ۲۳۶) ۔

۲۲ - محمد بن محمد بن احمد المیانجی فاروقی چشتی گجراتی

محمد بن احمد المیانجی صاحب 'تفسیر محمدی'، کے صاحب زادے ہیں۔ ان کے مندرجہ ذیل رسالے برلن کے کتب خانے میں محفوظ ہیں ۔ وفات ۱۵۹۲ء/۱۰۰۰ھ کے بعد ہوئی ۔

۱ - 'نکات الاخوان'
۲ - 'مراجین العشاق'
۳ - 'الجمع بین الدنیا و العقبیٰ'
۴ - 'رسالة فی من عرف‌الله كل لسانه'
۵ - 'جواهر العلوم'
۶ - 'الحیرة فی ذات‌الله'
۷ - 'تحفة السلوك الموصلة الی‌الله ملك‌الملوك'
۸ - 'رسالة فی الاوراد'
۹ - 'المفلس فی امان‌الله' - (زبیداحمد ۱ ۳ تاریخ بروکلمن ۲ : ۴۲۰ و'مقدمہ مراجین‌العشاق')۔

شیخ محمد بن محمد بن احمد فاروقی چشتی کی تمام دستیاب کتب اور رسائل تصوف سے متعلق ہیں ۔ 'نکات الاخوان بعون الله المنان' میں صوفیانہ اور فکر انگیز معارف بیان کیے ہیں ۔ ہر بات اور ہر مسئلہ کا آغاز لفظ نکتہ سے کرتے ہیں ۔ مثلاً نكتة العقل ما ينجيك من الاخلاق المذمومة الى الاخلاق المحمودة یعنی عقل کے سلسلے میں یہ نکتہ ہے کہ عقل وہ ہے جو تجھے اخلاق مذمومہ سے نجات دلا کر اخلاق محمودہ سے آشنا کر دے ، مگر 'مراجین العشاق بین ابحرالاشواق' کا بھی تقریباً یہی اسلوب ہے تاہم یہاں ہر مضمون و مسئلہ کا آغاز لفظ مرجان (موتی جمع مراجین) سے کرتے ہیں ، مثلاً مرجان ، واعلم ان العشق يكون بحيث لايعتبرمعه العاشق والمعشوق' (یعنی عشق کا وجود یوں ہے کہ اس کے ساتھ عاشق و معشوق کا ہونا ضروری نہیں ، عشق کو دوام ہے) ۔ 'رسالة فی بیان الجهاد الاكبر' میں اصلاح نفس انسانی کے متصوفانہ اصول بیان کیے ہیں ۔

'من عرف الله كَلَّ لسانه' میں بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ وہ اپنے شیخ اور ماموں نصیرالدین محمود اودھی چراغ دہلی کی خدمت میں تھے کہ ایک سائل نے پوچھا کہ من عرف‌الله كل لسانه (جس نے اللہ کو پہچان لیا ہے اس کی زبان کند ہو گئی) اور من

عرف اللہ طال لسانہ (جس نے اللہ کو پہچان لیا اس کی زبان دراز ہوگئی) ، میں کیا فرق ہے ، تو شیخ نے جواب دیا اول سے مراد لسان المقال اور ثانی سے مراد لسان الحال ہے اوّل الذکر، کی کیفیت مؤخرالذکر سے زیادہ فصیح ہوتی ہے ۔ اس رسالے میں اسی قول کی تشریح کے ضمن میں معارفِ تصوّف جمع کیے ہیں[1] ۔

۲۳ ۔ شیخ طیب سندھی

انہوں نے پہلے سندھ میں مولانا یونس مفتیؒ سندھ سے علم حاصل کیا ۔ پھر گجرات پہنچ کر مولانا عبدالاوّل زید پوری سے حدیث پڑھی ۔ پچاس سال تک برہانپور وغیرہ مقامات پر حدیث کا درس دیتے رہے ۔ 'حواشی مشکٰوۃ المصابیح' اور 'شرح رسالہ غوثیہ' ان کی تصانیف ہیں ۔ شیخ طیب بن ابی طیب سندھی ایک محدّث فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ صوفی کامل بھی تھے ۔ تصوّف آپ کو اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں ملا تھا ۔ اسی جذبۂ تصوف و معرفت نے آپ کو شیخ محی الدین محمد بن علی ابن العربی کے 'الرسالۃ الغوثیۃ' کی شرح لکھنے کی ترغیب دلائی اور علم الحدیث کے میدان میں آپ نے 'مشکٰوۃ المصابیح' پر مفید حواشی و تعلیقات تحریر فرمائیں جو بظاہر ناپید ہیں ۔ ۱۵۸۲ء/۹۹۰ھ اور ۱۵۹۱ء/ ۹۹۹ھ کے درمیان وفات پائی ۔ (نزھۃ الخواطر۴: ۱۶۵ ۔ ڈاکٹر محمد اسحاق ، ص ۱۲۸) ۔

۲۴ ۔ ابوالفیض فیضی

ابوالفیض بن مبارک ناگوری متخلّص بہ فیضی ۱۵۴۷ء/۹۵۴ھ میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے ۔ وہ فارسی اور عربی دونوں زبانوں کے مسلّمہ ادیب تھے ۔ ان کی فارسی شاعری کے محامد مولانا شبلی نے 'شعرالعجم' میں خوب اجاگر کیے ہیں ۔ عربی میں ان کی دلچسپ اور مایہ ناز تصنیف 'سواطع الالہام' (تفسیر بے نقط) ہے ۔ اگرچہ تفسیری نکات کم ہیں لیکن ادبی کمال کی وجہ سے یہ ہندوستان کے اس دور کی نمایاں تخلیق ہے ۔ اسی صنعت میں اس نے ایک دوسری کتاب 'مواردالکلم' بھی لکھی ہے ، جس کا ایک عمدہ مخطوطہ پشاور میں ہے ۔

'سواطع الالہام' اور 'موارد' دونوں طبع ہو چکی ہیں ۔ علامہ فیضی کی نادر تفسیر 'سواطع الالہام' غالباً اپنی نوعیت کی واحد بے نقط تفسیر قرآن ہے کیونکہ صنعت اہمال میں قرآن کریم کے مختلف اجزاء اور سورتوں کی بے نقط تفسیر کا کہیں کہیں ذکر ملتا ہے جو مختلف بلاد و ادوار کے اہلِ علم نے لکھیں ، لیکن پورے قرآن کریم کی مکمل مہمل

---

۱ ۔ آلسورٹ نمبر ۳۱۰۵ ، ۳۱۰۶ ، ۳۱۴۵ ، ۳۱۶۳ ، ۳۲۳۲ ، ۳۲۳۳ ، فہرست انڈیا آفس لائبریری نمبر ۱۴۱۲ ، ۱۴۱۴ ۔

الحروف تفسیر فیضی ہی کی ہے ۔ فیضی جس دور سے تعلق رکھتا ہے اس میں نہ صرف اسلامی ہند بلکہ اکثر بلادِ اسلامیہ کے علماء و ادباء عربی نثر (بلکہ فارسی نثر بھی) تکلف و تصنع کے ساتھ لکھنے میں بڑا فخر و کمال خیال کرتے تھے ۔ عربی نثر کا یہ دور ، دورِ انحطاط کہلاتا ہے اور اس میں معنی کی جگہ لفظ اور باطن کی جگہ ظاہر کو سنوارنے پر زور صرف ہوا ۔ فیضی کی یہ کوشش نہ صرف اس متصنّع و متکلّف دور کی بہترین یادگار ہے بلکہ صنعتِ اہمال (یعنی مہمل و بے نقط حروف میں شعر و نثر لکھنا) کا عظیم شاہکار ہے ۔ فیضی عربی و فارسی زبانوں کے مفرداتِ لغوی اور اسالیبِ ادبی پر کامل عبور اور قدرت رکھنے کے علاوہ ایک ذہین ، طباع اور عظیم المرتبت عبقری بھی تھا ، اس لیے اس کی صنعتِ اہمال میں جہاں تکلّف و تصنّع کا عنصر نسبتاً بہت کم ہے وہاں جگہ جگہ معانی و افکار کے درّ و جواہر بھی بکھرے پڑے ہیں اور یہی بات فیضی کے فیضانِ طبع کے کمال اور علم و فضل کی بلندی کا راز ہے ۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فیضی نے یہ نادر شاہکار صرف دو سال کے قلیل عرصے میں مکمل کیا تھا اور یہ بھی روایت ہے کہ شیخ منورالدین لاہوری جیسے یکتائے روزگار فضلاء نے اس تفسر پر نظرِ ثانی کی اور اس کی نوک پلک درست کرنے میں فیضی کا ہاتھ بٹایا ۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فیضی نے صنعتِ اہمال کے التزام کے ساتھ ساتھ قدماء مفسرین کی تفاسیر کے علمی نکات کو مہمل و بے نقط حروف میں یوں پیش کیا ہے جیسے ایک ماہر صرّاف بکھرے ہوئے موتی چن چن کر ایک لڑی میں پرو دیتا ہے[1] ۔

اس میں شک نہیں کہ تشریحِ الفاظ اور تاویلِ آیات میں اس نے متقدمین کی خوشہ چینی کی ہے (مثلاً بسملہ کی تشریح کرتے ہوئے لفظ الجلالہ کی توجیہات زمخشری ، بیضاوی وغیرہ سے نہ تو مختلف ہیں اور نہ ان پر کوئی اضافہ ہے[2]) اور اس لحاظ سے دوسرے ہندی علمائے تفسیر (جیسے علی المہائمی ، ثناء اللہ پانی پتی اور نواب صدیق حسن خاں وغیرہ) اس سے ہزارقدم آگے اور ہزار درجہ بلند ہیں ۔ لیکن فیضی کی یہ فضیلت کیا کم ہے کہ وہ صنعتِ اہمال کے التزام اور متقدمین کے جواہر گرانمایہ کو سمیٹنے کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ ایسے نادر نکات پیدا کرتا ہے جن پر انسان عش عش کر اٹھتا ہے ۔ 'سواطع الالہام' کا دیباچہ اس بات کے بہت سے شواہد فراہم کرتا ہے جو بڑی تقطیع کے مطبوعہ نسخے کے اکیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور جس میں فیضی کا وہ قصیدہ میمیہ بھی شامل ہے جو اس نے صنعتِ اہمال میں نظم کیا اور اپنی تفسیر کی مدح و تقریظ کے طور پر درج کیا

---

۱ ۔ نزھۃ الخواطر ۵ : ۱۶ ۔

۲ ۔ دیکھئے سواطع الالہام ، ص ۲۱ ۔

ہے ۔ اس مقدمے میں اور بے شمار نکات کے علاوہ اللہ جل جلالہ کی عظمت، رسول اللہؐ کی مدح اور قرآن کریم کے کمال اعجاز کے بارے میں بھی بڑی پرمغز باتیں موجود ہیں ۔ ایک جگہ علوم القرآن کے بحر بیکراں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے :"علم کلام اللہ داماء لا ساحل له و طوْد لاَ مسلك له وکل واحد أراد و صوله و ما وصل أمده ورام سلوک درکه و ما ادرك حده"[1] (کلام اللہ کہ ایک سمندر بیکراں ساحل اور کوہ بے راہ و دشوار گزار ہے ، جس نے بھی اس کی انتہا کا قصد کیا ، نہ پہنچ پایا اور جس نے بھی اس کے انکشافات کا ارادہ کیا اس کے سرے کو نہ پا سکا) ۔

فیضی کی تفسیر میں دو باتیں کھٹکتی ہیں ۔ ایک تو اس کا اختصار ہے جس کا سبب صنعت اہمال کے جال میں گرفتار ہونے کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا اور دوسری بات یہ ہے کہ اس کی عربی پر بھی دیگر ہندی علماء کی طرح فارسی کا رنگ اسلوب غالب ہے ۔ مثلاً اسی مذکورہ بالا قطعہ عبارت ہی کو لیجیے ، اس میں 'وصوله' اور 'سلوك درکه' کو واؤعطف کے ساتھ ملانا کوئی اچھی عربی نہیں ، اسی طرح عرب یہ نہیں کہیں گے 'وکل واحد أراد' بلکہ وہ کہیں گے 'وکل من اراد' ۔ کل واحد دراصل پیداوار ہے فارسی ترکیب 'ہر کسی کہ خواست' کی ۔

'سواطع الالہام' کے مطبوعہ نولکشوری نسخے کے آخر میں کئی ایک تقاریظ کے علاوہ فیضی کی تفسیر کے نامانوس اور مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی شامل ہے ۔ چونکہ اکبر کی بے راہ روی میں باپ اور بھائی کی طرح اس کا بھی بڑا ہاتھ تھا ، اس لیے محدث دہلوی ، بدایونی اور مولانا عبدالحئی حسنی نے ان کے مثالب بہت لکھے ہیں ۔ ۱۵۹۶ء/ ۱۰۰۴ھ میں فوت ہوئے ۔ (نزھۃ الخواطر ۲۶ - ۳۱ ، تذکرہ ص ۷۷ اور مصادر جو تذکرہ میں ہیں) ۔

۲۵ ۔ شیخ عبدالاحد بن زین العابدین فاروقی سرہندی

شیخ مجدد کے والد اور چشتیہ سلسلے کے عظیم المرتبت بزرگ تھے ۔ فقہ ، اصول اور تصوف کا درس دیتے اور وحدۃ الوجود کے مسئلہ کی مشکلات حل کرتے تھے ۔ رسالہ 'اسرارالتشہد' اور 'کنوز الحقائق' وغیرہ ان کی تصنیفات ہیں ۔ 'کنوز الحقائق' کا اقتباس شیخ مجدد نے 'رسالہ تہلیلیہ' میں دیا ہے ۔ ۱۵۹۱ء /۱۰۰۷ھ میں وفات پائی ۔ (نزھۃ الخواطر ۵ : ۱۶۳ ۱۹۳) ۔

---

۱ ۔ دیکھیے سواطع الالہام ، ص ۱۰ ۔

۲۶ - ابوالفضل بن مبارک ناگوری

۱۵۵۱ء/۹۵۸ھ میں پیدا ہوئے - تحصیلِ علم سے فارغ ہو کر درس و تدریس میں مشغول ہوئے - ۱۵۷۲ء/۹۸۱ھ میں شاہی دربار میں حاضر ہوئے - پہلی ملاقات میں آیۃالکرسی کی تفسیر بطورِ تحفہ پیش کی - دوسرے سال سورۃ الفتح کی تفسیر ہدیۃً لائے اور دربار سے منسلک ہو گئے اور جب شہنشاہ اکبر نے دین سے آزادہ روی اختیار کی تو ان کی بڑی تائید کی - فارسی کی تصنیفات بے شمار اور ان میں سے بعض خوب متداول ہیں - عربی تصنیفات مذکورہ بالا 'تفسیرِ آیۃ الکرسی' و 'سورۃ الفتح' ہیں - مقدم الذکر کا ایک نسخہ پشاور میں ہے - 'حیٰوۃ الحیوان' کا فارسی ترجمہ بھی اس کی تصانیف میں سے ہے -

شیخ ابوالفضل علامی نے اپنے بھائی ابوالفیض فیضی کے برعکس فارسی زبان میں اپنے معارف و فیوض پیش کیے ہیں جن میں 'آئینِ اکبری'، 'اکبرنامہ' اور 'دفترِ ابوالفضل' کسی تعارف کی محتاج نہیں - ان کی عربی نگارشات میں سے 'تفسیر سورۃ الفتح' اور 'تفسیر آیۃالکرسی' ہے جن میں سے صرف مؤخر الذکر کا تذکرہ ملتا ہے - ہندی علماء نے آیۃالکرسی میں اسم اللہ الاعظم کی علمی بحث کے علاوہ اس آیت کی بنیاد پر توحیدِ ربانی کی تشریح کی ہے اور بتایا ہے کہ آیت کا ہر آنے والا لفظ توحیدِ باریِ تعالیٰ کی جامعیت میں اضافہ کرتا جاتا ہے - اسی بنا پر اہلِ علم نے 'آیۃ الکرسی' کو 'آیۃ التوحید' کا بھی نام دیا ہے -

دکن کی ایک مہم سے واپسی پر راستہ میں شہزادہ جہانگیر کے ایما سے قتل کر دیئے گئے - تاریخ وفات 'تیغ اعجاز نبی اللہ سر باغی برید' سے بطور تخرجہ نکلتی ہے - (نزھۃ الخواطر، ۵:۲۵-۲۶ تذکرہ ۷۸، دربارِ اکبری ۷۷-۵۳۸؛ رودِ کوثر ۱۶۰-۱۷۰؛ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۱ : ۳۰۳ ، دینِ الٰہی کا پس منظر از پروفیسر محمد اسلم) -

۲۷ - بہاالدین عبدالکریم النہروالی

مفتی قطب الدین محمد نہروالی (لاہوری) مقدم الذکر کے بھتیجے ہیں - احمد آباد میں پیدا ہوئے اور بعد میں حجاز چلے گئے - ۱۵۷۴ء/۹۸۲ھ میں مکہ کے مفتی اور ۱۵۸۴ء/۹۹۰ھ کے قریب خطیب مقرر ہوئے - تصانیف میں بخاری کی نامکمل 'شرح النہر الجاری' اور مسجد حرام کی 'تاریخ اعلام العلماء الاعلام' شامل ہیں - مفتی بہاالدین بن محب الدین النہروالی ثم المکی کی نامکمل 'کتاب النہر الجاری علی صحیح البخاری' کا تو کہیں وجود معلوم نہیں ہو سکا مگر مکہ مکرمہ کی 'تاریخ مسمی اعلام العلماء الاعلام ببناء المسجد الحرام' کا ایک نسخہ بانکی پور کی لائبریری میں موجود ہے - یہ کتاب دراصل خلاصہ ہے 'الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام' کا جو ان کے استاذ اور چچا مفتی قطب الدین نہروالی ثم مکی کی تصنیف

ہے اور جس کا تفصیلی ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اصل کی طرح خلاصہ بھی ، ایک مقدمے ، دس ابواب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے ۔ مؤلف خطبۂ کتاب میں رقمطراز ہے : فقد أمرنی من تجب اطاعته . . . . . باختصار اعلام کتاب اعلام الاعلام باخبار المسجد الحرام تالیف عمی و استاذی و شیخی و والدی و اعتمادی ، من نبتت فی حیاض درسه دقائق النعمان و ثبتت فی ریاض غرسه شقائق النعمان مفتی بلد الله الامین مولائی و سیدی قطب الدین نور الله تعالیٰ ضریحه (مجھے ایک ایسی ہستی نے حکم دیا ہے ، جس کی اطاعت واجب ہے ، کہ میں کتاب 'اعلام الاعلام باخبار المسجد الحرام' کا اختصار کروں جو میرے چچا ، میرے استاذ ، میرے شیخ ، میرے والد اور میرے سہارے ، جن کے حلقۂ درس میں باریک مسائل کے پودے آگے ہیں ، جس کے کاشت کردہ گلستان میں پھول کھلے ہیں ، مفتی بلد امین میرے مولا و آقا قطب الدین نوراللہ ضریحه کی تالیف ہے) ۔

۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء میں وفات پائی ۔ ان کی وفات چونکہ ذی الحجہ میں ہوئی ہے اس لیے وفات کے لحاظ سے جہانگیری عہد سے تعلق رکھتے ہیں ۔

ان علماء و مشائخ کے علاوہ مندرجۂ ذیل اصحاب بھی اس دور کے نامور علماء میں سے تھے ۔ یہ فہرست زیادہ تر نزھة الخواطر سے ماخوذ ہے اور مقالہ نگار سے سنہ وار ترتیب دی ہے ۔

شمس الدین محمد بن رکن الدین محمد سندھی (عبدالعزیز آصف خان کے والد) متوفی ۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء ۔ فیروز لاہوری متوفی ۹۳۳ھ/۱۵۲۶ء ۔ شرف الدین شیرازی بیجاپوری (مؤلف حاشیہ بیضاوی) متوفی ۹۳۴ھ/۱۵۲۷ء ۔ مولانا شعیب دہلوی (بقول تذکرہ بہترین واعظ) متوفی ۹۳۶ھ/۱۵۲۹ء ۔ مودود لاری متوفی ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء ۔ مولانا الیاس اردبیلی ، مولانا چاند منجم بہ عہد ہمایوں ۔ مولانا عبداللہ لاہوری متوفی ۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء نصیر الدین کشمیری متوفی ۹۴۶ھ/۱۵۳۹ء ۔ احمد بن محمد نہروالی والد صاحب الاعلام متوفی ۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء ۔ رکن الدین سندھی (مؤلف شرح اربعین و خلاصۃ کیدانی) متوفی ۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء ۔ میران سندھی متوفی ۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء ۔ یونس بن ابی یونس سندھی (استاذ شیخ طیب) متوفی ۹۵۱ھ/۱۵۴۴ء ۔ ابراہیم بن معین الایرجی متوفی ۹۵۲ھ/۱۵۴۵ء ۔ میرک شاہ (مؤلف شرح حصن الحصین) متوفی ۹۵۶ھ/۱۵۴۹ء ۔ حسام الدین ملتانی (استاد علی متقی) متوفی ۹۶۰ھ/۱۵۵۲ء ۔ حسن بن داؤد بنارسی مؤلف 'مرغوب الطالبین' (صرف) متوفی ۹۶۰ھ/۱۵۵۲ء ۔ شیخ بدھ بہاری (مؤلف شرح الارشاد فی النحو) بعہد سلیم شاہ ۔ میرک محمود سندھی (والد میرک عبدالباقی) متوفی ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء ۔ ابوسعید کانپوری (بسیار گو شاعر تھے) متوفی ۹۶۶ھ/۱۵۵۸ء ۔ عبدالرحمٰن لاہوری متوفی ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء ۔ مولانا

محمد سعید ترکستانی متوفی ۱۵۶۲ء/۹۷۰ھ میرک محمد بن محمود سندھی مؤلف فتاویٰ تورانیہ متوفی ۱۵۶۲ء/۹۷۰ھ ۔ احمد بن عبدالقدوس گنگوہی (مؤلف رسالہ جملۃ الغناء و رسالۂ اثبات وحدۃ الوجود) متوفی ۱۵۶۴ء/۹۷۲ھ ۔ محمد بن عاشق چریا کوٹی (مؤلف تفسیر محمدیؒ ۔ حاشیۃ تلویح ۔ الجواہر المدنیۃ فی الفنوں الاربعۃ ۔ الکوکب الدری فی التاریخ) متوفی ۱۵۶۴ء/۹۷۲ھ ۔ میر مرتضیٰ شریفی (مؤلف کافیہ منظوم) متوفی ۱۵۶۴ء/۹۷۲ھ ۔ قاضی محمد معین لاہوری متوفی ۱۵۶۷ء/۹۷۵ھ ۔ ابوالفتح تھانیسری متوفی ۱۵۶۸ء/۹۷۶ھ ۔ فیروز گنائی کشمیری متوفی ۱۴۷۳ء/۸۷۶ھ ۔ نظام الدین امیٹھوی ۱۵۷۱ء/۹۷۹ھ ۔ عثمان بن ابی عثمان الحنفی بنگالی متوفی ۱۵۷۲ء/۹۸۰ھ ۔ محمد حسین یزدی (’شمائل منظوم، اور ’شرح شمائل ترمذی‘ کے مصنف) متوفی ۱۵۷۳ء/۹۸۱ھ ۔ نظام الدین شیخ بھکاری کا کوروی مصنف ’النہج‘ (اصول حدیث) و ’معارف‘ و ’شرح و ملہمات قادریہ‘ (تصوف) متوفی ۱۵۷۳ء/۹۸۱ھ ۔ مولانا حسن بن احمد بن نصیرالدین مصنف تفسیر القرآن جس میں ربط آیات کا اہتمام کیا گیا تھا اور ’حواشی تفسیر بیضاوی‘ و ’حاشیہ‘ نزہۃ الارواح‘ متوفی ۱۵۷۴ء/۹۸۲ھ میرک عبدالباقی سندھی (ہیئت و ہندسہ کے ماہر ۔ کئی شکلیں ایجاد کیں ۔ عبدالخالق گیلانی نے جو فاضل مرزا جان کے شاگرد تھے ان سے استفادہ کیا) ۔ متوفی ۱۵۷۵ء/۹۸۳ھ ۔ مولانا عبدالسلام لاہوری متوفی ۱۶۲۲ء/۱۰۳۲ھ شاگرد فتح اللہ شیرازی سے متقدم ہیں) متوفی ۱۵۷۵ء/۹۸۳ھ ۔ عبداللہ بن سعداللہ متقی سندھی متوفی ۱۵۷۶ء/۹۸۴ھ ۔ قاضی عیسی عبدالرحیم گجراتی مؤلف ’رسالۃ فی جواز السماع رسالۃ فی التوکل‘ (تفصیل کے لیے دیکھئے زبید احمد) متوفی ۱۵۷۶ء/۹۸۵ھ ۔ عبدالغفور اعظم پوری (خلیفہ عبدالقدوس گنگوہی) متوفی ۱۵۷۷ء/۹۸۵ھ ۔ علاء الدین عطا محمد الحسینی گجراتی (ابن الفارض کے طور پر عربی کے دو دیوانوں کے مصنف) متوفی ۱۵۷۸ء/۹۸۶ھ ۔ شمس الدین شیرازی بیجاپوری مصنف ’حاشیہ بیضاوی‘ متوفی ۱۵۷۸ء/۹۸۶ھ ۔ محمد بن منتخب امروہی میر عدل متوفی ۱۵۷۸ء/۹۸۶ھ ۔ محمد ماہ جونپوری مصنف ’المنشورۃ المنتظمۃ‘ (تصوف ۔ دیکھئے زبید احمد متوفی ۱۵۷۸ء/۹۸۶ھ ۔ حکیم شمس الملک گیلانی متوفی ۱۵۸۰ء/۹۸۸ھ ۔ عنایت اللہ شیرازی متوفی ۱۵۸۰ء/۹۸۸ھ ۔ ’عبدالمعطی‘ یا ’کثیر‘ عربی کے شاعر اور مؤلف ’اسماء الرجال البخاری‘ (نامکمل) متوفی ۱۵۸۱ء/۹۸۹ھ ۔ قاضی صدرالدین لاہوری متوفی ۱۵۸۲ء/۹۹۰ھ ۔ ملا محمد ہروی (تلمیذ فاضل مرزا جان) متوفی ۱۵۸۲ء/۹۹۰ھ ۔ محمد بن احمد الفاکہی مؤلف ’رسالۃ تکلم فیہا علی آیۃ الکرسی‘ ۔ نور الابصار‘ (فقہ شافعی) ’رسالۃ فی الصلاۃ و باب السلاطین‘ متوفی ۱۵۸۴ء/۹۹۲ھ ۔ اسماعیل بن ابدال اللاہوری متوفی ۱۵۸۵ء/۹۹۳ھ ۔ داؤد خاکی مؤلف ’العقیدۃ الجلالیۃ ورد المریدین‘ اور اس کی شرح ’دستور السالکین‘ وغیرہ متوفی ۱۵۸۵ء/۹۹۳ھ ۔ کبیرالدین بن قاسم پشاوری متوفی ۱۵۸۵ء/۹۹۳ھ ۔ نورالدین سفیدونی (ہایوں

کے استاد اور مصاحب) متوفی ۱۵۸۵ء/۹۹۳ھ - شیخ معین قاضی لاہوری متوفی ۱۵۸۶ء/ ۹۹۵ھ - اسحاق بن کاکو لاہوری ۱۵۸۷ء/۹۹۶ھ - نظام الدین نارنولی (صاحب مدرسہ نارنول) متوفی ۱۵۸۸ء/۹۹۷ھ - حکیم ابوالفتح گیلانی متوفی ۱۵۸۸ء/۹۹۷ھ - حسن بن حسام نارنولی لاہوری (چالیس سال تدریس میں مشغول رہے) متوفی ۱۵۸۹ء/۹۹۸ھ - سیف الدین دھلوی (شیخ محدث کے والد) متوفی ۱۵۸۹ء/۹۹۸ھ - قاضی محمد یزدی جنہوں نے اکبر کے خلاف فتویٰ دیا - متوفی ۱۵۸۹ء/۹۹۸ھ - مخدوم نوح ھالہ والے متوفی ۱۵۸۹ء/۹۹۸ھ -

دسویں صدی ہجری (سولہویں صدی عیسوی) کے چند علماء کا سنہ وفات معلوم نہ ہوسکا جو یہ ہیں : عبدالخالق گیلانی میر فتح اللہ شیرازی کے ہم سر تھے - قاضی یعقوب عربی اشعار ہندی بحور میں کہا کرتے تھے - محمد بن حسین لاری شاگرد علامہ دوانی محمد ابن الحسن العلمی (میبذی کا مقبول حاشیہ لکھا) یاسین بن ابی یاسین الحنفی - عبدالقادر سرہندی -

گیارھویں صدی ہجری (سترھویں صدی عیسوی) کی ابتدا سے شہنشاہ اکبر کے سال وفات تک کے کچھ مشاہیر یہ ہیں :

احمد بن محمد الحضرمی مؤلف 'مقالات جابریۃ' غالباً 'سواطع الالہام' کی تقریظ بھی انہوں نے ہی مکمل کی جو اس کے آخر میں چھپی ہے - متوفی ۱۵۹۲ء/۱۰۰۱ھ - منجھن بن عبداللہ اللکھنوتوی ، متوفی ۱۵۹۲ء/۱۰۰۱ھ - علی بن بدرالدین گیلانی لاہوری متوفی ۱۵۹۳ء/۱۰۰۲ھ - نظام الدین اکبر آبادی مؤلف طبقات اکبری متوفی ۱۵۹۴ء/۱۰۰۳ھ - حاجی محمد کشمیری مصنف 'شرح حصین حصین' - 'شرح شمائل' - 'فضائل القرآن' - 'مصباح الشریعۃ' اور 'شرح الاوراد' متوفی ۱۵۹۷ء/۱۰۰۶ھ - حاجی سلطان تھانیسری متوفی ۱۵۹۹ء/ ۱۰۰۸ھ - حمیدالدین بن عبداللہ السندھی (شیخ رحمت اللہ کے بھائی) مصنف 'القول الحسن فی جواز الاقتداء بالشافعی' (زبید احمد) و 'غایۃ البیان فی استحیاء الملائکۃ من الرحمان' (پشاورو ۹۳۹) متوفی ۱۶۰۰ء/۱۰۰۹ھ - عبداللہ سندیلوی مؤلف 'سراج السالکین' ، 'کنز الاسرار' وغیرہ متوفی ۱۶۰۱ء/۱۰۱۰ھ - مولانا قیام الدین لاہوری متوفی ۱۶۰۴ء/ ۱۰۱۳ھ -

★ ★ ★

پانچواں باب

فصل دوم

جہانگیر تا اورنگ زیب (۱۶۰۵ء/۱۰۱۴ھ - ۱۷۰۷ء/۱۱۱۸ھ)

سیاسی ، تمدنی ، ثقافتی اور فکری ماحول

سیاسی اور تمدنی ماحول : نورالدین جہانگیر (۱۶۰۵ء/۱۰۱۴ھ-۱۶۲۷ء/۱۰۳۷ھ) کو اپنے باپ سے ایک منظم و مستحکم سلطنت ورثے میں ملی جس کا وہ صحیح معنی میں حقدار ثابت ہوا اور اس نے اپنے آبا و اجداد کی میراث کو برباد نہ ہونے دیا ۔ اس نے اپنے عہد میں اپنے پیشرووں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بعض محصول معاف کرنے کے علاوہ عوامی فلاح و بہبود کے کاموں پر خصوصی توجہ مرکوز کی ، اس کی زنجیرِ عدل ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے ۔

جہانگیر کی وفات پر ۱۶۲۷ء/۱۰۳۷ھ جمادی الاولی میں شہاب الدین محمد شاہجہان (۱۶۲۷ء-۱۶۵۸ء) تخت نشین ہوا ۔ اس کے ابتدائی عہد میں بندیلہ اور دکن کی بغاوتیں فرو کی گئیں ۔ احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت ختم ہوئی اور گولکنڈہ اور بیجا پور کے سلاطین نے شاہجہان کی اطاعت قبول کی ۔ تیس سالہ شاہجہانی دور حکومت امن و امان اور خوشحالی کا دور ہے ، جسے بجا طور پر مغلوں کا سنہرا دور کہا جاتا ہے ۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ داخلی امن و سکون کے علاوہ شاہجہان نے خارجہ تعلقات میں صلح جوئی کی حکمتِ عملی اختیار کی اور دوسری وجہ خود بادشاہ کی لطیف و دلکش شخصیت ہے ۔

اپنے باپ شاہجہان کے بیمار ہونے پر اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی ہوئی جس کے نتیجہ میں محی الدین اورنگ زیب (۱۶۵۸ء-۱۷۰۷ء) تخت نشین ہوا ۔ وہ ایک صاحب سیف وقلم اور باہمت بادشاہ تھا ۔ زمام اقتدار سنبھالتے ہی اسے کئی ایک داخلی فتنوں کی سرکوبی کرنا پڑی جن میں اپنے بھائی شجاع کی سرکشی ، خوشحال خاں خٹک ، مارواڑ اور میواڑ وغیرہ کی بغاوتیں ہیں ، جن پر بادشاہ نے اپنے حسنِ تدبیر اور ہمت سے قابو پا لیا ۔ اس کے بعد تمام عمر مرہٹوں اور بیرونی سازشیوں کے خلاف جہاد میں مصروف رہا ۔ اس مردِ مجاہد کی پیرانسالی بھی اس کی راہ میں حائل نہ ہو سکی اور فروری ۱۷۰۷ء/ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ میں جہاد

کے دوران ہی داعی اجل کو لبیک کہا اوراس شاہِ غازی کو دکن میں دفن کیا گیا ۔

ملکی انتظام کے لحاظ سے وہ اپنے پیش روؤں کے نقشِ قدم پرچلا اور اس نے رعایا کی خوشحالی کا اپنے پیش روؤں سے زیادہ خیال رکھا ۔ اس پر یہ الزام تو غلط ہے کہ اس نے غیر مسلموں پر ظلم کیے ۔ البتہ ہندوؤں کو جو نامناسب آزادیاں اور ناجائز مراعات پچھلے دور میں ملی تھیں ان میں کسی قدر کمی کر دی گئی ۔ قوانین و احکام کے بارے میں وہ شریعت سے رجوع کرتا تھا ، پھر بھی علماء سے مشورہ لے لیتا تھا اور آخری فیصلہ مصالح ملکی کی روشنی میں وہ خود کرتا تھا ۔ اس کی سلطنت کا نمایاں کارنامہ اسلامی شان و شوکت کے احیاء کی کوشش اور دینی روایات کی پابندی تھی ۔ اگر وہ اپنے نہج پر اپنے شہزادوں کی بھی تربیت کر لیتا تو آج اس ملک کا نقشہ دگرگوں ہوتا ۔ بہر حال ہندوستان کے مسلم باشندوں میں اپنے مذہب کے لیے غیر مسلموں کے مقابلے پر جو جوش و خروش پایا جاتا تھا اور جس کے نتیجہ میں مملکت پاکستان وجود میں آئی ، اس کی ابتدائی داغ بیل اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھوں پڑ چکی تھی ۔

سلاطین کا علمی و دینی ماحول

جہانگیر کا بچپن ہمایوں اور اکبر سے مختلف حالات میں گزرا ۔ وہ ناز و نعمت میں پروان چڑھا اور علم و کمال کے گہوارے میں اس کی نشوونما ہوئی ۔ معمول کے مطابق چار سال چار مہینہ اور چار روز کی عمر میں مکتب نشینی ادا ہوئی ۔ فیضی اور مولانا میر کلاں محدث اس کی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے اور عبدالرحیم خان خانان اور قطب الدین اتکہ اس کے اتالیق تھے[۱] ۔ علوم فلسفہ اور املاء و انشاء کے استاد مولانا علی احمد نشانی تھے ۔ نشو و نما فارسی زبان کے ماحول میں ہوئی ، مگر ترکی زبان بھی سیکھی ۔ چنانچہ توزک بابری کے آخر میں کچھ اجزاء ترکی زبان میں اضافہ کیے ۔ اس کی اپنی توزک سادگی ، بے ساختگی اور فارسی زبان پر قدرت کا ایک عمدہ نمونہ ہے ۔ رزم و بزم اور غم و الم ہر ایک مقام کی تصویر کشی خوب کرتا ہے اور اس پر طرفہ یہ کہ پیچیدہ فلسفی موضوعات کو بھی نہایت سلجھے انداز میں پیش کر دیتا ہے[۲] ۔

نثر کی طرح اس کی شاعری بھی دلچسپ ہے ۔ شعر گوئی کے علاوہ شعر شناسی میں بھی اسے کمال حاصل تھا ۔ بے شمار شاعروں کو صلوں سے نوازا ۔ اس نے سکوں

---

۱ ۔ اکبر نے دوسرے شاہزادوں کی تعلیم کا بھی اہتمام کیا اور ایک دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس نے شہزادہ مراد کو پادری مانسٹریٹ کے حوالہ کیا کہ اس کو مغرب کے مذاہب کی تعلیمات سے روشناس کرائے ۔ (المنہاج ، ص ۵۰) ۔

۲ ۔ کچھ عمدہ نمونے بزم تیموریہ (ص ۱۲۹ تا ۱۳۶) میں دئیے گئے ہیں ۔

پر شعر ثبت کر کے شعر خوانی کو فروغ دیا۔ عرفی، طالب آملی، نظیری نیشاپوری اور خدا جانے کتنے اور شاعروں کو اس نے طرح طرح کے انعامات سے نوازا۔ وہ شاعری کے علاوہ مصوّری اور تعمیرات و باغات وغیرہ فنونِ لطیفہ کا بھی دلدادہ تھا۔ علمائے دین کی بھی اس نے قدر دانی کی۔ کتابوں کی قدر دانی بھی بدستور قائم رکھی اور اپنے اسلاف کی طرح اس نے بھی شاہی کتب خانہ کی سر پرستی کی۔ اس کے لیے ایک منصب دار ناظم مقرر کیا اور خوش نویس اور مصوّر رکھے۔ ہمایوں کی طرح وہ بھی ایک مختصر کتب خانہ اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا اور کبھی کبھار انعامات میں کتابیں بھی تقسیم کر دیتا تھا[1]۔

مذہبی افکار کے لحاظ سے جہانگیر بابر اور ہمایوں کے دور سے دور پڑ گیا تھا۔ تاہم اس میں اکبر کی طرح بے راہ روی نہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ نواب فرید خاں کی حکمتِ عملی کی بدولت، جسے اکبر کے آخری دور میں اکبر کے دربار میں بڑی قدر و منزلت حاصل ہوئی تھی، خود شہنشاہ اکبر کی انتہا پسندی میں بھی کمی آ گئی تھی۔ جہانگیر کے دربار میں رہ کر نواب فرید خاں جہانگیر کے خیالات پر بھی بڑی حد تک اثر انداز ہوا۔ اسباب کچھ بھی ہوں، جہانگیر نے ایک دین سے برگشتہ دربار اور دین کے دلدادہ عوام کے ملے جلے ماحول میں نشو و نما پائی تھی۔ اس لیے اُس کے خیالات میں ایک گونہ اعتدال تھا۔ اس نے درباریوں سے سجدۂ تعظیمی کرایا، مگر قاضی اور میرِ عدل کو اس سے معاف کر دیا۔ بعض مسلمانوں کو اس بنا پر مستحقِ تعزیر قرار دیا کہ وہ سنیاسیوں سے ملے اور ان کے زندقہ و الحاد کے کلمات زبان پر لانے لگے۔ کئی مسجدیں تعمیر کیں، جب قلعہ کانگڑہ کو فتح کیا تو علمائے اسلام کے ذریعہ اذان نماز وغیرہ ارکانِ اسلام ادا کیے اور گائے کا ذبیحہ کیا۔

اعتدال کی طرف میلان رکھنے کے باوجود اس کی مذہبی پالیسی زیادہ خوش آیند نہ تھی۔ وہ جب راجوری سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ مسلمان راجپوت ہندو راجپوتوں کو لڑکیاں دیتے ہیں اور ان کی لڑکیاں نکاح میں لیتے ہیں۔ جہانگیر کہتا ہے کہ "گرفتن خوب، اما دادن نعوذ باللہ"۔ گویا اس معاملہ میں وہ صرف غیرت کے تقاضوں پر عمل کرتا تھا۔ شریعت کی پابندی ضروری نہیں سمجھی۔ بہر حال اس کے دور میں ہندوؤں کی سینہ زوری میں خاصا فرق آ گیا۔

علماء کے مقابلے میں رعونت اسے ورثہ میں ملی تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اس نے حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ کو دربار میں بلا کر قید کر دیا اور پھر اپنے توزک میں ان کی

۱۔ بزم تیموریہ، ص ۱۳۹ تا ۱۶۸۔ اسلامی کتب خانے، ص ۲۲۰ - ۲۲۴۔

قید اور رہائی دونوں واقعوں کا اندراج نہایت پھیکے انداز میں کیا[1] ۔ یہ محض خدا کا فضل تھا کہ خود شیخ مجددؒ کی گرفتاری بھی اس کی اصلاح کا وسیلہ بنی اور بقول صاحب "خزینۃ الاصفیاء" "بادشاہ از محبان شیخ شد بحدیکہ گاہے آنجناب را از خود جدا نمی کرد و شاہزادہ خرم را واصل حلقۂ مریدان شیخ نمود" ۔

اس عبارت میں ممکن ہے قدرے مبالغہ ہو ، بہر حال یہ واقعہ ہے کہ بالآخر جہانگیر نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کو قید خانہ سے نکال کر اپنے دربار میں بلایا اور چندے دربار میں ٹھہرا کر اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا ۔ وہ جتنی مدت دربار میں ٹھہرے رہے بادشاہ کے ساتھ صحبتیں رہیں ۔ جس کے بارے میں شیخ مجددؒ بظاہر مطمئن نظر آتے ہیں ۔

شاہجہان کی مکتب نشینی خاندانی روایات کے مطابق ہوئی ۔ مولانا قاسم تبریزی ، حکیم دوائی گیلانی وغیرہ فضلاء اس کے اساتذہ تھے ۔ جن کی نگرانی میں شاہجہان نے ادب کی چاشنی حاصل کی اور خطاطی میں مہارت پیدا کی[2] ۔ تاہم شہزادہ کی طبیعت فنون لطیفہ کی دلدادہ تھی ، اس لیے وہ ان اساتذہ سے کچھ زیادہ نہ سیکھ سکا ۔ یہاں تک کہ بقول جہانگیر وہ اپنی آبائی زبان ترکی کے ذوق سے بھی ناآشنا تھا[3] ۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے تزک یا دیوان کی قسم کی کوئی تالیف یادگار نہیں چھوڑی ۔

علمی کمالات کی تحصیل میں اس کمی کی تلافی اس نے دو امور سے کی ۔ ایک یہ کہ وہ اپنے دربار میں وقتاً فوقتاً علماء و فضلاء کی مجالس منعقد کر کے بحث و تمحیص کے ذریعے استفادہ کرتا اور دوسرے یہ کہ اپنی وزارت کے لیے سعداللہ خاں جیسے باکمال وزیر کو منتخب کیا جس نے علماء کی قدردانی خود بھی کی اور بادشاہ سے بھی کرائی[4] ۔

شاہجہان کا دور شعر و شاعری کی سرپرستی کے لیے خصوصیت کے ساتھ مشہور ہے ۔ اکبر اور جہانگیر نے شعراء کی جو قدردانیاں کیں ، اس کی شہرت ایران تک پہنچی اور وہاں سے شعراء نے تیموری دربار کا رخ کرنا شروع کیا ۔ ان شعراء میں ملک الشعراء ابوطالب کلیم ، حاجی محمد جان قدسی اور مرزا صائب تبریزی بہت مشہور ہیں ۔ شاہی کتب خانہ شاہجہان کے عہد میں جوں کا توں رہا ۔

شاہجہان کے مذہبی خیالات جہانگیر سے بھی زیادہ اچھے تھے ۔ وہ نمازی تھا ، اس

---

۱ ۔ توزک جہانگیری ، ص ۲۷۳ - ۳۱۲ ۔

۲ ۔ عمل صالح ۱ : ص ۳۱ - ۳۲ ۔

۳ ۔ توزک جہانگیری بحوالہ بزم تیموریہ صفحہ ۱۷۰ ۔

۴ ۔ آئندہ صفحات مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا تذکرہ دیکھیے ۔

کے دور میں شراب نوشی میں کمی ہوئی ۔ اس نے ہندوؤں کے ساتھ ناانصافی برتے بغیر بہت سی ایسی رسموں کا خاتمہ کر دیا جو اکبری دور کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے رواج پذیر ہوگئی تھیں ۔ مثلاً دربار میں بادشاہ کو سجدۂ تعظیمی کرنا ، پگڑی میں بادشاہ کی تصویر لگانا ، بقول برنیئر اس نے کئی نئے مندر بنارس میں گرائے مگر ان کی جگہ مسجدیں نہیں بنوائیں ۔

بھمبر کے علاقہ میں مسلمان لڑکیوں کو ہندو شوہروں کے قبضہ سے نکالنے کی مہم چلائی تو وہاں کا راجہ مسلمان ہو گیا ۔ شیخ محمد گجراتی نے جو علوم رسمی سے واقف اور ہندوؤں کا داروغہ تھا ، ستر مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے قبضہ سے نکالا اور ستر مسجدیں واگزار کر دیں ۔ شاہجہان نے صدرالصدور کے عہدے کے احترام کو بحال کیا ۔ شریعت کے مطابق مقدمات کے فیصلے کرائے ۔ دہلی کی مسجد شاہ جہانی جہاں اس کے ذوقِ تعمیر کا حسین نمونہ ہے وہاں یہ اس کے مذہبی رجحانات کی آئینہ دار بھی ہے ۔

اورنگ زیب عالمگیر ایک وسیع النظر اور سلیم الفطرت عالم تھا ۔ اس کی تعلیم لائق اور قابل اساتذہ کی نگرانی میں ہوئی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہان کو تحصیلِ علوم کے بارے میں اپنی کوتاہی کا احساس تھا ۔ اس لیے اس نے اپنے بچوں کی تعلیم کا بہتر انتظام کیا اور اس انتظام کی بدولت داراشکوہ اور اورنگ زیب کو علم وحکمت کا وافر حصہ نصیب ہوا ۔ اورنگ زیب عالمگیر کے اساتذہ میں مولانا عبداللطیف سہارنپوری ، مولانا ہاشم گیلانی ، علامی سعداللہ ، ملا شیخ احمد (ملا جیون) ، مولانا سید محمد قنوجی ، شیخ عبدالقوی اور ملا شفیعائی جیسے فضلاء کا نام لیا جاتا ہے ۔ سید علی خان الحسینی، 'جواہر رقم، وغیرہ مشہور خطاطوں کی تربیت سے خطِ نسخ و نستعلیق دونوں میں کمال پیدا کیا ۔ سلوک و طریقت میں بھی شیخ مجددؒ کے فرزند خواجہ محمد معصوم اور دیگر بزرگوں سے استفادہ کرتا رہا اور "اطلبوا العلم من المہد الی اللحد" پر کاربند رہ کر اپنی مجاہدانہ مصروف زندگی میں مطالعہ اور شغلِ علمی کو مسلسل وقت دیتا رہا ۔ بقول سرکار ایک مشغول حکمران ہونے کے باوجود قلیل فرصت کو عربی کی فقہی اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں شوق سے گزارتا ۔ 'رقعاتِ عالمگیری' سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ اس کے مصنف کو عربی ادب اور فارسی شعر و شاعری پر کتنی قدرت حاصل تھی ۔ عربی اور فارسی کے علاوہ ترکی اور ہندی بھی روانی کے ساتھ بول سکتا تھا ۔ اس کے شغف کی بڑی یادگار 'فتاویٰ عالمگیری' ہے جس کے بارے میں تفصیل آگے آئے گی ۔

اس کو شعر و ادب میں جہانگیر و شاہجہان کی طرح انہماک نہیں تھا تاہم ان فنون میں اس

کے ذوقِ لطیف کے شاہد خود اس کے رقعات ہیں۔ اس کے دربار سے منسلک علماء و فضلاء اور مؤرخین کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔ جن میں شیخ نظام ، مولانا محمد یعقوب لاہوری ، قاضی محب اللہ بہاری ، قاضی عبدالوہاب گجراتی اور شیخ الاسلام وغیرہ علماء میں سے اور نعمت خاں عالی ، مرزا روشن ضمیر محمد افضل سرخوش اور ناصر علی وغیرہ شعراء اور فنکاروں میں سے شہرہ آفاق ہیں۔

شاہی کتب خانہ جو اسلاف سے چلا آرہا تھا اسےعالمگیر نے مزید ترقی دی۔ خود کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا اور کتب خانہ کے مشمولات کا اسے پورا علم رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کے سامنے 'نجوم الفرقان' کی تعریف کی گئی تو اس نے اپنے کتب خانہ کا حوالہ دے کر جواب دیا کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کتابیں لکھی گئی ہیں[1]۔

اورنگ زیب کی دین سے وابستگی حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات کی عکاس اور اکبری دور کے الحاد کا مکمل رد عمل تھی۔ وہ ہمیشہ باوضو رہتا اور اس کی زبان پر کلمہ طیبہ کا ہمیشہ ورد جاری رہتا ، نماز مسجد میں اول وقت جماعت کے ساتھ ادا کرتا۔ خضوع وخشوع کے ساتھ سنن و نوافل پڑھتا ، ایام بیض (چاند کی تیرھویں ، چودھویں اور پندرھویں تاریخوں) کے روزوں کی پابندی کرتا۔ عام مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں نماز جمعہ ادا کرتا۔سال کی مخصوص راتوں کوشب بیداری کرتا۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام خود بھی کرتا اور اپنی اولاد سے بھی کراتا۔ رمضان کے مقدس مہینے میں رات کا کافی حصہ بیدار رہتا اور علماء وصلحاء کی صحبت میں گزارتا۔ حج ادا نہ کر سکا اور اس کی تلافی حجاج کے ساتھ رعایات کے ذریعہ کرنے کی کوشش کی۔ ہر دوسرے تیسرے سال حرمین کے لیے کثیر رقم بطورِ خیرات روانہ کرتا۔

مکروہات و محرمات سے مکمل پرہیز تھا۔ سرود سے خود بھی متنفر تھا اور جو دوسرے لوگ اس سے پرہیز کرتے ان کی بھی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اس کے عہد میں زنانِ بازاری کو دارالحکومت سے خارج کر دیا گیا تھا اور احتساب کا محکمہ سرگرمی سے نواہی و محرمات کی روک تھام میں مصروفِ عمل رہا[2]۔

ثقافتی اور فکری ماحول

تعلیم و تعلم اس دور میں: ابتدائی مکاتب کے لیے اکبر نے جو منہج جاری کیا تھا

---

۱ - مزید معلومات کے لیے 'تمدنی کارنامے' ص ۲۸۰ تا ۸۱ اور اسلامی کتب خانے دیکھیے۔

۲ - مآثر عالمگیری ، ص ۲۸۲ تا ۲۸۵ بزم تیموریہ ، ص ۲۲۲ تا ۲۹۳ پر مزید تفصیلات یکجا ملیں گی۔

اس کے نتائج کے بارے میں ہمارے پاس معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں ۔ بہر حال اتنا معلوم ہے کہ اس وقت سے یا اس سے پہلے مسلمانوں کے مکاتب میں جو ابتدائی تعلیم فارسی زبان میں ہوتی تھی اس میں ہندو بھی مسلمانوں کے ساتھ شریک تھے ۔ اس فارسی نصاب کی دو قسمیں تھیں : جو طلبہ عربی زبان اور دینی علوم میں مہارت اور تبحر حاصل کرنا چاہتے تھے ، وہ اسے مختصر کر دیتے تھے اور 'کریما' ، 'گلستان' ، 'بوستان' 'سکندر نامہ' وغیرہ چند کتابوں کے ذریعے فارسی کا ذوق پیدا کرنے کے بعد عربی کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے[1] ۔ لیکن جن لوگوں کو دفتری منصوبوں کے لیے فارسی میں مہارت پیدا کرنے کی ضرورت تھی ، ان کے لیے نصاب کافی وزنی تھا ۔ 'گلستان' ، 'بوستان' کے بعد 'انشائے یوسفی' ، 'انشائے ابوالفضل' وغیرہ ایسی انشاء کی کئی بڑی کتابیں پہلے درجات میں شامل تھیں اور اس کے بعد نظم ، افسانہ ، تاریخ اور اخلاق سے متعلق نہایت معیاری اور مستند کتابیں اگلے درجات میں زیرِ درس رہتی تھیں ۔ ان کتابوں کے ذریعے اسلامی ثقافت مسلمان اور ہندو دونوں سوسائٹیوں میں پروان چڑھتی اور باہمی خوشگوار زندگی بسر کرنے کے لیے علم و ادب کا ایک مشترک میدان ہاتھ آتا ۔ چنانچہ ہندو فضلاء کے قلم سے شعر و انشاء ، لغت اور تاریخ کے فنون میں فارسی کا کافی ذخیرہ اس وقت دستیاب ہے ، جس میں فارسی کے علاوہ اُن کے عربی پر عبور کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں[2] ۔

جہانگیر نے ایک فرمان جاری کیا تھا کہ جو امیر یا دولتمند سیّاح لاوارث فوت ہو، اس کی املاک بحقِ شہنشاہ ضبط ہوں اور ان سے مدارس اور خانقاہوں کی تعمیر اور مرمت کے مصارف ادا ہوں ۔ بہت سے مدارس و مکاتیب جو تیس تیس سال سے وحوش وطیور کے مسکن بنے ہوئے تھے ، جہانگیر نے مرمّت کرا کے انہیں معلّمین سے آباد کیا ۔

شاہجہان کے عہد میں بھی وہ تمام درسگاہیں جو عہدِ سابق میں قائم ہوئی تھیں بدستور علم کی خدمت میں مصروف رہیں اور ان کے نام کے اوقاف بدستور جاری رہے ۔ خود اس نے جامع مسجد دہلی کے ساتھ اس کے جنوب میں ایک شاہی مدرسہ بھی قائم کیا تھا ۔ جس کا 'نام دارالبقاء'[3] تھا ۔(یا ممکن ہے دارالبقاء شاہی مدرسہ کے علاوہ ہو) جس کی نگرانی صدرالدین صدر الصدور کے سپرد تھی اور جس کے پاس ہی دو حوض ، ایک

---

۱ ۔ مثلاً مولانا حکیم عبدالحئی ، شیخ محمد افضل الہ آبادی کے حالات میں لکھتے ہیں : قرأ الرسائل المختصرة و میزان الصرف و الضوء و التہذیب و شرح الشمسیة و شرح الوقایہ و مختصر المعانی و شرح المطالع و تفسیر البیضاوی و شرح حکمة العین (نزہة الخواطر ۶ : ۲۶۹ باختصار) ۔

۲ ۔ اس نصاب کی کچھ تفصیلات ہندوستان کی اسلامی درسگاہیں ، ص ۱۰۳–۱۲۳ پر ملیں گی ۔

۳ ۔ اسلامی درسگاہیں ، ص ۲۳ ۔

مسجد ، شفاخانہ اور بازار واقع تھا[1] ۔

اورنگ زیب کے عہد میں خصوصاً عربی کے تعلیم و تعلم کی طرف توجہ بڑھ گئی ۔ اس نے اپنی حدود مملکت میں بیشمار مدارس ومکاتیب قائم کیے۔ سترھویں صدی عیسوی سے لے کر بیسویں صدی کی ابتدا تک علمائے فرنگی محل کی شہرت بر صغیر کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھی اور تمام عربی مدارس کے کتب خانے ان علماء کے حاشیوں سے آراستہ کتابوں سے اب بھی بھرے پڑے ہیں ۔'فرنگی محل' لکھنؤ کا ایک محلہ تھا جس میں ایک فرانسیسی کی متروکہ جائیداد تھی ۔ اورنگ زیب نے وہ جائیداد نظام الدین سہالوی کے خاندان کے سپرد کی اور وہیں ان کا دارالعلوم قائم ہوا ۔ ملک کے مختلف حصوں میں عالمگیر نے طلبہ کے لیے وظائف مرتب کیے ۔ بالکل ابتدائی کتاب 'میزان' پڑھنے والے کو روزانہ ایک آنہ یومیہ ، ذرا آگے قدم بڑھانے والے کو دو آنہ یومیہ اور 'شرح وقایہ' پڑھنے والے کو آٹھ آنہ یومیہ (پندرہ روپیہ ماہوار) دیا جاتا ۔ اس زمانہ کے نرخوں کے لحاظ سے یہ بہت گراں قدر وظائف تھے۔ اس نے صوبہ گجرات کے دیوان کو حکم دیا کہ مملکت محروسہ کے اہم علاقوں میں مدرس مقرر کیے جائیں ۔ طالب علموں کو 'میزان' سے لے کر 'کشاف' تک کی تعلیم دی جائے اور ان کو سرکاری خزانہ سے حسب رائے صدر صوبہ و تصدیق مدرس وظائف دیے جائیں۔ چنانچہ احمد آباد ، سورت اور نہروالہ کے لیے تین مدرس مقرر[2] کیے گئے ۔گجرات کی کوئی خصوصیت نہیں تھی ۔ اس قسم کے احکام دوسرے صوبوں میں بھی جاری تھے ۔ مصنف 'ماثر عالمگیری' لکھتا ہے :

> "در جمیع بلاد و قصبات این کشور وسیع فضلاء و مدرسان را بوظائف لائقہ از روزانہ و املاک موظف ساختہ برائے طلبۂ علوم وجوہ معیشت در خور حالت و استعداد مقرر فرمودہ بود" ۔

گجرات کے بوہروں کے بچوں کے لیے تعلیم لازمی اور جبری قرار دی گئی تھی ۔ ان کے لیے بہترین اساتذہ مقرر کیے گئے اور امتحان کا طریقہ رائج کیا گیا ۔ فضلاء اور طلبہ کے لیے مدد معاش اور وظائف کا نظام ہندو رعایا کے لیے بھی رائج تھا ۔ بہت سے ہندو خاندانوں میں اب بھی ایسے دستاویز پائے جاتے ہیں جن کے ذریعہ اس قسم کی امداد

۱۔ مسلم ثقافت بحوالہ آثار الصنادید ، باب سوم ۲۹ ۔

۲۔ مدرس ، مکتب ، مکتب مدرسہ کی اصطلاحیں اسی زمانے میں بچوں کی متوسط درجہ کی اور مستعد طلبہ کی درسگاہوں کے لیے مقرر تھیں ۔ مدرسہ گویا وہ تھا جسمیں میزان (ابتدائی) سے لے کر کشاف (منتہیانہ درجہ) کی پڑھائی کا انتظام تھا ۔ بعض مدارس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے درجات کے لیے معاون بھی ہوتے ہوں گے ۔

جاری کی گئی تھی[۱] -

نصابِ تعلیم : عربی کا نصاب تعلیم جہانگیر کے زمانے میں تقریباً وہی تھا جس کی تفصیل فصلِ اول میں گذر چکی ہے - تاہم اس دور کے نصاب میں معقولات کا پلہ بھاری ہے اور فقہ ، تفسیر اور حدیث کی کمی نظر آتی ہے - یہی وہ تبدیلی ہے جو اکبری دور کے بعد ہندوستان کے نصاب میں بتدریج ہونے لگی - جیسا کہ فصل اول میں گزر چکا ہے یہ تبدیلی میر فتح اللہ اور دوانی کے دوسرے تلامذہ کی پیدا کردہ تھی -

عہدِ جہانگیر میں اور اس کے بعد ایران سے درآمد شدہ یہ علوم ایک طرف وجیہہ الدین[۲] علوی اور دوسری طرف میر فتح اللہ شیرازی[۳] کے تلامذہ کی وساطت سے تمام شمالی ہند میں پھیل گئے[۴] -

حکیم کامران و حکیم دستور بلخی

شہنشاہ اکبر کے عہد میں آزاد خیالی آ گئی تھی - عہد جہانگیری میں جہاں تک شاہی دربار کا تعلق ہے وہ آزادی نہ رہی اور مذہبی روایات کا احترام رواج پذیر ہونے لگا - تاہم ملک کے دوسرے حصوں میں وہ اثرات باقی تھے اور چند آزاد خیال معقولی حکماء اپنے خیالات کو چند برگشتہ محبانِ فلسفہ تک پہنچاتے رہتے تھے - یہ حالت عہد شاہجہانی تک متعدی رہی - مؤلف 'دبستانِ مذاہب' نے خوب تجسس کے ساتھ اس وقت کے کئی ایسے نوادر چن چن کر جمع کیے ہیں ، انہی میں کامران اور دستور بلخی جیسے حکماء کے حالات بھی ہیں جو علومِ فلسفہ میں علمی کمال کی بنیاد پر چند اصحاب کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے - یہ دونوں ''فلسفہ مشائین'' (نو افلاطونیت) کے ماہر تھے - ان میں سے ملا دستور بلخی مولداً ، اصفہانی نسلاً ، بلخ میں فاضل مرزا جان کے تلامذہ سے استفادہ کرنے کے بعد ایران آیا اور میر باقر داماد بہاءالدین عاملی اور میرزا ابولقاسم فندرسکی وغیرہ شیراز کے فضلاء کی صحبتوں سے علمی فائدہ اٹھایا - پھر وہاں سے پاک و ہند پہنچا -

---

۱ - ان تفصیلات کے لیے دیکھیے اسلامی درسگاہیں ، ص ۸۰ تا ۸۱ -

۲ - سلسلہ تلمذ وجیہ الدین علی - ضیاء الدین نیوتنی - جمال کوروی - لطف اللہ کوروی - ملا جیون وغیرہ -

۳ - سلسلۂ تلمذ - فتح اللہ شیرازی ، عبدالسلام لاہوری ، عبدالسلام دیوی اور ان سے محمد افضل جونپوری ، محب اللہ الہ آبادی ، قاضی عبدالقادر لکھنوی وغیرہ -

۴ - عوارف المعارف ، ص ۱۴ ، ۱۵ -

حکیم کامران شیرازی وطن میں علوم فلسفہ پڑھ کر گوا آیا ۔ وہاں عیسائی بن کر پادریوں سے انجیل وغیرہ کے علوم سیکھے۔ پھر برّ صغیر کے ہندو راجوں سے واقفیت پیدا کر لی اور برہمنوں سے ہندؤوں کے علوم حاصل کیے ۔ دستور اور کامران دونوں تجارت سے گزر بسر کرتے تھے اور انہوں نے اپنے لیے ایک فلسفیانہ ضابطۂ مذہب و اخلاق چن لیا تھا ۔ اس میں گوشت کھانا ممنوع ، مگر شراب پینا جائز تھا اور دعائیں واجب ، عقول ِ نفوس (مجردات) اور کواکب سے مانگی جاتی تھیں ۔

اورنگ زیب کے عہد میں دو تبدیلیاں خاص طور پر ہونے لگیں ۔ پہلی یہ کہ عربی علوم کی طرف شہنشاہ کی توجہ ہوگئی ۔ اکبر کے فرمان اور اورنگ زیب کے فرمان اس بارے میں دو مخالف سمتوں کی رہنمائی کرتے ہیں اور اکبر کے معاشرتی علوم اور بیاکرن نیائے وغیرہ کے مقابلہ میں اورنگ زیب کے فرمان میں باقاعدہ میزان سے لیکر کشاف تک کے درس زور دیا گیا ۔ اس فرمان سے عربی کو فروغ تو ہوا ، لیکن علوم عقلیہ کا جو چرچا ہونے لگا تھا وہ کم نہ ہو سکا ۔ دوسری تبدیلی یہ ہوئی کہ اس دور میں علوم کے فروغ کے بارے میں برّ ِ صغیر خود کفیل ہونے لگا ۔ اب تک برّ ِ صغیر علوم کے بارے میں عموماً ایران یا عرب سے متاثر ہوتا تھا ، مگر اورنگ زیب کے عہد اور نظام ِ تعلیم میں ایرانی علماء اور علوم کو وہ سرپرستی نہ مل سکی جو ہمایوں تا شاہجہان کے ادوار میں ملا کرتی تھی ۔ دوسری طرف گجرات کے خاتمہ اور سمندر پر یورپین ممالک کے قبضہ کے ساتھ عرب ممالک کے ساتھ عملی روابط بھی نسبتہً کم ہو گئے ۔ اس لیے اس طرف سے بھی علوم کے فیضان میں کمی رہی ۔ اورنگ زیب کی تمام توجہ 'فتاویٰ عالمگیری' کی طرف مبذول رہی ۔ یہ غالباً ایرانیت کے خلاف تورانیت کا ردّ ِ عمل تھا ، جس کا اثر اورنگ زیب نے اپنی شاہزادگی کے زمانے سے قبول کیا تھا ۔

چند مشاہیر اہل ِ علم

اس دور کے مشاہیر اہل ِ علم کا ذکر حصہ دوم (ضمیمہ) میں ہو گا ۔ چھ حضرات یعنی شیخ مجدّدؒ ، شیخ محدّث ، مولانا محمود جونپوری ، مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی ، میر زاہد ہروی اور قاضی محب اللہ بہاری کی شخصیتیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں ۔ ان میں سے شیخ مجدّد کا تذکرہ ارباب ِ تصوّف کے عنوان کے تحت کیا جائے گا ۔ بقیہ حضرات سے متعلق ضروری معلومات مندرجہ ذیل ہیں :

شیخ محدّثؒ

جیسا کہ فصل ِ اول میں ذکر ہو چکا ہے کہ مولانا شیخ عبد الحق بن سیف الدین

دہلوی نے درس و افادہ پر اپنی توجہ مرکوز کر دی تھی ۔ طبیعت مائل بہ سکون اور مرنجان مرنج تھی اس لیے آپ نے منکر پر نکیر سے زیادہ معروف کی اشاعت پر زور دیا ۔ اصلاحِ احوال کی خاطر بعض نیک سیرت امراء کے ساتھ روابط قائم کیے ۔ جن میں سے نواب مرتضیٰ خان فرید کا نامِ گرامی خاص طور پر معروف ہے ۔ جہانگیر کی تخت نشینی میں ان کی مساعی کو بڑا دخل تھا ۔ اسی بنا پر شیخ محدثؒ نے جہانگیر کے تخت نشین ہوتے ہی نواب صاحب کو ایک مکتوب لکھا ۔ اس میں اصلاحِ احوال کی طرف خاص توجہ دلائی اور یہ تلقین کی کہ اسے بادشاہ کی نظر سے گزارا جائے ۔

دربارِ شاہی سے اجتناب کے باوجود آپ نے خاص بادشاہ کی تلقین کی خاطر ایک رسالہ بنام 'الرسالة النورية السلطانيه'[۱] فارسی میں لکھا اور ایک 'چہل حدیث' کا فارسی میں ترجمہ کیا ۔ جہانگیر اور شاہجہان دونوں ان کے قدردان تھے اور جہانگیر نے اپنی توزک (وقائع سال چہاردہم جلوس) میں ان کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کیا ہے ۔ شیخ محدّثؒ نے ۱۶۴۲ع/۱۰۵۲ھ میں ۹۴ سال کی عمر میں وفات پائی ۔ سال ولادت کی تاریخ 'شیخِ اولیا' سے اور سال وفات کی 'فخر العالم' سے نکلتی ہے ۔

شیخ محدّثؒ کا بڑا کارنامہ علمِ حدیث اور خصوصاً 'مشکٰوة المصابیح' کے درس و مطالعہ کی برصغیر میں ترویج و اشاعت ہے ۔ حضرت شیخ نے مشکٰوة کی ایک شرح ('اشعة اللمعات') فارسی میں لکھی ، جو بارہا چھپ چکی ہے ۔ ایک اور فاضلانہ 'شرح لمعات التنقیح' عربی میں ہے ۔ جس کا ایک عمدہ قلمی نسخہ اسلامیہ کالج پشاور میں بھی ہے ۔ علاوہ ان کے تقریباً ساٹھ تصنیفات ہیں ، جن میں سے نصف کے قریب عربی یا عربی و فارسی میں مصبوح ہیں ۔ بقیہ فارسی میں ہیں ۔ فارسی کتابوں میں 'اخبارالاخیار' متداول اور مقبول ہے ۔ عربی کتابوں میں 'ما ثبت بالسنة' (فضائل شہورو ایام سے متعلق) اور 'رسالہ مصطلح الحدیث' (معروف بہ مقدمہ مشکوٰة) مطبوع اور متداول ہیں ۔ مولانا شیخ عبد الحق محدثؒ دہلوی کی ایک عربی تصنیف 'لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰة المصابیح' ہے ۔ خصوصیت کے ساتھ کتاب کا مقدمہ (جو 'مقدمة اللمعات' کے نام سے مشہور ہے) بہت مقبول ہے ۔ اس میں شیخ نے اصولِ حدیث پر بڑے عمدہ اور جامع انداز سے بحث کی ہے اور مصطلحات حدیث کو سہل الفہم اسلوب کے ساتھ پیش کیا ہے ۔ وہ علمِ حدیث کی ضرورت و اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

فان اولی ما یعتنی به أرباب الهمم العالیة فی طلب الکما لات و السعادات

---

۱ ۔ قلمی نسخہ کتاب خانہ پشاور ۔ اس رسالہ میں آپ نے داد رسی کے لیے زنجیر لٹکانے کی تدبیر بعض قدیم سلاطین کی طرف منسوب کی ہے ۔ بہت ممکن ہے کہ جہانگیر نے زنجیر عدل کا تصور اسی رسالہ سے لیا ہو ۔

و أهم ما يصرف فى تحصيله نقود الاعمار و الاوقات علم الدين ، الذى يرفع الله الذين اوتوه مراتب ودرجات ، ويكشف بها عنهم العمى ، و يحفظهم عن الردى ، و يهديهم إلى الهدى ، و يعصمهم عن الضلالة ، ويخرجهم من الظلمات ، و أفضل العلوم و أشرفها و أعلاها و أسناها علم التفسير و الحديث ، فكلاهما الأصل المقصود بالذات ، وما سواهما من العلوم وسائل اليها ، و آلات او فروع لها و نتائج و ثمرات ، و علم الحديث هوالمرجع والمآل ، أو هو بيان و تفسير لكتاب الله المتعال ، اذ احكام الكتاب كلها كليات و مجملات ومبهمات ، والسنة تبين جزئياتها ، وتفصل مجملاتها ، و تعين كيفياتها و كمياتها وهيأتها و صفاتها ، و سائر الاوضاع و الأحوال للحرام و الحلال[1]"۔

(کمالات و سعادات کی طلب بلند ہمت والے لوگ جس چیز کا سب سے زیادہ اہتمام کرتے ہیں اور جس کی تحصیل میں عمریں اور اوقات صرف کرتے ہیں اس میں سے زیادہ اہم علمِ دین ہے ۔ جس کے باعث اللہ تعالیٰ اہلِ علم کے مراتب و درجات بلند کرتا ہے ۔ ان کی نگاہوں کے پردوں کو دور کرتا ، انہیں ہلاکت سے محفوظ رکھتا ، ہدایت کی راہ دکھاتا ، گمراہی سے بچاتا اور تاریکیوں میں سے نکالتا ہے ۔ تمام علوم میں سے افضل و اعلیٰ ، اشرف و روشن ترین علم تفسیر و حدیث ہے کیونکہ یہ دونوں مقصود بالذات ہیں ۔ باقی علوم ان کا وسیلہ ، ذریعہ اور فروعات اور نتائج و ثمرات ہیں اور علم الحدیث مرجع و مآل یا اللہ تعالیٰ کی کتاب کا بیان اور تفسیر ہے ۔ کیونکہ کتاب اللہ کے احکام یا تو کلیات ہیں اور یا مجملات و مبہمات ہیں اور سنت ان کی جزئیات کو بیان کرتی ، مجملات کی تفصیل بتاتی اور ان کی کیفیت و کمیت اور ہیئت و صفت کی تعیین کے علاوہ دیگر احوال و کوائف اور حلال و حرام کی بھی تعیین کرتی ہے[2]) ۔

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی

آفتابِ پنجاب مولانا عبدالحکیم شمس الدین سیالکوٹ کے رہنے والے اور مولانا کمال الدین بن موسیٰ (متوفی ۱۶۰۸ء/۱۰۱۷ھ) کے شاگرد تھے ۔ جن کے وسیع حلقہ تلامذہ میں حضرت مجددؒ الف ثانی اور علامی سعداللہ خان جیسے ناموراصحاب شامل تھے ۔

---

۱ ۔ لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح ۱ : ۱۲ ۔

۲ ۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے : حیات شیخ عبد الحق از خلیق احمد نظامی ۔ مقالہ ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم در انگریزی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام طبع جدید ۔ دونوں مقامات پر مزید مراجع بھی درج ہیں) ۔

مولانا عبدالحکیم عہدِ اکبری میں تحصیلِ علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد عہدِ جہانگیری میں اپنے ہی شہر میں آسودگی کے ساتھ درس و افادہ میں مصروف رہے ۔ عہدِ شاہجہانی آیا تو مولانا عبدالحکیم کی علمی شہرت اطراف میں پھیل گئی تھی اور مولانا کی پذیرائی دربار میں بھی بہت خوب ہوئی ۔ دو دفعہ بادشاہ نے انہیں چاندی کے ساتھ تولا اور ہر دفعہ وہ چاندی (چھ لاکھ روپیہ) انہیں انعام میں دی گئی ۔ کئی دیہات جاگیر کے طور پر ملے چنانچہ وہ فراغِ خاطر کے ساتھ ''تخم علم و فضل در سر زمینِ سینہ ہا و سفینہ ہا[1] '' کی کاشت کرتے رہے ۔ تصانیف کی شہرت عرب و روم تک پھیلی ۔ المحبی فرماتے ہیں ''جمع الفضائل عن ید وحاز العلوم و انفرد و أفنی کہولتہ وشیخوختہ فی الانہاك علی العلوم وحل دقائقہا ومضی من جلیہا و غامضہا علی حقائقہا''[2] :

(انہوں نے فضائل کا اکتساب کیا اور علوم میں منفرد مقام پایا اور اپنی تمام عمر علوم میں منہمک رہنے ، ان کے مشکل مسائل حل کرنے اور گہرے حقائق معلوم کرنے میں صرف کی) ۔

تصانیف کی فہرست مآثر الکرام میں یہ دی گئی ہے ۔ 'حاشیہ تفسیر بیضاوی' ، 'حاشیہ مقدمات تلویح' ، 'حاشیہ مطول' ، 'حاشیہ شریفیہ'، 'حاشیہ شرح مواقف' ، 'حاشیہ شرح عقائد' 'تفتازانی حاشیہ خیالی' ، 'حاشیہ شرح شمسیہ' ، 'حاشیہ عبدالغفور' ، 'تکملہ حاشیہ عبدالغفور' ، 'حاشیہ شرح مطالع' ، 'حاشیہ شرح عقائد ملا جلال' ، 'درہ ثمینہ (رسالہ خاقانیہ[3]) در اثبات (علم) واجب تعالیٰ' ، 'حواس در کنار شرح حکمۃ العین' ، 'حواشی در کنار شرح ہدایۃ الحکمۃ' ، 'حواشی در کنار مراح الارواح' ۔ ان کتابوں میں سے کئی چھپ چکی ہیں اور غیر مطبوعہ تصانیف کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں ۔ ان کے علاوہ اور بھی تصانیف ہیں ۔ مثلاً 'حاشیہ کشاف' وغیرہ ۔ فارسی میں 'ترجمہ غنیۃ الطالبین' جو انہوں نے شاہ بلاول قادری[4] لاہوری متوفی ۱۶۳۶ء/۱۰۴۶ھ کی فرمائش پر کیا تھا مطبع امید لاہور سے چھپ گیا ہے ۔

علامہ بیضاوی کی تفسیر 'انوارلتنزیل و أسرار التأویل' صدیوں سے اسلامی درسگاہوں اور جامعات کے نصاب میں شامل رہی ہے اور ہر دور اور ہر اسلامی ملک کے اہلِ علم کے ہاں ایسے مقبولیت حاصل رہی ہے اور اس کی بیسیوں شروح و حواشی لکھے گئے

---

۱ ۔ مآثر الکرام ، ص ۲۰۵ ۔

۲ ۔ خلاصۃ الاثر ۲ : ۳۱۸ ۔

۳ ۔ تقریباً ۲۰ صفحے کا ایک چھوٹا سا مگر اہمیت کا حامل رسالہ ۔

۴ ۔ ان کے حالات کے لیے دیکھئے اولیائے لاہور ، ص ۷۵-۸۵

۵ ۔ حاشیۃ البیضاوی ، ص ۶۶۳ ۔

ہیں 'خصوصاً برّ صغیر پاک و ہند اور ترکی میں ۔ ان تمام شروح و حواشی میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کا 'حاشیۃ البیضاوی' (یا 'حاشیۃ القاضی البیضاوی'[۵]) سب سے زیادہ مقبول و متداول ہے ۔ یہ صرف سورۃ الفاتحہ سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران پر مشتمل ہے ۔ قاضی بیضاوی نے بھی اپنا زور قلم زیادہ تر انہی سورتوں کی تفسیر پر صرف کیا ہے ۔ اس لیے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کا صرف انہی سورتوں کو منتخب کرنا اور انہی پر اکتفا کرنا بجا اور کافی ہے ۔

ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بیضاوی اور زمخشری کی تفسیروں کا گہرا مطالعہ کرنے کے علاوہ ان کی تدریس پر بھی کافی عمر صرف کی تھی اور دونوں پر اپنے تنقیدی و تشریحی رشحات بھی سپردِ قلم کئے تھے ۔ اس لیے وہ اپنے 'مقدمہ حاشیۃ البیضاوی' میں یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ "جل ان یکون شریعۃ لکل وارد وان یطلع علیہ إلا واحد بعد واحد فقلت لہم أیہا الخلان الدینیۃ والاخوان الروحانیۃ انی آنست نارا فی بوادی ھذا الکتاب آتیکم منہا بقبس لعلکم تصطلون[۱]" (یہ تفسیرِ بیضاوی اس قدر اہم کتاب ہے کہ اس کے پنگھٹ پر ہر پیاسا وارد نہیں ہو سکتا اور اس سے کوئی خال خال ہی واقف ہو سکتا ہے ۔ چنانچہ میں نے اپنے دینی دوستوں اور روحانی بھائیوں سے یہ کہا کہ میں نے اس کتاب کی وادی میں آگ دریافت کر لی ہے اس میں سے میں تمہارے لیے ایک چنگاری لے آتا ہوں تاکہ تم تاپ سکو) ۔ سیالکوٹی کی یہ کتاب 'خلاصۃ الاثر' کے مصنف المحبی کی نظر سے بھی گزری تھی ، چنانچہ وہ اس کا ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے : "حاشیۃ علی تفسیر البیضاوی علی بعض سورۃ البقرۃ ، رأیتہا و طالعت فیہا أبحاثاً دقیقۃ" (تفسیر بیضاوی میں سے سورہ بقرہ پر ان کا حاشیہ میں نے بھی دیکھا ہے اور اس میں میں نے بڑی دقیق بحثوں کا مطالعہ کیا[۲]) ۔

ملا عبدالحکیم کا یہ حاشیہ بڑا دقیق ، پر مغز اور کثیر الفوائد ہے ۔ بیضاوی نے جن فنون کے سہارے یہ تفسیر مرتب کی تھی سیالکوٹی نے ان تمام فنون کے دقائق و غوامض پر گہری نظر رکھنے کے علاوہ دو چند فنون و معارف کی مدد سے اپنے حاشیہ کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے ۔ اس حاشیہ کے فوائد مختصراً یہ ہیں :

۱ ۔ قواعد صرف و نحو کی بحثیں ۔

۲ ۔ نامانوس اور مشکل مفردات کی لغوی تشریحات جہاں بعض اوقات وہ فارسی میں بھی تشریح کرتے ہیں[۳] ۔

---

۱ ۔ حاشیۃ البیضاوی ، ص ۲ ۔

۲ ۔ خلاصۃ الاثر ۳ : ۳۱۸ ۔

۳ ۔ حاشیہ بیضاوی، ص ۹ ۔

۳ ـ علامہ بیضاوی کی بعض عبارات بڑی مغلق و دقیق ہیں جو آسانی سے سمجھ نہیں آتیں ـ سیالکوٹی نے ایسی عبارات کی بہت عمدہ تشریح کی ہے ـ

۴ ـ تفسیر بیضاوی میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کی تخریج کی ہے اور ان کے ضعف و ثقاہت کے بارے میں آئمۂ فن کی آراء و اقوال بھی پیش کیے ہیں ـ

۵ ـ بیضاوی کے شافعی نقطہ نظر کے مقابلے میں سیالکوٹی نے اپنا حنفی نقطۂ نظر بڑی وضاحت و استدلال کے ساتھ پیش کیا ہے ـ

٦ ـ تصوّف کے نکات اور صوفیہ کی آراء و اقوال کا بھی ذکر کیا ہے ـ

۷ ـ علامہ بیضاوی نے جہاں عقائد و علم الکلام کی بحث چھیڑی ہے وہاں سیالکوٹی نے ایک عمیق النظر فلسفی اور قوی الاستدلال منطقی کی حیثیت سے ان پر تفصیلی گفتگو کی ہے ـ یہ الگ بات ہے کہ ایسے مقامات پر فاضل سیالکوٹی کا فکر اس قدر بلند اور اسلوب اس قدر دقیق ہے کہ عام قاری کی رسائی مشکل سے ہو سکتی ہے ـ

۸ ـ بیضاوی نے علوم قرآن مثلاً قراءۃ ، شانِ نزول اور ناسخ و منسوخ وغیرہ بحثوں سے بھی تعرّض کیا ہے ـ سیالکوٹی نے بھی ان سے اعراض نہیں کیا ـ

۹ ـ بیضاوی نے علم المعانی کی روشنی میں بلاغت و اعجازِ قرآن کے سلسلے میں اہل سنت اورمعتزلہ کے موقف سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ربات قرآن کی جو تشریح معتزلہ کرتے ہیں ان سےاعجاز قرآن کا موقف تقویت حاصل کرنے کے بجائے کمزور ہوتا ہے ـ

۱۰ ـ علامہ بیضاوی پر ایک الزام یہ ہے کہ وہ زمخشری کے خوشہ چیں ہیں ، لیکن سیالکوٹی نے دونوں تفسیروں پر گہری نظر رکھتےہوئے تقابل و تفاضل کا منصب بھی انجام دیا ہے اور جگہ جگہ بیضاوی کی برتری کی نشاندہی کی ہے ـ مثلاً بیضاوی کے خطبہ کے ابتدائی الفاظ ''الحمدللہ الذی نزل الفرقان علی عبدہ'' کی وضاحت کرنے کے بعد سیالکوٹی لکھتے ہیں ، ''اعلم ان المصنف ادرج فی نصف الفقرۃ جمیع ما اور دہ صاحب الکشاف فی صفحۃ منہ مع حسن الاقتباس لمفتتح سورۃ الفرقان ، ففیہ اشارۃ الی ان کتابہ ھذا مع و جازۃ عبارتہ و ظھور دلالتہ یحتوی علی لب لب الکشاف مع لطائف زائدۃ علیہ''[1] ـ (کہ بیضاوی نے نصف جملہ میں وہ سب کچھ بیان کر دیا ہے جو صاحبِ 'کشاف' نے اپنی تفسیر کے پورے ایک صفحہ میں بیان کیا ہے ـ اس کے علاوہ بیضاوی کی عبارت میں سورت فرقان کے آغاز کا حسن اقتباس بھی موجود ہے ـ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ 'تفسیر بیضاوی' اختصار و وضاحت کے علاوہ 'کشاف' کے نچوڑ پر بھی حاوی ہے اور اس میں زائد نکات بھی موجود ہیں) ـ

---

۱ ـ حاشیہ بیضاوی ، ص ۵ ـ

انہوں نے ۵ جنوری ۱۶۵۶ء/۱۲ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ کو وفات پائی اور سیالکوٹ میں دفن ہوئے[۱] ۔

مولانا محمود جونپوری

مولانا محمود بن محمد فاروق جونپوری ۱۵۸۵ء/۹۹۳ھ میں پیدا ہوئے ۔ استاد الملک مولانا محمد افضل جونپوری ماژند رانی سے تکمیل علوم کی ۔

مولانا محمود تحریر کے ماہر تھے ۔ مجلس میں اہل علم پر گرفت کرنے میں طاق تھے ۔ تاہم تقریر میں تحریر کی طرح مہارت نہ تھی ۔ ان کی کتاب 'الشمس البازغة' جو انہی کی مختصر متن 'الحکمة البالغة' کی شرح ہے ، اپنی سلاست کے اعتبار سے فلسفہ کی کتابوں میں شاہکار سمجھی جاتی ہے اور آج تک مدارس نظامیہ کے نصاب میں داخل ہے ۔

'الشمس البازغة' ہندی علمائے عربیہ کی ان تصانیف میں سے ہے جنہیں برِ صغیر پاک و ہند میں بہت مقبولیت اورشہرت حاصل ہوئی ۔ یہ کتاب صدیوں مدارسِ نظامیہ کے تعلیمی نصاب میں شامل رہنے کے علاوہ برِ صغیر کی کئی ایک یونیورسٹیوں کے بعض نصابوں میں بھی شامل رہی ہے ۔ علماء نے اس کتاب پر متعدد حواشی اور شروح بھی لکھیں جن میں سے ملا حمد اللہ کا حاشیہ بہت مشہور و مقبول ہے ۔

'الشمس البازغة' ملا محمود جونپوری نے اپنی آخری بیماری کے دوران مکمل کی ۔ مصنف کا ارادہ تھا کہ یہ کتاب علوم عقلیہ کی تینوں شاخوں (المنطق ، الطبیعات اور مابعدالطبیعات) پر مشتمل ہو، مگر تنگیٔ حالات کے پیش نظر وہ صرف ایک شاخ یعنی الطبیعات پر اپنے خیالات کو مکمل شکل میں پیش کر سکے ۔ مصنف کی یہ کتاب دراصل ان کی ایک اور کتاب 'الحکمة البالغة' کی شرح ہے ۔ چنانچہ 'الشمس البازغة' میں 'الحکمة البالغہ' کا متن لفظ ''قلت'' کے ساتھ شروع ہوتا ہے جب کہ 'الشمس البازغة' کی عبارت لفظ ''اقول'' سے شروع ہوتی ہے ۔ اس کتاب کو تین فنون (ابواب) میں منقسم کیا گیا ہے ۔ فن اول میں السماع الطبیعی کی بحث ہے جس میں دو مقالے ہیں ۔ مقالہ اولی فی مبادی الاجسام (اجسام کے مبادی کے بیان میں) اور مقالہ ثانیہ فی اللواحق العامة للاجسام (اجسام کو پیش آنے والے حوادث کے بیان میں) کے بارے میں ہے ۔ فن دوم فی السماء والعالم (دنیا اور آسمان) کے متعلق ہے۔ اس میں صرف ایک ہی مقالہ ہے اور

---

۱ - مزید تفصیل کے لیے دیکھیے مآثر الکرام ، ص ۲۰۳ - ۲۰۵ سبحة المرجان ، ص ۶۶ - نزهةالخواطر ۵ : ۲۱۰-۲۱۱ - خلاصة الاثر ۲: ۳۱۸ ، بروکلمن ۲: ۴۱۷م ذیل ۲: ۶۱۳ - مقالات شبیر احمد خان غوری دارالرحیم مئی و جون ۱۹۶۷ و المعارف مارچ ، اپریل ، مئی ۱۹۶۸ زبید احمد بعدد اشاریہ ، غلام محی الدین صوفی ۲۷۵-۲۷۸ ۔

فن سوم بھی ایک ہی مقالے پر مشتمل ہے جو نامکمل ہے۔ اس میں ''فی الکون والفساد'' (کون و فساد) کی بحث ہے۔ یہ کتاب ۱۸۶۳ء/۱۲۸۰ھ میں لکھنؤ سے پہلی بار شائع ہوئی۔

فلسفہ کے علاوہ انہیں علوم بلاغت پر بھی بڑا عبور تھا جس کی شہادت ان کی 'کتاب الفوائد' سے ملتی ہے جو عضدالدین ایجی کی 'الفوائد' کی شرح ہے۔ شاہ جہاں کے دربار میں رصد بنانے کی توقع لے کر آئے۔ مگر وزیر نے حامی نہیں بھری اس لیے واپس ہوئے[1]۔ پھر شہزادہ شجاع نے اپنے ہاں بنگال بلا لیا اور کچھ مدت وہاں گزار دی۔ وہیں شیخ نعمت اللہ فیروز پوری سے بیعت بھی کر لی۔ ۲۲ فروری ۱۶۵۲ء/۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ کو وفات پائی۔ مندرجہ بالا دو کتابوں کے علاوہ 'حاشیہ میر قطبی حرز الایمان' (شیخ محب اللہ الہ آبادی کے 'تسویہ' کے رد میں) 'الدوحۃ المیادۃ فی تحقیق الصورۃ والمادۃ' رسالہ اقسام نساء' (فارسی) اور فارسی کا ایک دیوان ان کی تصنیفات ہیں[2]۔

میر زاہد ہروی

قاضی محمد اسلم کابلی ہروی کے فرزند تھے۔ ان کے والد شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں قاضی ہوئے ہیں۔ شاہجہان کے عہد میں ان کے منصب اوراعزاز میں مزید اضافہ ہوا۔ ۱۶۵۰ء/۱۰۶۱ھ میں لاہور میں وفات پائی۔ قاضی محمد زاہد اپنے والد کی زندگی میں کابل کی وقائع نویسی پر مامور ہوئے۔ عہد عالمگیری میں ترقی کر کے پہلے لشکر کے محتسب اور اس کے بعد کابل کے صدر بنے اور وہیں ۱۶۸۹ء/۱۱۰۱ھ میں وفات پائی۔ تصنیفات میں 'حاشیہ شرح مواقف' 'حاشیہ رسالہ قطبیہ' اور 'حاشیہ شرح تہذیب جلالی' (زواھد ثلاثۃ) خوب مشہور اور تا حال خال خال مقامات پر داخل درس ہیں[3]۔

میر زاہد کے یہ تینوں حواشی، جو معقولات سے متعلق ہیں، ایک مدت تک برصغیر کے عربی مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل رہے ہیں اور ہمیشہ منتہی طلبہ ہی ان حواشی کے دقیق فوائد اور باریک نکتوں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ 'رسالہ قطبیۃ' اور

۱۔ مولانا گیلانی فرماتے ہیں کہ بادشاہ کے مقربین میں داخل ہوئے (نظام تعلیم و تربیت ۱: ۲۹۳)۔

۲۔ نزھۃ الخواطر ۵: ۳۹۷-۳۹۹-۶؛ ۲۹۵۔ مآثر الکرام، ص ۲۰۲ سبحۃ المرجان، ص ۵۳-۶۶ زبید احمد، ص ۳۰۹-۳۱۰-۳۴۹ (جہاں اور مصادر کا بھی ذکر ہے) بروکلمن ۲: ۴۲۰ ذیل ۲: ۶۲۱۔

۳۔ سبحۃ المرجان، ص ۶۷۔ نزھۃ الخواطر: ۳۵۷-۶: ۳۰۶-۳۰۸-مآثر، ص ۲۰۹ زبید احمد، ص ۲۴۲-۳۲۸-۳۵۲۔ تذکرہ (اردو)، ص ۲۹۴۔

'شرح تہذیب، منطق میں نہایت جامع اور مستند کتابیں ہیں۔ ہندی علماء کی ایک بہت بڑی تعداد نے ان کے شروح و حواشی لکھے ہیں۔ لیکن ان میں میر زاہد کے حواشی اپنی بعض ممتاز خصوصیات کے باعث سب سے زیادہ مقبول ہوئے۔ میر زاہد پیدائشی طور پر ایک ماہر معقولات کی صلاحیتوں کے حامل تھے اور ہمیشہ معقولات کے درس و تدریس میں منہمک رہنے کے باعث انہیں اس میدان میں کامل قدرت حاصل ہو گئی تھی۔ اس لیے انہوں نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو دوسروں کی نسبت زیادہ قدرت و جامعیت کے ساتھ اپنے پر مغز حواشی کو پیش کیا۔ میر زاہد اپنے حواشی میں کتاب کے مشکل مقامات کے حل اور توضیح کے ساتھ ساتھ نئے نئے نکات بھی پیدا کرتے ہیں۔ کہیں کہیں مصنف پر بڑے معقول اعتراض بھی کیے ہیں جن میں سے بعض کے وہ خود جواب دیتے ہیں اور بعض کو قارئین کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ السید الشریف الجرجانی کی 'شرح المواقف، پر میر زاہد کے عمدہ حواشی میں یہ خوبیاں بکثرت موجود ہیں اور منطق ، فلسفہ اور علم الکلام میں ان کی کامل مہارت کا زندہ ثبوت ہیں۔

قاضی محب اللہ بہاری

قاضی محب اللہ بن عبدالشکور بہاری ، مولانا قطب الدین شہید سہالوی کے تلمیذ تھے۔ شہنشاہ عالمگیر نے پہلے لکھنئو کا قاضی اور پھر اپنے پوتے رفیع القدر کا استاد مقرر کیا۔ جب شہزادہ شاہ عالم کو کابل کی نیابت سپرد ہوئی تو یہ ان کے ساتھ کابل چلے گئے۔ شاہ عالم کے عہد میں صدر الصدور مقرر کئے گئے مگر جلد ہی ۱۷۰۷ء/ ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی۔ 'رسالہ جوہر فرد' ، 'رسالہ مغالطہ عامۃ الورود' اور 'متن سلم العلوم ، (مطنق میں) 'مسلم الثبوت' (اصول فقہ میں) اور ایک رسالہ اس بحث سے متعلق ہے کہ حنفیہ کا مسلک رائے کی بجائے حدیث پر مبنی ہے ، ان کی تصنیفات ہیں۔ جن میں سے سلم اور مسلم دونوں نہایت مقبول اور تاحال داخل درس ہیں۔

قاضی محب‌اللہ بہاری معقولات اور علم اصول فقہ کے مسلّم امام تھے۔ تمام ہندی علماء کی تصانیف میں سے جس قدر ان کی دو کتابوں کو مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی ، شاید ان فنون پر لکھنے والوں میں سے کسی اور عالم کی کسی کتاب کو اتنی مقبولیت و شہرت نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ ان میں سے ایک علم منطق میں 'سلم العلوم، اور دوسری علم اصول فقہ میں 'مسلم الثبوت ، ہے۔ 'مسلم الثبوت' کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ پاک و ہند کے مدارس نظامیہ میں یہ کتاب منتہی طلبہ کو پڑھائی جاتی ہے جبکہ وہ اس سے قبل اس فن میں 'اصول الشاسی، اور 'نورالانوار، وغیرہ کتب اصول فقہ سے فارغ ہو چکے ہوتے ہیں۔

قاضی صاحب نے کتاب کے دیباچے میں علم اصول فقہ کی ضرورت و اہمیت اور اس فن سے اپنے گہرے شغف کا اظہار کرتے ہوئے 'مسلم الثبوت' کی شاندار تصنیف پر ان الفاظ میں فخر کیا ہے: ''و کنت صرفت بعض عمری الی تحصیل مطالبه و وکلت نظری الی تحقیق مآربه فلم یحتجب عنی حقیقة ولم یخف علی دقیقة ، ثم لأمر ما أردت أن احررفیه سفراً وافیاً و کتاباً کافیاً یجمع الی الفروع اصولاًوالی المشروع معقولا و یحتوی الی طریقی الحنیفه و الشافعیة ولا یمیل میلا ما عن الواقعیة فجاء بفضل الله تعالٰی و توفیقه کماتری معدن أم بحر بل سحر لا یدری و سمیعة بالمسلم'' (میں نے اپنا کچھ وقت اس کے مطالب کی تحصیل پر صرف کیا اور اپنے فکر کو اس کے مقاصد کی تحقیق پر لگایا ۔ چنانچہ مجھ سے کوئی حقیقت اور کوئی نکتہ پوشیدہ نہ رہا اور کسی سبب سے میں نے اس موضوع پر ایک کافی و وافی کتاب تصنیف کرنے کا ارادہ کیا جو فروع کے ساتھ ساتھ اصول اور شریعت کی عقلی توجیہات پر مشتمل ہو اور شافعی و حنفی نظریات اصول فقہ پر حاوی ہو اور حقیقت سے یہ دور بھی نہ ہٹنے پائے۔ چنانچہ یہ کتاب اللہ کے فضل و توفیق سے ، جیسا کہ ظاہر ہے ایک معدن یا سمندر بلکہ ایک بے مثل جادو ہے اور میں نے اس کتاب کا نام 'المسلم' رکھا ہے جس کا تاریخی نام 'مسلم الثبوت' ہے[1]) ۔

'مسلم الثبوت' ایک مقدمے، تین مقالات اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے ۔ مقدمہ میں علم اصول فقہ کی تعریف ہے ۔ مقالۂ اول میں مبادیٔ علم الکلام کی بحث ہے۔ مقالۂ ثانیہ احکام پر مشتمل ہے ۔ مقالۂ ثالثہ اصول لغت سے بحث کرتا ہے اور خاتمے میں اجتہاد وغیرہ کی بحث [2] ہے ۔ 'مسلم الثبوت' اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اس میں نہ صرف حنفی اصول فقہ سے بحث ہے بلکہ شافعی اور دیگر فقہی مذاہب کے اصولوں سے بھی بحث کی گئی ہے اور یہی بات کتاب کی مقبولیت کا ایک سبب ہے۔ مقبولیت کے دیگر اسباب میں سے ایک کتاب کا اختصار اور جامعیت بھی ہے اور یہی اسباب تھے جنھوں نے علماء کو نہ صرف اس کی تدریس پر مائل کیا بلکہ اس کی شروح اور حواشی بھی لکھےجو درجن کے قریب پہنچتے ہیں ۔

فتاوئ عالمگیری : اورنگ زیب عالمگیر کے دور کا سب سے عظیم شاہکار 'فتاوائے عالمگیری' ہے ۔ کتاب اور اس کا اردو ترجمہ مطبوعہ اور متداول ہیں ۔ اورنگ زیب عالمگیر نے قضاۃ کے لیے قانون شریعت کا مستند مجموعہ مہیا کرنے کی خاطر اس کی تالیف پر شاہی خزانہ سے دو لاکھ روپیہ صرف کیا ۔ پایۂ تخت کے علماء

---

۱ - مقدمة مسلم الثبوت ۔
۲ - ایضاً ۔

و فضلاء کے علاوہ اور مملکت میں جہاں بھی کسی بڑے فقیہ کی شہرت تھی اسے بلا کر اس کام میں شریک کیا گیا۔ شیخ نظام الدین برہانپوری کی نگرانی میں چالیس پچاس فقہاء نے یہ منصوبہ سرانجام دیا۔ کتاب کے چار حصوں میں سے قاضی محمد حسین جونپوری، سید علی اکبر سعد اللہ خانی، ملا حامد جونپوری اور محمد اکرم لاہوری کے سپرد ایک ایک حصہ تھا اور ہر ایک صاحب کے ساتھ تقریباً دس دس معاون مقرر کئے گئے تھے۔ ان معاونین کی پوری فہرست دستیاب نہیں۔ تاہم سابق الذکر پانچ کے علاوہ مندرجہ ذیل بائیس اصحاب کے اسمائے گرامی (کل ستائیس نام) ملتے ہیں[1]۔

۱ - ابوالخیر ٹھٹھوی سندھی۔

۲ - رضی الدین بھاگلپوری۔

۳ - ابوالواعظ ہرگامی۔

۴ - نظام الدین ٹھٹھوی سندھی۔

۵ - وجیہ الدین گوپاموی۔

۶ - مفتی ابوالبرکات دہلوی۔

۷ - احمد بن ابی المنصور گوپاموی

۸ - جلال الدین مچھلی شہری۔

۹ - شاہ عبدالرحیم دہلوی۔

۱۰ - قاضی عصمت اللہ لکھنوی۔

۱۱ - محمد جمیل جونپوری۔

۱۲ - محمد دولت فتح پوری سہالوی۔

۱۳ - محمد سعید سہالوی۔

---

۱ - یہ نام کچھ نزھۃ الخواطر سے اور کچھ بزم تیموریہ سے مل گئے ہیں۔ ان میں سے بعض کے بارے میں کچھ مزید تفصیلات اس سے آگے آئینگی۔ مخدومی ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم نے مصنفین فتاویٰ پر ایک مضمون ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین میں شائع کیا تھا جو اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۶۹ء میں دوبارہ شائع ہوا ہے۔ اس میں بھی مرآۃ العالم کے حوالہ سے کچھ مزید معلومات ملیں گی۔ ملا حامد جونپوری کا سنہ وفات معلوم نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر زبید احمد نے سال وفات ۱۷۵۹ء/۱۱۷۳ھ درج کیا ہے وہ کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ان کے دوسرے حالات کے لیے نزھۃ ۶ : ۶۰ اور میگزین (مندرجہ بالا) دیکھیے۔

۱۴ - محمد غوث کا کوروی ۔

۱۵ - میر محمد قنوجی ۔

۱۶ - محمد شفیع ۔

۱۷ - وجیہ الرب ۔

۱۸ - محمد فائق ۔

۱۹ - امیر میران[1] علامہ ابوالفرح معروف بہ سید معدن ۔

۲۰ - غلام محمد قاضی القضاۃ لاہور ۔

۲۱ - عنایت اللہ مونگھوری ۔

۲۲ - محمد رفیع (معاون ملا وجیہ) ۔

شیخ نظام الدین برہانپوری ہفتہ میں تین روز اسے عالمگیر کو سناتے اور عالمگیر کی نظر میں جو مسئلہ کھٹکتا اس پر شیخ صاحب سے بحث و تمحیص ہوا کرتی تھی ۔ شاہ عالمگیر نے فتاویٰ کے فارسی ترجمہ کے لیے بھی مولانا چلپی عبداللہ رومی[2] کو مقرر فرمایا تھا ۔ مگر شاید یہ ترجمہ تکمیل پذیر نہ ہو سکا ۔

مراکزِ علم

اس دور میں علماء کی تعداد بڑھنے لگی اور فصل اول کے ذکر کردہ مراکز کے علاوہ سیالکوٹ دیوہ ، جائس ، الہ آباد اور بنارس وغیرہ میں چند مراکز کا مزید اضافہ ہوا ۔

اس دور کے مدارس

فصل اول میں بیان ہو چکا ہے کہ اسلامی دور کی تقریباً ہر مسجد ، خانقاہ ، مزار اور کسی عالم کا گھر مدرسہ کا کام دیا کرتا تھا ۔ بہر حال مدرسہ کے نام سے جن مدارس کا نام لکھتے ہیں ان میں سے دہلی میں مدرسہ دارالبقاء ، جامع مسجد آگرہ کے ساتھ جہاں آرا بیگم کا بنا کردہ مدرسہ ، لاہور میں مدرسہ مسجد وزیر خاں ، سیالکوٹ میں مدرسہ مولانا عبدالحکیم ، تھانیسر میں دارا شکوہ کا تعمیر کردہ مدرسہ ، بیانہ میں مدرسہ قاضی

---

۱ - ممکن ہے امیر میران اور علامہ ابوالفرح دو شخصیتیں ہوں ۔ تحقیق نہ ہو سکی ۔

۲ - مصنف فریدۃ الزمانۃ فی تفسیر انا عرضنا الامانۃ ۔

رفیع الدین ۔ قطب الدین شہید سہالوی کے دادا کا مدرسۂ سہالی ، جس میں وہ خود پڑھاتے رہے ۔ جونپور کے بہت سے مدارس جن کے بارے میں شاہجہان کا قول تھا کہ "پورب شیراز ما است" ۔

ڈھاکہ میں شائستہ خاں کا مدرسہ اور خان محمد میرزا کی مسجد سے ملحق مدرسہ ۔ ہند کی میں محمد تقی رہتکی کا مدرسہ (نزهة الخواطر ۵ : ۲۲) سورت میں سید محمد بن عبداللہ العیدروس کے مزار کے پاس زاہد بیگ کا مدرسہ تعمیر کردہ ۱۶۳۱ء/۱۰۴۱ھ ۔ اورنگ زیب عالمگیر کے ایک فرمان کے مطابق تعمیر کردہ احمد آباد ، سورت اور نہروالہ کے مدارس ۔ قاضی اکرام الدین شیخ الاسلام کا تعمیر کردہ مدرسہ اور مدرسہ فیض صفا گجرات[1] وغیرہ ۔

سلسلہ ہائے تصوف

اس دور میں روشنیہ فرقہ ایک سیاسی تحریک بن کر کوہستانِ سرحد میں تقریباً ختم ہو گیا ۔ سلسلۂ شطاریہ مقبول سلسلوں میں شامل ہوگیا اور 'جواہر خمسہ' کی تعریب کے بعد اس کا اثر ممالکِ عرب اور انڈونیشیا تک پھیل گیا ۔ سلسلۂ مداریہ کا زور زیادہ تر بنگال میں رہا اور انہیں اپنی ناشدنیوں کے باوجود شاہ شجاع کی طرف سے علاقے میں کھلے پھرنے اور لوگوں سے آذوقہ حاصل کرنے کا پروانہ ملا ۔ متداول فرقوں میں سے کبرویہ کا اثر کشمیر تک ہی محدود رہا ۔ سہروردیہ میں بابا نصیب الدین کشمیری (متوفی ۱۶۳۷ء/۱۰۴۷ھ) ، عبدالرزاق مکی (مدفون نیلاگنبد لاہور) (متوفی ۱۶۳۸ء/۱۰۴۸ھ) ، مولانا حیدر کشمیری (متوفی ۱۶۴۷ء/۱۰۵۷ھ)، شاہ دولا گجراتی (متوفی ۱۶۶۴ء/۱۰۷۵ھ) ۔ مولانا محمد اسماعیل المعروف شیخ وڈھا لاہوری (متوفی ۱۶۷۴ء/۱۰۸۵ھ) مشہور اصحاب تھے ۔ سلسلۂ چشتیہ کا زیادہ رواج پورب اور دکن میں تھا اور محمد بن فضل اللہ برہانپوری صاحب 'التحفة المرسلة'[2] (متوفی ۔ ۱۶۱۹ء/۱۰۲۹ھ) شیخ محمد بن ابی سعید کالپوری صاحب کتاب 'الروائح و رسالہ وحدة الوجود' (متوفی ۔ ۱۶۶۰ء/۱۰۷۱ھ) اور مولانا عبدالرشید جونپوری (متوفی ۔ ۱۶۷۲ء/۱۰۸۳ھ) ان علاقوں میں اس سلسلے کے مشہور ترین بزرگ تھے ۔ ان کے علاوہ شمال مغربی علاقے میں شیخ احمد شوریانی (متوفی ۱۵۹۴ء/۱۰۰۳ھ) اخوند درویزہ پشاوری (متوفی ۱۶۳۸ء/۱۰۴۸ھ) مولانا عبدالوہاب مانکواوی پشاوری (متوفی ۱۶۶۲ء/۱۰۷۳ھ) اور شیخ عبدالخالق لاہوری (متوفی ۱۶۶۳ء/۱۰۷۳ھ) بھی سلسلۂ چشتیہ کے مشہور اصحاب میں سے تھے ۔

---

۱ ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے : 'ہندوستان کی اسلامی درسگاہیں' ۔

۲ ۔ ایک بہت اہم کتاب جس کے مندرجات کی تفصیل زبید احمد کے ہاں ص ۴۷ پر درج ہے ۔ اس کی شروح دیارِ عرب میں شیخ ابراہیم الکورانی اور شیخ عبدالغنی نابلسی نے لکھیں ۔ (بروکلمن ذیل ، ص ۶۱۷) ۔

سلسلۂ قادریہ کا زور شمالی ہند میں اور خصوصاً لاہور ہی زیادہ رہا۔ حضرت شاہ ابو المعالیؒ قادری (متوفی ۱۶۸۲ء/۱۰۹۳ھ) کا ذکر فصلِ اول میں آ چکا ہے۔ عہدِ جہانگیری و شاہجہانی میں اس سلسلہ کے گلِ سر سبد حضرت شیخ میاں میرؒ لاہوری تھے۔

حضرت میاں میرؒ

حضرت میاں میرؒ سندھ کے شہر سہوان میں پیدا ہوئے۔ علوم دینیہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہیں شیخ سیوستانی سے طریقۂ قادریہ میں بیعت کی۔ پچیس سال کی عمر میں لاہور آ کر ریاضت اور تلقین و ہدایت میں مشغول ہوئے اور یہیں ۱۶۳۵ء/۱۰۴۵ھ میں وفات پائی۔ جہانگیر آپ کا معتقد ہوا، اس نے آپ کو دربار میں بلایا اور اعزاز و اکرام کے ساتھ واپس کیا۔ جہانگیر کے بعد شاہجہاں نے اس سے زیادہ عقیدتمندی کا اظہار کیا اور دو دفعہ خود درگاہ میں حاضری دی۔ دارا شکوہ آپ کا خصوصی عقیدتمند اور آپ کے مرید ملا شاہ قادری کا مرید تھا۔ اس کی کتاب 'سکینۃ الاولیا' میں آپ کے سوانح درج ہیں۔ حضرت میاں میرؒ کے مرید ملا شاہ قادری موسم گرما کشمیر میں اور موسمِ سرما لاہور میں گزارا کرتے تھے۔ ان کی ریاضتیں اور کرامتیں دونوں مشہور تھیں اور کشمیر میں ان کا بڑا اثر تھا۔ آپ کی مجلس کی تاثیر سے بکثرت اصحاب شیعیت چھوڑ کر اہلِ سنت میں داخل ہوئے۔ مگر وحدۃ الوجود کے نظریہ میں غلو رکھتے تھے۔ دو دفعہ عطا کشمیری نے آپ کے خلاف آواز اٹھائی۔ ایک دفعہ بعہد شاہجہاں دارا شکوہ نے بچا لیا اور دوسری دفعہ بعہد اورنگ زیب گورنر کشمیر نے۔ بالآخر ایک شاہی فرمان کی رو سے کشمیر چھوڑ کر لاہور میں مستقل مقیم ہوئے اور یہیں ۱۶۶۱ء/۱۰۷۲ھ میں وفات پائی۔ شیخ میاں میرؒ کی مرنجان مرنجی کا اثر ملا شاہ پر اور ملا شاہ کی آزاد روی کا اثر شہزادہ دارا شکوہ (قادری) پر بہت خراب پڑا۔ اہلِ جذب و سلوک کی صحبت سے دارا نے ابتدا کی اور اہلِ کفر و الحاد کی صحبتوں پر اس کی انتہا ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ قرآنِ حکیم کو اپنشدوں سے ماخوذ سمجھنے لگا۔ اس دور کی یادگار اس کی کتابیں 'مجمع البحرین' اور 'سرِ اکبر' ہیں۔ اس کی اس بے راہ روی نے عام مسلمانوں کو اس سے بد دل کر دیا اور اورنگزیب اس کے مقابلہ میں کامیاب ہوا۔

حضرت مجددؒ الثانی

سلسلۂ نقشبندیہ کو شیخ مجدّدؒ کی آفاق گیر شخصیت کی وجہ سے بہت بڑا فروغ حاصل ہوا۔ شیخ مجدّدؒ نے خواجہ باقی باللہؒ کی وفات کے بعد سرہند میں مسند درس و افادہ

پھائی ۔ وہ علم کلام اور معقولات میں بھی تبحر رکھتے تھے۔ اس لیے منتہی طلبہ کو تمام علوم بھی پڑھاتے تھے[1] اور علوم باطن کا فیض بھی پہنچاتے تھے ۔ آپ نے عہد جہانگیری میں ارباب مناصب کے ذریعہ پچھلی خرابیوں کی اصلاح کی مگر خود دربار سے دور رہے ۔ تاآنکہ آپ کے ایک خلیفہ شیخ بدیع الدین سہارنپوری کی بے احتیاطی سے جہانگیر کے دل میں آپ سے بدگمانی پیدا ہوئی اور اس نے آپ کو بلا کر قید خانے میں ڈال دیا ۔ دوسرے سال رہا ہوئے تو مصلحت یہی دیکھی کہ چندے شاہی دربار میں رہ کر اصلاح کی کوشش بھی کریں اور شہنشاہ کے دل سے غلط فہمیوں کے ازالہ کی سبیل بھی نکالیں ۔

آپ کی ہدایت و ارشاد کا اثر دربار سے باہر عام معاشرے میں زیادہ محسوس ہوا ۔ آپ نے ترویج شریعت پر زور دیا ۔ خلفائے راشدین کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ کیا اور ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی جسارت کے بارے میں شرعی احکام کی پابندی کی تلقین کی ۔ وحدۃ الوجودی فلسفہ کی وجہ سے اس وقت کے معاشرہ پر نہایت خراب اثر پڑ رہا تھا اور اس کے بعض قائلین غلو کرکے اباحیت اور کفر و الحاد کی طرف مائل ہونے لگے تھے ۔ آپ نے فلسفہ وحدۃ الشہود کی تلقین کرکے وحدۃ الوجود کے اثرات کو زائل کرنے کی کوشش کی ۔ عہد اکبری میں آپ نے 'رسالہ تہلیلیہ' اور 'اثبات النبوۃ' کے علاوہ ایک رسالہ 'ردّ روافض' بھی لکھا تھا ، جس کا عربی ترجمہ شاہ ولی اللہؒ نے اضافہ کے ساتھ کیا ہے ۔ رسالہ 'مبدأ و معاد' ، 'معارف الدنیا' ، 'تعلیقات بر شرح رباعیات باقی باللہ' ، 'تعلیقات عوارف ارشاد المریدین' ، 'مکاشفات عینیہ' وغیرہ زمانۂ مابعد کی تصنیفات ہیں ۔ مگر ان تمام سے زیادہ اہم اور متداول آپ کے ۵۳۶ مکتوبات ہیں ، جو تین دفتروں میں مرتب ہوئے تھے اور بارہا شائع ہو چکے ہیں ۔ مکتوبات کا ترجمہ عربی میں بھی ہوا ہے[2] ۔

حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مکتوب (نمبر ۳۰۵) میر محب اللہ کے نام تحریر فرمایا ہے جس میں آپ نے اسرار نماز سے آگاہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ایک عام مبتدی شخص کی نماز اور ایک خدا رسیدہ منتہی کی نماز میں کیا فرق ہے ۔ آپ فرماتے ہیں :

"بداں ارشدك اللہ تعالی کہ تمامی صلوۃ و کمالات آں نزد فقیر عبارت از رتبان فرائض و واجبات و سنن و مستحبات نماز است کہ در کتب فقہیہ بتفصیل بیان یافتہ است ، امری دیگر و رای ایں امور اربعہ نیست کہ در

۱ ۔ دیکھیے نزھۃ الخواطر ، حالات بدرالدین سرہندی صاحب حضرات القدس (۵ : ۹۰) ۔
۲ ۔ تذکرہ امام ربانی از مولانا منظور نعانی ، ص ۲۹۶ ۔

تمامی نماز آنرا مدخلی باشد ۔ خشوع نماز نیز مندرج در ہمیں امور اربعہ است و خضوع قلب نیز منوط بآنہا ۔ جمعی بہ علم این امور کفایت و رزیدہ اند و در عمل مساہلہ و مداہنہ اختیار نمودہ لاجرم از کمالات نماز قلیل النصیب گشتہ اند ۔ و جمعی دیگر اہتمام بحضور قلب بحق سبحانہ بہ اعمال ادیہ جوارح کم پردازند و اقتصاربر فرائض سنن نمایند و این جماعہ نیز از حقیقت نماز آگاہ نگشتہ اند و کمال نماز را از غیر نماز جستہ چہ حضور قلب را از جملہ احکام نماز نشمردہ اند و آنچہ در خبر است لا صلوة الا بحضور القلب تواند بود کہ مراد از حضور قلب باشد باین امور اربعہ تافتوری دراتیان امری ازیں امور واقع نشود ، و ورای این حضور دیگر بفہم این فقیر نمی در آید" ۔

سوال : چون تمامی نماز و کمال آن مربوط باتیان امور اربعہ گشت و امر دیگر ورای اینہا در کمال آن ملحوظ نشد پس فرق درمیان نماز مبتدی و منتہی نماز عامی کہ مقرون بہ اتیان این امور باشد چہ بود ؟ ۔

جواب : فرق از راہ عامل است نہ از راہ عمل ۔ اجر یک عمل بواسطہ تفاوت عمل متضاد نیست عملیکہ از عامل مقبول و محبوب بوقوع آید اجر آن اصناف مضاعف اساتازان اجری کہ مترتب بر عمل غیر آن عامل باشد چہ عامل ہرچند عظیم القدر باشد عمل او جزیل الاجر است[1]" ۔

آپ کا سلسلہ آپ کے خلفاء مولانا دانشمند کے واسطے سے بنگال میں، مولانا ابوالفتح کے واسطے سے سندھ میں اور مولانا محمد لقمان و محمد ہشام کشمی (مصنف 'زبدة المقامات در احوال سلسلۂ مجددیہ، و سوانح مجدد الف ثانی) کے واسطے سے دکن میں بھی پھیلا ۔ مگر آپ کے سلسلے کا زیادہ زور شمالی ہند اور ماوراء النہر میں خواجہ محمد معصوم سرہندی (م - ۱۶۶۸ء/۱۰۷۹ھ) اور شیخ آدم بنوری (وفات مدینہ منورہ ۱۶۴۳ء/۱۰۵۳ھ) اور ان کے خلفاء کے ذریعہ ہوا ۔

خوش قسمتی سے خواجہ محمد معصوم کے روابط شہزادہ محمد اورنگ زیب (شہنشاہ عالمگیر) کے ساتھ بڑھ گئے اور احیائے شریعت کی تحریک کو شہنشاہ کی سرپرستی میں پورا فروغ نصیب ہوا[2] ۔ ورنہ بالفرض داراشکوہ کامیاب ہو جاتا تو عہد اکبری اپنے پورے عروج کے ساتھ دوبارہ عود کر آتا ۔

---

۱ - مکتوبات امام ربانی ۱ : ۳۰۰ ۔

۲ - مزید حالات کے لیے دیکھیے : رود کوثر معاشری و علمی تاریخ ۔ تذکرہ امام ربانی (الفرقان پریس) المعارف لاہور اگست ۱۹۶۸ء میں پروفیسر اسلم کا مقالہ ۔

عالمِ اسلام کے دیگر مشاہیر

عالمِ اسلام کے اس دور کے دیگر مشاہیر میں سے چند کے نام یہ ہیں :

مصر و شام میں : نجم الدین احمد الغزی محدث متوفی ۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء۔ عبد الرؤف المناوی محدث صاحب 'کنوز الحقائق' متوفی ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۱ء۔ احمد بن محمد المقری 'مؤرخ صاحب نفح الطیب' متوفی ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء۔ نور الدین علی بن ابراہیم الحلبی 'مؤرخ صاحب السیرۃ الحلبیہ' متوفی ۱۰۴۴ھ/۱۶۲۰ء۔ نجم الدین محمد بن محمد الغزی 'مورخ صاحب الکواکب السائرہ' متوفی ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء۔ شہاب الدین احمد بن محمد الخفاجی صاحب 'حاشیہ بیضاوی و ریحانۃ الالباء' متوفی ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء۔ ابوالاخلاص حسن بن عمار الوفائی شرنبلالی فقیہ صاحب 'نورالایضاح' وغیرہ متوفی ۱۶۵۸ء/ ۱۰۶۹ھ۔ احمد بن سلامۃ القلیوبی ادیب صاحب 'نوادر قلیوبی'۔ متوفی ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء۔ ناصر الدین عبد السلام اللقانی محدّث متوفی ۱۶۶۷ء/۱۰۷۸ھ۔ خیر الدین الرملی فقیہ صاحب 'فتاوی تنقیح فتاوی الحامدیہ' متوفی ۱۰۸۱ھ/۱۶۷۰ء۔ عبد الحیؒ بن المعاد الحنبلی مورخ صاحب 'شذرات الذھب' متوفی ۱۰۸۹ھ/۱۶۷۸ء۔

حجاز میں : جمال الدین محمد بن ابی بکر الشلی مؤرخ صاحب 'تکملۃ النور السافر' متوفی ۱۰۹۳ھ/۱۶۸۲ء۔ شیخ ابراہیم بن الحسینی الکورانی محدّث (والد محمد بن ابراهیم الکورانی استاد شاہ ولی اللہ) متوفی ۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء۔ حسن بن علی بن یحییٰ المجیمی محدث متوفی ۱۱۱۳ھ/۱۷۰۲ء۔

ایران میں : بہاءالدین محمد بن الحسین العاملی صاحب 'خلاصۃ الحساب تشریح الافلاک کشکول' متوفی ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء۔ محمد باقر بن محمد داماد المعلم الثالث صاحب 'الافق المبین' متوفی ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء۔ صدر الدین الشیرازی محمد بن ابراہیم علامہ ثانی صاحب اسفار اربعہ متوفی ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء۔ عبد الرزاق اللہ یجی متوفی ۱۰۵۰ھ/ ۱۶۴۰ء۔ ملامحسن کاشی متوفی ۱۰۹۰ھ/۱۶۷۹ء۔ محمد بن الحسن الحر العاملی صاحب 'امل الامل' متوفی ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۸ء۔ محمد باقر مجلسی صاحب 'بحرالانوار' متوفی ۱۱۱۰ھ/۱۶۹۹ء۔

روم (سلطنت عثمانیہ میں) : حاجی خلیفہ مصطفی بن عبد اللہ کاتب چلپی صاحب 'کشف الظنون' وغیرہ متوفی ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۷ء۔ کمال الدین احمد بن حسام الدّین البیاضی حنفی صاحب 'اشارات المرام من عبارات الامام' متوفی ۱۰۹۸ھ/۱۶۹۶ء۔ محمد بن حسین الانقوری فقیہ صاحب 'الفتاوی الانقرویہ' متوفی ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۷ء۔

---

۱ - یہ تفصیل بروکلمن جلد دوم سے ماخوذ ہے۔ ایران کے فلاسفہ کے لیے براؤن ۴ : ۴۹۶ بعد بھی ملاحظہ ہو۔

۱۶۰۵ - ۱۷۰۷ء/۱۰۱۴ تا ۱۱۱۹ھ

۱ - صبغة الله بھڑوچی

مجدالدین صبغة الله بن سید روح الله بھڑوچی گجراتی شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کے تلمیذ اورمرید تھے - آپ علوم ظاہروباطن کے ماہر اور استاد ومرشد تھے۔ حجاز کا سفر کر کے بھڑوچ واپس ہوئے اور کچھ عرصہ مالوہ اور بیجاپور میں گزارا ۔۱۵۹۶ء/۱۰۰۵ھ میں دوبارہ حجاز پہنچے اور تدریس افادہ میں مشغول رہے - ۱۶۰۶ء/۱۰۱۵ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی - تصنیفات میں 'حاشیہ تفسیر بیضاوی'، 'کتاب الوحدة'، 'رسالہ آراء الدقائق فی شرح مرآة الحقائق مالا یسع المرید ترکہ کل یوم' اور محمد غوث گوالیاری کی 'جواہر خمسہ' کی تعریب شامل ہیں - جن میں سے اول الذکر اور آخر الذکر کے قلمی نسخے ملتے ہیں[1] -

شیخ صبغة الله کی یہ مؤخرالذکر تصنیف جو شیخ محمد خطیرالدین المعروف محمد غوث گوالیاری کی فارسی تصنیف 'جواہر خمسہ' کا عربی ترجمہ ہے، تصوّف کے موضوع پر ہندی علماء کی تصانیف میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے - کتاب کا عربی ترجمہ 'تعریب الجواہر الخمسة' کے نام سے موسوم ہے اور اس کے چار نسخے قاہرہ، برلن، رام پور اور کلکتہ میں پائے جاتے ہیں - کتاب پانچ اقسام پر مشتمل ہے اور ہر قسم کے جوہر کے عنوان سے شروع ہوتی ہے - جوہر اول میں عبادت کے طریقوں سے بحث ہے - دوسرے جوہر میں رجوع الی الله کے اعلیٰ درجوں کا بیان ہے۔ تیسرا جوہر اسماء حسنی سے بحث کرتا ہے - چوتھا جوہر شطاری صوفیوں کے سلسلۂ تصوف سے متعلق ہے اور پانچواں جوہر تصوف کے ان بلند ترین مقامات و درجات سے بحث کرتا ہے جو یقین و حقیقت سے آشنا ہونے کے بعد ایک فنا فی الله صوفی کا مقصود ہوتے ہیں -

۲ - حکیم علی الجیلانی

جالینوس زماں، حکیم علی بن ابی علی (جیلانی) گیلانی اپنے فن کے مشہور ماہر تھے - اپنے ماموں حکیم الملک شمس الدین (جیلانی) گیلانی اور امیر فتح الله شیرازی سے علوم عقلیہ اور

---

۱ - مآثر ص ۳۰ - سبحة، ص ۴۶، خلاصة الاثر ۲ : ۲۴۳ - نزھة الخواطر ۵ : ۱۷۵ - ۱۷۷ زبید احمد، ص ۳۲، تذکرہ علمائے ہند (اردو)، ص ۲۴۴، رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، ص ۸۰ -

صدرالصدور عبدالنبی سے علوم شرعیہ کی تحصیل کی تھی۔ ذہانت و فطانت میں طاق تھے۔ شیعہ مذہب میں غلو رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک عجیب حوض بنوایا تھا جس کے نیچے ساز و سامان سے آراستہ کمرہ تھا، جہاں انسان حوض میں غوطہ لگا کر پہنچتا تھا۔ آپ نے اکبر اور جہانگیر دونوں کو یہ کرشمہ دکھایا تھا۔ ۱۶۰۹ء/ذی الحج ۱۰۱۷ھ میں وفات پائی۔ 'قانون شیخ' کی ایک عمدہ شرح ان کی یادگار ہے۔ جس کا حصۂ کلیات چھپ چکا ہے اور مکمل نسخہ پانچ مجلدات میں رامپور کے کتب خانہ میں موجود ہے[1]۔

شیخ رئیس ابوعلی ابن سینا کی 'قانون فی الطب' طبی علوم کا انسائیکلوپیڈیا ہے جو ہر دور میں اطباء کا مرجع رہی ہے۔ اہل علم نے اس کی بہت سی شروح لکھی ہیں جن میں امام فخرالدین رازی اور علاءالدین ابن نفیس القرشی کی شروح قابل ذکر ہیں۔ مؤخرالذکر نے اپنی شرح میں ابن سینا پر تنقید کی اور ان کی بعض باتوں کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی اور بعد میں 'موجزالقانون' کے نام سے ایک خلاصہ بھی لکھا۔ ہندی علماء طب میں حکیم شفائی خان کے علاوہ جالینوس زماں حکیم علی جیلانی نے بھی قانون کی شرح لکھی جس میں نہ صرف یہ کہ انہوں نے شیخ ابن سینا کے افکار اور نظریات طبی کی تشریح کی بلکہ القرشی کے خود ساختہ اعتراضات کا بھی جواب دیا۔ اہل فن کی رائے میں حکیم علی جیلانی کی 'شرح القانون فی الطب' ابن سینا کی اس مایۂ ناز کتاب کی سب سے بہتر اور جامع شرح ہے۔

۳۔ قاضی نوراللہ شستری

سید نوراللہ بن شریف بن نوراللہ حسینی مرعشی شستری مشہور بہ شہید ثالث ۱۵۴۹ء/۹۵۶ھ میں شستر میں پیدا ہوئے اور مشہد میں تحصیل علوم کی۔ پھر ہندوستان آئے اور بادشاہ کے مقرب ہوئے۔ مذہباً شیعہ تھے۔ شہنشاہ اکبر نے انہیں لاہور کا قاضی مقرر کیا اور انہوں نے اس شرط پر اس منصب کو قبول کیا کہ وہ اہل سنت کے چار مذاہب میں سے جس مذہب کے مطابق چاہیں فیصلہ کر سکیں گے۔ پھر فیصلہ کرتے وقت ایسی رائے کی گنجائش نکالتے جو مذہب شیعہ کے موافق ہوتی۔ قاضی صاحب نے شیعہ مذہب کے بہت سے مسائل کی تائید میں کتابیں لکھیں، جنہیں وہ اہل سنت سے چھپاتے رہے۔ بہرحال شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں قاضی صاحب کی کتاب 'مجالس المؤمنین' کسی کے ہاتھ لگی اور انہوں نے شہنشاہ کو دکھائی۔ شہنشاہ نے قاضی کو آگرہ بلوا کر کانٹوں کے

۱۔ منتخب التواریخ بدایونی (اردو ترجمہ)، ص ۶۵۳ - زبید احمد، ص ۸۵، ۳۸۳ - نزهة الخواطر ۵ : ۲۸۵ - ۲۸۶ - بروکلمن ذیل، ص ۶۲۰ -

درے لگوائے ، جس کے دوران ہی وہ فوت ہو گئے ۔ سن وفات ۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء ہے ۔ 'مجالس المؤمنین' (فارسی) کے علاوہ 'مصائب النواصب' (نواقض الروافض کے رد میں)،'صوارم مہرقہ' (ابن حجر ہیتمی کے صواعق محرقہ کے رد میں)،'احقاق الحق' (ابطال الباطل کے رد میں)،'حاشیہ تفسیر بیضاوی' ، 'حاشیہ الہیات شرح تجرید' ، 'حاشیہ حاشیۃ قدیمہ' ، 'حاشیہ علی تہذیب الکلام' (تینوں علم کلام میں)،'حاشیہ علی المیبذی' (فلسفہ)،'حاشیہ علی شرح الشمسیہ' 'حاشیہ علی شرح التہذیب الدوانی' (منطق) 'حاشیہ علی شرح الجامی' (نحو) 'حاشیہ علی المطول' (بلاغت) 'رسالہ فی مسح الرجلین' (فقہ) 'سراج القلوب' (تصوف) وغیرہ ۔ کئی تصانیف عربی میں ہیں ۔ راقم الحروف نے ان کے 'حاشیہ بیضاوی' کا مطالعہ کیا ۔ اس میں عموماً بے جا تطویل سے کام لیا گیا ہے[۱]۔

اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے درمیان مسئلہ خلافت کے بارے میں اختلاف رائے موجود ہے اور ہر ایک کے نقطہ نظر پر بہت کچھ لکھا گیا ہے ۔ علامہ ابن حجر الہیتمی المکی نے 'الصواعق المحرقۃ' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جس میں خلافت کے بارے میں سنی نقطہ نظر کے مبنیٰ برحق ہونے اور شیعہ نقطہ نظر کے غلط ہونے پر کلام کیا گیا تھا ۔ علامہ نور اللہ شستری نے 'الصوارم المہرقۃ فی دفع الصواعق المحرقۃ' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جس میں نہ صرف ابن حجر کے دلائل کو غلط ثابت کیا بلکہ شیعی نقطہ نظر کی صداقت بھی ثابت کی گئی ۔ لیکن اسلوب بیان ، قوتِ استدلال اور عمقِ افکار کے لحاظ سے ابنِ حجر کا پلہ بھاری ہے ۔ علامہ شستری کی دوسری اہم تصنیف 'مصائب النواصب' ہے ، جو مخدوم الحسن شیرازی کی کتاب 'النواقض فی رد الروافض' کے جواب میں لکھی گئی ۔ مخدوم الحسن شیرازی نے جن شیعی عقائد پر نقطہ چینی کی اور ان کی تغلیط کی تھی علامہ شستری نے ان کی تردید کی اور اپنے عقائد کی صحت ثابت کی ۔ کتاب 'مصائب النواصب' آٹھ مقدمات اور چھ اجناد (واحد جند) پر مشتمل ہے ۔ مقدمات میں علامہ شستری نے 'صاحب النواقض' کے حالات ، حقیقتِ ایمان اور تحقیقِ امامیہ کی اصلیت بیان کی ہے ۔ اس کے بعد کتاب کے چھ ابواب میں شیعی عقائد پر تفصیلی بحث ہے ۔ ہر باب کو جند (لشکر) کا نام دیا گیا ہے ۔ مثلاً جند اول ان آیات کے بارے میں ہے ، جن سے 'صاحب النواقض' نے استدلال کیا ہے ۔ جند ثانی اُن احادیث کے متعلق ہے جو 'صاحب النواقض' نے ذکر کی ہیں ۔ اسی طرح یہ سلسلہ جند سادس پر ختم ہوتا ہے ۔

---

۱ ۔ نزہۃ الخواطر ۵ : ۴۲۵ ۔ ۴۲۷ ۔ بدایونی (اردو ترجمہ)، ص ۶۳۶ ، بروکلمن ۲ : ۴۱۷ ۔ ذیل ۲ : ۶۰۷ ، بانکی پور (مفتاح) نمبر ۲۳۲ ، ۱۰۹۶ ۔ زبید احمد بحسب الفہرس فہرست رائل ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۸۳ ۔ ۱۰۲ ۔ ۱۰۳ ، ۱۰۴ ، ۸۷۶ ، ۵۸۵ ، ۸۸۶ ۔

۴ - عبدالنبی شطاری

عمادالدین محمد عارف عثمانی معروف بہ عبدالنبی شطاری حنفی المذہب اور پابندِ شریعت صوفی بزرگ اور عالم تھے۔ صوفی عبداللہ شطاری متوفی ۱۶۰۱ء/۱۰۱۰ھ کے مرید تھے۔ سالِ وفات معلوم نہ ہوسکا۔ صرف اپنی کتاب 'فواتح الانوار' کے خاتمہ سے ان کا عہد معلوم ہوجاتا ہے، جہاں عربی میں لکھا ہے، "بروز جمعہ ۸ ذی الحج ۱۰۲۰ھ بمطابق ۱۶۱۲ء والد بزرگوار کے مرقد کے پاس شہر آگرہ میں فراغ حاصل کیا۔ اتمام کی تاریخ "افضالِ حق" ہے۔ مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی نے اس کی فارسی کتاب کا (مصنف کا خود نوشت) قلمی نسخہ دیکھا تھا جس میں ان کی کوئی پچاس تمام و ناتمام تصنیفات کے نام درج تھے۔ ان کی پچاس دوسری کتابوں کے نام بھی دیے ہیں۔ یہ تمام کتابیں اب ناپید ہیں۔ ممکن ہے ان میں کچھ عربی میں ہوں[1]۔

۵ - مولانا جمال بن نصیر چنابی

مولانا جمال بن نصیر چنابی اور مولانا جلال بن نصیر چنابی دو بھائی کیلیانوالہ ضلع گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے اور دونوں صاحبِ تصنیف بزرگ تھے۔ مولانا جمال نے 'شرح کافیہ'، ملا جامی پر ایک حاشیہ لکھا جو مطبوع بھی ہے اور اس کے قلمی نسخے بھی متعدد کتاب خانوں کی زینت ہیں۔ یہ حاشیہ حسب تصریح مصنف ۱۶۱۰ء/ ۱۰۱۹ھ میں لکھا گیا۔

'کافیہ ابنِ حاجب' نحو کی جامع اور مختصر تصنیف ہے۔ اس کی بہترین شرح 'الفوائد الضیائیہ' ہے جو اپنے مصنف ملا عبدالرحمٰن جامی کی نسبت سے 'شرح الجامی' کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ دونوں کتابیں بہت مقبول و متداول رہی ہیں۔ مؤخرالذکر پر ہندی علماء نے بکثرت حواشی وشروح لکھی ہیں جن میں وجیہ الدین گجراتی اور عبدالحکیم سیالکوٹی خصوصیّت سے قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا جمال‌الدین بن نصیرالدین چنابی کا 'حاشیہ شرح الجامی' بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس حاشیہ کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے نہ صرف ملا جامی کی مشکل و معقد عبارات کو حل کیا ہے بلکہ علمِ نحو کی امہات الکتب کی روشنی میں مسائلِ نحو کو سہل اور واضح انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ 'شرح الجامی' کے دیگر اہم حواشی کے ساتھ ساتھ یہ حاشیہ بھی اہلِ علم کے ہاں مقبول و متداول رہا ہے۔

---

۱ - تذکرہ علمائے ہند (اردو)، ص ۳۲۷ - ۳۲۸ - طرب الاماثل ۲۲۷ - ۲۲۹ - ڈاکٹر زبید احمد کی کتاب بحسب الفہرس - ڈاکٹر اسحاق کی کتاب ہندوستان میں علم حدیث، ص ۱۳۹ - ۱۴۰ -

دوسری تصنیف 'شرح قصیدہ بردہ' کے دو نسخے (مطبوعہ ۱۹۰۷ء اور ۳۲-۳۳۷۱ھ) پشاور میں ہیں ۔ یہ شرح ۱۵۹۰ء/۹۹۹ھ میں لکھی گئی ۔ ان کے برادر خورد مولانا جلال چنابی نے مولانا عبداللہ تلنبی کے 'بدیع المیزان' (منطق) پر حاشیہ لکھا جو چھپ چکا ہے ۔ 'تفسیرِ بیضاوی' پر ان کے حاشیہ کا قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے ۔

مولانا جلال بن نصیر چنابی کا حاشیہ جو 'حاشیہ جلال بن نصیر علی تفسیر البیضاوی' کے نام سے موسوم ہے ، 'تفسیرِ بیضاوی' کے تیسویں سپارے پر مشتمل ہے ۔ مصنف نے اپنے ان حواشی میں متقدمین کے حواشی سے بھی کافی استفادہ کیا ہے ۔ خصوصیت کے ساتھ ملا سعید چلپی اور ملا جلال الدین الحنفی وغیرہ کے اقوال و آراء کا تتبّع کیا ہے ۔ منتخب مقامات تفسیر کی شرح و توضیح کے علاوہ بیضاوی پر وارد کئے جانے والے بعض اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے ۔ وہ اپنے حاشیہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں : فیقول العبد المفتقر الی اللہ المتعال القدیر القوی ، تراب اقدام الطلبة جلال بن نصیر الچنابی ، ان ھذہ حواشی وتعلیقات علی الجزء الاخیر من التفسیر البیضاوی ، جمعتھا لتکون تذکرة لاولی الالباب و تحفة لفضلاء الطلاب (اللہ تعالیٰ قدیر و قوی کا محتاج ، بندہ خاک پائے طلبہ جلال بن نصیر چنابی کہتا ہے کہ 'تفسیر بیضاوی' کے آخری پارے پر یہ کچھ حواشی و تعلیقات ہیں جو میں نے اس غرض سے جمع کیے ہیں تا کہ یہ اہل دانش کے لیے یاد گار اور فاضل طلبہ کے لیے ایک تحفہ ثابت ہوں) ۔ قصیدہ بردہ کی بھی ایک شرح 'کشف الحقائق' لکھی ہے (پشاور نمبر ۱۱۲۰) جو مولانا جمال کی شرح سے زیادہ مبسوط ہے ۔ سالہائے وفات دونوں حضرات کے معلوم نہ ہو سکے[1] ۔

۹ ۔ حاجی دبیر

شیخ عبداللہ محمد بن سراج الدین عمر بن کمال نہروالی گجراتی معروف بہ حاجی دبیر محدث، مؤرخ اور ادیب تھے ۔ ۱۵۳۹ء/۹۴۶ھ کے لگ بھگ حجاز میں پیدا ہوئے اور شیخ عزالدین زمزمی اور شیخ ابن جوہیتمی سے استفادہ کیا ۔ ۱۵۵۴ء/۹۶۲ھ میں ہند آ کر وزیر محمد الغ خان کے ملازم ہوئے اور اس کے لیے ایک کتاب 'فوائح الاقبال ونوائح الانتقال' تصنیف کی ۔ ان کی مشہور کتاب 'ظفرالوالہ بمظفروالہ' (گجرات کے خاندان مظفری کی تاریخ) تین جلدوں میں حکومتِ ہند نے سر ڈینی سن راس کے زیر اہتمام شائع کی ہے ۔ سالِ وفات معلوم نہ ہو سکا بہر حال وہ ۱۶۱۲ء/۱۰۲۰ھ میں بقیدِ حیات تھے[2] ۔

---

۱ ۔ لباب المعارف نسخہ اسلامیہ کالج ، انڈیا آفس کیٹلاگ، بروکلمن ذیل ۱ : ۵۳۴ ۔

۲ ۔ دیباچہ ظفرالوالہ ۔ نزهة الخواطر ۵ : ۳۵۰ - ۳۵۳ جہاں گجرات کی تعریف میں چند اشعار بھی ہیں ۔ بروکلمن ۲ : ۳۱۶ ، ذیل ۲ : ۵۹۹ ۔

۷ ۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ

متوفی ۱۶۲۴ء/۱۰۳۴ھ حالات حصہ اول میں مندرج ہو چکے ہیں ۔

۸ ۔ مفتی عبدالسلام لاہوری

لاہور کے مفتی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور شیخ بہاءالدین زکریا کی اولاد میں سے تھے۔ علوم عقلیہ میں میر فتح اللہ شیرازی کے تلمیذ خاص تھے ۔ مدرسہ لاہور کی مدرسی میں عمر گزاری ۔ مگر تصنیف و تالیف کا اہتمام نہیں کیا جس کا انہیں آخر عمر میں افسوس رہا ۔ ۱۶۲۷ء/۱۰۳۷ھ میں فوت ہوئے[1] ۔

۹ ۔ شیخ عبدالقادر حضرمی

محی الدین ابوبکر عبدالقادر بن شیخ العیدروس الشافعی الحضرمی ثم الہندی الگجراتی کے والد شیخ بن عبداللہ المتوفی ۱۵۸۳ء/۹۹۰ھ اپنے وقت کے بڑے اولیاء میں سے تھے جو حضر موت سے آکر احمد آباد میں مقیم ہوئے تھے ۔ وہ صاحب ارشاد و ہدایت اور ایک عربی دیوان اورتصوف کے کئی رسالوں کے منصف تھے ۔ عبدالقادر ۱۵۷۰ء/۹۷۸ھ میں احمد آباد میں پیدا ہوئے ۔ تحصیل علوم کے بعد اپنے والد اور کئی دیگر مشائخ سے بیعت ہوئے ۔ پھر درس و افادہ میں مشغول ہوئے۔

شیخ عبداللہ بن محمد بن عمر المکی الآصفی الفخانی کی نادر کتاب 'ظفر الوالہ بمظفر الوالہ' ان چند گنی چنی کتب تاریخ میں سے ہے جو ہندی علماء نے عربی زبان میں تصنیف کیں اور ان میں اسلامی ہند کی تاریخ قلمبند کی ۔ 'ظفرالوالہ' دو دفتروں پر مشتمل ہے ۔ دفتر اول میں آل مظفر کے ان شاہان گجرات کی مفصل تاریخ ہے جنہوں نے ۱۳۹۶ء تا ۱۵۷۲ء تک حکومت کی ۔ ضمنی طور پر اس دفتر میں دکن اور خاندیش کے سلاطین کی تاریخ بھی مذکور ہے ۔ دفتر ثانی میں شمالی ہند کے ان تمام شاہی خاندانوں کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے جنہوں نے بارھویں صدی عیسوی سے سولھویں صدی عیسوی تک مختلف اوقات میں مختلف علاقوں پر حکومت کی ۔ مصنف نے اپنی اس کتاب میں تمام معتبر کتب تاریخ سے استفادہ کیا ہے جو فارسی میں اس وقت دستیاب تھیں ۔ مثلاً 'ابوالفضل'، 'الجورجانی' اور 'ضیاء البرنی' کے علاوہ 'مرآۃ سکندری'، 'تاریخ عجمی'، 'تحفۃ السادات' اور 'تاریخ بہادر شاہی' کے اقتباسات مصنف نے بکثرت دیئے ہیں ۔ مصنف

---

۱ ۔ نزھۃ الخواطر، ۵ : ۲۲۳ ۔ خزینۃ الاصفیا : ۲۰۰ ۔

اگر نسلاً ایرانی اور زیادہ تر برِ صغیر میں مقیم رہا تھا تاہم اس کا عربی اسلوبِ نگارش کافی بہتر ہے ، خصوصاً جب وہ کسی فارسی ماخذ سے اقتباس کا ترجمہ پیش کرتا ہے ۔ لیکن جہاں وہ خود اپنی یاد داشت استعمال کرتا ہے وہاں عبارت اکثر ابہام اور بے ربطی کا شکار ہو جاتی ہے ۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے عرب مؤرخین کے تتبع میں واقعات کو سنہ وار مرتب کیا ہے اور سیاسی تاریخ کے علاوہ علمی ، ادبی اور ثقافتی تاریخ کی جھلکیاں بھی پیش کی ہیں ۔ کہیں کہیں وہ ہندی علماء کی فارسی نما عربی بھی لکھتا ہے، مثلاً وفی إحدی واربعین نہض قطب الدین تسخیرآبو وفتح القلعۃ و کان الرانا کونپھا تغلب علیہا ولم تکن لہ و لما کان صاحب القدیم فی طاعۃ قطب الدین اعادھا لہ (سنہ ۱۴۳۷ء/۸۴۱ھ میں قطب الدین آبو کی تسخیراور قلعہ کی فتح کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور رانا کونپھا اس پر قابض ہوگیا تھا ۔ حالانکہ یہ اس کا نہ تھا اور چونکہ قلعہ کا پرانا مالک قطب الدین کی اطاعت میں تھا اس لیے وہ اسے لوٹا دیا[1]) ۔

کئی جلیل القدر بزرگوں نے ان سے خرقۂ تصوّف حاصل کیا ۔ بروکلمن نے ان کی ۲۵ تصنیفات کے نام گنائے ہیں ، جو تمام کی تمام بوہار کے کتب خانہ میں موجود ہیں ۔ ان کی سب سے مشہور تصنیف 'النورالسافر' (دسویں صدی ہجری یعنی سولھویں صدی عیسوی کے مشاہیر کے حالات) چھپ چکی ہے ۔ اس دور کے ہندوستان میں عربی زبان کو مادری زبان کے طور پر بولنے والے اور لکھنے والے زیادہ تر جنوبی ہند کے حضارمہ تھے اور شیخ عبدالقادر ان کے گلِ سر سبد تھے ۔ ۱۶۲۸ء/۱۰۳۸ھ میں احمد آباد میں فوت ہوئے[2] ۔

'النورالسافر عن اخبارالقرن العاشر' اہلِ علم و فضل اور مشاہیر کے تذکروں کے اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کا آغاز حافظ ابن حجر عسقلانی نے 'الدرر فی الکامنۃ المئۃ الثامنۃ' لکھ کر کیا تھا ۔ حافظ ابن حجر نے آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عسوی) کے مشاہیر اہلِ علم و فضل کے سوانح مرتب کیے ۔ اس کے بعد حافظ شمس الدین السخاوی نے 'الضوء اللامع القرن فی التاسع' لکھی جو نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) کے اہلِ کمال کی تاریخ اور سوانح حیات پر مشتمل ہے ۔ اول الذکر دونوں کتابیں دیارِ عرب کے علماء کی ہیں مگر مؤخرالذکر ایک ایسے عالم کی تصنیف ہے جو اگرچہ نسلاً تو عرب تھے مگر پیدائشی طور پر ہندی تھے ۔ 'النور السافر' پہلی دو کتابوں سے کئی لحاظ سے ممتاز ہے ۔ ایک تو یہ کہ اول الذکر دونوں کتابیں حروف تہجی کے اعتبار سے

---

۱ - ظفرالوالہ ۱ : ۱۳ ۔

۲ - نزھۃ الخواطر ۵ : ۲۳۵ - ۲۳۶ ۔ خلاصۃ الاثر ۲ : ۴۲ - ۴۴ النور السافر ، ص ۳۳۶ - ۳۴۳ - بروکلمن ۲ : ۴۱۹ ذیل ۲ : ۶۱۷ ۔

مرتب ہوئیں مگر یہ سنہ وار واقعات و حوادث کے مطابق مرتب ہوئی۔ دوم یہ کہ اول الذکر دونوں کتابیں نہایت اختصار سے لکھی گئیں ، مگر 'النور السافر' میں تفصیل بلکہ بعض اوقات تطویل سے کام لیا گیا ہے ۔ سوم یہ کہ پہلی دونوں کتابوں کا دائرہ کار صرف سوانح رجال تک محدود ہے مگر 'النور السافر' میں دیگر سیاسی و ادبی تاریخ کے واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں ۔ اسی طرح 'النور السافر' کے مصنف نے اپنی کتاب کا آغاز تبرکاً سیرتِ نبوی ؐ سے کیا ہے ۔ اس کے بعد ۹۰۱ھ/۱۴۹۵ء سے ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱ء تک کے اہم تاریخی حوادث اور علم و فضل کا مفصل تذکرہ کیا ہے ۔ وہ اپنی کتاب کے موضوع کے دائرۂ کار کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں : هذا انموذج لطيف و عنوان شريف ذكرت فيه و فيات من ظفرت بتاريخ وفاته ممن مات فى هذا القرن الذى اوله سنة احدى و تسعماة ختم بالحسنى من سائر العلماء و الصلحاء و القضاة والاد باء و الملوك والاعيان مصر يآ كان أوشامياً ، حجاز يآ كان أويمنياً روسياً أو هندياً ، مشرقياً أو مغربياً و ضممت إلى للذك ذكر بعض الحوادث و الماجريات و الحكايات العيجبة و الملح الغريبة[1] ۔(یہ ایک عمدہ نمونہ اور بلند پایہ نشانی ہے ۔ میں نے اس میں ان لوگوں کی تاریخِ وفات ذکر کی ہے جو ۹۰۱ھ/۱۹۴۲ء کے بعد اس صدی کے آخر تک فوت ہوئے اور ان کی تاریخِ وفات مجھے میسر آسکی ۔ ان میں تمام علماء ، صلحاء ، قاضی، ادیب ، بادشاہ اور سربرآوردہ اشخاص میسر ہیں خواہ وہ شام یا مصر کے ہوں ، خواہ حجاز ، یمن ، روم ، ہند ، مشرق یا مغرب کے ہوں ۔ اس کے علاوہ میں نے اس کتاب میں حوادث ، واقعات ، عجیب حکایات اور انوکھی دلچسپ باتیں بھی شامل کر دی ہیں) ۔

۱۰ ۔ عبدالحکیم لاہوری

مخدوم الملک مولانا عبد اللہ سلطانپوری کے فرزندِ ارجمند تھے ۔ اپنے والد کے ساتھ حج کا سفر کیا ۔ پھر انہیں کے ساتھ واپس آ کر احمد آباد میں مقیم ہوئے ۔ جب مخدوم الملک فوت ہوئے اور ان کا گھر بار لٹ گیا تو یہ احمد آباد سے لاہور آئے اور زاویۂ عزلت میں زندگی بسر کرنے لگے ۔ علومِ فقہ و اصول کے ماہر اور صاحب نسبت بزرگ تھے ۔ ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں بمقام لاہور فوت ہوئے اور زیب النساء کے باغیچے کے پاس دفن ہوئے ۔'فصوص الحکم' کی فارسی شرح (مقبول مفتی غلام سرور مقبول عام و خاص) اور چشتیہ کے اشغال و اذکار سے متعلق ایک رسالہ موسوم بہ 'اسرار عجیبہ' ان کی تصانیف ہیں ۔ بروکلمن نے ایک اور عبد الکریم بن محمد لاہور اور ان کی ان عربی تصانیف 'تصوف' کا ذکر کیا ہے جو برلن کے کتب خانہ میں پائی جاتی ہیں ۔ وہ صاحب

۱ ۔ النور السافر ، ص ۱ ۔

۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء میں بقید حیات تھے۔ ڈاکٹر زبید احمد صاحب نے بظاہر ان دو اصحاب کو ایک سمجھا ہے اور صرف اختلاف سنین وفات پر متنبہ فرمایا ہے[۱]۔

'رسالہ عقائد الموحدین' جس کا نسخہ برلن کی لائبریری (نمبر ۱۸۴۸)میں موجود ہے ، تصوّف کے موضوع پر ایک اچھوتی تصنیف ہے ۔ کیونکہ اس میں اسلامی تصوّف پر علم الکلام کے انداز میں بحث کی گئی ہے ۔ مصنف چونکہ وحدت الوجود پر پختہ ایمان رکھتے ہیں اس لیے اس پر بڑے زور دار انداز میں بحث کرتے ہیں اور عقلی و نقلی دلائل سے اپنے موقف کی تائید و توضیح کرتے ہیں ۔ اس ضمن میں وہ ایک حدیث نبوی ؐ سے استدلال کرتے ہیں کہ ہمہ اوست کا نظریہ در اصل رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے عین مطابق ہے ۔ وہ حدیث یہ ہے : کان اللہ فی الاول و لم یکن معہ شیٔ و ھوالآن کما کان کہ اللہ جل شانہ ازل میں اس وقت بھی موجود تھا جب اس کے ساتھ اور کوئی شے نہ تھی اور اب بھی وہ اسی طرح موجود ہے جس طرح پہلے تھا ۔ مصنف کے نزدیک اللہ کی ذات زمان و مکان کی حدود و قیود سے پاک ہے (ھو منزہ عن الحد و النہایہ) ۔ رسالہ نو ابواب پر مشتمل ہے ۔ باب اول فی النفاق ، باب ثانی فی الردۃ (مرتد ہونا) ۔ باب ثالث فی المشیخۃ (پیری مریدی) باب رابع فی ادب المرید مع الشیخ (مرید کا پیر سے کیا برتاؤ ہونا چاہیے) ، باب خامس اتباع شیخ کے بارے میں ، باب سادس فی الحب والاخلاص (اخلاص و محبت) باب سابع فی البقاء و الفناء (بقا اور فنا کے بارے میں) باب ثامن فی الذکر (یاد خدا) اور باب تاسع فی وحدت الوجود کے موضوع پر ہے ۔

حسن بن علی بن شدقم

فاضل ادیب اور شاعر تھے ۔ مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پا کر ہندوستان آئے اور احمد نگر کے نظام شاہیوں کے ہاں خوب اعزاز پایا ۔ درمیان میں ایک دفعہ حجاز کا سفر کرکے دوبارہ دکن آئے اور وہیں ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۶ء میں فوت ہوئے ۔ ان کی تصنیف 'زھرالریاض و زلال الحیاض'(سیر و رجال)مؤلفہ۹۹۵ھ/۱۵۸۶ءکے قلمی نسخے بوہار وغیرہ میں ملتے ہیں ۔ ایک دوسری تصنیف 'الجواہر النظامیہ من حدیث خیر البریہ' (حدیث) نظام شاہ کے لیے لکھی تھی[۲]۔

'زھر الریاض و زلال الحیاض' اپنی نوعیت کی ایک مفید کتاب ہے ۔ مصنف نے نہایت سادہ اور آسان انداز میں تاریخی معلومات کو جمع کر دیا ہے ۔ کتاب کا مواد

---

۱ - خزینۃ الاصفیاء ۱ : ۱۰۵ - ۱۰۷ - نزھۃ الخواطر ۵ : ۲۴۳ - زبید احمد ، ص ۳۰۹ -
۲ - سلافۃ العصر ، ص ۲۴۹ - کشف الحجب ، ص ۳۰۵ -

حروفِ تہجی کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے جو سہولتِ استفادہ کا باعث ہے - بنیادی طور پر یہ کتاب سیرت نبویؐ ، تاریخِ اسلام اور زعماء کے سوانحِ حیات پر مشتمل ہے - جس کا مواد زیادہ تر متقدّمین کی متداول کتابوں سے ماخوذ ہے - تاہم مصنف نے اپنے تجربات ، مشاہدات اور معلومات سے کتاب کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے اور تاریخی مواد کے ساتھ ساتھ ادب ، ثقافت اور جغرافیہ کے بارے میں کافی معلومات دے دی ہیں - یہ کتاب ۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء میں مکمل ہوئی جیسا کہ خود مصنف نے صراحت کی ہے :

فی اثناء ذالک سنة ثمان و ثمانین و تسعمائة عن لی السفر الی بلاد الدکن المصونة عن الافات و المحن ، فوفق الله لاتمامه با حمد نکر حماها الله تعالی و ملیکها من التغیر و العبر و ذلک عام اثنین و تسعین و تسعمائة و سمیته زهر الریاض و زلال الحیاض"-

(اسی اثنا میں ۹۸۸ھ/۱۵۸۹ء میں میں بلاد دکن ، خدا اسے آفات و محن سے محفوظ رکھے ، کے سفر پرگیا جہاں احمد نگر میں ، خدا اسے اور اس کے بادشاہ کو تغیّراتِ زمانہ سے محفوظ رکھے ، ۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء میں اللہ نے مجھے اس کی تکمیل کی توفیق بخشی اور میں نے اسے 'زھر الریاض و زلال الحیاض' کا نام دیا ہے) - یہ کتاب ناپید ہے[1] -

۱۲ - تاج الدین نقشبندی

شیخ تاج الدین بن زکریا بن سلطان عثمانی حنفی نقشبندی سنبھل میں پیدا ہوئے- علوم کی تحصیل کے بعد تکمیلِ باطن کے لیے اجمیر اور ناگور گئے- پھر اللہ بخش شطاّری کے مرید ہوئے اور ان سے کئی طریقوں میں اجازت حاصل کی - خواجہ باقی باللہ لاہور پہنچے تو ان کو ایک خط لکھا جس کی بنا پر شیخ تاج الدین خواجہ صاحب کی خدمت میں پہنچے اور تین ہی دن میں نقشبندیہ کے مدارجِ سلوک طے کیے اور سب سے پہلے اجازتِ بیعت حاصل کر لی - آپ خواجہ صاحب کے ہاں کچھ مدت تک یک جان و دو قالب ہو کر رہے - پھر خواجہ صاحب کی وفات پر وطن چھوڑ کر مختلف علاقوں کی سیر کرتے ہوئے مکّہ معظّمہ پہنچے اور مسندِ ارشاد بچھائی - لاتعداد اکابر نے ان سے تربیت حاصل کی - جمادیٰ الاول ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء میں فوت ہو کر جبل قعیقعان (مکّہ معظّمہ)

---

۱ - زبید احمد بحسب الفہرس نزھة الخواطر ۵ : ۳۱ - ۱۳۰ - سلافة العصر ، ص ۴۳۹ ، خلاصة الاثر : ۲ : ۲۳ - بروکلمن ۲ : ۴۱۶ - بعد (جہاں اس کے ایک بیٹے اور ایک پوتے کا ذکر بھی ہے) -

کے قریب دفن ہوئے۔ متعدّد تصنیفات میں سے بعض کے نام یہ ہیں : 'تعریب النفحات' ۔ (جامی کی نفحات کا عربی ترجمہ) 'تعریب الرشحات' (حسین کاشفی کی رشحات کا عربی ترجمہ) 'آداب المریدین' ۔ 'رسالہ فی طریق الساد' ۔ 'النقشبندیہ و شرحہ مفتاح المعیة' ۔ 'الصراط المستقیم' ۔'النفحات الالہیة فی موعظة النفس الزکیہ' ۔'جامع الفوائد' (تمام تصوف میں) 'رسالہ فی انواع الاطعمة' (باورچی خانہ) 'رسالة کیفیة غرس الاشجار' (باغبانی) ان کے علاوہ کئی رسالے علم طب میں بھی لکھے ۔ اوّل الذکر چاروں کے قلمی نسخے قاہرہ وغیرہ کے بعض کتب خانوں میں ملتے ہیں[1] ۔

شیخ تاج الدین بن زکریا نقشبندی نے تصوّف کے موضوع پر جو متعدّد رسالے لکھے ہیں ان میں 'الرسالة فی طریق السادات النقشبندیہ' (برلن کی لائبریری نمبر ۲۱۸۶ میں رسالے کا جو نسخہ موجود ہے اس کا نام یوں دیا گیا ہے : 'رسالة جلیلة و نبذة عظیمة فی سلوک خلاصة السادة النقشبندیة الصدیقیة' اور مصنف کا نام یوں درج ہے : "تاج الدین بن ذکریا بن سلطان الشیرازی الهندی القرشی العثمانی') بہت اہم ہے ۔ اس میں انہوں نے نقشبندی سلسلے کے بارے میں بڑے عمدہ اور جامع انداز میں بحث کی ہے ۔ رسالے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مشہور عالم و صوفی شیخ عبد الغنی نابلسی(م۔۱۷۳۰ء/۱۱۴۳ھ)نے 'مفتاح المعیة فی الطریق النقشبندیة' کے نام سے اس کی مفصل شرح لکھی ہے ۔ شیخ تاج الدین اس بات پر پختہ ایمان رکھتے ہیں کہ نقشبندی طریقت در اصل اہل سنت کا طریقہ ہے ۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

> اعلم وفقک الله تعالىٰ ان معتقد السادة النقشبندیة قدس الله تعالىٰ اسرار ھم ھو مُعتَقَدُ اھل السنة والجماعة و طریقھم دوام العبودیة التی لاتتصور بغیر اداء العبادة ۔
>
> (جان لے اللہ تعالیٰ تجھے توفیق بخشے کہ نقشبندی حضرات ، قدس اللہ اسرارھم کا عقیدہ بعینہٖ اہل السنت والجماعت کا عقیدہ ہے اور ان کی طریقت ہمیشہ عبادت میں مشغول رہنا ہے جس کے بغیر عبادت کا ادا ہونا متصوّر نہیں ہو سکتا) ۔

رسالہ میں نقشبندی طریقت کے چھ طریقے یا اسلوب ذکر و عبادت بیان کیے گئے ہیں ۔

۱۲ ۔ ملا عبدالسلام اعظمی

دیوہ (اعظم گڑھ) کے رہنے والے تھے۔ ملا عبدالسلام لاہوری سے استفادہ کے لیے

---

۱ ۔ زبید احمد ، ص ۳۰۸ ۔ نزهة الخواطر ۵ : ۹۹ - ۱۰۲ - خلاصة الاثر ۱ : ۴۷۳ بروکلمن ۲ : ۴۱۹ ذیل ۲ : ۶۱۸ ۔

لاہور آئے اور ان کے بعد اسی مدرسہ کے مدرس ہوئے ۔ ملا قطب الدین سہالوی کے والد شیخ عبدالحلیم (م ۔ ۱۶۴۰ء/۱۰۵۰ھ) نے بمقام لاہور ان سے 'ھدایہ' پڑھا ۔ تصنیفات میں 'حاشیہ خیالی'، 'حاشیہ شرح صحائف'، (عقائد) 'حاشیہ تہذیب' (منطق) 'حاشیہ ہدایہ' (فقہ) 'حاشیہ بیضاوی' (تفسیر) 'شرح منار' اور ('حاشیہ تحقیق') 'غایۃ التحقیق اصول فقہ' شامل ہیں ۔ جن میں سے 'شرح منار' کا قلمی نسخہ بانکی پور میں ہے ۔ ('مفتاح ۴۷')' سال وفات معلوم نہ ہوسکا[1] ۔ ملا عبد السلام دیوی (متوفی ۱۶۳۲ء/۱۰۴۲ھ) نے اپنے عہد کی متداول درسی کتابوں پر جو حواشی یا شروح لکھیں ان میں سے صرف 'الشرح علی المنار' کے ایک نسخے کا پتہ چل سکا ہے جو بانکی پور کی لائبریری (نمبر ۱۵۰۸) میں پایا جاتا ہے ۔ حافظ الدین ابوالبرکات عبد اللہ بن احمد نسفی (متوفی ۱۳۱۰ء/۷۱۰ھ) کی یگانۂ روز گار تصنیف 'منار الانوار' اپنی جامعیت و اختصار کے باعث حنفی اصولِ فقہ کے موضوع پر بہترین کتاب مانی گئی ہے ۔ حاجی خلیفہ نے اس کتاب کی متعدد شروح اور حواشی کا ذکر کیا ہے ۔ ملا عبدالسلام دیوی کی شرح ، جو 'الشرح علی المنار' کے نام سے موسوم ہے ، ہندی علماء کی شروح المنار میں سے ایک ہے ۔ اس شرح میں مصنف نے اصولِ فقہ کی دیگر متداول کتابوں سے مدد لی ہے اور حنفی مکتبِ فکر کے فقہی اصولوں پر مدلل روشنی ڈالی ہے اور ہر مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے ۔ کتاب کا قلمی نسخہ دو سو چالیس اوراق یعنی چار سو اسی صفحات پر مشتمل ہے ۔ اسی سے اس شرح کی جامعیت و افادیت اور کثرتِ مواد و معلومات کا اندازہ ہو جاتا ہے ۔

۱۵ ۔ شیخ محب اللہ الہ آبادی

شیخ محب اللہ بن مبارز فاروقی علاقہ خیر آباد (اودھ) کے ایک دیہات میں پیدا ہوئے تھے ۔ ملا عبدالسلام لاہوری سے تکمیلِ علوم کی تھی ۔ حضرت میاں میرؒ اور علامی سعداللہ خان ان کے ہم درس رہے ۔ سعداللہ خان وزیر بنے تو شیخ محب اللہ کو الہ آباد کی نظامت ملی ۔ بعد میں انہوں نے شیخ ابوسعید گنگوہی سے طریقۂ چشتیہ میں بیعت ہو کر زہد و ریاضت کا گوشہ اختیار فرمایا ۔ وہ بڑے عالم ، فاضل اور صوفی بزرگ تھے ، لیکن وحدۃ الوجود اور بعض دوسرے مسائل کی تعبیر میں حدود سے تجاوز کر گئے ۔ اس کے لیے برِ صغیر کے 'ابن عربی' اور 'شیخ کبیر' کہلائے اور ان کے بارے میں اپنے وقت کے اکابر کی رائے مختلف ہوگئی ۔ ان کی مشہور تصنیف رسالہ 'تسویہ' ہے جو

---

۱ ۔ نزھۃالخواطر ۵ : ۲۲۲ بعد ۔ زبید احمد صفحہ ۲۷۶ ۔ مآثر الکرام صفحہ ۲۳۵ ۔ معارف جولائی ۱۹۷۰ء صفحہ ۳۶ ۔

مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی کی 'شرح تحلیہ' کے ساتھ چھپ گیا ہے۔ اس رسالہ کی انہوں نے دو شرحیں ایک عربی اور دوسری فارسی میں لکھی ۔ فارسی شرح کا ایک نسخہ پشاور میں ہے ۔ اس رسالہ کی چند غیر محتاط تعبیرات کی وجہ سے دورِ عالمگیری میں بحکم شہنشاہ اس رسالہ کے نسخے جلائے گئے اور شیخ کے خلیفہ سید محمدی شارح 'تسویہ' سے باز پرس کی گئی[1] ۔ 'تسویہ' کے علاوہ 'ترجمۃ الکتاب' (تفسیر میں) 'فصوص الحکم' کی عربی 'شرح تجلیۃ الفصوص' ، 'انفاس الخواص المغالطۃ العامۃ' ، 'اخص الخواص' اور 'عقائد الخواص' (تصوف میں) اور 'الکتاب المبین' (فلسفہ میں) ان کی وہ تصنیفات ہیں جن کے قلمی نسخے ملتے ہیں[2] ۔

شیخ محی الدین ابن العربی کے فلسفۂ وحدۃ الوجود کو جس شدومد کے ساتھ محب اللہ الہ آبادی نے پیش کیا ہے اس کی مثال شاید ہی اور کہیں مل سکے، حتیٰ کہ شیخ الہ آبادی وحدۃ الوجود کی تشریح و تعبیر میں خود الشیخ الاکبر سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں ۔ فلسفہ وحدۃ الوجود کی اس تعبیر اورانتہا پسندانہ تائید کےباعث نہ صرف یہ کہ وہ برِّ صغیر کے 'ابنِ عربی' اور 'شیخ کبیر' بن گئےبلکہ بعض اہلِ علم کی جانب سے شدید مخالفت اور نکتہ چینی کا نشانہ بھی بنے ۔ شیخ محب اللہ الہ آبادی نے الشیخ الاکبر کے فلسفۂ وحدۃالوجود کو عام کرنے کے لیے ان کے افکار و نظریات کی تشریح و تعبیر کو اپنامقصد بنا لیا تھا ۔ اسی سلسلےکی ایک کوشش 'شرح فصوص الحکم' بھی ہے۔ شیخ محب اللہ نے 'فصوص الحکم' کی دوشروح لکھیں ایک عربی میں اور ایک فارسی میں ۔ شیخ کے علاوہ ہندی علماء میں سے شیخ علی المہائمی اور شیخ امیر اللہ بہاری صاحب 'حل معضلات الفصوص' جسے 'تحلیل معضلات ابن العربی' بھی کہا جاتا ہے، (انڈیا آفس لائبریری نمبر ۱۰۴۳) نے بھی 'فصوص الحکم' کی شروح لکھی ہیں ۔ لیکن محب اللہ کی شرح مسمی 'تجلیۃ الفصوص' کوسب پر فوقیت حاصل ہے ۔ شیخ نے 'فصوص الحکم' کی لفظی اور معنوی مشکلات کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا ۔ مفردات لغوی کی تشریح ، نحوی تراکیب کا حل، مشکل جملوں اور عبارات کی توضیح اور شیخؔ کے افکار کی معنوی گہرائی ، غرض ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کی ہے ۔

شیخ محب اللہ الہ آبادی نے اسی سلسلے میں ایک اور عمدہ کوشش بھی اپنی یادگار چھوڑی ہےاور وہ 'انفاس الخواص' ہے، جس کےتین نسخےانڈیا آفس لائبریری (نمبر ۱۲۷۹)،

---

۱ - معاشرتی علمی تاریخ ، ص ۳۱۹ - ۳۲۱

۲ - نزھۃ الخواطر ۵ : ۳۲۲ - ۳۲۵ - زبید احمد بحسب الفہرس ، بروکلمن ۲ : ۴۲ - ذیل ۲ : ۶۱۸ - تذکرۃ (اردو)، ص ۴۰۴ : ۴۰۵ ، رود کوثر، ص ۴۴۰ ۔ معاشری و علمی تاریخ ، ص ۳۶۰ ۔

رام پور (نمبر ۹۳) اور بانکی پور (نمبر ۸۸۳) میں موجود ہیں ۔ تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب میں شیخ محب اللہ نے ابن العربی کے فلسفۂ تصوّف کی تشریح کر کے اپنے آپ کو بسرِ صغیر کے 'ابن عربی' اور 'شیخ کبیر' ہونے کو صحیح ثابت کر دیا ہے ۔ جس طرح ابن العربی نے 'فصوص الحکم' میں ہر فص کو ایک نبی سے مختص کیا ہے اور پھر اس کے ضمن میں فلسفۂ تصوّف کو پیش کیا ہے ، اسی طرح شیخ محب اللہ نے ہر نبی سے ایک نفس (بمعنی قول یا ملفوظ جمع انفاس) منسوب کیا ہے اور ابن عربی کی اقتدا میں اپنے فلسفۂ تصوّف کی تشریح کی ہے ۔ 'انفاس الخواص' اکیاسی (۸۱) انفاس پر مشتمل ہے ۔ پہلا نفس حقیقت محمدیؐ سے متعلق ہے جو "النفس الاحمدی" کے نام سے موسوم ہے ۔ اس کے بعد حضرت آدمؑ سے شروع کر کے حضرت محمدؐ تک تمام انبیاء سے ایک ایک نفس مختص کیا ہے اور پھر خلفاء راشدین کے انفاس کے بعد مختلف اولیاء کے انفاس ہیں ، جن میں سب سے آخری نفس شیخ محب اللہ کے اپنے پیر و مرشد شیخ ابوسعید بن نور بن علی بن عبدالقدوس سے مختص ہے ۔ ہر بزرگ شخصیت کا نفس اس سے مشہور قول یا ملفوظ سے شروع ہوتا ہے ۔ انبیاء کے وہ انفاس (اقوال و ملفوظات) لیے گئے ہیں جو قرآن کریم میں مذکور ہیں ۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام سے متعلق جو نفس ہے وہ یوں شروع ہوتا ہے:
وقال ابوالبشر آدم صفی اللہ ؛ ربنا ظلمنا انفسنا (ابوالبشر آدم صفی اللہ نے کہا : اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے آپ پر زیادتی کی) ۔

یہ کتاب 'انفاس الخواص' دراصل 'فصوص الحکم' کے ایک خلاصہ کی شرح ہے جو شیخ محب اللہ نے مرتب کیا تھا ۔

شیخ محب اللہ الہ آبادی کا ایک اور علمی کارنامہ ان کی صوفیانہ تفسیر قرآن ہے جو 'ترجمة الکتاب' (یا المراتب الاربعة) کے نام سے موسوم ہے ۔ شیخ نے 'حاشیة ترجمة الکتاب' کے نام سے اپنی اس کتاب پر خود حواشی بھی تحریر کیے ہیں[1] ۔ شیخ 'ترجمة الکتاب' کے مقدمے میں لکھتے ہیں : فانه کان لی وقت فجاء رجل من اقصی المدینة و معه فصوص الحکم بین یدی ساجداً قائماً تحت الکرسی ملتمساً لقراءته علی . . . . وقد بشر به و بتسمیته 'بترجمة الکتاب' (میں ایک خاص حال میں تھا کہ شہر کے دور کنارے سے ایک شخص 'فصوص الحکم' کے لیے میرے سامنے کرسی کے نیچے سجدہ کی حالت میں آ کھڑا ہوا اور مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کی زبانی یہ کتاب سنوں . . . . . اور پھر اس نے یہ بھی بتایا کہ اسے بشارت دی گئی ہے کہ میں اس موضوع پر ایک کتاب لکھوں گا اور اس کا نام 'ترجمة الکتاب' ہوگا) ۔ کتاب کو مصنف نے چار مراتب میں تقسیم کیا ہے اور اسی اعتبار سے اسے 'المراتب الاربعة' کا نام بھی دیا جاتا ہے ۔ مرتبہ اولیٰ میں علم

---

۱ ۔ دیکھیے انڈیا آفس لائبریری نمبر ۱۳۹۶ ، ۱۳۹۷

الکلام کے بعض اہم و ضروری مسائل کا بیان ہے ۔ مثلاً ذات واجب تعالیٰ اور اس کی صفات کا اثبات ، رویتِ ربانی اور افعال العباد ۔ مرتبہ ثانیہ میں بعض ضروری فقہی مسائل کا بیان ہے ۔ 'مرتبہ ثالثہ' میں اسرارِ طریقت کا ذکر ہے اور 'مرتبہ رابعہ' میں حقیقت یا ایک سالکِ راہِ تصوّف کے شخصی تجربات بیان کیے ہیں ۔ یہ آخری 'مرتبہ' بعض تنبیہات پر مشتمل ہے ، جیسے وجود ، خلافت ، تکلیفِ شرعی ، نورِ ربانی ، معرفت اور ولایت کے بارے میں بعض تنبیہات ۔ شیخ نے 'ترجمة الکتاب' پر جو حواشی لکھے ہیں وہ بھی زیادہ تر اسی مرتبۂ رابعہ سے متعلق ہیں ۔ حاشیہ 'ترجمة الکتاب' کے دیباچے میں شیخ نے ذکر کیا ہے کہ 'الفتوحات المکیة' اور 'فصوص الحکم' کے گہرے مطالعہ کے بعد اہلِ معرفت و تصوّف کے اقوال کی روشنی میں میں نے اپنی کتاب 'ترجمة الکتاب' کے مرتبۂ رابعہ کے بارے میں بعض حقائق و معارف کا اضافہ کرنے کا ارادہ کیا اور یہ حواشی مرتب کیے ہیں ۔

۱۶ ۔ سید احمد گیسو دراز کالپوی

شیخ احمد بن ابی سعید کالپوی عالم اور سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ تھے ۔ ابتدائی علوم اپنے گھر پر اپنے والد (شیخ محمد بن ابی سعید متوفی ۱۰۷۱ھ/۱۶۶۰ء جن کا تذکرہ ہو چکا ہے) سے حاصل کیے ۔ پھر شیخ محمد افضل الہ آبادی کے شاگرد ہوئے ۔ علومِ باطن میں تربیت اپنے والد صاحب سے پائی ۔

خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز (متوفی ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء مدفون گلبرگہ) کی صحبت میں انہوں نے بھی زلفیں چھوڑی تھیں ۔ اس لیے یہ بھی گیسو دراز مشہور ہوئے ۔ وحدۃالوجود کے قائل تھے ۔ عربی زبان میں 'شرح'، 'شرحِ عقائد نسفی' اور 'جوامع الکلم' (شرح اسماءاللہ الحسنیٰ) اور فارسی زبان میں 'مشاہدات' (تصوف) اور ایک دیوان ان کی تصانیف ہیں جو ناپید ہیں ۔ ۱۰۸۴ھ/۱۶۷۳ء میں بعمر ۳۶ سال وفات پائی[1] ۔

۱۷ ۔ جعفر الصادق العیدوس

جعفر بن علی بن عبداللہ بن شیخ المعروف جعفر الصادق 'النور السافر' کے مؤلف کے خاندان میں مشہور بزرگ گزرے ہیں ۔ تریم (حضرموت) میں پیدا ہوئے ، تفسیر ، فقہ ، حدیث ، تصوف ، عربیہ ، حساب ، ہیئة اور فرائض میں مہارت حاصل کرنے کے بعد کچھ

---

۱ ۔ نزہة الخواطر ۵: ۶۱ ۔ ۶۲ ؛ زبید احمد ، ص ۳۰۹ ۔ تذکرہ ، ص ۲۲۵ ۔ خزینة الاصفیاء ۱ : ۴۷۴ ۔ ۴۷۵ (آخر الذکر تینوں نے سال وفات ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء بتایا ہے مگر نزہة الخواطر کا بیان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے) ۔

مدت اپنے وطن میں اجلال و احترام سے گزارے ، پھر ہند آئے اور ملک عنبر کے ہاں اعزاز پایا ۔ فارسی سیکھی اور اس میں عربی سے ترجمے کیے ۔ کئی کتابوں کے مصنف اور بلند پایہ صاحبِ دیوان شاعر تھے ۔ دارا شکوہ کے اشارہ پر اس کی کتاب 'سکینة الاولیاء' کا عربی ترجمہ 'تحفة الاصفیاء' کے نام سے کیا ، جس کا قلمی نسخہ رامپور میں ہے ۔

شیخ جعفر العیدوس نے فارسی زبان سے عربی میں جن کتابوں کے تراجم کیے ان میں سے صرف 'تحفة الاصفیاء'، تعریب 'سفینة الاولیاء' کا ایک نسخہ دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہ گیا ہے ۔ مترجم چونکہ خالص عرب خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کی ولادت اور نشوونما بھی بلادِ عرب میں ہوئی ، اس کے علاوہ انہوں نے خداداد صلاحیت سے فارسی زبان پر بھی عبور حاصل کر لیا تھا ، اس لیے 'تحفة الاصفیاء' کا اسلوبِ بیان فصیح و بلیغ اور صحیح عربی زبان میں ہے اور ترجمہ کے بجائے ذہنی تخلیق معلوم ہوتی ہے ۔ ۱۶۵۴ع/۱۰۶۵ھ میں وفات پائی[۱] ۔

۱۸ ۔ مولانا نورالحق دہلوی

جمال الدین ابو السعادات مولانا مفتی نورالحق البخاری شیخ عبدالحق دہلوی کے فرزندِ ارجمند اور حسنِ سلیقہ اور علم و فضل میں اپنے والد کے مثل تھے ۔ شیخ ان کو اپنا وجودِ ثانی کہا کرتے تھے اور انہیں اپنا جانشین ٹھہرایا تھا ۔ شیخ عبدالحق کی زندگی میں اکبر آباد کے قاضی مقرر ہوئے اور "حق اس منصب نازک چنانچہ باید بتقدیم رسانید[۲]" ۔ پھر شیخ کی وفات پر ان کی مسند سنبھال لی ۔ ان کی مشہور تصنیف 'صحیح بخاری' کی مبسوط شرح 'تیسیرالقاری' (فارسی) ہے جو مطبوع ہے ۔ اس کے علاوہ 'شرح شمائل ترمذی' (فارسی) 'تفسیر سورة الفاتحہ' (فارسی) اور 'حاشیہ شرح جامی' عربی کے قلمی نسخے ملتے ہیں ۔ 'شرح عضدی مطالع' اور 'شرح ہدایہ الحکمۃ' وغیرہ معقول کی کتابوں پر بھی حواشی لکھے جو ناپید ہیں ۔ بقیہ چند کتابوں کا تعلق فارسی ادب سے ہے ، جس کے وہ اچھے ادیب اور شاعر تھے اور مشرق تخلص فرماتے تھے ۔ ۱۶۶۳ع/۱۰۷۳ھ میں ۹۲ سال کی عمر میں وفات پائی[۳] ۔

---

۱ ۔ نزهة الخواطر ۵ : ۱۰۷ ، خلاصة الاثر ۱ : ۴۸۲ ، زبید احمد ، ص ۳۹۵ (معمولی تصحیح کے ساتھ)

۲ ۔ مآثر الکرام ، ص ۲۰۲ ۔

۳ ۔ : حیات شیخ عبدالحق، ص ۲۵۷ - ۲۶۰ - زبید احمد، ص ۲۵۷، ۳۶۰ ، نزهة الخواطر ۵: ۴۲۳ ببعد ، تذکرہ (اردو)، ص ۵۳۴ ، ڈاکٹر اسحاق ، ص ۱۵۴ ۔

شیخ نورالحق دہلوی کی 'تفسیر سورۃ الفاتحہ' کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (۲: ۲۰۴) کے کتب خانے میں موجود ہے ۔ سورۃ الفاتحۃ ام الکتاب اور فاتحۃالکتاب ہونے کی حیثیت سے قرآن کریم کی اہم سورۃ ہے ۔ اس میں جو مسائل بیان ہوئے ہیں وہ اختصار و جامعیت کے لحاظ سے مضامین قرآن کا خلاصہ سمجھے جاتے ہیں ۔ اس سورۃ کی اسی اہمیت کے پیش نظر برصغیر کے بہت سے اہل علم نے اس سورۃ کی تفسیر پر مستقل کتابیں لکھی ہیں جن میں شیخ ابوالفضل اور ملا عبداللہ اللبیب بھی شامل ہیں ۔ شیخ نورالحق دہلوی کی یہ کوشش بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے ۔ شیخ نے اپنی تفسیر میں متقدمین خصوصاً زمخشری ، بیضاوی اور رازی کی تفاسیر سے مدد لی ہے اور اپنے زمانے کے عام مفسّرین کے انداز میں سورۃ الفاتحہ کی تفسیر کی ہے ۔ مفردات لغوی ، تراکیب نحوی اور دیگر علمی و فقہی مسائل سے مفصل بحث کی ہے اور تقریباً ان تمام مسائل سے تعرض کیا ہے جن سے بیضاوی اور زمخشری بحث کرتے ہیں ۔

۱۹ ۔ محمد حسین جونپوری

قاضی محمد حسین جونپوری عہد شاہجہانی میں جونپور کے قاضی تھے ۔ عہد عالمگیر میں اولاً الہ آباد کی قضا سپرد ہوئی ، پھر محتسب بنائے گئے اور منصب میں اضافہ ہوا ۔ 'فتاویٰ عالمگیری' کی تدوین میں ان کا بڑا حصہ ہے ۔ جلوس عالمگیر کے تیرھویں سال ۱۶۷۰ء/۱۰۸۱ھ میں وفات پائی[۱] ۔

۲۰ ۔ مفتی وجیہ الدین گوپاموی

۱۵۹۶ء/۱۰۰۵ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے خاندان کے بزرگوں سے تحصیل علم کی ۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی وسیع تھا ۔ 'فتاویٰ عالمگیری' کے ایک ربع کی تدوین ان کے سپرد تھی اور دس علماء کی ایک جماعت ان کی معاون تھی ۔ دیگر تصنیفات میں 'حصن' حصین کی شرح (اوراد) اور 'خیالی' (عقائد) اور 'مطول' (بلاغت) پر حواشی اور تصوّف کے کچھ رسالے شامل ہیں ، جو بظاہر سب ناپید ہیں ۔ ۱۶۷۲ء/۱۰۸۳ھ میں فوت ہوئے[۲] ۔

۲۱ ۔ عبدالرشید جونپوری

شمس الحق شیخ محمد رشید بن محمد مصطفیٰ عثمانی جونپوری جو بعد میں ملا عبدالرشید

---

۱ ۔ نزہۃالخواطر ۳۶۴ ۔

۲ ۔ نزہۃ الخواطر ۵ : ۴۳ ۔

کے نام سے مشہور ہوئے، ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱ء میں جونپور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی علوم اپنے علاقے میں حاصل کیے اور تکمیل استاد الملک محمد افضل جونپوری اور مفتی نورالحق دہلوی سے کی۔ ابتدائے شباب میں تصوف کی طرف مائل ہوگئے، مگر شیخ طیب بنارسی نے پہلے علم کی تحصیل کی ہدایت کی اور فراغت کے بعد انہیں کئی طریقوں میں بیعت فرمایا۔ کافی مدت تک تدریس میں مشغول رہے۔ بعد میں سب کچھ چھوڑ کر کتب تصوف خصوصاً ابن عربی کی کتابوں کے مطالعہ میں مصروف رہنے لگے۔ شاہجہان نے ان کی شہرت سن کر بلانے کے لیے آدمی بھیجا مگر انہوں نے اپنی خانقاہ سے نکلنا قبول نہیں کیا۔ یوم جمعہ ۹ رمضان ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء کو صبح کی نماز میں انتقال فرمایا۔

ان کا رسالہ 'رشیدیہ' (آداب مناظرہ میں) درس نظامی میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ 'حاشیہ شرح عضدیہ' (اصول فقہ) 'شرح ہدایۃ الحکمۃ' (فلسفہ) 'خلاصۃ النحو' اور شیخ اکبر کی 'اسرارالمخلوقات' کی شرح وغیرہ عربی تصانیف ہیں۔ فارسی میں شعر کہتے تھے اور شمسی تخلص فرماتے تھے۔ تصوف کے چند رسالے اور ایک دیوان فارسی میں لکھا۔ 'رشیدیہ' کے سوا باقی تمام کتابیں غالباً ناپید ہیں[1]۔

'الآداب الرشیدیة فی شرح الآداب الشریفیة فی المناظرة'، شیخ عبدالرشید جونپوری کی ایک زندۂ جاوید تصنیف ہے اور صدیوں سے علم المناظرہ میں ایک مستند، جامع اور مفید کتاب کی حیثیت سے اہل علم و فضل کا مرجع رہی ہے۔ مدارس نظامیہ کے فاضل علماء فارغ التحصیل ہونے کے بعد شوقیہ طور پر جن علوم میں تخصص و مہارت کی کوشش کرتے ہیں اس میں ہیئت کے علاوہ فن مناظرہ بھی ہے۔ اس موضوع پر شیخ جونپوری کی یہ تصنیف کافی و وافی سمجھی جاتی ہے۔ 'الآداب الرشیدیة' جو عام طور پر صرف 'الرشیدیة' یا 'رشیدیہ' کے نام سے موسوم ہے دراصل شیخ علی بن محمد الجرجانی (م - ۱۴۱۳ء/۸۱۶ھ) جو عام طور پر میر سید شریف جرجانی کے نام سے مشہور ہیں، کی ایک مقبول و مستند تصنیف 'الآداب الشریفیہ فی المناظرة' کی ممزوج شرح ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ شرح نے اصل کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اہل علم و فضل 'الآداب الشریفیة' کے بجائے صرف 'الرشیدیة' کو اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہیں۔ شیخ عبدالرشید کے علاوہ اور علماء نے بھی 'الآداب الشریفیة' کی شروح لکھی ہیں جن میں ملا عبدالباقی بن غوث الاسلام صدیقی جونپوری (م - ۱۶۷۵ء/۱۰۸۶ھ) کی دو شروح 'الآداب الباقیة' اور 'الابحاث الباقیة' قابل ذکر ہیں۔ لیکن جو شہرت 'الرشیدیة' کو حاصل ہوئی اور کسی کو نصیب نہیں ہو سکی۔

۱- زبید احمد بحسب الفہرس، تذکرہ، ص ۲۹۷ (دونوں کتابوں میں مزید مراجع کا ذکر ہے) نزھة الخواطر ۵: ۲۶۷-۲۷۰؛ مآثرالکرام، ص ۲۰۳-۲۰۴۔

میر سید شریف نے اپنی کتاب 'الآداب الشریفیة' کی جو تقسیم و ترتیب رکھی تھی، شارح نے بھی 'الآداب الرشیدیة' کی ترتیب و تقسیم تقریباً وہی رکھی ہے۔ یعنی سب سے پہلے علم المناظرہ کے سلسلے میں چند مقدمات ہیں، پھر چند ابحاث اور سب سے آخر میں بعض اہم امور کے بارے میں خاتمہ کے عنوان سے ایک مستقل باب ہے۔ ملا عبدالرشید جونپوری نے شرح کے آخر میں آٹھ ایسی باتوں کا اضافہ کیا ہے جو امام فخرالدین رازی کے نزدیک ایک مناظر کے لیے ضروری ہیں۔ شرح چونکہ ممزوج ہے اس لیے اصل اور شرح کی عبارت باہم مربوط و مخلوط معلوم ہوتی ہے۔ تاہم اصل کی عبارت کے اوپر خط کھینچ دیا گیا ہے تاکہ اصل و شرح کے درمیان امتیاز قائم رہے۔ شارح لفظ المناظرة کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''المناظرة مأخوذ امامن النظیر بمعنی ان ماخذھا شیٔ واحد وھوالنظر او من النظر بمعنی الابصار او بمعنی التفات النفس الی المعقولات والتأمل فیھا او بمعنی الانتظار او بمعنی المقابلة (لفظ مناظرہ یا تو النظیر سے ماخوذ ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ ان دونوں کا ماخذ یعنی نظر ایک ہے، یا لفظ مناظرہ النظر سے ماخوذ ہے۔ بمعنی قوتِ بینائی یا مطلب یہ ہوگا کہ نفس انسانی معقولات کی جانب متوجہ ہو اور ان میں غور و فکر کرے، یا یہ لفظِ مناظرہ بمعنی انتظار اور مقابلہ ہے[1])۔

۲۲۔ علی اکبر الہ آبادی

قاضی علی اکبر حسینی حنفی الہ آبادی فقہ اور قواعدِ عربی کے بالغ النظر عالم تھے۔ علامی سعد اللہ خاں نے ان کو اپنے فرزند لطف اللہ کا معلم مقرر کیا۔ پھر شہنشاہ عالمگیر نے اپنے عہد میں شہزادہ محمد اعظم کی تعلیم پر مامور فرمایا اور جب ان کی فضیلت سے واقف ہوئے تو لاہور کی قضا سپرد کی جس کے فرائض انہوں نے نہایت دیانت داری اور جاہ و جلال سے انجام دیے۔ تدوینِ 'فتاویٰ عالمگیری' کے ایک ربع کی نظارت (نگرانی) ان کے سپرد تھی۔ ۱۶۷۸ء/۱۰۹۰ھ میں والیٔ لاہور قوام الدین اصفہانی کے اشارے سے کوتوالِ شہر نے ان کو ظلماً قتل کیا۔ شہنشاہ نے کوتوالِ شہر کو قصاص میں قتل کیا اور والی کو شیخ الاسلام کے سپرد کیا مگر ان کے ورثہ نے اسے معاف کر دیا۔ 'فصول اکبری' اور اس کی شرح (عربی) تین کتابیں عربی کے قواعد صرف میں لکھیں جن میں سے مقدم الذکر 'درس نظامی' میں شامل ہے[2]۔

شیخ علی اکبر ہندی علماء صرف و نحو میں ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں۔ ان کی

۱۔ الرشیدیة، ص ۵۔

۲۔ نزھة الخواطر ۵: ۲۸۱-۲۸۲، بحوالہ مآثر الامراء و مآثر عالمگیری۔ زبید احمد ۳۰، ۳۰۸۔

عربی صرف کے قواعد و اصول کے بارے میں دو کتابیں ہیں جن میں سے ایک 'فصول اکبری' ہے جس میں عربی صرف کے قواعد فارسی زبان میں بیان کیے گئے ہیں - یہ ایک نہایت مفید کتاب ہے جو مدارسِ عربیہ کے نصاب تعلیم میں داخل رہی ہے - مصنف نے یہ کتاب بشرِ صغیر کے مبتدی طلبہ کے لیے لکھی - اس میں افعال کی اقسام ، تصریف اور تعلیل پر بڑے جامع اور مختصر انداز میں بحث کی گئی ہے -'فصول اکبری' کے ساتھ مصنف کے دو اور قیمتی رسالے بھی شاملِ طباعت ہیں جن میں سے ایک 'گہر منظوم' ہے جس میں عربی قواعدِ صرف کو فارسی نظم میں پیش کیا گیا ہے اور دوسرا رسالہ 'لامیہ' ہے جس میں مصنف نے الف لام (حرف تعریف) کے مختلف معانی اور مقاصدِ استعمال سے بحث کی ہے -

شیخ علی اکبر الہ آبادی کی دوسری اہم تصنیف 'الاصول الاکبریۃ' ہے - اس کتاب کا موضوع بھی 'فصول اکبری' کے موضوع سے ملتا جلتا ہے - تاہم اس میں ذریعہٴ اظہار فارسی کے بجائے عربی ہے - مصنف نے اس کتاب میں عربی صرف و نحو کے اصول و قواعد پر بڑے عام فہم اور جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے اور افعال کی مختلف اقسام (ثلاثی مجرد ، ثلاثی مزید فیہ ، رباعی مجرد ، رباعی مزید فیہ اور ہفت اقسام) کی تفصیلی بحث کے علاوہ مصادر کے اوزان ، جمع کے اوزان اور افعال کی تصریف و تعلیل بھی بیان کی ہے -

۲۳ - نظام الدین برہانپوری

مولانا نظام الدین برہانپوری اپنے وقت کے متبحر عالم تھے - انہوں نے فتویٰ دینے میں قدیم یادیں تازہ کیں - عالمگیر نے بزمانہ نیابتِ دکن انہیں خدمات تفویض کیں اور جب شہنشاہ ہوئے تو 'فتاویٰ عالمگیری' کے وسیع منصوبے کے نگران مقرر ہوئے اور صلہ میں منصب میں اضافہ پایا - چالیس سال شہنشاہ کی خدمت میں گزارے - شہنشاہ ان سے 'احیاء العلوم' اور 'فتاویٰ عالمگیری' کا مذاکرہ کیا کرتے تھے - بقول مرأۃ العالم ۱۶۸۱ء/۱۰۹۲ھ میں وفات پائی - مگر بزمِ تیموریہ میں ہے کہ بادشاہ نے ۱۶۸۵ء/۱۰۹۷ھ میں انہیں نوازا[1]-

۲۴ - عبداللہ اللبیب

مولانا عبداللہ اللبیب مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے فرزندِ ارجمند اور علم و فضل

---

۱ - نزھۃ الخواطر ۵ : ۳۲۰ - اورینٹل کالج میگزین ، فروری ۱۹۶۹ء - بزم تیموریہ ، ص ۲۳۸ بعد -

میں اپنے والد کے جانشین تھے - انہوں نے دیگر علوم اپنے والد سے اور علمِ حدیث مولانا نورالحق دہلوی سے حاصل کیا - سیالکوٹ میں ہی مسند درس بچھائی - ان کے مدرسہ کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی - اورنگ زیب عالمگیر ان کا اور ان کی اولاد کا قدردان تھا- شہنشاہ نے مولانا کو صدارت عظمیٰ سپرد کرنا چاہی مگر انہوں نے قبول نہیں فرمائی - ۱۶۸۲ع/۱۰۹۳ھ میں فوت ہوگئے -

تصنیفات میں 'تصریح حاشیہ تلویح' مطبوع ہے - 'تفسیر سورہ فاتحہ' کا[1] قلمی نسخہ رامپور میں اور 'حاشیہ علی حاشیة عبدالغفور' کا برٹش میوزیم میں ملتا ہے - ان کی وفات پر ان کے چچازاد بھائی نے ان کی یاد میں 'زاد اللبیب' نام کتاب لکھی جو مطبوع اور متداول ہے[2]-

ملا عبداللہ اللبیب سیالکوٹی کی ایک تصنیف 'التصریح بغوامض التلویح' بھی ہے، جس کا نسخہ انڈیا آفس لائبریری (نمبر ۳۲۷) میں موجود ہے - صدرالشریعة علامہ قاضی عبداللہ بن مسعود حنفی بخاری (م - ۱۳۴۶ع/۷۴۷ھ) نے حنفی اصول فقہ کے موضوع پر ایک جامع کتاب لکھی تھی جس کا نام 'تنقیح الاصول' ہے - اس کتاب کی سینکڑوں شروح اور حواشی میں سے سب سے بہتر اور مقبول ترین شرح علامہ سعدالدین تفتازانی (م - ۱۳۸۹ع/۷۹۲ھ) کی شرح ہے جو 'التلویح الی کشف حقائق التنقیح' کے نام سے موسوم اور متداول ہے - ملا عبداللہ اللبیب نے اسی التلویح کے حواشی اور شرح لکھی ہے - یہ کام انہوں نے اپنے والد مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی نگرانی میں اپنے زمانۂ شباب میں انجام دیا اور اس میں اپنے والد بزرگوار کے حواشی بھی شامل کر دیے جو انہوں نے التلویح کی تدریس و مطالعہ کے دوران مرتب کئے تھے - ملا عبداللہ سیالکوٹی کی یہ شرح اصل کتاب کے بعض اہم اور مشکل مقامات کی تشریح و توضیح پر مبنی ہے اور مکمل کتاب کی شرح نہیں ہے[3]-

۲۵ - محمد اکرم لاہوری

ملا محمد اکرم ولد ملا محمد یحییٰ لاہوری فاضل مدرس تھے - شہزادہ کامگار محمد بخش کے معلّم مقرر ہوئے تھے اور صلح ، حلم اور بردباری میں مثل تھے - موروثی مفتی تھے- قاضی عبداللہ کے بعد اردوئے معلیٰ کے قاضی مقرر ہوئے - 'فتاویٰ عالمگیری' کے ایک ربع کی

---

۱ - اس تفسیر پر ان کے خواہرزادہ محمد فضل اللہ نے ۱۷۰۲ع/۱۱۱۴ھ میں حاشیہ لکھا - قلمی نسخہ انڈیا آفس میں ہے -

۲ - نزہةالخواطر ۵ : ۲۵۳ - زبید احمد بحسب الفہرس ، بروکلمن ذیل ۲ : ۶۱۳ -

۳ - کشف الظنون : ۲ ، ۸۳۳ ، انڈیا آفس نمبر ۳۱۹ ، ۳۲۲ ، ۳۲۷ -

تدوین ان کے سپرد تھی ۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی فرماتے تھے کہ لاہور میں کوئی شخص ملا یحییٰ کے بیٹے کی فضیلت کو نہیں پہنچتا ۔ ۱۶۸۲ء/۱۰۹۳ھ میں وفات پائی[1]۔

۲۶ ۔ رضی الدین بھاگلپوری

علم و فضل میں امتیاز اور شہرت کی بنا پر 'فتاویٰ عالمگیری' کے مؤلفین میں شامل کیے گئے اور تین روپیہ روزینہ مقرر ہوا ۔ فقہ کے علاوہ سیاست ، ادب اور فنون سپہ گری میں بھی ماہر تھے ۔ قاضی محمد حسین جونپوری کے ہاں تقرب حاصل ہوا اور بختاور خان کی سفارش سے 'یک صدی' منصب عطا ہوا ۔ پھر خان کا لقب ملا ۔ پھر کچھ مدت برار کی جاگیر میں نیابت ملی ۔ ۱۶۸۵ء/۱۰۹۶ھ میں فوت ہوئے ۔

۲۷ ۔ محمد یعقوب بنانی

ابو یوسف محمد یعقوب بنانی (یا بنبانی ؟) لاہوری بڑے فاضل محدث، فقیہ اور معقولات کے ماہر تھے ۔ لاہور میں پیدا ہوئے اور یہیں اساتذۂ فن سے تکمیل علوم کی ۔ شہنشاہ شاہجہان نے انہیں فوج کا میر عادل مقرر فرمایا ۔ اس کے ساتھ مدرسۂ شاہجہانیہ (دارالبقاء) میں درس بھی دیتے رہے ۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں ناظر محاکم بنائے گئے ۔ ۱۶۸۷ء/۱۰۹۸ھ میں وفات پائی اور دہلی میں مدفون ہوئے ۔ 'خیر جاری شرح صحیح بخاری'، 'المعلم شرح'، 'صحیح مسلم'، اور 'مصفی شرح مؤطا' (حدیث میں) 'حاشیہ عضدی و شرح تہذیب الکلام' (عقائد میں) 'حاشیہ بیضاوی' (تفسیر میں) 'شرح حسامی' اور 'شرح شرعة الاسلام' (فقہ و اصول میں) 'اساس العلوم حاشیہ رضی' (قواعد عربیہ میں) ان کی تصانیف ہیں ۔ جن میں سے اول الذکر کا ایک قلمی نسخہ بانکی پور میں موجود ہے ۔ باقی تمام کتابیں غالباً ناپید ہیں[2]۔

۲۸ ۔ ملا قطب الدین سہالوی

خاندان فرنگی محل کے جد اعلیٰ اور بانی درس نظامی مولانا نظام الدین کے والد مولانا قطب الدین شہید سہالوی بن مولانا عبدالحکیم انصاری علوم معقول و منقول کے فاضل بزرگ تھے ۔ انہوں نے علوم درسیہ مولانا دانیال چوراسی (تلمیذ عبدالسلام دیوی

---

۱ ۔ ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۵۳ء ۔ بزم تیموریہ ، ص ۲۵۱ ۔ منتخب اللباب (اردو) ۳ : ۲۸۳ ۔ ۲۸۴ ۔

۲ ۔ نزھۃالخواطر ۵ : ۴۳۹ ۔ ۴۴۰ ۔ ڈاکٹر اسحاق ، ص ۱۶۶ ۔ مفتاح نمبر ۴۹۴ ۔

تلمیذ عبدالسلام لاہوری) سے پڑھے - تیس سال کی عمر میں علوم سے فارغ ہو کر قاضی گھاسی الہ آبادی کے ہاتھ پر (جو محب اللہ الہ آبادی کے خلیفہ تھے) طریقۂ چشتیہ میں بیعت کی - روزانہ تہجد میں ختمِ قرآن فرماتے اور مسلسل روزے رکھا کرتے تھے۔ ہفتہ میں پانچ دن درس دیتے اور منگل اور جمعہ کو تصنیف میں مشغول رہتے -

بقول آزاد 'عمر ہا انجمن درس آراست و جہان جہان ارباب را بہ پایہ تکمیل رساند' - حافظ امان اللہ بنارسی اور قاضی محب اللہ بہاری ان کے مشہور تلامذہ میں سے تھے۔ ایک خاندانی نزاع میں فریقِ مخالف نے ان کے گھر پر دھاوا بول دیا - اس حملے میں شیخ اور ان کے خاندان کے بہت سے افراد شہید ہو گئے - اس کے بعد ان کے صاحبزادے اپنے بھائیوں کے ساتھ لکھنؤ منتقل ہوئے اور اورنگ زیب عالمگیر نے ان کو ایک فرانسیسی کی متروکہ املاک (فرنگی محل) کا قبضہ دلا دیا - شیخ قطب الدین کی شہادت ۱۶۹۲ء/۱۱۰۳ھ میں وقوع پذیر ہوئی - مولانا عبدالاعلی بن عبدالعلی فرنگی محلی نے ان کی سوانح کے بارے میں 'رسالہ قطبیہ' لکھا -

تصنیفات میں سے 'شرحِ عقائدِ جلالی' 'شرحِ عقائدِ نسفی' اور 'مطول تفتازانی' کے حاشیے اور 'رسالہ دارالحرب' (واقعۂ شہادت) ضائع ہوئے - 'حاشیہ امور عامہ' کے کچھ اجزاء اور 'حاشیہ تلویح' 'حاشیہ شرح حکمۃ العین' اور غالباً 'حاشیہ تفریعات بزدوی' بچ گئے تھے مگر وہ بھی اب سب ناپید ہیں[1]۔

۲۹ - ابن معصوم الدستکی

صدرالدین السید علی بن احمد نظام بن معصوم الحسینی الحسنی الشیعی الدستکی الشیرازی ثم المدنی ۱۶۸۱ء/۱۰۹۲ھ میں بمقام مدینہ منورہ پیدا ہوئے - مشہور فلسفی غیاث الدین کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے والد حیدر آباد کے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں مقیم تھے - سید علی بھی ابتدائے شباب میں یہاں آئے اور پندرہ سال تک حیدر آباد میں رہے۔ عبداللہ قطب شاہ کی وفات پر ابوالحسن (تانا شاہ) کی اس سے نہ بنی اور ابن معصوم نے اورنگ زیب عالمگیر تک رسائی حاصل کی ، جنہوں نے اسے خان (سید علی خان) کا خطاب دے کر مختلف مناصب پر مقرر کیا - زندگی کے آخری دور میں وہ پاک و ہند چھوڑ کر حجاز و عراق اور وہاں سے شیراز چلے گئے۔ ۱۷۰۵ء/۱۱۱۷ھ میں بمقام شیراز فوت

---

۱ - نزهة الخواطر ۶ : ۲۳۰ - ۲۳۱ - زبید احمد ۳۲۸ - تذکرہ صفحہ ۳۹۰ - (اور ان دونوں کے ذکر کردہ دیگر مراجع) مقالات شبلی ۳ : ۱۰۳ - ۱۱۳ - مآثر الکرام ، ص ۲۰۹ - ۲۱۰ - سبحہ ، ص ۷۶ - معارف جولائی ۱۹۷۰ھ -

ہوئے ۔ وہ بالغ النظر ادیب، مؤرخ اور شاعر تھے۔ تصنیفات میں سے 'سلافة العصر فی محاسن الشعراء بکل مصر' متداول ہے ۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنے زمانے کے بہت سے شعراء کے حالات جمع کیے ہیں ۔ جس میں جنوبی ہند کے عربی زبان کے شعراء کا بھی تذکرہ ہے ۔ باقی تصنیفات میں سے 'ریاض السالکین' (شرح الصحیفة السجاریة') اور 'انوار الربیع فی انواع البدیع' چھپ چکی ہیں اور 'سلوة الغریب و اسوة الاریب' (عجائب و غرائب) 'الدرجات الرفیعة فی طبقات الامامیة من الشیعة'، 'الطراز فی اللغة' 'الحدائق الندیة شرح الفوائد الصمدیہ' اور عربی کے ایک دیوان کے قلمی نسخے کتب خانوں میں محفوظ ہیں ۔ مولانا حکیم عبدالحیؒ نے 'الکلم الطیب والغیث الصیب' (اذکار و ادعیہ) بھی ان کی ایک تصنیف بتائی ہے اور اس میں سے اشعار کا نمونہ بھی دیا ہے[1] ۔

'سلافة العصر فی محاسن الشعراء بکل مصر' جس کا نام بعض نسخوں میں 'سلافة العصر فی محاسن اعیان العصر' بھی آیا ہے ، در اصل عربی زبان کے مشاہیر شعراء کے تذکروں کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہ سلسلہ 'یتیمة الدھر' کے مصنف ابو منصور الثعالبی (م ۱۰۳۷ء/۴۲۹ھ) نے شروع کیا تھا اور بعد میں 'دمیة القصر' کے مصنف الباخرزی، (م ۱۰۷۴ء/۴۶۷ھ) اور 'خریدة القصر' کے مصنف اصفہانی (م ۱۲۰۰ء/۵۹۷ھ) نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا ۔ 'سلافة العصر' در اصل اس سلسلے کے ایک اور تذکرے کا تکملہ اور ضمیمہ ہے جو شیخ شہاب الدین الخفاجی (م ۱۶۶۸ء/۱۰۶۹ھ) کی تصنیف ہے اور 'ریحانة الالباء' کے نام سے شائع اور متداول ہے ۔ ابن معصوم کو 'سلافة العصر' کی تصنیف کا شوق بھی 'ریحانة الالباء' کے مطالعہ کے بعد پیدا ہوا ۔ چنانچہ وہ کتاب کی اہمیت اور ستائش بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں : بیدا نہ اقتطف ریحانة من روض و امتاح نقطة من حوض فجاء الثمد ووقف دون الامد و اھمل ذکر جاعة من اکابر الفضلاء و اماثل النبلاء و مجیدی الشعراء و مفیدی البلغاء (یہ کتاب بایں ہمہ اوصاف بعض نقائص سے خالی نہیں کیونکہ اس کے فاضل مصنف نے ایک ہی باغ سے پھول توڑے ہیں اور ایک ہی حوض سے سیرابی حاصل کی ہے چنانچہ وہ تھوڑا سا پانی لا سکا اور دور جانے سے باز رہا ۔ اس لیے اس نے بڑے بڑے فضلاء بہترین شرفاء ، عمدہ شعراء اور اچھے بلغاء کا تذکرہ نہیں کیا[2]) ۔ ابن معصوم نے نہ صرف الخفاجی کی کمی کو پورا کیا بلکہ اور مفید و مزید اضافے بھی کیے ۔

یہ تذکرہ تقریباً ستوا سو شعراء کے سوانح اور انتخاب کلام پر مبنی ہے اور اس

---

۱ ۔ زبید احمد ۔ بروکلمن ۲ : ۴۲۱ ذیل ۲ : ۶۲۷ ۔ ۶۲۸ ۔ نزھة الخواطر ۶ : ۱۸۳ ۔ ۱۸۴
سبحة المرجان ، ص ۸۵ ۔

۲ ۔ سلافة العصر ، ص ۸ ۔

میں برِ صغیر پاک و ہند کے بعض شعراء کا تذکرہ بھی ہے ۔ مصنف نے کتاب کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ قسم اول اہلِ حرمین شریفین کے بارے میں اور قسم ثانی میں مصر و شام اور ان کے آس پاس کے شعراء کا ذکر ہے ۔ قسم ثالث میں شعراء یمن کا تذکرہ ہے ، قسم رابع عراق و عجم اور بحرین کے شعراء کے تذکرے پر مشتمل ہے اور قسم خامس المغرب (مراکش ، تونس اور الجزائر وغیرہ) کے شعراء کے سوانح اور انتخابِ کلام پر مبنی ہے ۔

۳۰ ۔ مولانا محمد محسن کشمیری

مولانا محمد محسن معروف بہ کشو کشمیری عالم و فاضل بزرگ تھے ۔ ۱۷۰۷ء/ ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی ۔ 'مواہب علیہ حاشیہ شرح عقائد جلال' ، 'حواشی ھدایہ' اور 'نجات المؤمنین' صاحب 'نزھۃالخواطر' نے تصنیفات بتائی ہیں ۔ جن میں سے 'نجات المومنین' کا قلمی نسخہ موجود ہے ۔ 'حاشیہ شرح عقائد جلالی' کا نسخہ اسلامیہ کالج میں ہے ، جسے مطبوعہ فہرست میں محسن فانی کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور قلمی نسخہ میں اس کی تصحیح کی گئی ہے[1] ۔

'نجات المومنین' سنی علم الکلام کے موضوع پر اپنی قسم کی واحد اور بہترین کتاب ہے ۔ خلافت اور امامت کا مسئلہ اہل السنۃ والجماعۃ اور اہلِ تشیع کے درمیان محلِ نزاع رہا ہے اور اس موضوع پر بے شمار کتابیں ہر دو طرف سے لکھی جا چکی ہیں مگر سنی نقطۂ نظر پر اس سے بہتر شاید ہی کوئی کتاب لکھی گئی ہو ۔ ملا محمد محسن کشمیری کا اسلوبِ بیان اور طرزِ استدلال بہت دلچسپ اور قوی ہے جو قاری کو بے حد متاثر کرتا ہے ۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ اگر خلفاءِ ثلاثہ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ حق پر نہ ہوتے اور معاذ اللہ غاصب ہوتے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ ان سے تعاون کیوں کرتے اور مالِ غنیمت میں سے حصہ اور دیگر فوائد و حقوق کیوں قبول کرتے ؟۔ اگر تین خلفاء برحق نہ تھے تو حضرت علیؓ نے ان سے بیعت کیوں کی ، جبکہ سعدؓ اور بلالؓ صحابہ کرام نے جرأت کی اور ان کا اعتراف نہ کیا ؟ حضرت علیؓ تقیہ فرما سکتے

---

۱ ۔ نزھۃ الخواطر ۶ : ۲۳۷ ۔ زبید احمد، ص ۲۲۹ ۔ تذکرہ، ص ۳۶۹ ۔ لباب المعارف نمبر ۹۳ء ۔

ہیں تو یہی تقیّہ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ نے کیوں نہ کیا ؟ ۔ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں سے ایک معاذ اللہ غلطی پر تھا ۔ یا یہ کہ چونکہ تین خلفاء حق پر تھے، اس لیے حضرت علیؓ نے ان سے بیعت کر لی مگر یزید حق پر نہ تھا اس لیے حضرت امام حسین نے اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی بجائے شہادت کو ترجیح دی اور باطل کے سامنے ڈٹ گئے ۔ اسی طرح وہ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ اگر حضرت علیؓ امامِ منصوب (اللہ کی طرف سے متعین کردہ) ہوتے تو جب تیسرے خلیفہ کے انتخاب کے لیے مجلسِ شوریٰ نامزد کی گئی تھی تو انہوں نے اس مجلس کی رکنیت کیوں قبول فرمائی؟ اس موقع پر یہ اعلان کیوں نہ فرمایا کہ میری امامت کے بارے میں قطعی نصوص موجود ہیں اور میری امامت محلِ نزاع نہیں ، اس لیے انتخاب کے لیے کسی مجلسِ شوریٰ کی نہ ضرورت ہے اور نہ میں اس کا ممبر بننا قبول کرتا ہوں ۔

۲۱ ۔ اورنگ زیب عالمگیر

مناسب ہوگا اگر آخر میں ان کا دوبارہ تبرکاً تذکرہ کردیا جائے ۔ 'فتاویٰ ہندیہ' کی تالیف پر ان کی نگرانی اور دوسرے مذہبی کارناموں کا ذکر بقدرِ مناسب ہوچکا ہے ۔ یہاں اس پر یہ اضافہ کیا جاتا ہے کہ شہنشاہ نے ایامِ شہنشاہی میں قرآنِ کریم بھی حفظ کیا تھا ۔ مرزا روشن ضمیر نے (جو عربی فارسی اور ہندی زبانوں میں موسیقی میں مہارت کے لیے مشہور ہیں) اس پر رباعی کہی اور بیس ہزار روپیہ انعام پایا ۔ قرأۃ وتجوید حافظ ابراہیم سے سیکھی ۔ شہنشاہ نے ایک چہل حدیث بعہد شہزادگی اور ایک بہ اہتّام شہنشاہی مرتب کی ۔ کسبِ حلال کے لیے اپنے ہاتھ سے مصحف لکھے اور ان کے زرِ ہدیہ کو اپنی تجہیز و تکفین کے لیے مخصوص فرمایا ۔ اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے چند مصحف حرم نبویؐ میں بھی رکھوائے ۔ اواخر فروری ۱۷۰۷ء/ ذوالقعدہ ۱۱۱۸ھ میں رحلت فرمائی ، رحمۃ اللہ تعالیٰ ۔

علامہ اقبال نے ان کے بارے میں لکھا ہے :

شاہِ عالمگیر گردوں آستان — اعتبارِ دود مانِ گورگاں
پایۂ اسلامیان برتر ازو — احترامِ شرعِ پیغمبرؐ ازو

درمیانِ کارزارِ کفر و دین
ترکشِ مارا خدنگِ آخرین
تخم الحادے کہ اکبر پرورید
باز اندر فطرتِ دارا دمید
شمع دل در سینہ ہا روشن نبود
ملت ما از فساد ایمن نبود
حق گزید از ہند عالمگیر را
آن فقیرِ صاحبِ شمشیر را
از پیے احیاء دین مامور کرد
بہر تجدید یقین مامور کرد
برقِ تیغش خرمنِ الحاد سوخت
شمعِ دین در محفل ما برفروخت
کور ذوقان داستانہا ساختند
وسعتِ ادراک او نشناختند
شعلۂ توحید را پروانہ بود
چون براہیم اندرین بتخانہ بود
در صفِ شاہنشہان یکتا ستے
فقرِ او از تربتش پیدا ستے

★ ★ ★

چھٹا باب

سلطنت مغلیہ کا زوال (۱۷۰۷ء - ۱۸۵۷ء)

اٹھارھویں صدی عیسوی کے آغاز سے انیسویں صدی کے نصف ثانی کے آغاز تک کا زمانہ پاک و ہند کی ملت اسلامیہ کی تاریخ میں دراصل ہولناک حوادث کی درد ناک داستان کا زمانہ ہے ۔ اس دور میں مسلمانوں کو اپنے جن خود غرض ، کوتاہ اندیش اور غدار سیاسی رہنماؤں سے واسطہ پڑا اور جس اذیت‌ناک بےکسی کے عالم میں انہیں زندگی بسر کرنا پڑی ، اس کی مثال پوری تاریخ میں مشکل سے ملے گی[1] ۔

محمد شاہ رنگیلے کے عہد کے آخری سالوں (۱۷۴۸-۴۰ء) میں بابر کی قائم کردہ عظیم الشان سلطنت کا آفتاب غروب ہونے لگا تھا ، حتیٰ کہ ڈیڑھ صدی کے بعد اس کا آخری تاجدار ایک مجرم کی حیثیت سے سزا پا کر جلا وطن ہوگیا[2] ۔ اس سریع زوال کے کئی اسباب تھے ۔ ایک تو یہ کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کو کوئی دوسرا اورنگ زیب نصیب نہ ہو سکا ۔ عالمگیر خود بھی نوے سال کی عمر میں فوت ہوا اور اس عمر میں انسان کے دماغی قویٰ کے ساتھ ساتھ جسمانی قویٰ بھی مضمحل ہو جاتے ہیں ۔ پھر اس کا جانشین جب تخت و تاج کا وارث بنا تو وہ بھی ضعف پیری کا شکار تھا[3] ۔ زوال پذیر سلطنتوں کو سنبھالنے کے لیے طاقتور خون کے ساتھ جرأت مند اور بیدار مغز حکمران کی ضرورت ہوتی ہے ۔ لیکن اورنگ زیب کے جانشین ان خوبیوں سے محروم تھے اور جن میں کچھ دم خم تھا وہ نامساعد حالات کا شکار ہو کر ناکام ہوگئے[4] ۔ دوسرا بڑا سبب سلطنت کے مشیروں اور کارپردازوں کی غداری اور نمک حرامی ہے ۔ تین اشخاص ، جن میں سے ایک ذوالفقار خاں اور دوسرے دو بارھہ کے سید برادران تھے ، برِ صغیر کے مسلمانوں کے قصرِ اقتدار کو منہدم کرنے میں برابر کے شریک تھے ۔ ان کے اعمال میں سے کوئی عمل ایسا نہ تھا جو خود غرضی اور غداری کے پست ترین محرکات

---

۱ - بر عظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ، ص ۲۲۳ ، ۲۲۵ ، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۷ء ، ص ۲۱۰ - آب کوثر ، ص ۱۶۸ لاہور ۱۹۳۰ء ۔

۲ - ایضاً ۔

۳ - آب کوثر ، ص ۱۶۸ ۔

۴ - آب کوثر ، ص ۱۶۵ ببعد ۔

سے ملوث نہ ہو[1] ۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں راسخ الاعتقاد اہل دین کی جو قدر و منزلت ہوئی ، اس کے ردِ عمل کے طور پر شیعہ علماء کے دل میں جو کدورت پیدا ہوئی ، اس نے مستقل معاشرتی و سیاسی روگ کی شکل اختیار کر لی اور ایرانی و تورانی امراء میں رقابت و منافرت کا ایک سلسلہ چل نکلا ، جس نے ملتِ اسلامیہ کو کمزور سے کمزور تر کر دیا[2] ۔ مرہٹوں کی سرکشی ، نادر شاہ کا حملہ (۱۷۳۹ء) ، ایسٹ انڈیا کمپنی کی ریشہ دوانیاں اور سب سے بڑھ کر اس صدی کے آخر میں غلام قادر روہیلے کی دلی پر چڑھائی (۱۷۸۸ء) ایسے اسباب ہیں جنہوں نے مغلیہ سلطنت کی تباہی مقدر کر دی[3] ۔

ان حوادث کے بعد دہلی کے بادشاہوں میں اتنی سکت باقی نہ رہی کہ وہ وسیع سلطنت کے سرکش صوبیداروں کو قابو میں لا سکتے ، چنانچہ اس کے نتیجے میں بنگال میں علی وردی خاں ، دکن میں نظام الملک آصف جاہ اور اودھ میں سعادت علی خاں خود مختار ہو گئے[4] ۔ اسی طرح بعد میں مختلف صوبے خود مختار ریاستوں میں تبدیل ہوتے گئے ۔ پنجاب ، سرحد اور کشمیر سکھوں کی عملداری میں آ گئے ۔ سندھی امراء بھی خود مختار ہو گئے اور جنوبی ہند میں سلطان حیدر علی نے میسور کی ریاست قائم کی ۔ دہلی کے مغل بادشاہ جو ۱۷۸۸ء میں غلام قادر روہیلے کی چڑھائی کے بعد تخت نشین ہوتے رہے ، ان کی حکومت لال قلعہ تک محدود رہی اور ان میں سے اکثر بیرونی قرضوں کے وظیفہ خوار رہے اور ان کی حیثیت شاہِ شطرنج سے زیادہ نہ تھی[5] ۔

مرکز کی کمزوری کے بعد یہ خود مختار ریاستیں بھی اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکیں ، چنانچہ ۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی کے بعد بنگال انگریز کمپنی کے قبضے میں آ گیا ۔ ۱۷۹۹ء میں میسور کی اسلامی ریاست بھی ختم ہو گئی ۔ اودھ پہلے ایک باجگذار ریاست بنا اور پھر ۱۸۵۶ء میں اسے بھی برطانوی مقبوضات میں شامل کر لیا گیا ۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد برِ صغیر میں اسلامی تاریخ کا سنہرا باب عبرت ناک انجام کو پہنچ گیا[6] تاہم حیدر آباد دکن کی "دولتِ آصفیہ" کمپنی کے تابع ہونے کے باوجود اپنا داخلی وجود برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گئی اور اسلامی علوم اور ثقافت کی خدمات انجام دیتی رہی[7] ۔

---

۱ ۔ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ، ص ۲۲۳ ۔
۲ ۔ آب کوثر ، ص ۱۶۵ ۔ بر عظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ، ص ۲۱۲ ببعد ۔
۳ ۔ ایضاً ۔
۴ ۔ آب کوثر ، ص ۱۶۶ ، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ، ص ۲۱۹ ببعد ۔
۵ ۔ آب کوثر ، ص ۱۶۷ ۔ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ، ص ۲۴۴ ببعد ۔
۶ ۔ آب کوثر ، ص ۱۶۷ ۔
۷ ۔ ایضاً ۔

سیاسی زوال اور معاشرتی خرابیاں ایک دوسرے کا لازمی نتیجہ ہیں - کبھی یوں ہوتا ہے کہ معاشرتی خرابیاں سیاسی زوال پر منتج ہوتی ہیں اور کبھی اس کے برعکس سیاسی زوال قوموں کو معاشرتی خرابیوں میں مبتلا کر دیتا ہے ، لیکن برِ صغیر کی ملّتِ اسلامیہ پہلی صورت سے دو چار ہوئی - مغل بادشاہوں نے باہر سے کئی معاشرتی عناصر کو درآمد کیا جن میں اکثریت ایرانیوں کی تھی - پھر بھی انہوں نے ہندو رعایا کو بھی اپنانے کی کوشش کی اور ایرانی اور ہندو عنصر پر مغل بادشاہوں کے اعتماد نے مسلمان آبادی کو مایوس کیا اور اس سے معاشرے میں بڑی خرابیاں پیدا ہو گئیں ۔ ایک طرف مسلم قوم کے اکثریت والے طبقے کے خلاف شیعوں اور ہندوؤں میں تعاون کی روایت پیدا ہو گئی[1] اور دوسری طرف شیعہ سنی نزاع نے ایک مستقل معاشرتی خرابی کی شکل اختیار کر لی اور غالی شیعہ اور متشدّد سنی آپس میں دست و گریباں ہو گئے اور علمی بحث و مناظرہ اور مذہبی جنگ و جدال کے معرکے برپا ہونے لگے جنہوں نے نہ صرف یہ کہ سلطنتِ مغلیہ کا جنازہ نکال دیا ، بلکہ ملتِ اسلامیہ کو اندرونی خلفشار و انتشار سے دو چار کر دیا جس کی صدائے بازگشت اب بھی کبھی کبھی سنائی دیتی ہے - اسی طرح کئی ایک ہندو رسوم نے بھی اسلامی معاشرے میں راہ پا لی - شراب خوری ، بد چلنی ، بد اخلاقی ، توہم پرستی اور تشکیک و الحاد کی لعنتیں دورِ اکبری سے شروع ہوئیں اور اس کے بیٹے اور پوتے کے عہد میں شباب کو پہنچ گئیں ، جن کا قلع قمع نہ مجدّد الف ثانیؒ کے جہاد سے ہو سکا اور نہ عالمگیر کی مجاہدانہ تلوار سے[2]۔

ہماری تاریخ کا یہ باب سیاسی و تمدنی اعتبار سے جس قدر تاریک اور حوصلہ شکن ہے علمی اور فکری اعتبار سے اسی قدر روشن اور حوصلہ افزا بھی ہے[3] - اسی دور میں قطب الدین احمد المعروف بہ شاہ ولی اللہؒ دہلوی ایسا عظیم مفکّر اور مجدّد پیدا ہوتا ہے جس کی نظیر ہند میں علومِ اسلامیہ کی تاریخ میں نہیں ملتی اور جس کی فکرِ بلند و نگاہِ دور رس غزالی اور ابنِ رشد کو بھی مات کر دیتی ہے - یہ مردِ خدا امّتِ اسلامیہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سنبھالنے کے لیے میدانِ عمل میں کود پڑتا ہے اور اپنی کوشش سے احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں کفر کی طاقت کو ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں ایسی شکستِ فاش دلاتا ہے جس کے بعد اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملتا - دوسری طرف وہ علمی اور فکری رہنمائی کے جامع منصوبے بناتا ہے اور ایک ایسی تحریک اٹھاتا

---

۱ - برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ، ص ۲۱۷ -

۲ - برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ، ص ۲۱۳ ببعد ، آب کوثر ، ص ۱۴۲ -

۳ - آب کوثر ، ص ۱۶۹ -

ہے جو خطرات میں ملّتِ اسلامیہ کی رہنمائی کا کام دیتی چلی جاتی ہے[1] ۔

شاہ صاحب کے والد شاہ عبدالرحیم ایک عالمِ باعمل اور گوشہ نشین صوفی تھے، آپ کو 'الفتاویٰ العالمگیریۃ' کی ترتیب و تدوین میں تعاون کی دعوت دی گئی جسے دینی خدمت سمجھ کر قبول کر لیا گیا ۔ مگر کوئی عہدہ قبول نہ کیا ، بلکہ دہلی کے ایک محلے میں 'مدرسہ رحیمیہ' کی بنیاد رکھی جس نے آگے چل کر ملّت کی رہنمائی کے لیے سرچشمۂ ہدایت کا کام دیا اور شاہ ولی‌اللہ ایسا عظیم مجتہد اور امام المحدّثین پیدا کیا ۔ شاہ عبدالرحیم چونکہ ایک عالمِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ صوفی بھی تھے اس لیے انہوں نے فقہ و تصوّف اور شریعت و طریقت کے درمیان کشمکش کو کم کر کے ان میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی[2] ۔ یہ چیز شاہ ولی اللہؒ کو ورثے میں منتقل ہوئی اور آپ نے اسلامی شریعت کے عقائد اور اعمال کی حکیمانہ تشریح کی اور ان کے اسرار و رموز بیان کیے ۔ شیعہ سنی کشمکش کو کم کرنے کے علاوہ شریعت و طریقت میں مطابقت پیدا کی اور مختلف فقہی آراء و مسالک میں صلح اور تطبیق کی کوشش کی ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہند کی ملّت اسلامیہ پر اس خاندان کے بڑے بڑے احسانات ہیں اور زندگی کے ہر میدان میں ان کی عظیم الشان خدمات موجود ہیں ۔ اگر یہ خاندان نہ ہوتا تو مریض قوم کا علاج شاید ہی کوئی مصلح کر سکتا[3] ۔

برِّصغیر میں اسلام کی اشاعت اور علومِ اسلامیہ کی ترویج چونکہ تخت و تاج کی مرہون منت نہیں رہی ، اس لیے اس دورِ زوال میں بھی عربی اور اسلامی علوم کے کئی ایک جلیل القدر علماء پیدا ہوئے ۔ اسی دور میں مولانا عبدالجلیل بلگرامی اور مرتضیٰ زبیدی بلگرامی ایسے عظیم آئمہ لغت و ادب اور صاحبِ فن شعراء ہوئے اور اسی دور میں ملا نظام الدین سہالوی اور دیگر علمائے فرنگی محل پیدا ہوئے جنہوں نے علومِ اسلامیہ کے نصاب کو از سرِ نو مرتب کیا اور مختلف علوم و فنون میں تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ برِّصغیر کے گوشے گوشے میں اسلامی مدارس کا ایک جال بچھا دیا ۔ یہ اسی گروہ کا احسان ہے کہ دورِ غلامی میں بھی مسلمانوں کی دینی رہنمائی اور روحانی غذا کا کچھ نہ کچھ سامان ہوتا رہا[4] ۔

---

۱ ۔ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ، ص ۲۳۱ ببعد ، آب کوثر ، ص ۲۱۵ ۔

۲ ۔ رود کوثر ۔ ص ۵۳۵ ببعد ، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ، ص ۲۲۷ ۔

۳ ۔ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ، ص ۲۲۵ ببعد ، آب کوثر ، ص ۲۱۵ ۔ رود کوثر ، ص ۵۵۱ ببعد ۔

۴ ۔ آب کوثر ، ص ۱۶۹ ، ۱۷۵ ، رود کوثر ، ص ۶۰۳ ۔

اس دور کی علمی تاریخ کے ضمن میں یہ بات بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اس دور میں جہاں شمالی ہند کے علاقوں میں شیعہ مذہب کو بڑا فروغ حاصل ہوا وہاں شیعہ علماء و مجتہدین کی ایک ایسی جماعت تیار ہوگئی جس نے شیعہ مذہب کی ترویج و اشاعت اور تائید و حمایت بھی کی اور بلند پایہ علمی کارنامے بھی انجام دیئے۔ مرشد آباد ، عظیم آباد ، لکھنؤ اور حیدرآباد دکن نے شیعہ ثقافتی مراکز کی حیثیت سے بڑی اہمیت اختیار کر لی[1] ۔ اسی طرح حنفی فقہاء و متکلمین کے ساتھ علمائے اہل حدیث اور محدثین کا ایک علمی سلسلہ چلا جس کی عملی تشکیل حضرت شاہ ولی اللہؒ دھلوی کے ہاتھوں انجام پائی ان تمام فکری مکاتب اور مسالک کی علمی کاوشوں نے اسلامی معاشرہ پر واضح اثرات ڈالے[2] ۔

اس دور کے ممتاز علماء

مرزا رستم معتمد خان بدخشی

امیر فاضل نواب معتمد خان رستم بن دیانت خان قباد الحارثی البدخشی ، عالمگیر کے عہد کی ممتاز شخصیت ہیں ۔ فضل و کمال میں بڑی شہرت رکھتے تھے اور جامع معقول و منقول اور حاوی اصول و فروع تسلیم کیے جاتے تھے[3] ۔ سرکاری مناصب کے علاوہ علوم و فنون اور کتابوں سے بھی بڑی محبت تھی ۔ بقول ڈاکٹر زبید احمد[4] برٹش میوزیم میں ایسی کتب بکثرت موجود ہیں جو معتمد خان اور ان کے بیٹے (محمد بن رستم بدخشی[5]) کی خاطر نقل کی گئیں اور پھر معتمد خان نے انہیں پڑھا اور حواشی پر جگہ جگہ تصحیح کی ۔ معتمد خان کی تاریخ وفات معلوم نہیں ہوسکی تاہم وہ اورنگ زیب کے زمانے میں ہوئے ہیں ۔

ان کی "کتاب المقائیس" ہندسہ و ریاضی کے موضوع پر ایک لاجواب کتاب ہے اور اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے ۔ برٹش میوزیم میں بھی

---

۱ ۔ رود کوثر ، ص ٦١٦ ببعد ۔

۲ ۔ مفصل دیکھئے تاریخ اہل حدیث از مولانا محمد ابراہیم میر، ص ۹ ببعد ، لاہور۱۹۵۳ء و تحریک آزادی فکر اور حضرت شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی از مولانا محمد اسماعیل سلفی گجرانوالہ ۱۹٦٦ء ، ص ۱۷ ببعد ۔

۳ ۔ نزہۃ الخواطر ، ٦ : ۸٦ ۔

۴ ۔ ڈاکٹر زبید احمد برٹش میوزیم ، ص ۱٦۲ ۔

۵ ۔ نزہۃ الخواطر ، ٦ : ۲۵۹ ۔

بھی ایک ٹکڑا ہے ۔ یہ کتاب اصل میں ترجمہ ہے کلاویوس (Clavius) کی تصنیف Eight books of Gromonics کا ۔ مخطوطے کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ اس کتاب کے ترجمے کے لیے مترجم نے پرتگال کا سفر کیا[1] ۔ معتمد خان بدخشی نے پرتگالی زبان سے لفظی ترجمہ کیا ہے اور اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا ۔ حتیٰ کہ مقدمہ بھی نہیں لکھا ۔ ترجمے کا ہر باب 'قال کلاویوس' (کلاویوس نے کہا ہے) سے شروع ہوتا ہے ۔ قلمی نسخے کے سرورق پر مصنف کے بیٹے مرزا محمد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ عبارت موجود ہے : مسودۃ کتاب المقاییس الذی صنفہ کلاویوس الفرنجی بلسان لاتین (کذا) و ترجمہ' والدی بلسان عربی (مسودۂ کتاب المقاییس جو کلاویوس فرنگی نے لاطینی میں لکھی اور میرے والد نے اس کا عربی زبان میں ترجمہ کیا) ۔

سید ابوبکر سورتی

سید ابوبکر بن محسن باعبود علوی سورتی۔(متوفی بعد ۱۷۱۵ء/۱۱۲۸ھ) یمن سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور 'سورت' میں سکونت اختیار کی ۔ ان کے مفصل حالات زندگی اور تاریخ وفات دستیاب نہیں۔ صاحب 'نزھۃالخواطر'[2] نے ان کا تذکرہ چار سطروں میں کیا ہے اور بتایا ہے کہ سید ابوبکر یمن کے مشہور ادباء میں سے تھے اور انہوں نے بدیع الزمان الھمدانی اور الحریری کے طرز پر 'المقامات الھندیۃ' کے نام سے پچاس مقالے لکھے جن کی روایت الناصر بن الفتاح اور انشاء ابوالمظفر الھندی سے منسوب کیا ۔ کتاب کا سال تصنیف ۱۷۱۵ء/۱۱۲۸ھ ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ۱۷۱۵ء میں یا اس کے بعد فوت ہوئے۔ 'المقامات الھندیہ' کے مخطوطے پشاور ، رامپور ، آصفیہ اور بہار میں موجود ہیں ۔

سید ابوبکر علوی سے قبل بدیع الزمان ہمدانی کے تتبع میں 'الحریری' ، ابوطاہر اشترکونی اندلسی اور شمس الدین ابوالھندی وغیرہ نے افسانوی رنگ میں مسجّع و مقفٰی عبارات کے ساتھ مقامات لکھے ہیں ، لیکن سید ابوبکر کی 'المقامات الھندیۃ' اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہ سرزمینِ ہند میں لکھی گئی اور اس کا مواد ، موضوعات اور کردار سب ہندی ہیں ۔ مصنف اہلِ زبان ہونے کے علاوہ فصیح البیان اور قادرالکلام ادیب بھی تھے اس لیے ان کی زبان اور اسلوبِ بیان میں سجع و قافیہ کی روانی ہے ، بناوٹ نہیں ، اور حُسنِ تعبیر کے ساتھ حُسنِ معانی بھی موجود ہے ۔

---

۱ ۔ ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۱۹۲ ، فہرست انڈیا آفس لائبریری ، ۲۶۳ ۔

۲ ۔ نزھۃ الخواطر ، ۶ : ۴ ۔

ملا جیون

احمد بن ابی سعید بن عبید اللہ صدیقی المعروف ملا جیون ۱۶۳۷ء/۱۰۴۷ھ میں شہر امیٹھی میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکرؓ سے جا ملتا ہے[1]۔ ملاجیون بڑے ذہین اور قوی الحافظہ تھے۔ سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا اور ۲۲ سال کی عمر میں علومِ متداولہ سے فارغ ہو گئے۔ درسی کتابوں کی عبارت بغیر کتاب دیکھے پڑھ دیتے تھے[2]۔ فراغت کے بعد اپنے شہر میں تدریس میں مشغول رہے اور پھر محی الدین اورنگ زیب بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ بادشاہ نے بڑی قدر و منزلت کی اور ان سے علم حاصل کیا۔ اورنگ زیب کا بیٹا شاہ عالم بھی ان کا احترام کرتا تھا[3]۔

ملا جیون کے اساتذہ میں شیخ محمد صادق ستوکھی اور ملا لطف اللہ ساکن کوڑا، جہان آباد کے نام قابلِ ذکر ہیں اور شاگردوں میں شہنشاہ اورنگ زیب بھی شامل ہے[4]۔

دو دفعہ زیارتِ حرمین اور حج سے سرفراز ہونے کے علاوہ ملا جیون نے اجمیر، دہلی اور لاہور کا سفر بھی کیا اور بالآخر ۱۷۱۷ء/۱۱۳۰ھ میں دہلی میں وفات ہوئی اور امیٹھی میں دفن ہوئے[5]۔

ان کی تصانیف یہ ہیں:

۱۔ 'التفسیرات الاحمدیۃ فی بیان الآیات الشرعیۃ معروف بہ تفسیر احمدی' جو آیاتِ احکام کی تشریح ہے، ۱۶۵۳ء/۱۰۶۳ھ میں سولہ سال کی عمر میں دورانِ تعلیم شروع کی اور فراغت کے بعد ۲۷ سال کی عمر میں ۱۶۶۴ء/ ۱۰۷۵ھ میں تمام ہوئی۔

۲۔ 'نورالانوار فی شرح المنار' (جو مدینہ منورہ میں دو ماہ کے عرصے میں، بغیر کسی کتاب کی مدد کے، ۱۶۹۳ء/۱۱۰۵ھ میں لکھی۔ اس شرح پر متعدد حواشی اور ایک سے زائد شروح لکھی گئیں۔

۱۔ سبحۃ المرجان، ص ۹۔ صاحب نزہۃ الخواطر، ۶: ۱۰ نے انہیں حضرت صالح نبیؑ کی اولاد بتایا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں، دیکھیے تذکرہ علمائے ہند از مولوی رحمان علی، ص ۱۵۵۔

۲۔ نزہۃ الخواطر، ۶: ۱۹، تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۵۵۔

۳۔ حوالہ سابق، سبحۃ المرجان، ص ۹۷۔

۴۔ نزہۃ الخواطر، ۶: ۱۹، تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۵۵، سبحۃ المرجان، ص ۹۷، حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۶۔

۵۔ نزہۃ الخواطر، ۶: ۱۹، تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۵۵، سبحۃ المرجان، ص ۹۷، حدائق الحنفیہ، ص ۴۳۶۔

ملا جیون کی یہ تصنیف دراصل امام ابوالبرکات حافظ الدین عبداللہ بن احمد النسفی متوفی ۱۳۱۰ء/۷۱۰ھ کی 'منار الانوار' کی شرح ہے جو حنفی اصول فقہ پر ایک مستند ، مختصر اور جامع کتاب متصوّر ہوتی ہے ۔ امام نسفی کی اس کتاب کی سینکڑوں شروح و حواشی لکھے گئے ۔ برّ صغیر پاک و ہند میں بھی متعدّد علماء نے اس کی شروح و حواشی لکھے جن میں شیخ ابوالفضائل سعدالدین دہلوی (م-۱۴۸۱ء/۸۹۱ھ) کی 'افاضۃالانوار' غالباً سب سے پہلی شرح ہے ۔ ملا جیون کی 'نورالانوار فی شرح المنار' برّ صغیر میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی اور آج تک مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں داخل ہے ۔ ملا جیون کی شرح میں بھی اختصار و جامعیت کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور انہوں نے کتاب کے مشکل الفاظ اور عبارات کی تشریح کے علاوہ مسائل کو شواہد و دلائل سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے[1] ۔

۳ ۔ 'السوانح' (جو ملا جامی کی 'اللوائح' کی طرز پر دوسرے سفر حرمین کے دوران ۱۷۰۰ء/۱۱۱۲ھ میں لکھی ۔

۴ ۔ 'آداب احمدی' (سیرت و سلوک کے موضوع پر) ۔

۵ ۔ 'مناقب الاولیاء' (یہ کتاب ملا نے آخری عمر میں اپنے شہر میں تصنیف کی اور اس ضمن میں اپنے حالات بھی درج کیے ہیں)[2] ۔

۶ ۔ 'انوارالفرقان و ازھارالقرآن' ۔

ملا جیون کی مندرجہ بالا تصانیف میں سے 'التفسیرات الاحمدیۃ فی بیان الآیات الشرعیۃ' خصوصی توجہ کی مستحق ہے ، جو قرآن کریم کی ان آیات کی تفسیر ہے جن سے فقہی مسائل اور شرعی احکام کا استنباط ممکن ہے ۔ ملا جیون کی یہ کتاب ابوبکر ابن العربی الاندلسی کی 'احکام القرآن' ، امام ابوبکر الجصاص کی 'احکام القرآن' اور امام غزالی اور شیخ عزالدین بن عبدالسلام وغیرہ کی تصانیف کی یاد کو تازہ کرتی ہے ۔ شروع سے لے کر آخر تک ترتیب قرآنی کے مطابق ہر سورت کی آیات احکام کی تشریح کی ہے ۔ ملا جیون کی یہ کتاب اس لحاظ سے ابن العربی کی 'احکام القرآن' سے ممتاز ہے کہ انہوں نے ایک تو آیات سے فقہی مسائل اور شرعی احکام کے استنباط پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آیات کا پس منظر اور ان کی لفظی تشریح بھی پیش کی ہے ۔ اس کے علاوہ انہوں نے فقہ ، فتاویٰ اور علم الکلام کی اہم تصانیف سے فائدہ اٹھایا ہے جن میں سے بعض کا انہوں نے

---

۱ ۔ کشف الظنون ۲ : ۵۰۹ ؛

۲ ۔ ایضاً ۔ ابجد العلوم، ص ۹۰۷ ۔ خزینۃ الاصفیاء ، ۲ : ۳۴۵ ببعد ، مآثرالکرام ، ص ۲۱۶ ببعد ۔ زبید احمد بامداد اشاریہ ۔

مقدمہ میں تذکرہ بھی کیا ہے ۔ وہ ایک جگہ اپنے طریق تالیف کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"فاخذت اجمع الایات التی استنبطت منہا الاحکام الفقہیة والقواعد الاصولیة و المسائل الکلامیة بالترتیب القرآنیة ثم فسرتہا باحسن وجہ من التفسیر و شرحتہا باکمل جہة من التحریر آخذا من الکتب المتداولة لفحول العلماء و الزبر المتعارفة بین الائمة و الصلحاء"

(میں نے ان آیات کو جمع کرنا شروع کیا جن سے فقہی احکام ، اصولی قواعد اور کلامی مسائل کا استنباط کیا گیا ہے اور اس کی ترتیب میں نے قرآن کی ترتیب کے مطابق رکھی ہے ۔ پھر میں نے ہر آیت کی عمدہ طریقے سے تفسیر اور مکمل طریقے سے شرح بھی کی ہے ، میں نے اپنی معلومات ان کتابوں سے جمع کی ہیں جو بڑے جید علماء کی تھیں اور جو آئمہ و صلحاء کے ہاں مقبول رہی ہیں)[1] ۔

کتاب ۱۸۴۶ء/ ۱۲۶۳ھ میں کلکتہ سے اور ۱۹۰۹ء/۱۳۲۷ھ میں بمبئی سے چھپی ہے ۔ اول الذکر مطبوعہ نسخے پر کتاب کا نام غلط اور 'مع تصریحات المسائل الفقہیہ' کے الفاظ کا اضافہ ہے ۔

شاہ عبدالرحیم دہلوی

شاہ عبدالرحیم بن وجیہ الدین فاروقی دہلوی ۱۶۴۴ء/۱۰۵۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم گھر پر بھائی اور میر محمد زاہد ہروی سے معقولات کا درس لیا ، جو جامع علوم عقلی و نقلی ، حاوی علوم اصلی و فرعی اور محدث تھے[2] ۔ شاہ صاحب کو نقشبندی اور چشتی دونوں صوفیا سے نسبت تھی اور تصوف کے موضوع پر انہوں نے ایک کتاب بھی لکھی ۔ آپ نے دہلی میں مدرسہ رحیمیہ کی بنیاد رکھی اور درس وتدریس میں مشغول رہے اور ۷۷ سال کی عمر میں ۱۷۱۸ء/۱۲صفر ۱۱۳۱ھ میں انتقال ہوا ۔ آپ امام الہند شاہ ولی اللہؒ دہلوی اور شاہ اہل اللہ دہلوی کے والد تھے[3] ۔

۱ ۔ التفسیرات الاحمدیة ص ۲ ۔

۲ ۔ نزہة الخواطر ، ۶ : ۱۴۴ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۹۶ ۔

۳ ۔ نزہة الخواطر ، ۶ : ۲۹۶ ،والثقافة الاسلامیة فی الہند ، ص ۲۰۱ ۔

حافظ امان اللہ بنارسی

امان اللہ بن نور اللہ بن الحسین حنفی بنارسی ہند کے مشہور شہر بنارس میں پیدا ہوئے۔ حفظِ قرآن کے بعد طلبِ علم کی خاطر گھر سے نکلے۔ انہوں نے درسی کتابیں شیخ محمد ماہ دیوکاسی اور شیخ قطب الدین حسینی شمس آبادی سے پڑھیں اور معقول و منقول اور اصول و فروع میں تبحر حاصل کیا۔ علمِ کلام، فقہ اور اصولِ فقہ آپ کے خاص موضوعات تھے۔ ان کے تبحرِ علمی کی بنیاد پر عالمگیر نے انہیں صدارتِ لکھنؤ کا منصب عطا کیا، جہاں محب اللہ بہاری قاضی لکھنؤ کے ساتھ ان کے علمی مباحث ومناظرے ہوتے رہے[1]۔

حافظ امان اللہ کی تصانیف میں سے 'المفسر فی الاصول' اور اس کی شرح 'محکم الاصول' (اصول فقہ کے موضوع پر) 'حاشیہ تفسیر بیضاوی'، 'حاشیہ شرح العضدی'، 'الرسالۃ فی المغالطۃ العامۃ الورود'، 'تحقیق المثل الافلاطونی'، 'تحقیق الکل الطبیعی'، اور 'الحاشیہ علی الآداب الرشیدیۃ' 'الحاشیہ علی التلویح'، 'حاشیہ شرح المواقف'، 'شرح العقائد للدوانی'، قابلِ ذکر ہیں۔

حافظ امان اللہ بنارسی کی ان تصانیف میں سے اصولِ فقہ پر ان کی دو کتابیں ہماری خصوصی توجہ کی مستحق ہیں، ایک 'المفسر فی الاصول' اور دوسری 'محکم الاصول'۔ کیونکہ اصولِ فقہ میں ان کا مقام بہت بلند ہے اور اس موضوع پر قاضی محب اللہ بہاری صاحبِ 'مسلم الثبوت' سے ان کے اکثر مناظرے و مجادلے رہتے تھے، چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے انہوں 'المفسر فی الاصول' کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا پھر اس کے بعد خود ہی اس کی ایک مفصل شرح لکھی جس کا نام 'محکم الاصول' یا 'المحکم شرح المفسر' ہے۔ حافظ بنارسی کے رسالے اور اس کی شرح کو وہ مقبولیت و شہرت تو حاصل نہ ہوئی جو ان کے مدِ مقابل قاضی محب اللہ کی کتاب کو نصیبِ ہوئی، تاہم حنفی اصولِ فقہ پر یہ ایک قابلِ قدر کتاب ہے۔ ان کی وفات ۱۷۲۰ء/۱۱۳۳ھ میں ہوئی[2]۔

فاضل ہندی

شیخ بہاء الدین محمد بن تاج الدین حسن الاصفہانی المعروف فاضل ہندی اپنے عہد کے

۱۔ سبحۃ المرجان، ص ۸۷، حدائق الحنفیۃ، ص ۴۳۶، ابجد العلوم، ص ۹۰۶، ۔ نزہۃ الخواطر، ۶: ۳۹ مآثر الکرام، ص ۲۱۲۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۱۹۔

۲۔ سبحۃ المرجان، ص ۸۷، حدائق الحنفیہ ص ۴۳۶۔ ابجد العلوم، ص ۹۰۶، نزہۃ الخواطر، ۶: ۳۹۔ مآثر الکرام، ص ۲۱۲، تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۱۹، ؛زبید احمد بامداد اشاریہ

ممتاز فقیہ اور محدث تھے اور حدیث ، فقہ اور بلاغت پر کتابیں تصنیف کیں ، ان کی وفات ۱۷۲۴ء/۱۱۳۷ھ میں ہوئی[1]۔

ان کی تصانیف میں سے 'کشف لثام الابہام فی شرح قواعد الاحکام' ، 'الزبدۃ فی اصول الدین' ، 'المناہج النبویۃ' 'التلخیص فی البلاغۃ' اور 'منیۃ الحریص فی شرح التلخیص' قابل ذکر ہیں[2]۔

سید عبدالجلیل بلگرامی

سید عبدالجلیل بن میر احمد حسینی واسطی ثم بلگرامی ۱۶۶۰ء/۱۰۷۱ھ میں بلگرام میں پیدا ہوئے[3]۔ ابتدائی کتابیں سید سعداللہ بلگرامی سے پڑھیں اور پھر اودھ کے مشہور زمانہ علماء سے کسب فیض کے بعد شیخ غلام نقشبند سے عربی ادب اور شیخ مبارک بلگرامی سے حدیث کی سند لی ۔ انہیں تفسیر ، حدیث اور فقہ کے علاوہ عربی ادب اور لغت پر زبردست قدرت حاصل تھی ۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی آپ کے نواسے اور نامور تلامذہ میں سے تھے[4]۔

سید عبدالجلیل بلگرامی عالمگیر کے عہد میں گجرات (پنجاب) ، بھکر اور سیوستان (سندھ) میں وقائع نگاری (بخشی گری) کے فرائض انجام دیتے رہے اور بالآخر ۱۷۱۸ء/۱۱۳۰ھ میں اس منصب سے سبکدوش ہو کر پہلے بلگرام اور پھر دہلی میں تدریس میں مشغول رہے ۔ ۱۷۲۵ء/۱۱۳۸ھ میں ان کی وفات ہوئی[5]۔

کسی تذکرہ نگار نے ان کی کسی تصنیف کا تو ذکر نہیں کیا البتہ آزاد اور صاحب 'نزھۃ الخواطر' نے ان کے عربی اشعار کے نمونے دیے ہیں ، جو ان کے شاعرانہ کمالات کی دلیل ہیں[6]۔ مثلاً یہ شعر :

هو القطب الاّ انّه البدر طالعا سوٰی انّه المرّیخ لکنّه السّعد

---

۱ - ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۳۲۸ -

۲ - ایضاً ص ۳۶۴ ، زبید احمد بامداد اشاریہ -

۳ - سبحۃ المرجان ، ص ۹۷ ، ابجدالعلوم ، ص ۹۰۷ حدائق الحنفیۃ ، ص ۴۳۷ ، مآثرالکرام ، ص ۲۵۷ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۳۰۵ -

۴ - نزھۃ الخواطر ۶ : ۱۳۹ ، سبحۃ المرجان ص ۹۷ ، حدائق الحنفیہ ص ۴۳۷ - مآثرالکرام ص ۲۵۷ ، خزانہ عامرہ ص ۳۵۲ - ابجدالعلوم ص ۹۰۷ ، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۷۴ -

۵ - ایضاً -

۶ - نزھۃ الخواطر ۶ : ۱۴۰ و سبحۃ المرجان ۹۷ بعد -

(وہ قطب ہے لیکن وہ طلوع ہونے والا ماہِ تمام بھی ہے ، اس کے علاوہ وہ مریخ ہے مگر وہ سراپا سعد یعنی علامتِ نیک بختی بھی ہے) ۔

شیخ ابوالحسن السندھی الکبیر

شیخ ابوالحسن نورالدین محمد بن عبدالہادی الحنفی السندی صوبہ سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے اور یہیں پرورش پائی اور تحصیلِ علم کی خاطر تستر اور مدینہ منورہ کا سفر اختیار کیا ۔ آپ کے شیوخ میں السید محمد بن عبدالرسول البرزنجی اور شیخ ابراہیم بن حسن الکورانی المدنی کے نام ممتاز حیثیت رکھتے ہیں[1]۔

شیخ ابوالحسن جو "الکبیر" کے لقب سے امتیازی حیثیت سے یاد کیے جاتے ہیں ، علومِ متداولہ سے فراغت کے بعد حرم نبوی[2] میں تدریس و تعلیم میں مشغول ہوگئے اور علم و فضل ، فہم و ذکا اور تقویٰ و صلاح کی بنیاد پر زبردست شہرت حاصل کی ۔ حتیٰ کہ ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء میں جب وہ فوت ہوئے تو شہرِ مدینہ منورہ میں سب کاروبار معطل کر دیے گئے اور مسجد نبوی[2] میں ان کے جنازے میں عوام و خواص کا بہت بڑا اجتماع ہوا اور حکامِ وقت نے ان کے جنازے کی مشایعت کی اور جنۃ البقیع میں دفن کیا[2]۔

شیخ ابوالحسن کی ان تصانیف کا ذکر ملتا ہے : 'الحواشی الستۃ علی الصحاح الستۃ' (جامع الترمذی کا حاشیہ نا مکمل ہے) ۔ 'حاشیۃ مسند الامام احمد بن حنبل' ، 'حاشیۃ فتح القدیر'(تاباب النکاح)، 'الآیات البینات اور شرح اذکار الامام النووی'[3]۔ 'منہل الھداۃ'، 'الفتوحات النبویۃ' ۔ شیخ کی ان تصانیف میں سے اوّل الذکر (یعنی صحاحِ ستہ پر جو حواشی ہیں) ان کا ایک نسخہ الکتبخانۃ الخدیویۃ قاہرہ میں موجود ہے ۔

شیخ عنایت اللہ لاہوری

مردم خیز خطۂ لاہور نے عربی و اسلامی علوم کے جن نامور اور ناقابلِ فراموش فضلاء کو جنم دیا ان میں سے ایک شیخ ابوالمعارف عنایت اللہ لاہوری بھی ہیں ، جو اپنے عہد میں نہ صرف لاہور بلکہ اطراف و اکناف میں بھی ایک فقیہ اور ممتاز عالمِ دین کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتے تھے[4]۔ انہوں نے بہت سی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی

---

۱ ۔ نزھۃ الخواطر ۶ : ۳۰۔
۲ ۔ ایضاً ۔
۳ ۔ ایضاً ، ڈاکٹر زبید احمد بامداد اشاریہ ۔
۴ ۔ نزھۃ الخواطر ۶ ؛ ۱۹۰ ۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۷ ۔ حدائق الحنفیۃ ص ۴۳۹ ۔

ہیں جن کا تذکرہ کتابوں میں ملتا ہے۔ 'شرح الوقایة' پر ان کا شاندار حاشیہ (جو 'غایة الحواشی' کے نام سے موسوم ہے) بڑے اہم اور مشکل فقہی مسائل اور فروعات سے بحث کرتا ہے۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مولانا عبدالحی لکھنوی نے 'عمدة الرعایة' کے مقدمے میں اس کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے صراحت سے لکھا ہے کہ میں نے اس سے استفادہ کیا ہے[1]۔ اس کے علاوہ انہوں نے 'ملتقط الحقائق' کے نام سے 'کنز الدقائق' پر حاشیہ بھی لکھا (جس میں یہ ثابت کیا ہے کہ تشہد میں سبابہ کے ساتھ اشارہ سنت ہے) اور دو رسالے : 'هبة الطاعات' اور 'تنقیح المرام' (سالِ تصنیف ۱۶۹۸ء/۱۱۱۰ھ) تحریر کیے ہیں[2]۔

شیخ عنایت اللہ کا سالِ وفات ۱۷۲۸ء/۱۱۳۱ھ ہے[3]۔

مولانا امام الدین الریاضی

مولانا امام الدین بن لطف اللہ بن احمد لاہوری ثم دہلوی برِّ صغیر کے ان ممتاز علماء میں سے تھے جنہیں علمِ ریاضی اور ہندسہ میں کمال حاصل تھا۔ وہ اپنے عہد کے عظیم ریاضی دان اور بیمثال مہندس تھے اور اغلباً یہ فنون انہوں نے اپنے والد لطف اللہ بن احمد لاہوری سے حاصل کئے تھے[4]۔

مولانا امام الدین فنونِ ہندسہ و ریاضی کے علاوہ فنونِ ادب سے بھی شغف رکھتے تھے۔ بقول صاحبِ 'نزهة الخواطر' انہوں نے فارسی کے چند عمدہ اشعار اپنی یادگار چھوڑے ہیں اور 'الریاضی' ان کا تخلص تھا۔ مولانا کی وفات ۱۷۳۳ء/۱۱۴۵ھ میں ہوئی[5]۔

ہندسہ و ریاضی کے فنون میں ان کی یہ تصانیف قابلِ ذکر ہیں : 'التصریح' (جو العاملی کی 'تشریح الافلاک' کی شرح ہے اور جسے علماء نے بے حد پسند کیا ہے)۔ 'حاشیة الملخص علی شرح الملخص للجغمینی' اور 'حاشیہ علی خلاصة الحساب للعاملی'[6]۔

۱۔ مقدمة عمدة الرعایة ص ۷۔
۲۔ نزهة الخواطر ۶ : ۱۹۰۔
۳۔ حدائق الحنفیة ص ۴۳۹ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۳۵۷ ، نزهة الخواطر ۶ : ۱۹۹۔
۴۔ نزهة الخواطر ۶ : ۳۸۔
۵۔ نزهة الخواطر ۶ : ۳۸۔
۶۔ ایضاً۔

نواب حاذق الملک دهلوی

حکیم محمد کاظم بن حکیم حیدر علی تستری ثم دهلوی جو نواب حاذق الملک کے نام سے زیادہ مشہور ہیں ، اپنے عہد کے ان صاحبِ تصانیف علمائے طب میں سے ہیں جنہوں نے برِّ صغیر میں اس فن کو ترقی دینے کے لیے بڑی خدمات انجام دی ہیں[۱] ۔

نواب حاذق الملک نے المجوسی کی 'کامل الصناعة' سے معلومات اخذ کرکے طب کے موضوع پر دو کتابیں مرتب کیں جن میں سے ایک 'اکمل الصناعة' (دو جلد) اور دوسری 'جامع الصنائع (ایک جلد) ہے۔ ان کا سالِ وفات ۱۷۳۶ء/۱۱۴۹ھ[۲] ہے ۔

مولانا نورالدین احمد آبادی

شیخ نورالدین بن محمد صالح احمد آبادی گجراتی ۱۶۵۳ء/۱۰۶۳ھ میں احمد آباد میں پیدا ہوئے ، بچپن ہی سے علم سے گہرا شغف تھا اور تمام زندگی علم کی خدمت میں گذار دی ۔ انہوں نے 'گلستانِ سعدی' اپنی والدہ سے پڑھی۔ درسی کتابیں مولانا احمد بن سلیمان گجراتی ، مولانا فرید الدین احمد آبادی اور شیخ محمد بن جعفر الحسینی البخاری سے پڑھیں[۳]۔

بقول آزاد وہ :

"علامہ زمان و یگانہ اقران است ، در عین عصر مثل او کم گزشته[۴] ۔"

'اور تمام فضائل میں امتیازی حیثیت حاصل کر لی ، حتیٰ کہ اپنے عہد اور اپنے شہر میں درس و تدریس میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے"۔[۵]

وہ بڑے زاہد ، متقی اور تہجد گزار تھے[۶] ۔ تفسیر و حدیث اور فقہ و منطق میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے ۔

ان کی تصانیف بے شمار ہیں جن میں سے 'التفسیر النورانی للسبع المثانی' ، 'التفسیر الربانی علی سورة البقرة' ، 'نورالقاری شرح صحیح البخاری' ، 'الطریق الامم شرح فصوص

---

۱ ۔ نزهة الخواطر ۶ : ۳۳۶ ۔
۲ ۔ نزهة الخواطر ۶ : ۳۳۶ ،
۳ ۔ سبحة المرجان، ص ۴۹ ، ابجد العلوم ، ص ۹۱۱، مآثر الکرام، ص ۲۱۹، نزهة الخواطر ۶ ۳۹۰ ۔ اتحاف النبلاء ، ص ۲۳۷ ، حدائق الحنفیة ، ص ۴۴۴، تذکرہ علماء ہند ، ص ۵۳۷ ۔
۴ ۔ مآثرالکرام ، ص ۲۱۹ ۔
۵ ۔ نزهة الخواطر ۶ : ۳۹۰ ۔
۶ ۔ ایضاً ۔

الحکم' 'الحاشیۃ القویمۃ علی الحاشیۃ القدیمۃ حل المعاقد' اور 'شرح تہذیب المنطق' اہم ہیں - ان کے علاوہ 'بیضاوی'، 'شرح المواقف'، 'المطول'، 'شرح الوقایۃ'، 'شرح المطالع'، شرح الجامی'، 'التلویح' اور دیگر بیشمار درسی کتابوں پر حواشی لکھے[1] -

شیخ نور الدین احمد آبادی کی ان تصانیف میں سے 'التفسیر النورانی للسبع المثانی' جو سورۃ الفاتحۃ کی تفسیر ہے اور 'شرح تہذیب المنطق'، جو علامہ تفتازانی کی 'تہذیب المنطق' کی شرح ہے، کے قلمی نسخے پائے جاتے ہیں - اول الذکر کا پیر محمد شاہ کی لائبریری میں اور مؤخر الذکر کا نسخہ آصفیہ لائبریری حیدر آباد میں موجود ہے - ۹۱ سال کی عمر میں ۱۷۴۲ء/۱۱۵۵ھ میں وفات پائی[2] -

محمد اعلیٰ تھانوی

مولانا محمد اعلیٰ بن حامد بن صابر الحنفی العمری التھانوی نے نحو اور ادب کی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں - شروع ہی سے کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا اس لیے اوائل عمر ہی میں ان کے پاس ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا اور اساتذہ سے علم حاصل کرنے کے بجائے وہ کتابوں کے مطالعہ میں منہمک ہوگئے اور ایک مدت کے بعد اپنا حاصل مطالعہ ایک عظیم الشان دائرۃ المعارف کی شکل میں 'کشاف اصطلاحات الفنون' کے نام سے پیش کیا - یہ لاثانی کتاب ایک مقدمہ اور دو فنون پر مشتمل ہے - فن اوّل میں عربی اور فن ثانی میں عجمی الفاظ سے بحث ہے - اس کی تکمیل ۱۷۴۵ء/۱۱۵۸ھ میں ہوئی اور ۱۸۶۲ء میں ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے زیر اہتمام (بڑی تقطیع کے ۱۵۶۴ صفحات پر) شائع ہوئی[3] -

شیخ محمد اعلیٰ کی یہ کتاب اگرچہ تمام اصطلاحات کا احاطہ نہیں کرتی تاہم اس کی اہمیت و افادیت سے انکار ناممکن ہے - یہ کتاب بلاشبہ علمی مصطلحات کا ایک عظیم دائرہ معارف ہے - شیخ صاحب کو جیسا کہ مقدمہ میں انہوں نے ذکر کیا ہے یہ شدید احساس تھا کہ مختلف فنون و علوم کی اصطلاحات فنیہ کے بارے میں کوئی جامع کتاب موجود نہیں - پھر ایک ہی اصطلاح دو یا اس سے زائد فنون میں مستعمل ہے اور ہر جگہ اس کا مفہوم جدا ہے - اس لیے انہوں نے ایک ایسی کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا جس میں تمام فنی اصطلاحات کا ہر علم کے اعتبار سے احاطہ کیا جائے، تاکہ طالبان علم و دانش جب

---

۱ - نزھۃ الخواطر ۶: ۳۹۱، حدائق الحنفیۃ، ص ۴۴۴، مآثر الکرام، ص ۲۱۹، سبحۃ المرجان ص ۹۴، تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۳۷ - زبید احمد بامداد اشاریہ -

۲ - ایضاً -

۳ - نزھۃ الخواطر ۶: ۲۷۸، کشاف اصطلاحات الفنون، ص ۱، تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۸۸ -

فارغ التحصیل ہو کر تدریس و تالیف میں مشغول ہوں تو انہیں شیوخ و اساتذہ کی بار بار محتاجی نہ کرنی پڑے ۔ وہ اپنی کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"فَلَمَّا فَرَغتُ مِنْ تحصیل العلوم العربیة والشرعیة من حضرة جناب استاذی ووالدی شمرت عن ساق الجد الی اقتناء ذخائر العلوم الحکمیة الفلسفیة مِنَ الحکمة الطبعیة والالٰهیة والریاضیّة کعلم الحساب والهندسة والهیئة والاسطرلاب ونحوها فَلَمْ یتیسر تحصیلها من الاساتذة فصرفتُ شَطراً من اَلزمان الی مطالعة مختصراتها الموجودة عندی فَکَشَفَهَا الله تعالی فاقتبستُ منها المصطلحات اوان المطالعة وسطرتها علی حدة علی حدة فی کل باب باب یلیق بها علی ترتیب حروف التهجی کی یسهل استخراجها لکل احد[۱]"۔

(جب میں اپنے استاذ اور والد سے عربی و شرعی علوم پڑھ کر فارغ ہو گیا تو حکمت و فلسفہ کے علوم جیسے حکمتِ طبعیہ ، الٰہیہ اور ریاضی جیسے حساب ، انجینئرنگ ، ہیئت اور اسطرلاب وغیرہ کے موضوع پر کتب کے ذخائر جمع کرنے کا پختہ عزم کیا تو ان کا حصول مجھے اساتذہ سے میسّر نہ آ سکا ۔ چنانچہ ان علوم کی جو مختصرات میرے پاس موجود تھیں ان کے مطالعہ پر میں نے ایک مدت صرف کی ، تو اللہ تعالٰی نے مجھ پر راز منکشف کروائے اور مطالعہ کے دوران میں نے ان کی اصطلاحات جمع کرلیں اور حروفِ تہجّی کے اعتبار سے ہر ایک کو الگ الگ مرتب کر دیا تاکہ ہر شخص کے لیے ان سے استفادہ آسان ہو جائے) ۔

افسوس کے اس عظیم فاضل کے حالاتِ زندگی اور صحیح تاریخِ وفات کہیں نہیں ملتی ، صرف اس قدر معلوم ہو سکا ہے کہ وہ عالمگیر کے عہد میں تھانہ بھون کے قاضی تھے ، ان کی انگشتری کا نقش یہ تھا :

"خادم شرع والا محمد اعلیٰ"

اور وہ تھانہ بھون میں ہی مدفون ہیں[۲] ۔

---

۱ ۔ کشاف اصطلاحات الفنون ، ص ۱

۲ ۔ ایضاً ۔

علامہ حمداللہ سندیلوی

ملا حمد اللہ بن شکر اللہ بن دانیال بن پیر محمد صدیقی 'سندیلہ' میں پیدا ہوئے۔ مسلکاً شیعہ تھے۔ علومِ متداولہ علامہ کمال الدین فتحپوری اور شیخ نظام الدین سہالوی سے سیکھے۔ فلسفہ و منطق پر خصوصی توجہ دی جس کے نتیجے میں معقولات کے امام تسلیم کر لیے گئے۔ اسی شہرت و کمال کی بنیاد پر والیٔ اودھ ابوالمنصور خان کی سفارش سے دہلی کے دربار سے 'فضل اللہ خان' کا خطاب عطا ہوا اور کئی ایک گاؤں بطور جاگیر دیے گئے جس کی آمد سے ملاحمد اللہ نے سندیلہ میں ایک بہت بڑی درس گاہ قائم کی[1]۔

ملا حمد اللہ سندیلوی نے 'الشمس البازغة' اور 'شرح هداية الحكمة' پر حواشی لکھنے کے علاوہ 'زبدۃ الاصول' کی شرح بھی لکھی۔ لیکن جس کتاب نے انہیں شہرتِ عام اور بقائے دوام بخشی وہ 'سلم العلوم' کی شرح ہے جو انہیں کے نام سے مشہور اور مدارسِ نظامیہ میں داخل ہے[2]۔

'سلم العلوم' قاضی محب اللہ بہاری کی تصنیف ہے جو علم المنطق میں اپنی جامعیّت اور اختصار کے باعث ایک مستند و مقبول کتاب ہے۔ ہندی علماء نے اس کی متعدد شروح و حواشی لکھے مگر ان سب میں ملا حمد اللہ سندیلوی کی شرح کو ہی شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل ہوئی۔ کتاب 'شرح سلم العلوم' کے بجائے 'حمد اللہ' کے نام سے زیادہ مشہور ہے اور ایسی مثالیں بہت کم ہیں کہ مصنف کا نام تصنیف کے نام پر رواج پا گیا ہو۔ ملا حمد اللہ نے اپنی شرح میں اسلوبِ ممزوج اپنانے کے بجائے حواشی کا اسلوب اپنایا ہے۔ وہ اصل عبارت کو "قولہ" کے ساتھ شروع کرتے ہیں اور پوری عبارت نقل کرنے کی بجائے "الخ" یا "آہ" لکھ کر اختصار سے کام لیتے ہیں۔ "حمداللہ" پر بھی متعدد حواشی لکھے گئے جن میں سے مفتی عبداللہ ٹونکی کا حاشیہ کافی مقبول ہے۔

ان کی وفات ۱۷۴۷ء/۱۱۶۰ھ میں دہلی میں ہوئی[3]۔

ملا نظام الدین سہالوی

ملا نظام الدین بن ملا قطب الدین بن عبدالحلیم انصاری سہالوی ثم لکھنوی برِّ صغیر پاک و ہند کے ان جلیل القدر علماء میں سے ہیں جنھوں نے اپنے علم و فضل سے شہرتِ عام

---

۱ ۔ تذکرہ علماء ہند، ص ۱۶۹، نزهة الخواطر ۶ : ۷۴ ۔
۲ ۔ ایضاً ۔
۳ ۔ ایضاً ۔

اور علوم عربیہ اسلامیہ کی خدمت سے بقائے دوام پائی ۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابو ایوب انصاری رضؓ سے جا ملتا ہے ۔ آپ کے ایک بزرگ علاء الدین انصاری سب سے پہلے برّ صغیر میں وارد[1] ہوئے اور اس خاندان کے ایک بزرگ شیخ نظام الدین لکھنئو کے قریب ایک قصبہ سہالی میں آ کر آباد ہوگئے تھے ۔ آپ کے والد ملا قطب الدین شہید ، جو بڑے فاضل اور عالمگیر سے راہ و رسم رکھتے تھے ، یہیں درس و تدریس دیتے تھے ۔ ملا نظام الدین بھی یہیں پیدا ہوئے اور ابتدائی کتب اپنے والد سے پڑھیں مگر ابھی وہ چودہ برس کے تھے کہ ان کے والد شہید کر دیے گئے[2] اور ملا نظام الدین کو سہالی چھوڑ کر لکھنئو میں آنا پڑا ، جہاں عالمگیر نے ملا قطب الدین کے لڑکوں کو 'فرنگی محل' کی عمارت عطا کر دی تھی ، ملا قطب الدین اس وقت 'شرح جامی' پڑھتے تھے ۔

ملا نظام الدین نے باقی تعلیم حافظ امان اللہ بنارسی ، ملا علی قلی جالسی اور مولانا غلام نقشبند لکھنوی وغیرہ سے حاصل کی[3] اور فرنگی محل میں تدریس کا سلسلہ جاری کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مدرسہ فرنگی محل نہ صرف پورب بلکہ تمام ہند میں ایک مثالی درسگاہ بن گئی ۔ ملا نظام دین کی تدریس کے مقابلے میں اس علاقہ کے تمام علماء و مدرسین کی محافل تدریس سرد تھیں ۔ مشرق و مغرب اور دور دراز کے شہر و قصبات سے لوگ ان کے پاس آتے اور تعلیم حاصل کرتے تھے ۔ برّ صغیر پاکستان و ہند میں شاید ہی کوئی ہوگا جو ان کا یا ان کے بیٹوں کا یا ان کے شاگردوں کا شاگرد نہ ہو[4] ۔

ملا نظام الدین سہالوی سے فیض حاصل کرنے والے نامور فضلاء میں سے کمال الدین عظیم آبادی ، سید ظریف عظیم آبادی ، علامہ کمال الدین فتحپوری ، شیخ غلام محمد برہانپوری ، شیخ عبداللہ امیٹھوی، شیخ احمد بن غلام نقشبند لکھنوی ، حمداللہ سندیلوی، شیخ وجیہ الدین دہلوی، ملا محمد بن غلام مصطفیٰ لکھنوی اور آپ کے نامور فرزند مولانا بحرالعلوم عبدالعلی کے نام قابلِ ذکر ہیں[5] ۔

---

۱ ۔ نزہۃ الخواطر ۶ ، ۳۸۳ : مقالات شبلی ۳ : ۹۲ ، ۱۰۶ ۔

۲ ۔ نزہۃ الخواطر ۶ : ۳۸۳ ، مقالات شبلی ۳ : ۹۲ ، ۱۰۶ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۵۲۵ ، سبحۃ المرجان ،ص ۹۰ ، ابجد العلوم ، ص ۹۱۱ ، مآثرالکرام ، ص ۲۲۰ ڈاکٹر زبیدہ احمد ، ص ۳۳۰ ۔

۳ ۔ نزہۃ الخواطر ۶ : ۳۸۳ ،

۴ ۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۲۵ ۔

۵ ۔ نزہۃ الخواطر ۶ ، ۳۸۵ ، ڈاکٹر زبید احمد، ص ۳۳۴ ۔ ۳۸۳ ، ۳۳۳

ملا سہالوی ایک عہد ساز اور تاریخ گر شخصیت اور فاضلِ اجل ہونے کے باوجود بھی بڑے متواضع اور منکسرالمزاج تھے۔ توکل و قناعت اور استغناء کا مجسمہ تھے[1]۔ آپ کو زہد و تصوف سے بھی گہرا شغف تھا۔ 'شاہ عبدالرزاق ہانسوی کے مرید تھے۔ شاہ صاحب سے کامل استفادہ کیا۔ حضرت شاہ ہانسوی قدس سرہ' ملا نظام الدین کو ان لوگوں میں سے شمار کرتے تھے جن کے متعلق ارشاد ہے: ان الذین آمنوا و عملوا الصالحات (وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک کام کیے)۔ ایک جہان کو اپنے باطنی علوم و معارف سے مستفید کیا، خلقِ کثیر نے ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کی، ان کی تعلیم وتربیت سے علماء و فضلاء کی ایک بڑی جماعت فارغ ہوئی۔ ان فضائل کے باوجود بے نفسی میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے اور اپنے کو ناچیزِ محض سمجھتے تھے[2]۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں:

> میں ۱۹ ذی الحجہ ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء میں لکھنؤ پہنچا اور ملا نظام الدین سے ملا، میں نے انہیں سلف صالحین کے طریقے پر پایا اور ان کی پیشانی پر نورِ تقدیس چمک رہا تھا[3]۔

مولانا نظام الدین سہالوی کی وفات ۸ جمادی الاول ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں ہوئی اور کسی نے آپ کی تاریخِ وفات ان الفاظ میں ادا کی: "ملک بود بیک حرکت ملک شد"[4]۔

ملا صاحب کی اہم تصانیف یہ ہیں: 'شرح مسلم الثبوت'، 'شرح منار الاصول'، 'شرح تحریر الاصول'، 'شرح الرسالة المبارزیة فی العقائد الاسلامیة'، 'الحاشیة علی شرح العقائد للدوانی'، 'الحاشیة علی الحاشیة القدیمة'، 'الحاشیة علی الصدرا'، 'الحاشیة علی الشمس البازغة' اور 'مناقب رزاقیہ' (جو ان کے مرشد شیخ عبدالرزاق ہانسوی کے حالات و مناقب پر مشتمل ہے)[5]۔

ملا نظام الدین سہالوی کی تصانیف کی اس فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ یہ سب کی سب متداول درسی کتابوں کی شروح یا حواشی ہیں، شروح میں سے

۱۔ مقالات شبلی ۳: ۹۶ بعد، نزہۃ الخواطر ۶: ۳۸۴۔
۲۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۲۶۔
۳۔ سبحۃ المرجان، ص ۹۵۔
۴۔ نزہۃ الخواطر ۶: ۳۸۵، سبحۃ المرجان، ص ۹۵، ابجد العلوم، ص ۹۱۱، حدائق الحنفیۃ، ص ۴۴۵، مآثرالکرام، ص ۲۲۱، تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۲۶، مقالات شبلی ۳: ۹۶ ڈاکٹر زبید احمد، ص ۳۳۰۔
۵۔ مقالات شبلی ۳: ۱۰۵۔ مفصل دیکھئے نزہۃالخواطر ۶: ۳۸۵، مقالات شبلی ۳: ۹۸، تذکرہ علماء ہند ص ۵۲۶۔

'شرح مسلم الثبوت' قابلِ توجہ ہے جس کے مختلف سات نسخے پائے جاتے ہیں ۔ ملا کی اس شرح کو وہ قبولیت و شہرت تو حاصل نہ ہوسکی جو ان کے بیٹے بحرالعلوم عبدالعلی کی شرح کو نصیب ہوئی ، تاہم یہ بھی ایک عمدہ شرح سمجھی جاتی ہے ۔ قاضی محب اللہ بہاری نے حنفی اصولِ فقہ پر 'مسلم الثبوت' کے نام سے جو کتاب لکھی تھی اور جو مقدمہ، تین مقالات مبادی ، چار اصولِ مقاصد اور ایک خاتمہ پر مشتمل تھی ، اس میں انہوں نے حنفی اصول فقہ کے علاوہ شافعی اصولِ فقہ پر بھی بحث کی اور دونوں کا تقابل کیا تھا ۔ ملا نظام الدین نے اپنی اس شرح ممزوج میں اسی ترتیب اور اسلوب کو برقرار رکھا ہے ۔ حواشی میں سے 'شرح العقائد العضدیہ' کا حاشیہ قابلِ ذکر ہے ، جو جلال الدین محقق دوانی کی تصنیف اور سنی علم الکلام پر عمدہ کتاب سمجھی جاتی ہے اور دینی مدارس میں مقبول رہی ہے ۔ اس پر ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور ملا نظام الدین کے ایک شاگرد ملا کمال الدین سہالوی نے بھی حواشی لکھے تھے ۔ مؤخرالذکر نے تو اپنے استاد کے حواشی سے پورا پورا استفادہ کیا اور دورانِ بحث اس کا اعتراف بھی کیا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ملا نظام الدین سہالوی کی شہرت کا باعث ان کی تصانیف نہیں بلکہ اس کا سبب ایک تو ان کے نامور تلامذہ ہیں اور دوسرا سب سے بڑا سبب ان کا طریقۂ تدریس اور ان کا وضع کردہ نصابِ تعلیم ہے ۔ ملا صاحب ایک کامیاب مدرس تھے ۔ چنانچہ ان کے فیض یافتہ علماء سرزمینِ ہند کے مختلف گوشوں میں پھیل گئے اور اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مدارسِ عربیہ کا ایک سلسلہ قائم کیا اور ان مدارس کا نصاب چونکہ ملا صاحب کا وضع کردہ تھا اس لیے یہ تعلیمی ادارے ''مدارسِ نظامیہ'' اور ان کا تعلیمی نصاب ''درسِ نظامی'' مشہور ہوا ۔ یوں گویا ''ملا نظام الدین سہالوی نے برّصغیر میں نظامِ تدریس کو ایک نئے نہج پر ڈال دیا جسے لوگوں نے خوشی سے قبول کیا''[۱] ۔ ''ملا صاحب نے اس نصاب میں وسعتِ نظر اور قوتِ مطالعہ کو یک جا جمع کر دیا ہے ۔ اس نصاب کو پڑھنے کے بعد طالب علم میں قوتِ مطالعہ ، دقتِ نظر اور کمالاتِ علمیہ کے حصول کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے''[۲] ۔

''درسِ نظامی'' اگرچہ بجا طور پر ملا نظام الدین سہالوی سے منسوب ہے (اور اس کی نسبت نظام الملک طوسی کے جامعہ نظامیہ بغداد کی طرف غلط ہے) لیکن حقیقت میں اس کی تاریخ ایک پشت اوپر ملا نظام الدین کے والد قطب الدین سہالوی شہید[۳] سے

۱ - مقالات شبلی، ص ۱۰۵، ۱۰۷ ؛ علمائے ہند ، ص ۵۲۶ ؛ ڈاکٹر زبید احمد، ص ۳۸۱ ، ۳۰
۲ - تفصیل کے لیے دیکھئے رود کوثر، ص ۳۸۱ ؛ بعد الثقافة الاسلامیہ فی الھند، ص ۱۶ -
۳ - الثقافة الاسلامیة فی الھند ، ص ۱۷ -

شروع ہوتی ہے ۔ فرق صرف یہ ہے کہ ملا شہید نے اپنے درسی نصاب میں ہر فن کی صرف ایک جامع اور مشکل ترین کتاب شامل کر لی تھی جسے پڑھنے کے بعد ان کے شاگردوں میں اس فن کو کماحقہ ، سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی ۔ ملا نظام الدین نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ ہر فن کی دو دو کتابیں شامل نصاب کیں[۲] ۔

ملا نظام الدین کے وضع کردہ نصاب پر بڑی لے دے ہو چکی ہے اور اس کے نقائص کی نشاندہی بھی کرائی جا چکی ہے۔ اس کا سب سے بڑا نقص تو یہ ہے کہ مدارس نظامیہ کا کوئی مربوط مرکزی نظام امتحانات موجود نہیں ۔ مدرسین کی معلومات محدود اور طریقۂ تدریس دقیانوسی قسم کا ہے ۔ خود نصاب تعلیم میں صرف و نحو اور لغو قسم کے فلسفے اور منطق پر فضول وقت ضائع ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح تفسیر و حدیث اور دیگر دینی علوم کے علاوہ ادب و لغت کے پہلو بہت تشنہ ہیں[۳] ۔

قاضی مبارک گوپا موی

قاضی محمد مبارک بن محمد دائم بن عبدالحیٔ بن عبدالحلیم بن المبارک ناصحی فاروق گوپاموی اپنے عہد کے مشاہیر اذکیاء اور بلند پایہ فضلاء میں سے تھے۔ گوپامؤ میں پیدا ہوئے اور قاضی قطب الدین گوپا موی سے کتب متداولہ کا درس لیا اور پھر طلب علم کی خاطر سفر اختیار کیا اور شیخ صبغة اللہ حسینی خیر آبادی محدّث سے سند حاصل کی ۔ بعد ازاں دہلی پہنچے اور درس و تحقیق میں شہرت حاصل کی اور ایک طویل مدت تک یہاں تدریس میں مشغول رہے ۔ وہ حمداللہ سندیلوی اور قاضی احمد علی سندیلوی کے معاصر تھے اور مؤخرالذکر کے ساتھ ان کا علمی مناظرہ و مباحثہ بھی ہوا[۴] ۔

قاضی مبارک نے 'شرح التہذیب' اور 'شرح المواقف' پر حواشی لکھے۔ لیکن ان کی شہرت کا باعث 'سلم العلوم' کی وہ شرح بنی جو ان کے نام سے موسوم اور مدارس نظامیہ میں داخل نصاب ہو کر مقبول ہوئی اور جس کی تکمیل ۱۷۳۰ء/۱۱۴۳ھ میں ہوئی[۵] ۔

علم المنطق کے موضوع پر ہندی علماء کی تصانیف میں سے ایک عمدہ کتاب قاضی محب اللہ بہاری کی 'سلم العلوم' ہے جس پر عربی ، فارسی اور اردو میں بے شمار حواشی

---

۱ - مقالات شبلی ۳ : ۱۰۵ -
۲ - ایضاً - ص ۱۰۵ ، ۱۰۷ -
۳ - تفصیل کے لیے دیکھیے رود کوثر، ص ۳۸۱ ببعد -
۴ - تذکرہ علمائے ہند ، ص ۴۰۳ ، نزھة الخواطر ۶ : ۲۷ ، زبید احمد بامداد اشاریہ -
۵ - ایضاً -

و شروح لکھی گئیں ۔ عربی زبان میں اس کی دو شروح بہت مقبول ہوئیں جن میں سے ایک حمداللہ سندیلوی کی شرح ہے اور دوسری قاضی مبارک گوپاموی کی اور عجیب بات یہ ہے کہ دونوں کتابیں اپنے مصنفوں کے نام سے موسوم ہوئیں ۔ چنانچہ سندیلوی کی شرح سلم العلوم 'حمداللہ' کے نام سے اورگوپا موی کی شرح 'قاضی مبارک' کے نام سے مشہور و متداول ہوئی ، یہ دونوں شرحیں یکساں مقبول ہیں اور کسی ایک کو برتری یا فضلیت دینا مشکل ہے ۔

قاضی مبارک گوپاموی نے 'شرح المواقف' کے بعض ابواب کے بارے میں جو حواشی تحریر کیے تھے وہ بھی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں ۔ میر محمد زاہد بن محمد اسلم الھروی نے شریف جرجانی کی 'شرح المواقف' کے حصہ ''الامورالعامۃ'' پر حواشی لکھ کر اورنگزیب (۱۶۵۹ء - ۱۷۰۷ء) کی خدمت میں پیش کیے تھے جنہیں اہل علم نے بہت پسند کیا اور شرف قبولیت بخشا ۔ قاضی مبارک نے 'شرح المواقف' کے انہی حواشی پر حواشی چڑھائے جو 'الحاشیۃ علی حاشیۃ میرزاھد علی الامورالعامۃ' کے نام سے کئی ایک لائبریریوں میں محفوظ ہیں ۔ ان کی وفات ۱۷۲۹ء/۱۱۶۲ھ میں ہوئی[۱] ۔

معتمد الملوک ہاشم علوی خاں

حکیم محمد ہاشم بن محمد ہادی شیرازی علوی جن کا لقب معتمدالملوک نواب علوی خان ہے اپنے زمانے کے مشہور عالم وطبیب اور یگانۂ روزگار شخصیت تھے ۔ وہ ۱۶۶۹ء/ ۱۰۸۰ھ میں شیراز میں پیدا ہوئے اور تحصیل علم کے بعد ۱۶۹۹ء میں ہندوستان آئے ۔ عالمگیر نے خلعت عطا کی اور پھر شاہ عالم کا قرب حاصل ہوا جس نے انہیں 'علوی خاں' کا خطاب دیا ۔ محمد شاہ نے 'معتمد الملوک' کے خطاب سے نوازا اور چاندی میں تولا ۔ دہلی کی تباہی کے بعد نادر شاہ انہیں اپنے ساتھ ایران لے گیا ۔ جہاں سے وہ رخصت حاصل کرکے حج اور زیارت حرمین کے لیے گئے اور پھر ۱۷۴۳ء میں ہندوستان واپس آ گئے اور علاج معالجہ اور طب کی عظیم خدمات انجام دینے میں مشغول ہوگئے[۲] ۔

حکیم علوی خان کی تصانیف میں 'شرح ہدایۃالحکمۃ' اور 'شرح الاسباب والعلامات' کے حواشی اور 'تحریر الاقلیدس' ، 'کتاب المجسطی' اور 'موجز القانون' کی شروح کے علاوہ 'التحفۃ العلویۃ' 'جامع الجوامع' ، 'آثار باقیۃ' اور طب و موسیقی پر متفرق رسائل شامل ہیں ۔

---

۱ - نزھۃ الخواطر ۶ - ۲۴۸ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۴۰۴ -

۲ - نزھۃ الخواطر ۶ ; ۳۶۵ -

حکیم معتمد الملوک علوی خان کی ان تصانیف میں سے دو مؤخرالذکر کتابیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں ۔ 'جامع الجوامع' کے بارے میں مولانا عبدالحیؒ کا قول ہے : کتاب لم ینسج علی منواله (یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی مثال کبھی تیار ہی نہیں ہوئی)۔ 'آثار باقیہ' جو 'قرابا دین علوی خان' کے نام سے بھی مشہور ہے برِ صغیر پاکو ہند میں طب پر لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے بہتر کتاب ہے ۔ مصنف نے یہ کتاب ترکیبِ ادویہ کے موضوع پر لکھی ہے ۔ شروع میں دوا سازی کے اصولوں پر تین مقدمات ہیں جن میں فاضل طبیب نے ادویہ کی ترکیب ، خاص مواقع کے لیے مقررہ مقدار اور وزن وغیرہ پر عمدہ اور جامع انداز میں بحث کی ہے ۔ اس کے بعد ہر طبی نسخے کو حروفِ تہجی کے اعتبار سے درج کیا ہے اور اس کی ضروریات و لوازمات سے مفصل بحث کی ہے۔ جگہ جگہ قدیم حکماء پر تنقید کی ہے اور اپنی رائے اور تجربات پیش کیے ہیں ۔ مولانا عبدالحیؒ لکھنوی کا قول ہے : ھی دلائل الاعجاز لذلك الفاضل الجدير بالاعزاز (یہ کتاب اس قابلِ عزت فاضل کی شخصیت کے معجزانہ کمال کی دلیل ہے) ۔ بانکی پور کی لائبریری کا فہرست ساز اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے[1] :

"Thus the work is a monumental representation of the mode of criticism, observation and adaptation made by the Indian physicians."

ان کی وفات ۱۷۴۹ء/۱۱۶۲ھ میں ہوئی[2] ۔

شیخ محمد حیات سندھی ، مدنی

مولانا محمد حیات بن ملا ابراہیم فلاریہ[3] سندھی ثم مدنی قبیلہ چاچڑ سے تعلق رکھتے تھے جو عادل پور میں آباد تھا ۔ اس زمانے میں ٹھٹھہ سندھ کا ثقافتی مرکز تھا ، چنانچہ مولانا محمد حیات بھی وہیں پہنچے اور شیخ محمد معین سندھی سے درس لیا ۔ پھر عنفوانِ شباب میں حرمین کی زیارت کے لیے گئے اور مدینہ منورہ میں شیخ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندھی نزیلِ مدینہ منورہ سے حدیث میں سند لی اور وہیں مقیم ہوگئے ۔ شیخ ابوالحسن مذکور کی وفات کے بعد چوبیس سال تک ان کی مسند نشینی کے فرائض انجام دیتے رہے، جہاں ان سے اطراف و اکناف کے علماء سندِ حدیث لینے آتے تھے ۔ ان کے عظیم شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے جن میں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی بھی شامل ہیں[4] ۔

۱ ۔ فہرست بانکی پور لائبریری نمبر ۱۰۲ ۔
۲ ۔ نزهة الخواطر ۶ : ۳۶۳ ۔ زبید احمد بامداد اشاریہ ۔
۳ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۲۷ ۔
۴ ۔ سبحة المرجان ، ص ۹۵ ببعد ، مآثر الکرام ، ص ۱۶۳ ببعد ، ابجد العلوم ، ص ۸۹۹ ؛ نزهة الخواطر ۶ : ۳۰۱ ، اتحاف النبلاء ، ص ۴۰۳ ببعد ۔

شیخ محمد حیات سندھی نے مختلف موضوعات پر کئی رسائل تحریر کیے ہیں ۔ جن میں سے 'تحفة الانام فی العمل بحدیث النبی علیه الصلوة والسلام' (یا 'تحفة الانام فی العمل بحدیث خیر الانام') اور 'الایقاف علی اسباب الاختلاف' قابل ذکر ہیں جو بظاہر ناپید ہیں ۔ ان کی وفات ۹ /صفر ۱۱۶۳ھ/۱۷۴۹ء میں ہوئی[1]۔

عبدالنبی احمد نگری

قاضی عبدالنبی بن عبدالرسول عثمانی احمد نگری گجراتی اقلیم گجرات کے شہر احمد نگر میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی کتب اپنے والد سے پڑھیں پھر عبداللہ احمد نگری، قطب الدین عثمانی گجراتی اور محمد محسن بن عبدالرحمٰن صدیقی گجراتی سے درس لیا اور ادب و لغت اور نحو و منطق کے ماہر عالم بن گئے ۔ وہ احمد نگر میں قاضی کے فرائض انجام دینے کے علاوہ تدریس میں بھی مشغول رہے[2] ۔ وہ اپنے زمانے کے علامہ اور یگانۂ زمانہ تھے ، شاہ وجیہ الدین علوی احمد آبادی کے مرید و شاگرد بھی تھے"[3] ۔

قاضی صاحب کی مشہور تصانیف میں سے 'کافیہ ابن حاجب' کی فارسی زبان میں شرح موسوم بہ 'جامع الغموض و منبع الفیوض' اور 'دستور العلماء' (جو چار جلدوں میں علوم و فنون کی اصطلاحات کی لغت ہے) کے علاوہ 'شرح التہذیب للیزدی' ، 'میر زاہد ملا جلال' ، الفرائض السراجیة ، 'دستور المبتدی' ، 'خلاصة الحساب للعاملی' ، 'المطول' اور 'الرشیدیة' وغیرہ پر حواشی و تعلیقات قابل ذکر ہیں[4] ۔

قاضی عبدالنبی احمد نگری کی ان تصانیف میں سے 'دستور العلماء' (جس کا پورا نام 'جامع العلوم الملقب بدستور العلماء فی اصطلاحات العلوم و الفنون ہے') ہماری خصوصی توجہ کی مستحق ہے ۔ علوم وفنون کی مصطلحات کے بارے میں برّ صغیر کے علماء نے جو کوششیں کی ہیں ان میں دو ناقابل فراموش اور اہل علم کے لیے ناگزیر ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ ان میں سے ایک تو شیخ محمد اعلیٰ تھانوی کی 'کشاف اصطلاحات الفنون' ہے جس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے اور دوسری یہ کتاب (یعنی 'دستور العلماء') ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ کثرت مواد اور ضخامت کے اعتبار سے اول الذکر کو برتری اور فضیلت حاصل ہے ، مگر حسن ترتیب کے لحاظ سے مؤخرالذکر بہتر ہے اور اس تک رسائی اور اس سے استفادہ بہت آسان ہے ۔ شیخ عبدالنبی نے اگرچہ کتاب کی ترتیب

---

۱ ۔ اتحاف النبلاء، ص ۳۰۳ ببعد ۔

۲ ۔ نزهة الخواطر ۶ : ۱۷۲ ۔

۳ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۳۲۸ ۔ زبید احمد بامداد اشاریہ ۔

۴ ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے نزهة الخواطر ۶ ، ۱۷۲ ببعد ۔

حروف تہجی کے لحاظ سے پیش کی ہے مگر اس نے لفظ اللہ' الاحمد اور الاصحاب کا ذکر ترتیب حروف تہجی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سب سے پہلے کیا ہے اور مقصد صرف یمن و برکت ہے۔ کتاب کا تعارف کراتے ہوئے مصنف لکھتا ہے :

"ان هذا دستور العلماء جامع العلوم العقلية ، حاوی الفروع و الاصول النقلية ، فيه فوائد غريبة و جرائد عجيبة ، فی تحقيقات اصطلاحات العلوم المتناولة وتدقيقات لغات الكتب المتداولة ، وتوضيحات مقدسات منتشرة مشكلة على المعلمين ، و تلويحات مسائل مبهمة متعسرة على المتعلمين" (یہ کتاب دستور العلماء ہے جو عقلی علوم کی جامع اور نقلی فروع و اصول پر حاوی ہے ، اس میں عجیب و غریب فوائد و بیانات ہیں۔ جن میں مستعمل علوم کی اصطلاحات کی تحقیق ہے ، متداول کتابوں کے الفاظ کی باریک تشریح ہے ، ان منتشر معلومات کی توضیح ہے جو اساتذہ کے لیے مشکل ہیں اور ان مبہم مسائل کی وضاحت ہے جو طلبہ کے لیے لاینحل ہیں[1]) ۔

یہ کتاب اپنے ضمیمے سمیت حیدرآباد دکن سے ۱۹۱۱ء/۱۳۲۹ھ میں چار جلدوں میں چھپی ہے ۔ ان کی وفات ۱۷۵۹ء/۱۱۷۳ھ میں ہوئی ۔

ملا حامد جونپوری

علامہ حامد حنفی جونپوری جو شیخ محمود عثمانی جونپوری کے پوتے تھے ، اپنے عہد کے فقہاء کبار میں سے تھے[2] ۔ درسی کتابیں زیادہ تر سید محمد زاہد بن محمد اسلم ہروی سے پڑھیں اور کچھ علامہ محمد شفیع یزدی سے۔ بحث و تحقیق میں محنت اور خداداد صلاحیت کی بنیاد پر اپنے اساتذہ کی زندگی ہی میں عظمت و شہرت حاصل کر گئے۔ حتٰی کہ شاہ جہاں نے وظیفہ مقرر کر دیا ۔ پھر سلطان عالمگیر کے عہد میں انہیں علماء کی اس جماعت میں شامل کیا گیا جس نے 'الفتاویٰ الهندية' المعروف 'فتاویٰ عالمگیری' مرتب کی ۔ اس کے علاوہ وہ محمد اکبر بن سلطان عالمگیر کے اتالیق بھی رہے[3] ۔ آپ کے صاحبزادے شیخ یوسف بن حامد جونپوری بڑے پائے کے فاضل تھے[4] ۔

ملا ہاشم سندھی

حاجی ہاشم بن عبدالغفور سندھی ان علمائے ربانی میں سے تھے جنہوں نے دین اسلام

---

۱ ۔ دستور العلماء ۱ : ۱
۲ ۔ نزهة الخواطر ۶ : ۶۰ ۔
۳ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۵۶۷ ، نزهة الخواطر ۶ : ۶۰ ۔
۴ ۔ نزهة الخواطر ۶ ، ۴۲۳ ۔

کی تبلیغ اور اشاعتِ سنتِ نبوی ؐ کی خاطر عظیم خدمات انجام دیں۔ حاجی ہاشم اپنے زمانے کے ممتاز عالم تھے۔ ان کے زمانے میں سینکڑوں لوگ دولت ایمان سے مشرف ہوئے۔ سلاطینِ وقت مثلاً نادر شاہ اور احمد شاہ سے پیغام و سلام رکھتے تھے۔ دین کی تقویت کے احکام ان کی درخواست کے مطابق حسبِ دلخواہ جاری ہوتے تھے اور بہت اچھی طرح عمل میں آتے تھے"[1]۔ انہوں نے ہر فن میں کتب تصنیف کیں۔ ان کی پیدائش ۱۶۹۲ء/۱۱۰۴ھ اور وفات ۱۷۶۰ء/۱۱۷۴ھ میں ہوئی[2]۔

شاہ ولی اللہ محدث ؒ دہلوی

شیخ الاسلام احمد بن عبدالرحیم بن وجیہ الدین العمری الدہلوی ۱۷۰۳ء/۴ شوال ۱۱۱۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تاریخی نام "عظیم الدین" بشارتی نام "قطب الدین" اور کنیت ابوالفیض ہے۔ لیکن ولی اللہ (اللہ کا دوست) کے لقب سے مشہور و معروف ہوئے[3]۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عمر بن الخطاب ؓ سے جا ملتا ہے۔ آپ کے والد شیخ عبدالرحیم دہلوی بانیٔ مدرسہ رحیمیہ دہلی کے ممتاز فضلاء اور اپنے عہد کے جید علماء میں سے تھے اور 'فتاویٰ عالمگیری'، 'الفتاوی الہندیۃ' کی نظرِ ثانی و اصلاح میں شریک تھے[4]۔

حضرت شاہ صاحب بچپن ہی سے بڑے شریف و سنجیدہ اور ذہین و فطین واقع ہوئے تھے اور کھیل کود میں بہت کم رغبت رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے پانچ سال کی عمر میں پڑھنا شروع کیا۔ سات سال کی عمر میں 'قرآن کریم' ختم کر لیا اور اپنے والد سے ابتدائی فارسی و عربی کتب پڑھ کر دس سال کی عمر میں 'شرح جامی' تک پہنچ گئے[5] اور پندرہ سال[6] کی عمر میں معقولات و منقولات کے فاضل بن گئے اور علومِ متداولہ کی سندِ فراغت حاصل کی۔ فاتحہ فراغ کی رسم کے موقع پر آپ کے والد نے ایک تقریبِ ضیافت منعقد کی جس میں ہر خاص و عام مسلمان کو شرکت کی دعوت دی[7]۔ نیک باپ نے اپنے ہونہار اور صالح فرزند کی ظاہری تعلیم و تربیت کے ساتھ باطنی اصلاح و تعمیرِ سیرت

۱۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۴۹۔
۲۔ ایضاً۔
۳۔ نزھۃ الخواطر ۶، ۳۹۸؛ ابجد العلوم، ص ۹۱۲؛ حدائق الحنفیۃ، ص ۴۴۷؛ مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ از عبدالحق حقانی۔
۴۔ نزھۃ الخواطر ۶: ۳۹۸؛ حدائق الحنفیۃ، ص ۴۴۷۔
۵۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۴۲؛ نزھۃ الخواطر ۶: ۳۹۹۔
۶۔ حدائق الحنفیۃ، ص ۴۴۷۔ نزھۃ الخواطر ۶: ۳۹۹ میں ۱۵ سال ہے جو درست نہیں۔
۷۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۴۲۔

کا بھی خاص خیال رکھا۔ چنانچہ سات سال کی عمر میں نماز پڑھنے اور رمضان کے روزے رکھنے کا حکم دیا اور نجابت و پاک‌دامنی کو قائم رکھنے کے لیے چودہ برس کی عمر میں سنت محمدیہ پر عمل کرتے ہوئے آپ کی شادی کر دی[1]۔ شاہ صاحب ابھی سترہ برس کے تھے کہ والد نے بیعت و ارشاد کے ساتھ مسندِ تدریس پر متمکن ہونے کی اجازت دے دی اور خود ۱۷۱۹ء/۱۱۳۱ھ کو اس دارِ فانی سے رحلت کر گئے[2]۔

شاہ ولی اللہؒ نے اکثر علومِ متداولہ معقولات و منقولات کی سند اپنے نامور باپ سے لی۔ البتہ علومِ حدیث کے لیے وہ شیخ محمد افضل سیالکوٹی (م۔ ۱۷۳۳ء/۱۱۴۶ھ) کے حلقۂ فیوض میں شامل ہوئے۔ پھر سفرِ حرمین کے دوران میں شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم الکردی المدنی، شیخ وفد اللہ المالکی المکی اور شیخ تاج الدین القلعی المکی سے صحاحِ ستہ اور دیگر کتبِ حدیث مثل 'موطأ مالک'، 'مسند احمد'، 'مسند دارمی'، 'الادب المفرد' اور قاضی عیاض کی 'الشفاء' وغیرہ کا سماع کیا اور روایت کی اجازت حاصل کی[3]۔

والد کی وفات کے بعد تقریباً بارہ برس تک مدرسہ رحیمیہ میں معقولات و منقولات کا درس دیتے رہے۔ ۱۷۳۱ء/۱۱۴۳ھ میں آپ اپنے ماموں شیخ عبداللہ بارھوی اور ماموں زاد بھائی شیخ محمد عاشق کے ہمراہ زیارتِ حرمین اور فریضۂ حج کے لیے روانہ ہو گئے[4]۔ یہاں آپ کا قیام دو سال تک رہا اور ۱۷۳۲ء/۱۱۴۵ھ میں واپس لوٹ آئے۔ اس اثناء میں شاہ صاحب مذکورہ بالا علماء حرمین کے علاوہ شیخ سناوی، سید عبدالرحمٰن ادریسی، محمد بن علا بابلی، شیخ عیسیٰ جعفری، شیخ حسن عجیمی، شیخ احمد علی اور شیخ عبداللہ بن سالم بصری سے بھی ملے اور اکتسابِ فیض کیا[5]۔

۱۷۳۳ء/۱۱۴۶ھ میں جب آپ واپس لوٹے تو سر زمینِ ہند میں اسلام اور اہلِ اسلام کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ شاہ صاحب نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد مدرسہ رحیمیہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پرانی جگہ کی تنگی کے پیشِ نظر سلطان محمد شاہ رنگیلا نے دہلی شہر کی ایک عالیشان حویلی دے دی، جس میں آپ نے دارالحدیث قائم کیا۔ یہ مدرسہ ۱۸۵۷ء/۱۲۷۴ھ تک قائم رہا جہاں خاندان

۱۔ نزہۃ الخواطر ۶: ۳۹۹؛ تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۴۲؛ مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ از عبدالحق حقانی۔

۲۔ مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ از عبدالحق حقانی۔

۳۔ نزہۃ الخواطر ۶: ۳۹۹ بعد۔

۴۔ ایضاً؛ تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۴۲۔

۵۔ مقدمہ حجۃ البالغہ از عبدالحق حقانی۔

ولی اللہ کے علم و عرفان کا فیضان جاری رہا[۱] ۔

شاہ صاحب نے اوقاتِ کار کو یوں تقسیم کر رکھا تھا کہ نمازِ صبح اور وظائف کے بعد دوپہر تک درسِ حدیث دیتے، علمِ حدیث اور اسرارِ دین سے مستفیض فرماتے اور پھر اپنے مدرسہ کے اساتذہ کی علمی مشکلات میں رہنمائی کرتے۔ بقول شاہ عبدالعزیز آپ اشراق کے بعد جو بیٹھ جاتے تو دوپہر تک نہ زانو بدلتے، نہ کھجلاتے اور نہ دہن مبارک سے تھوک پھینکتے[۲] ۔

آخری عمر میں نجف علی خاں نے آپ کے پہونچے اتروا کر ہاتھ بیکار کر دیے تھے لیکن شاہ صاحب اپنا فریضہ ادا کر چکے تھے اور ان کی اسلامی تحریک اپنی راہ پر گامزن ہو چکی تھی ۔ چنانچہ ۱۷۶۳ء / ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ کو اکسٹھ سال کی عمر میں آپ اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے اور ''او بود امام اعظم دین'' سے آپ کی تاریخِ وفات نکالی گئی ۔ آپ نے چار بیٹے چھوڑے جن میں سے ہر ایک ''الولد سر لابیہ'' (بیٹا اپنے باپ کا راز ہوتا ہے) کا مصداق تھا[۳] ۔

شاہ صاحب ''افضل علماء متأخرین اور سید المفسرین و سند المحدثین تھے''[۴] اور ''برصغیر پاکستان ہند و میں علومِ اسلامیہ کی تاریخ میں آپ کا کوئی ثانی و ہمسر نہیں ہوا''[۵]۔ صاحب 'نزهة الخواطر' شاہ صاحب کے تذکرے کا آغاز کرتے ہوئے انہیں یوں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے :

> ''شیخ امام ہمام ، خلق خدا میں اللہ کی حجت ، اماموں کا امام ، امت کا رہنما ، علامۂ علماء ، وارث انبیاء ، مجتہدین کی انتہا ، علمائے دین میں یکتا ۔ شرع متین کی ذمہ داری اٹھانے والوں کا قائد ، سنت کو زندہ کرنے والا اور جس کے ذریعہ اللہ نے ہم پر بہت بڑا احسان فرمایا ، شیخ الاسلام قطب الدین احمد ولی اللہ بن عبد الرحیم بن وجیہ الدین العمری الدہلوی''[۶] ۔

آپ کے استاد ابو طاہر مدنی کا قول تھا کہ :

''شاہ ولی اللہ مجھ سے حدیث کے الفاظ کی سند لیتے تھے اور میں ان سے معانی کی

---

۱ ۔ مقدمہ حجة اللہ البالغة از عبدالحق حقانی ۔

۲ ۔ ایضاً ۔ و ملفوظات شاہ عبدالعزیز ، ص ۵۲ ، ۸۳ ، ۹۵ ۔

۳ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۵۳۷ ، نزهة الخواطر ۶ : ۴۱۵ ۔ مقدمہ حجة اللہ البالغة ، ص ۶ ۔ ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۲۲ بعد ، حدائق الحنفیة ، ص ۴۴۸ ۔

۴ ۔ حدائق الحنفیة ، ص ۴۴۷ ۔

۵ ۔ ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۲۲ ۔

۶ ۔ نزهة الخواطر ۶ : ۳۹۸ ۔

صحبت حاصل کرتا تھا''[1] ۔

نواب صدیق حسن خاں کا قول ہے کہ :

''ان کا گھرانہ ہند میں علم دین کا گھرانہ ہے ، یہ خانوادہ علوم عقلیہ و نقلیہ میں اہل ہند کے استاذ تھے ۔ یہ لوگ اعمال صالحہ اور غیر فانی فضاؤں کے مالک تھے اور سر زمین ہند کے کسی گوشے میں علمائے دین کا ایسا گھرانہ نہیں تھا''[2] ۔

شاہ ولی اللہ دھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے عظیم کارناموں کی طویل فہرست کو تین ابواب میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ، آپ کے علمی کارنامے ، اصلاحی کارنامے اور علمائے حق کی ایک جماعت کی تیاری جس نے زندگی کے ہر میدان میں امت اسلامیہ کی رہنمائی کی اور اسلام و اہل اسلام کی سربلندی کے لیے ایک عظیم تحریک کو آگے بڑھایا[3] ۔

شاہ صاحب کے علمی کارنامے ، تعداد و مقدار اور قیمت و اہمیت کے لحاظ سے بر صغیر کی تمام اسلامی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں ۔ لیکن اس سے پہلے کہ ان کے افکار وآراء سے بحث کی جائے یہ مناسب ہوگا کہ ان کی تصانیف کی ایک فہرست پیش کر دی جائے ۔ آپ کی اہم عربی تصانیف یہ ہیں :

۱ - 'فتح الخبیر' ۲ - 'حجة الله البالغة' ۳ - 'البدور البازغة' ۴ - 'الخیر الکثیر' ۵ - 'التفہیمات الالہیة' (عربی وفارسی) ۶ - 'فیوض الحرمین' ۷ - 'المسوی من احادیث الموطا' ۸ - 'النوادر من احادیث سید الاوائل و الاواخر' ، ۹ - 'الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین' ۱۰ - 'اربعون حدیثا مسلسلة بالا شراف فی غالب سندھا' ۱۱ - 'الدرالثمین فی مبشرات النبی الامین' ۱۲ - 'الارشاد فی مہمات علم الاسناد' ، ۱۳ - 'تراجم ابواب البخاری' ۱۴ - 'الانصاف فی بیان سبب الاختلاف' ۱۵ - 'عقدالجید فی احکام الاجتہاد والتقلید' ۱۶ - 'القول الجمیل' ۱۷ - 'اللمحات' ۱۸ - 'تاویل الاحادیث' ۱۹ - 'السرالمکتوم فی تدوین العلوم' ۲۰ - 'حسن العقیدہ' ۲۱ - 'اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم' ۲۲ - 'دیوان الشعر'[4] ۔

---

۱ - نزہۃ الخواطر ۶ : ۴۰۴ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۵۴۲ ۔

۲ - ابجد العلوم، ص ۹۱۴ ۔

۳ - شاہ ولی اللہ کی تعلیم، ص ۵ ، مقدمة حجة البالغہ از عبدالحق حقانی ۱ : ۲ ۔

۴ - مفصل دیکھیں نزہۃ الخواطر ۶ : ۴۰۷ بعد ، مقدمة المسوی ، ص ۶ ، شاہ ولی اللہ کی تعلیم، ص ۲۳، حدائق الحنفیة، ص ۴۴۸، تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۴۳، ڈاکٹر زبید احمد، ص ۲۷۵، ابجد العلوم، ص ۹۱۴ ۔

آپ کی اہم فارسی تصانیف کے نام یہ ہیں :

۱۔ 'فتح الرحمٰن فی ترجمة القرآن' ۲۔ 'الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'[1] ۳۔ 'مقدمہ در فن ترجمہ قرآن' ۴۔ 'المصفی شرح الموطا' ۵۔ سرور المحزون' ۶۔ ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء' ۷۔ 'قرة العینین فی تفضیل الشیخین' 'ہمعات' ۹۔ 'سطعات' ۱۰۔ 'الطاف القدوس' ۱۱۔ 'انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ' ۱۲۔ 'انفاس العارفین' ۱۳۔ 'امداد فی مآثر الاجداد' ۱۴۔ 'العطیة الصمدیة فی الانفاس المحمدیة' ۱۵۔ 'انسان العین فی مشائخ الحرمین' ۱۶۔ 'ہوامع شرح حزب البحر' ۱۷۔ الجزء اللطیف[2] ۱۸۔ 'وصیت نامہ' ۱۹۔ 'رسالہ دانشمندی' ۲۰۔ 'کشف الغین فی شرح الرباعیتین' ۲۱۔ 'صرف میر'[3] ۔

شاہ صاحب نے جن علوم پر خصوصی توجہ دی ان میں سے تفسیر القرآن ، علم الحدیث' ، علم الفقہ' ، اصول التفسیر' ، آداب السلوک' ، علم الحقائق' ، علم العقائد' اور اصول الدین بھی ہیں[4] ۔

حضرت شاہ ولی اللہ کو اپنے فرضِ منصبی سے پوری پوری آگاہی تھی اور آپ کو اپنی خداداد صلاحیتوں کا بھی علم تھا ۔ چنانچہ آپ نے اپنی تصانیف میں کئی مقامات پر دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں امت اسلامیہ کی شیرازہ بندی کے لیے پیدا کیا ہے۔ کبھی وہ فرماتے ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس دور کا ناطق و حکیم اور اس طبقہ کا قائد و زعیم بنایا ہے ۔ کبھی 'قائم الزمان' اور کبھی خلعت فاتحیت اور دیگر انعاماتِ ربانی کا تذکرہ کرتے ہیں[5] ۔

شاہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے عربی زبان میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ تحریر و تقریر کی صلاحیت بخشی تھی ۔ آپ نے علومِ عربیہ کی تکمیل تو پہلے ہی کر لی تھی پھر دو سالہ قیامِ حرمین کے باعث آپ کو اہلِ زبان سے بالمشافہ گفتگو اور حجاز کے علمی

---

۱ ۔ فارسی تصانیف میں سے الفوزالکبیر اور الجزء اللطیف کے عرابی تراجم بھی طبع ہوچکے ہیں اور بعض روایات کے مطابق یہ تراجم خود شاہ صاحب کے کیے ہوئے ہیں ۔

۲ ۔ ایضاً ۔

۳ ۔ مفصل دیکھیے نزهة الخواطر ۶ : ۴۰۷ ببعد ، مقدمة المسوی ، ص ۶ ، شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص ۲۳۷ ، حدائق الحنفیة ، ص ۴۴۸ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۳۴۵ ، ڈاکٹر زبید احمد ص ۵۱۶ ، ابجد العلوم ، ص ۹۱۰ ۔

۴ ۔ نزهة الخواطر ۶ : ۴۰۱ ۔

۵ ۔ فیوض الحرمین مشہد ۴۰ ، الدرالثمین فی مبشرات النبی الامین حدیث سادس ، ص ۴ طبع دہلی ، نزهة الخواطر ۶ : ۴۰۳ ۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیم ، ص ۴ ببعد ۔

حلقوں میں شمولیت کا موقع ملا اس لیے عربی زبان میں تقریر کے ساتھ تحریر کا پختہ ملکہ پیدا ہو گیا اور جب آپ نے اسلامی علوم پر قلم اٹھایا تو بے تکان لکھتے چلے گئے اور اسرارِ شریعت و رموزِ دین کو عیاں کرتے گئے - یہی وجہ ہے کہ آپ کی مؤلفاتِ عربیہ جس طرح برِّ صغیر میں مقبول ہیں، اسی طرح بلادِ عرب میں بھی مقبول ہیں اور ان کے مصر و بیروت سے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں[1]-

برِّ صغیر پاکستان و ہند کے اکثر عربی داں علماء کے ذہنوں پر مقاماتِ بدیع الزمان ہمدانی اور حریری کا بوجھل اور اکتا دینے والا اسلوبِ نثرنگاری مسلط رہا مگر شاہ ولی اللہ نے سجع و قافیہ کے طلسم کو توڑ کر ایک خاص اسلوبِ نگارش اختیار کیا جس میں وسعت و سہولت کے ساتھ ساتھ فصاحت و بلاغت اور پختگی اور رونق بھی موجود ہے - آپ کی عربی نثر اور نظم میں ابداع و اصلیت پائی جاتی ہے اور نقل و تقلید کے نشانات شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں :

> "عربی زبان میں انہوں نے جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں ایک خاص قسم کی انشاء کی، جو ان کا مخصوص اسلوب ہے، پوری پابندی کی ہے، شاہ صاحب پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اپنی عبارتوں میں زیادہ تر جوامع الکلم النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ گفتگو کی پیروی کی - حتی الوسع وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدعا کا اظہار انہی لغات اور انہی محاوروں میں کریں جو لسانِ نبوت اور زبانِ رسالت سے خاص تعلق رکھتے ہیں"[2]- "شاہ صاحب کی تصانیف کے ہزاروں صفحے پڑھ جائیے آپ کو یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ یہ بارھویں صدی ہجری (اٹھارویں صدی عیسوی) کے پرآشوب زمانہ کی پیداوار ہے، جب ہرچیز بے اطمینانی اور بدامنی کی نذر تھی - صرف یہ معلوم ہوگا کہ فضل و علم کا ایک دریا ہے جو کسی شور و غل کے بغیر سکون و آرام کےساتھ بہہ رہا ہے، جو زمان و مکان کے خس و خاشاک کی گندگی سے پاک و صاف ہے"[3]-

شاہ صاحب کا ممتاز علمی کارنامہ ان کی معرکۃ الآراء تصنیف 'حجۃاللہ البالغۃ' ہے، جس کے کئی ایڈیشن اور اردو تراجم بلادِ عرب و پاک و ہند میں چھپ چکے ہیں - آپ نے اس

---

۱ - شاہ ولی اللہ کی تعلیم، ص ۳۳۵، نزہۃ الخواطر ۶ : ۴۰۱، مقدمۃ المسوی من احادیث الموطأ، ص ۷ -

۲ - مقدمۃ حجۃ اللہ البالغۃ، ص ۹ -

۳ - ایضاً -

کتاب میں شریعت اسلامی کی حکمت و فلسفہ ، اغراض و مقاصد اور اسرار و رموز کو جس طرح واضح کیا ہے اس کی مثال علوم اسلامیہ کی تدوین کی تاریخ میں ملنا مشکل ہے ۔ اصول و فروع ، مقدمات و مبادی اور مقاصد و نتائج کے استنتاج و استخراج پر جس شرح صدر اور سوز و اخلاص کے ساتھ آپ نے کلام کیا ہے اس کا اعتراف تمام دیار و ادوار کے علماء نے کیا ہے اور انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے[1]۔ شاہ صاحب سے پہلے زمانوں کے علماء کی تصانیف میں اسرار دینی کے بارے میں کہیں کہیں اشارات ملتے ہیں جیسے الغزالی کی 'احیاء علوم الدین'، شیخ عزالدین عبدالسلام المقدسی کی 'القواعد الکبریٰ' اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی 'الفتوحات المکیة' لیکن جامعیت و وسعت میں 'حجة اللہ البالغہ' اپنی مثال آپ ہے"[2]۔

یوں تو حضرت شاہ ولی اللہ رحمة اللہ علیہ کی جملہ تصانیف ایک خاص مقصد رکھتی ہیں اور ایک خاص پیغام دینے کی غرض سے لکھی گئی ہیں، کیونکہ شاہ صاحب ان علماء میں سے نہیں تھے جو محض علمی خدمت کے جذبے کی تسکین کی خاطر تصنیف و تالیف میں دل لگاتے ہیں بلکہ ان کے پاس تو ایک عظیم دل تھا جو امت مسلمہ کے زوال اور اسلام کے ثقافتی و معاشرتی نظام کی بربادی پر خون کے آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں قلبی بصیرت بھی عطا ہوئی تھی جو نور ربانی کی روشنی میں مستقبل کی راہیں متعین کر سکتی ہے ۔ اس لیے شاہ صاحب نے خون کے آنسو بہانے پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ وہ ایک پیغام لے کر آگے بڑھے ، امت کے سامنے ایک اصلاحی منصوبہ پیش کیا اور اسلامی معاشرہ میں صحیح اسلامی ثقافتی نظام نافذ کرنے کے لیے واضح پروگرام مرتب کیا ۔'حجة اللہ البالغة' میں یہی منصوبہ اور یہی پروگرام ہے، شاہ صاحب نے اس کتاب میں تعلیمات اسلامی کے ہر پہلو کو لیا اور ان کے اسرار و رموز کو اجاگر کیا اور مہد سے لے کر لحد تک انسانی معاشرے کو جو ضروریات پیش آ سکتی ہیں ان کے لیے ایک خیال افروز اور جاندار ضابطہ مرتب کیا ، جس کی افادیت اور ضرورت کا ہر دور اور خطے کے علمائے اسلام نے اعتراف کیا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ برِ صغیر کی امت مسلمہ اگر کسی اور اہل علم و فضل کو جنم نہ دیتی تو صرف شاہ صاحب کی قابل فخر شخصیت ہی کافی تھی اور شاہ صاحب اگر اور کتابیں لکھ کر امت پر احسان نہ بھی کرتے تو 'حجة اللہ البالغة' ان کا ایسا عظیم الشان احسان ہے جسے ملت اسلامیہ کبھی فراموش نہیں کر سکتی ۔

'حجة اللہ البالغة' کے دیباچے میں علم اسرار دین کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے

---

۱ ۔ نزهة الخواطر ۶ : ۴۰۲ ۔ مقدمة المسوی من احادیث الموطأ ، ص ۷ ۔

۲ ۔ نزهة الخواطر ۶ : ۴۰۲ ۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں :

"میرے نزدیک تمام فنونِ حدیث میں سب سے زیادہ دقیق اور سب کی جڑ اور اصل اور سب سے بلند و برتر اور تمام علومِ شرعیہ سے بہتر اور منزلت میں اعلیٰ و افضل اور قدر و قیمت میں سب سے بڑھ کر علم اسرارِ دین ہے ، جس میں احکام کی حکمت اور ان کی لِم* اور خواصِ اعمال کے اسرار و نکات بیان ہوتے ہیں ۔ بخدا یہ وہ علم ہے کہ جس کو خدا نصیب کرے وہ فرض عبادات سے فراغت کے بعد اپنے تمام عزیز اوقات اسی میں صرف کرے اور اس کو اپنا توشۂ آخرت بنا لے"[1]۔

یہ بلند پایہ تصنیف شیخ محمد عاشق کی تحریک پر وجود میں آئی جس میں شاہ صاحب کا مقصد یہ تھا کہ اس سے مبتدی و منتہی اور حاضر و غائب سب کو یکساں فائدہ پہنچے[2]۔ شاہ صاحب کی یہ کتاب اگرچہ اسلامی علم الکلام کے لیے مختص نہیں لیکن اگر علم الکلام دین اسلام کی عقلی توجیہ و تشریح کا نام ہے تو پھر شاہ صاحب تمام متقدمین علمائے علم الکلام پر سبقت لے گئے ہیں۔ کیونکہ متقدمین نے صرف عقائد کی توجیہ کی مگر انہوں نے عقائد و اعمال دونوں کے اسرار بیان کئے[3]۔ علم الکلام اور علم العقائد عموماً اجزائے ایمان کی تفسیر و تشریح تک محدود رہے ۔ مگر شاہ صاحب نے جہاں ان عقائد و احکام کی تشریح کی ہے وہاں ارکانِ اسلام اور دیگر دینی اعمال و معاملات کی حکمت اور اسرار و رموز بیان کیے ہیں ۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ وضو کی حکمت و مصلحت یہ ہے کہ انسان کو جہاں قلبی تسکین و بشاشت ہوتی ہیں وہاں انسانی فطرت کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے ۔ دنیا کے تمام انسان خاص مواقع پر اور خاص اشخاص سے ملنے کے لیے اپنے اعضاء (مثلاً ہاتھ منہ وغیرہ) کو پاک و صاف کرنا ضروری معمول سمجھتے ہیں اور مسلمان جب اللہ کے حضور میں آتا ہے تو وہ بھی ان مکشوف اعضاء کو پاک کرتا ہے ۔ غسل کی حکمت یہ ہے کہ بعض حالتوں میں انسان کا نفس بہیمی لذتوں میں مستغرق ہو جاتا ہے ، لہذا اسے متنبہ کرنے کے لیے پانی جیسی پاک شفاف چیز سے غسل کر کے اسے خبردار کرنے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے[4]۔

نماز میں انسان کو خشوع و خضوع کے ساتھ خدا کی تعظیم و مناجات کا موقع ملتا ہے جو اللہ کے حضور کا شرف حاصل کرنے اور اپنے آپ کو قیامت میں دیدارِ الٰہی کے

---

۱ ۔ حجۃ اللہ البالغہ ۱ : ۱۸ ۔

۲ ۔ ایضاً ، ص ۲۰ ۔

۳ ۔ ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۱۲۱ ۔

۴ ۔ حجۃ اللہ البالغہ ۱ : ۱۳۵ ۔

قابل بناتا ہے ۔ زکوٰۃ بخل ایسی کمینہ عادت کا علاج اور حاجتمند کی حاجت برآری کا ذریعہ ہے ۔ روزے سے خواہشاتِ نفسانی کو مغلوب کرنے کا موقع ملتا ہے اور حج میں مساوات اور شعائر اللہ کی تعظیم و تقدیس مقصود ہے[1] ۔

کتاب دو حصوں (اقسام) پر مشتمل ہے ۔ قسم اول میں سات مباحث اور ایک تتمہ ہے ۔ مبحث اول میں تکلیف (یعنی مسئولیت ، ذمہ دار اور جوابدہ قرار دیا جانا) اور انسانی اعمال کی جزا و سزا سے مفصّل بحث کی گئی ہے ۔ مبحث ثانی میں جزا و سزا کی حقیقت و کیفیت سے بحث ہے ۔ مبحث ثالث میں ان تدابیرِ نافعہ کا بیان ہے جو انسان کی دنیاوی زندگی میں کامیابی و سکون اور اخروی زندگی میں فلاح و نجات کا وسیلہ ہیں ۔ مبحث رابع میں سعادت (یعنی خوش بختی اور کامیابی) ، مبحث خامس میں نیکی و بدی کی ماہیت ، مبحث سادس میں سیاست ملیہ (یا دینی حکمتِ عملی) اور مبحث سابع میں حدیث نبوی ؐ سے شرعی احکام کے استنباط و استخراج کے طریقے کا بیان ہے ۔ حصّہ اول کا تتمہ یا خاتمہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں صحابہ کرام رض و تابعین کے فروعی اختلافات ، فقہی مذاہب و مسالک اور اہلِ حدیث و اہل الرأی کے درمیان تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کے علاوہ اجتہاد و تقلید پر بھی مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی گئی ہے ۔

قسم ثانی شریعتِ محمدی ؐ یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے اسرار و رموز کا بیان ہے اور عباداتِ و معاملات کی حکیمانہ تشریح ہے ۔ اس حصے میں جہاں دین کے اسرار و رموز اور شریعتِ اسلامی کی حکمت کو واضح کیا گیا ہے ، وہاں مختلف فقہی ابواب مثلاً طہارت ، نماز، زکوٰۃ ، روزہ ، حج ، نکاح ، طلاق ، وراثت ، جہاد ، آدابِ معاشرت اور دنیاوی معاملات کے اہم مسائل سے بحث بھی کی گئی ہے ۔ اس حصے میں دو اہم باتیں خصوصی تذکرہ کی مستحق ہیں، ایک شاہ صاحب کا نظریہ[2] احسان جو اگرچہ اسلامی آداب و اخلاق میں اہم رکن کی حیثیت سے مذکور و موجود تھا مگر وقت کی ضرورت کے پیشِ نظر اور اپنی خدا داد فکری قوت و صلاحیت کی بنیاد پر شاہ صاحب نے اس میں نئی روح ڈال دی ہے ۔ دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مختلف ابواب و موضوعات کے ضمن میں وارد ہونےوالی احادیث کی حکیمانہ تشریح اور ان میں تطبیق کی فاضلانہ کوشش ہے[3] ۔

---

۱ ۔ حجۃ اللہ البالغہ ۱ : ۳ ، ۵٦ ببعد مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۲ھ ۔

۲ ۔ حجۃ اللہ البالغہ ، ۲ : ۵۰ ببعد ، ٦۱ ببعد مطبوعہ قاھرہ ۱۳۲۲ھ

۳ ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ڈاکٹر زبید احمد، ص ۱۲۰ ببعد ، آب کوثر، ص ۳۰۸ ببعد ، رود کوثر، ص ۵٦۷ ببعد ۔

شاہ صاحب کی دوسری معرکۃ الآراء تصنیف 'موطاء' امام مالک کی شرح 'المسوی' ہے ، ان کے نزدیک امام مالک تمام محدثین پر فضیلت اور فوقیت رکھتے ہیں کیونکہ وہ واحد محدث تبع تابعین ہیں جن کی تصنیف ہم تک پہنچی ہے - باقی کتب حدیث 'موطأ' کا تتمہ ہیں[1] - 'موطأ' کی فارسی 'شرح المصفی' اگرچہ عربی شرح کے مقابلے میں مختصر ہے لیکن اس کا مقدمہ بڑی اہمیت رکھتا ہے جس میں شاہ صاحب نے 'موطأ' کی اہمیت اور امام مالک کی فضیلت پر مدلّل بحث کی ہے -

'المسوی' میں شاہ صاحب نے ہر باب کی احادیث کو سہولت کے لیے نئی ترتیب سے درج کر کے ہر ایک حدیث پر عالمانہ شرح و بسط سے بحث کی اور دیگر علماء کے اقوال ذکر کیے ہیں اور شافعی اور حنفی فقہاء کی آراء کو جامعیت و اختصار کے ساتھ پیش کر دیا ہے[2] -

''الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، شاہ صاحب کی ایک اہم تصنیف ہے جس میں انہوں نے فقہی فروعات میں عہد صحابہؓ و تابعین سے لے کر بعد کے زمانوں تک کے علماء کے اختلاف کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور مختلف فقہی مدارس کا تعارف کرایا[3] ہے- ان کے نزدیک اختلاف کے تین سبب ہیں - ایک تو یہ ہے کہ تمام صحابہؓ ہر وقت آپ کے ساتھ نہیں تھے بلکہ بعض وقت ایک صحابی نے جو بات دیکھی یا سنی اسے دوسرے نہ دیکھ سکے - اس لیے جب عہد تابعین میں صحابہؓ سے کسی مسئلے کے بارے میں سوال کیا گیا تو اپنے اپنے علم کے مطابق ہر ایک نے جواب دیا - دوسرا سبب احادیث کے معنی و مفہوم اور تشریح میں اختلاف ہے اور تیسری وجہ راوی حدیث کا ضعف حافظہ ہے[4] -

شاہ صاحب کی کتاب 'البدور البازغۃ' بعض نازک دینی مسائل سے بحث کرتی ہے جو ایک تمہید اور تین مقالات پر مشتمل ہے اور مختلف فصول میں منقسم ہے - ''یہ وہ 'تفہیمات الٰہیہ' ہیں جن کا اللہ کی عنایت سے ان کے دل پر فیضان ہوا اور پھر وہ زبان اور قلم کے ذریعہ ظہور پذیر ہوئیں''[5] - مقالہ اولی میں بنی آدم میں ہدایت و قیادت کے لیے فطری صلاحیت ، مقالہ ثانی میں ان اسباب کا ذکر جن کے ذریعہ

---

۱ - مقدمۃ المسوی ، ص ۱ : ۱۲ ببعد-
۲ - ڈاکٹر زبید احمد، ص ۴۴ ببعد ، مقدمۃ المسوی ۱ : ۱۲
۳ - الانصاف، ص ۴ ، ۱۹، ۳۱ ، ۵۷ ، ۸۰ -
۴ - ڈاکٹر زبید احمد، ص ۹۴ -
۵ - البدور البازغۃ، ص ۹ -

انسانیت کی رہنمائی ہوتی ہے اور مقالہ ثالث میں مختلف مذاہب و شرائع سے بحث ہے[۱]۔

'عقد الجید فی احکام الاجتہاد و التقلید' بھی ایک نہایت ہی اہم رسالہ ہے جو اجتہاد و تقلید کے متعلق ان اہم مسائل پر لکھا گیا ہے جو شاہ صاحب سے بعض لوگوں نے دریافت کیے تھے[۲]۔ یہ چار ابواب اور کئی فصول اور مسائل پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں شاہ صاحب نے اصولِ فقہ، اجتہاد کی شرائط اور مسائل اور تقلید کی حیثیت پر بڑے معتدل اور مدلّل انداز میں بحث کی ہے[۳]۔

'الفوز الکبیر' (جو اصل میں فارسی میں ہے مگر کسی مصری عالم نے اسے عربی کے قالب میں ڈھال دیا ہے) ایک نہایت اہم اور قیمتی کتاب ہے جس میں علمِ اصولِ تفسیر پر بڑے عالمانہ اور محققانہ انداز میں مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے جس کا پانچواں باب (فتح الخبیر) ایک مستقل رسالہ ہے جو غریب القرآن کے ان الفاظ پر مشتمل ہے جو حضرت ابنِ عباس سے منقول ہیں اور مختلف کتبِ حدیث میں مذکور ہیں[۴]۔ شاہ صاحب نے 'علومِ قرآن' کو پانچ اصناف قرار دیا ہے یعنی الاحکام، المخاصمة، التذکیر بآلاء الله التذکیر بایام الله اور التذکیر بالموت و مابعدالموت۔ شاہ صاحب نے اس کتاب میں ناسخ و منسوخ، شانِ نزول، متشابہات اور اسلوبِ قرآن پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ان اعتراضات کا بھی جواب دیا ہے جو مخالفین کی طرف سے 'قرآن' کے لفظی اسلوب اور معنی پر وارد کیے جاتے[۵] ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے عربی و فارسی میں الگ الگ کتب تصنیف کی ہیں مگر 'ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء' عربی و فارسی کا مرقع ہے۔ تمہید اور آغاز فارسی میں ہے مگر کہیں کہیں عربیت جوش میں آتی ہے تو قلم چل نکلتا ہے اور وہ خلفاء راشدین کی خلافت کی ترتیب کو برحق ثابت کرتے اور شیعہ سنی اختلاف کے سلسلے کی تمام غلط فہمیوں کو رفع کرتے جاتے ہیں۔ یہ کتاب بلاشبہ مسئلہ خلافت کے سلسلے میں اعتدال کی راہ دکھاتی ہے اور تمام شکوک و شبہات کو رفع کر دیتی ہے[۶]۔

حضرت شاہ صاحب کے اصلاحی کارناموں کی فہرست بھی بڑی طویل ہے، آپ کو

---

۱ - البدور البازغة، ص ۲۷، ۹۶، ۱۸۰ -

۲ - عقد الجید، ص ۶-

۳ - ڈاکٹر زبید احمد، ص ۳۶ ببعد -

۴ - فتح الخبیر، ص ۲، ڈاکٹر زبید احمد، ص ۲۲ ببعد -

۵ - مفصل دیکھیے شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، ص ۹۴ ببعد - ڈاکٹر زبید احمد، ص ۳۲ ببعد، رود کوثر، ص ۵۵۴ -

۶ - رود کوثر، ص ۵۷۵ ببعد -

یہ یقین تھا کہ ہند کی روبہ زوال ملّتِ اسلامیہ جن خطرات میں گھری ہوئی ہے ان کا مقابلہ آسان نہیں اور مغلیہ سلطنت کے مردے میں نئی روح پھونکنا بھی شاید ممکن نہ ہوگا۔ اس لیے ملت کے سیاسی احیاء کے لیے ایک طرف تو آپ نے نجیب الدولہ سے امید وابستہ کی اور اسلام کے دفاع کے لیے انہیں ترغیب دلائی اور دوسری طرف احمد شاہ ابدالی کو فتنہ پردازوں کی سرکوبی کی دعوت دی، اور شاہ صاحب کی ان کوششوں کے نتیجے میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو عبرت ناک شکست ہوئی[1]۔

سر زمینِ پاک و ہند میں جو لوگ ہرات وغیرہ کی طرف سے اسلام کے علمبردار بن کر آئے ان میں فقہی تشدّد اور سنیت کا رنگ غالب تھا مگر ایران سے آنے والے تصوّف کے ساتھ تشیع کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ دورِ زوال میں شیعوں اور سنیوں کا اختلاف ہولناک شدت اختیار کر گیا تھا۔ شاہ صاحب نے اس کی اصلاح کی خاطر 'ازالۃ الخفاء' لکھی جس سے اگر شیعوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا ہے تو اس کے ساتھ غالی سنیوں کے تشدّد میں بھی کمی آجاتی ہے۔ شاہ صاحب نے فضیلت شیخین (ابوبکرؓ و عمرؓ) کے ساتھ فضائلِ علی کرم اللہ وجہہ بھی خوب کھول کر بیان کیے ہیں[2]۔

شاہ صاحب کی دور رس نگاہوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ ملّتِ اسلامیہ کے اختلاف کو ختم کرنے کی صورت یہی ہے کہ اسرائیلیات و ضعیف روایات کو ترک کر کے کتاب اللہ اور سنت نبویؐ کے فہم و ادراک اور ان پر عمل کرنے پر زور دیا جائے[3]۔ چنانچہ اس کے لیے آپ نے قرآن فہمی کو عام و آسان کرنے کے علاوہ علمِ حدیث کے احیاء پر توجہ صرف کی۔ قرآن کریم کا فارسی ترجمہ 'فتح الرحمٰن' کے نام سے کیا اور اصولِ تفسیر پر 'الفوزالکبیر' اور 'قرآن' کے مشکل اور غریب الفاظ پر 'فتح الخبیر' تصنیف کی۔ شاہ صاحب کے نزدیک 'قرآن' ہی وہ کتاب ہے جو امّت کی وحدت اور وقت کے تقاضے کو پورا کرتا ہے۔ اس لیے آپ نے قرآن فہمی کے لیے ضروری مقدمات کے بعد کسی تفسیر کی مدد کے بغیر 'قرآن' پڑھانے پر زور دیا ہے۔ شاہ صاحب کو 'قرآن' پر اس قدر عبور تھا کہ آپ نماز کے متعلق تمام احادیث کو 'قرآن' سے مستنبط کر سکتے تھے[4]۔ علومِ 'قرآن' کو آپ نے پانچ اصناف میں تقسیم کیا ہے[5] اور مخالفین کی

۱۔ رود کوثر، ص ۳۳۶ ببعد مطبوعہ تاج آفس کراچی۔

۲۔ مفصل دیکھیے۔ فیوض الحرمین مشاہدہ ۲۲، رود کوثر، ص ۳۲۸، تذکرہ شاہ ولی اللہ دہلوی، ص

۳۔ حجۃ اللہ البالغۃ ۱: ۱۲۵ ببعد مطبوعہ مصر ۱۳۲۲ھ۔

۴۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیم، ص ۱۰، ۱۲، ۲۳، ۴۵، رود کوثر ۳۴۵ ببعد

۵۔ الفوز الکبیر، ص ۴، حجۃ اللہ البالغۃ ۱: ۵۵ ببعد۔

طرف سے 'قرآن' کے اسلوب و معانی پر وارد کردہ اعتراضات کے جوابات دینے کے علاوہ دیگر قرآنی مسائل مثلاً ناسخ و منسوخ اور شانِ نزول وغیرہ سے بھی بحث کی ہے[1]۔

سنتِ نبوی پر عمل پیرا ہونے کے لیے آپ نے علمِ حدیث کا احیاء ضروری سمجھا اور زیارتِ حرمین سے واپسی پر دہلی میں برِّ صغیر کا سب سے پہلا دارالحدیث قائم کیا اور اسی سعیٔ مشکور نے انہیں اپنے عہد کا امام المحدّثین بنا دیا[2]۔ شاہ صاحب کے نزدیک امام مالک کو تمام محدّثین پر تقدم و فضیلت حاصل ہے۔ آپ نے برِّ صغیر کے فقہ و معقولات کے دلدادہ علماء کو جہاں درسِ حدیث کی دعوت دی وہاں احادیثِ صحیحہ کی درجہ بندی کر کے مسائل کے استنباط میں آسانی پیدا کر دی[3]۔

فقہ کے میدان میں شاہ صاحب نے جو اصلاحی کارنامہ انجام دیا اس کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ آپ نے اجتہاد کو ہر دور میں فرضِ کفایہ قرار دیا اور جامد اور اندھی تقلید کے قائل فقہاء کی شدید مذمت کی[4]۔ دوسراً پہلو یہ ہے کہ آپ نے مختلف فقہی مسالک اور آراء میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کا خیال تھا کہ چونکہ شافعی اور حنفی فقہ کو قبولِ عام کا درجہ حاصل ہو چکا ہے، اس لیے انہیں باہم ضم کر کے ایک مسلک بنا دیا جانا چاہیے[5]۔

شاہ صاحب کے عہد میں فقہاء، معقولین اور بدعتی زاہدوں کے علاوہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے جھگڑے نے بھی فضا کو مکدّر کر رکھا تھا۔ چنانچہ آپ نے اسلامی تصوّف کو اصلی اور مستند رنگ روپ دینے کے لیے شریعت و طریقت میں تطبیق پیدا کی اور ظاہریین فقہاء اور صوفیاء میں صلح کرانے کے علاوہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے درمیان بھی مطابقت پیدا کی اور بتایا کہ ان کا اختلاف لفظی ہے حقیقت میں مجدد الف ثانیؒ کا نظریہ وحدت الشہود ابن العربی کے وحدت الوجود میں خود موجود ہے[6]۔ شاہ صاحب نے متشدّد فقہاء، بدعتی صوفیاء اور عیش پسند حکمرانوں پر بھی تنقید کی اور بتایا ہے کہ جس طرح دین کا ایک ظاہر ہے اسی طرح اس کا ایک باطن ہے

۱۔ مفصل دیکھیے الفوز الکبیر، ص ۳۷ ببعد، شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، ص ۲۷ ببعد۔
۲۔ الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، ص ۱۳۹۔
۳۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیم، ص ۱۵ ببعد، شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، ص ۱۰۹ ببعد، رود کوثر، ص ۳۵۱۔
۴۔ الانصاف، ص ۹۳، حجۃ اللہ البالغۃ ۱: ۱۵۳ ببعد۔ المصفیٰ، ص ۱۱، التفہیمات الالٰہیۃ ۱: ۱۵۱، ۲۰۹ ببعد، رود کوثر، ص ۳۵۲، ۳۸۱ ببعد۔
۵۔ ایضاً۔
۶۔ مفصل دیکھیے فیوض الحرمین مشاہدہ اول، شاہ ولی اللہ کی تعلیم، ص ۱۴، شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، ص ۲۰۹ ببعد۔

جس کا نام 'تصوف' یا 'معرفت و طریقت' ہے اور جسے احسان سے تعبیر کیا جاتا ہے[1] ۔

شاہ صاحب نے اسلامی معاشرے کی اصلاح کے لیے فلسفۂ اجتماعیت پر بھی کلام کیا ہے اور انسانی معاشرے کے مختلف مدارج کو ارتفاقات سے تعبیر کیا ہے ، جن کی تعداد چار ہے ۔ ارتفاق اول خاندان ہے جس کا ایک سربراہ ہوتا ہے ۔ یہ ارتفاق جماعتی زندگی اور انسانی معاشرے کا سنگ بنیاد ہے[2] ۔ ارتفاقِ ثانی میں ارتفاقِ اوّل کے تجربات کو پرکھا جاتا ہے اور ان میں ترمیم و تغیّر کیا جاتا ہے ۔ ارتفاق سوم سیاستِ مدن اور چہارم مختلف اقوام کے باہمی روابط سے بحث کرتا ہے[3] ۔ انسان میں چونکہ رفاہ عامہ کے تخیّل اور شوقِ زینت کے علاوہ ایجاد و تقلید کا مادہ بھی ہے اس لیے وہ گزشتہ لوگوں کے تجربات سے فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے اور ان کی روشنی میں ایجاد کر کے آگے بھی بڑھ سکتا ہے[4] ۔

شاہ صاحب کے نزدیک رسول اللہ ؐ کی ذات امت کے لیے اسوۂ حسنہ اور کامل نمونہ ہے اور آپ کی خلافت یا جانشینی امت کو منتقل ہوئی ہے مگر تقسیم ہو کر ۔ خلافت ظاہری تو اصحاب سیف و حکومت کو منتقل ہوئی لیکن باطنی خلافت جماعت علماء کو ملی ، جس کا فرض اصلاح امت ، دفاعِ اسلام اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے[5] ۔ آپ کا منصب چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت باطنی تھا اس لیے اپنے فرائضِ منصبی کی تکمیل کے لیے خود عمر بھر کمربستہ رہے اور اہلِ حق علماء کی ایک جماعت تیار کی جو ان حلقہ ہائے فیوض سے نکل کر ملت اسلامیہ کی مسلسل خدمت انجام دیتی رہی ہے ۔ اس جماعت میں آپ کے اپنے افرادِ خاندان بھی تھے جیسے شاہ عبدالعزیز شاہ رفیع الدین ، شاہ عبدالقادر ، شاہ عبدالغنی ، شاہ عبدالحیؒ اور شاہ اسماعیل شہید ۔ ان کے علاوہ آپ کے حلقۂ اثر سے فیضیاب ہونے والے علماء بھی شامل تھے۔ جیسے قاضی ثناء اللہ پانی پتی، محمد عاشق ، خواجہ محمد امین ، خیر الدین سورتی ، رفیع الدین مراد آبادی ، محمد فاخر الہ آبادی، شاہ محمد اسحاق دہلوی، سید نذیر حسین دہلوی اور عبداللہ غزنوی وغیرہ[6] ۔

---

۱ ۔ فیوض الحرمین مشاہدہ ۲۱ ، شاہ ولی اللہ کی تعلیم ، ص ۱۱۰ ، ۱۳۱ ۔

۲ ۔ حجۃ اللہ البالغۃ ۱ : ۳۹ ، البدور البازغۃ ، ص ۹۳ ۔

۳ ۔ مفصل دیکھیے ، شاہ ولی اللہ کی تعلیم ، ص ۲۳۰ ۔

۴ ۔ ایضاً ۔

۵ ۔ فیوض الحرمین ، ص ۲۳۷ ببعد ، رود کوثر ، ص ۱۴۳ ببعد ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۵۲۳ ۔ نزہۃ الخواطر ۶ : ۳۹۸ ببعد ۔

۶ ۔ ان بزرگوں کے تراجم تاریخی ترتیب کے مطابق آگے آتے ہیں ۔

محمد اسحاق خان دہلوی

حکیم محمد اسحاق خان بن اسماعیل خان دہلوی برّ صغیر میں بارھویں صدی ہجری (اٹھارھویں صدی عیسوی) کے ان نامور اطباء میں سے تھے جنہوں نے شیخ ابو علی سینا کی کتاب 'القانون' کی بہترین شروح لکھیں۔ حکیم اسحاق خان نے یہ شرح ۱۷۶۸ء/۱۱۸۲ھ میں تحریر کی اور کتاب کے صرف اس حصے کی شرح لکھی ہے جو بخار کی اقسام سے متعلق ہے اسی لیے کتاب کا نام 'غایة المفہوم فی تدبیر المحموم' رکھا گیا[1]۔ ان کی دوسری طبّی تصنیف 'موارد الحکم فی علاج الامراض من الرأس والقدم' ہے۔

'غایة المفہوم' کی تصنیف کے دوران میں حکیم اسحاق خان نے حکیم علی جیلانی کی 'شرح القانون' سے استفادہ کیا اور شیخ کے معترضین کے جوابات بھی دیے ہیں[2]۔

حکیم اسحاق خان نے اپنی شرح کے مقدمے میں شدّت بخار کی کیفیت و اسباب سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ 'القانون' کے اس حصے کی شرح کے سلسلے میں انہوں نے علاءالدین علی بن الحزم القرشی المتوفی ۱۲۸۸ء/۶۸۷ھ کی 'شرح کلیات ابن سینا' اور حکیم علی الجیلانی کی 'شرح القانون' سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔ اول الذکر نے شیخ رئیس پر جو اعتراضات کیے تھے مؤخر الذکر نے ان کا جواب دیا ہے۔ لیکن حکیم علی جیلانی کی عبارات و ابحاث بڑی طویل تھیں چنانچہ حکیم اسحاق خان نے ان کا نچوڑ اپنی شرح میں پیش کر دیا ہے۔

ان کی وفات ۱۷۶۸ء/۱۱۸۲ھ میں ہوئی۔

محمد علی حزین اصفہانی

شیخ محمد علی حزین ۱۶۹۱ء/۱۱۰۳ھ میں اصفہان میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب شیخ زاہدگیلانی (جو شیخ صفی الدین اردبیلی جدّ سلاطین صفویہ ایران کے مرشد تھے) سے جا ملتا ہے۔ نادر شاہ کے تسلط کے زمانے میں ہجرت کر کے برّ صغیر میں آ گئے اور ۱۷۳۴ء/۱۱۴۷ھ میں ٹھٹھہ پہنچے۔ مولانا آزاد بلگرامی سے بھکر میں ملاقات ہوئی اور حزیں نے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی اپنی بعض غزلیں آزاد کو تحفةً پیش کیں[3]۔

شیخ ملتان و لاہور سے ہوتے ہوئے دہلی پہنچے جہاں چودہ سال قیام رہا پھر ۱۷۴۷ء/۱۱۶۱ھ میں اکبر آباد، بنارس اور پٹنہ کی سیاحت کو نکلے اور ۱۷۶۶ء/

۱۔ ڈاکٹر زبید احمد، ص ۱۶۴، ۲۲۰۔
۲۔ ایضاً، ص ۱۶۳، ۱۶۴۔
۳۔ خزانۂ عامرہ، ص ۱۹۳، سرو آزاد، ص ۲۲۵، مقالات شبلی ۵ : ۱۳۳۔

۱۱۸۰ھ میں وفات پائی اور بنارس میں دفن ہوئے[1]۔

حزیں اگرچہ فارسی کے ایک عظیم شاعر تھے مگر وہ عربی ادب و شاعری پر گہری نظر رکھنے کے علاوہ عربی میں بہت اچھے شعر بھی کہتے تھے ۔ انہوں نے بہاء الدین عاملی کی فارسی غزل کی زمین میں عربی غزل کہی اور 'قصیدۃ لامیۃ العجم' کے جواب میں ایک عمدہ عربی قصیدہ لامیہ موزوں کیا ہے[2]۔ شیخ حزیں اصفہانی ''در علوم عقلی و نقلی پایۂ بلند و در شعر و شاعری مرتبہ ارجمند دارد ، زبان او از غایت صفا بآب زلال میاند و کلام او از نہایت آبداری نسب بسلک لآلی میرساند''[3]۔

حزیں کے عربی اشعار میں بھی اس کی فارسی شاعری کا اسلوب نمایاں نظر آتا ہے، وہ اگرچہ اپنے لامیہ میں شاعرانہ تعلّی سے کام لیتے ہوئے اور 'لامیۃ العجم' کو بھول جانے اور اپنے قصیدے کو اس کا نعم البدل سمجھنے کا مشورہ دیتا ہے مگر اس کی فارسی عربی دانی پر غالب ہونے کے باعث وہ اپنے پیشرو کی گرد راہ کو بھی نہیں پہنچ پاتا ۔ اس کے اشعار اور تراکیب میں عجمیّت بلکہ فارسیّت غالب نظر آتی ہے ، قصیدے کے چند شعر یہ ہیں :

وَلَیسَ عَنکَ سَوَادُ العَینِ مُنصَرِفاً
مَهمَا تُشَاهِدُ بِالتَّدعِیجِ وَ الکُحلِ

ترجمہ : تو خواہ سیاہ رنگ لگانے اور سرمہ ڈالنے کے ذریعہ کتنا ہی مشاہدہ کرے آنکھ کی پتلی تجھ سے دور نہیں ہوگی ۔

اِسمَع کَلاَمِی وَدَع لاَمِیَّۃً سَلَفَت
اَلشَّمسُ طَالِعَۃٌ تُغنِیکَ عَن زُحَلِ

ترجمہ : میری بات سن اور گزشتہ لامیہ کو چھوڑ ! کیوں کہ اب سورج طلوع ہوچکا ہے تجھے ستارہ زحل کی کیا حاجت !

---

۱ ۔ خزانۂ عامرہ ، ص ۲۰۰ ۔ سرو آزاد ، ص ۲۲۵ ۔
۲ ۔ خزانۂ عامرہ ، ص ۲۰۰ ، سرو آزاد ، ص ۲۲۵ ، نزهة الخواطر ۶ : ۳۲۳ ۔
۳ ۔ خزانۂ عامرہ ، ص ۱۹۳ ۔

فَوَ الَّذِی حَجَّتِ الزُّوَّارُ كَعْبَتَهُ

وَ كَمْ هُنَالِكَ مِنْ داعٍ وَ مُبْتَهِلٍ

ترجمه: مجھے اس ذات کی قسم جس کے کعبہ کا حاجی حج کرتے ہیں ، اور وہاں کتنے ہی دعا اور یاد خدا کرنے والے ہوں گے!

جرى مَجَارِىَ دَمْعِى حُبُّ حَضْرَتِهِ

وَ أَشْرَقَ الشَّوْقُ فِى صَدْرِى بِلاَ طَفَلٍ

ترجمه: (جواب قسم) آنجناب کی محبت میرے آنسوؤں کے بہنے کی جگہ رواں ہوئی اور تروتازگی کے بغیر میرے سینے میں جذبۂ شوق اٹھا۔

وَ كَمْ دَعَوْتُكَ يَا كَهْفِى وَ مُعْتَمَدِى

مستنصراً فَأْتِنِى بِالنَّصْرِ عَنْ عَجَلٍ

ترجمه: اور میں نے تجھے کتنی بار پکارا اے میری پناہ گاہ اور سہارے! مدد مانگتے ہوئے ، سوجلدی سے میری مدد کو آئیے۔

محمد صدیق لاہوری

شیخ محمد صدیق بن محمد حنیف حنفی لاہوری ١٧١٥ع/١١٢٨ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کابل سے ہجرت کر کے لاہور آئے تھے اور مسجد وزیر خان میں امامت کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم مولانا محمد عابد لاہوری سے حاصل کی۔ کتب درسیہ ملا حفیظ اللہ اور ملا ظہور اللہ وغیرہ سے پڑھیں۔ ١٧٥٦ع/١١٧٠ھ میں حج و زیارت حرمین کے دوران میں شیخ یحییٰ بن صالح مکی اور شیخ ابوالحسن سندھی سے حدیث کی سند لی۔ ان کی وفات ١٧٧٨ع/١١٩٣ھ میں ہوئی[1]۔

شیخ محمد صدیق لاہوری تفسیر و حدیث اور علوم فقہ میں کمال رکھتے تھے۔ ایک

١۔ حدائق الحنفیہ، ص ٤٥١ ببعد ، نزهة الخواطر ٦ : ٣٢٣ ، تذکرہ علمائے ہند، ص ٣٣٩۔

طویل مدت تک لاہور میں درس و تدریس اور افتاء کے فرائض انجام دیتے رہے،ان کی تصانیف کی فہرست کافی طویل ہے تاہم ان میں سے اہم یہ ہیں : 'سلک الدرر فی السیر' (یا مسلك الدرر لاکمل الرسل الاطهر)، 'مدارس الاسلام فی الکلام' ، 'شروط الایمان' ، 'القول الحق فی بیان ترك الشعر و الحلق' ، 'درء التعسف عن عصمة یوسف' ، 'جامع الطب الاحمدی هدم الطاغوت فی قصة هاروت و ماروت' ، 'ازالة الفسادات فی شرح مناقب السادات' 'مزیل الاحزان مدار السلام فی علم الکلام' ،'نور حدقة الثقلین فی تمثال النعلین' (نعلِ نبی ؐ کے بارے میں) ، 'شرح النفحات الباهرة فی جواز القول بالخمسة الطاهرة' ، (مسئلۂ پنجتن پاک کے بارے میں) اور 'تبییض الرق فی تبیین الحق' (شیخ عبدالحق محدث ؒ دہلوی کے بعض مسائل میں تساہل کے بارے میں ہے) ۔ افسوس یہ ہے کہ مولانا صدیق لاہوری کی یہ تمام تصانیف بظاہر ناپید ہیں، تاہم 'سلك الدرر لاکمل الرسل الاطهر' کے بارے میں فقیر محمد جہلمی کا قول ہے کہ سیرتِ نبوی ؐ کے موضوع پر یہ ایک مسجع و مقفیٰ کتاب ہے جس میں مصنف نے صنعتِ اہمال یعنی بے نقط اسلوبِ نگارش کے کمالات دکھائے ہیں اور فیضی کی 'سواطع الالہام' اور 'موارد الکلم' سے بہتر اور زیادہ قابلِ تعریف ہے[1]۔

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (۱۷۰۴ء - ۱۷۸۵ء/۱۱۱۶ھ - ۱۲۰۰ھ)

میر غلام علی آزاد بن سید محمد نوح بن سید فروز الحسینی بروز یکشنبہ ، ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ/۱۷۰۴ء بہ مقام بلگرام محلہ میدان پورہ میں پیدا ہوئے[2]۔ آپ کا سلسلۂ نسب امام زید شہید بن امام زین العابدین تک پہنچتا ہے[3] اور جیسا کہ انہوں نے خود صراحت سے لکھا ہے کہ ان کے آبا و اجداد کا اصل وطن واسط تھا[4]۔ مگر ہجرت کر کے سرزمینِ ہند میں وارد ہو گئے تھے اور بلگرام کے واسطی خانوادۂ سادات کے مورثِ اعلیٰ سید محمد صغری (م - ۶۴۵ھ/۱۲۴۷ء) کو بلگرام کی سرداری عطا ہوئی اور انہوں نے یہاں ۳۱ برس حکومت کی ، آزاد انہی کی اولاد میں سے تھے[5]۔ لیکن آزاد کے ایک معاصر شیخ

---

۱ - حدائق الحنفیة ص ۴۵۱ -

۲ - معجم المؤلفین ۷ : ۳۲ ، الاعلام ۵ : ۳۱۴ ، سبحة المرجان ، ص ۱۱۸ ، ماثر الکرام ، ص ۱۶۱ ، خزانہ عامرہ ، ص ۱۲۳ - ابجد العلوم ، ص ۹۲۰ ، اتحاف النبلاء ، ص ۳۳۰ - حدائق الحنفیہ ، ص ۴۵۴ - رحمان علی ، ص ۳۶۲ - ہدیة العارفین ۱ : ۷۷۰ ، شبلی ۵ : ۱۱۹ ، معارف دسمبر ۱۹۲۳ء نزہۃ ۶ : ۲۰۱ (سنة کو ستة پڑھا جائے) ،

۳ - حدائق ، ص ۴۵۴ -

۴ - سبحة المرجان ، ص ۱۱۸ -

۵ - شبلی ۵ : ۱۱۹ -

غلام حسین بلگرامی نے 'ماثرالکرام' کے جواب میں 'شرائف عثمانی' کے نام سے شیوخ بلگرام کی تاریخ لکھ کر یہ ثابت کیا کہ آزاد کا مولد و منشا بلگرام نہیں بلکہ 'سعدن' ہے، جہاں ان کے آبا و اجداد آ کر آباد ہو گئے تھے[1]۔

آزاد نے کتب درسیہ اس زمانے کے مشہور فاضل میر طفیل محمد بلگرامی (م - ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء) سے پڑھیں - عروض و قافیہ اور فنون ادب کی کتابیں اپنے ماموں سید محمد بن عبدالجلیل بلگرامی (م - ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء) سے پڑھیں[2] - ان کے نانا عبدالجلیل بلگرامی (م - ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء) سولہ برس کی سیروسیاحت اور ملازمت کے بعد جب بلگرام واپس آئے تو آزاد کی عمر اس وقت سترہ برس تھی - انہوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ان سے حدیث و سیرت نبوی کی سند کے علاوہ لغت اور عربی و فارسی شاعری میں بھی ان سے درس لیا[3]۔ ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء میں جب زیارت حرمین اور حج سے مشرف ہوئے تو مکہ میں شیخ عبدالوھاب بن احمد طنطاوی مصری شافعی[4] (م - ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء) سے حدیث کی سند حاصل کرنے کے علاوہ مدینہ میں شیخ محمد حیات سندھی ثم مدنی (م - ۱۱۶۳ھ/۱۷۵۰ء) سے صحاح ستہ کی سند لی[5] -

آزاد کو تصوف اور اوراد و وظائف سے بھی رغبت تھی - چنانچہ چشتی طریقۂ تصوف سے منسلک ہونے کے لیے سید العارفین لطف اللہ الحسینی الواسطی ثم بلگرامی (م - ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء) کی بیعت سے مشرف ہوئے[6]۔

زندگی میں انہوں نے تین سفر کیے۔ ایک سفر دہلی جس کے دوران میں اپنے نانا سے شرف ملاقات کے علاوہ تعلیم و تربیت کے زیور سے بھی آراستہ ہوئے۔ دوسرا سفر سندھ جس کا مقصد اپنے ماموں سید محمد بن عبدالجلیل سے ملاقات تھا - جو بادشاہ دہلی کی طرف سے سندھ کے میر بخشی اور وقائع نگار تھے اور سندھ کا ایک شہر سیوستان (یا سیستان) ان کا صدر مقام تھا۔ چنانچہ آزاد ۱۷۲۹ء/ ذوالحجہ ۱۱۴۲ھ کو بلگرام سے چلے اور ۱۷۳۰ء/ربیع الاول ۱۱۴۳ھ سیوستان پہنچے - راستے میں دلی، لاہور، ملتان اور اچ وغیرہ کو دیکھا اور لاہور میں ۲۹ محرم ۱۷۳۰ء/۱۱۴۳ھ کو شاہ آفرین لاہوری سے ملاقات ہوئی[7]۔ سیوستان میں چار

---

۱ - مآثر الکرام، ص ۵۰ - ۳ - معارف دسمبر ۱۹۲۳ -
۲ - سبحۃ المرجان، ص ۱۱۸، نزھۃ الخواطر ۶ : ۲۰۱، حدائق، ص ۳۵۳، ابجد، ص ۹۲۰ -
۳ - حوالہ سابق، شبلی ۵ : ۱۱۹ - رحمان علی، ص ۳۶۳ - اتحاف، ص ۳۳۰ -
۴ - سبحۃ المرجان، ص ۲۰، ہدیۃ ۱ : ۶۳۳، نزھۃ الخواطر ۶ : ۲۰۱ -
۵ - نزھۃ الخواطر ۶ : ۲۰۱، شبلی ۵ : ۱۲۳ -
۶ - سبحۃ المرجان، ص ۱۱۹، رحمان علی، ص ۳۶۳، ۱۰۸ ببعد -
۷ - خزانہ عامرہ، ص ۲۸، حدائق، ص ۳۵۵، شبلی ۵ : ۱۲۰ -

برس قیام کے دوران اپنے ماموں کے قائم مقام کی حیثیت سے میر بخشی اور وقائع نگاری کے فرائض انجام دیے اور جب واپس ہوئے تو راستے میں بھکر کے مقام پر شیخ علی حزین سے ملاقات ہوئی اور اس نے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی اپنی غزلیں آزاد کو تحفۃً پیش کیں[1]۔ ۱۷۳۴ء/رجب ۱۱۴۷ھ میں لاہور پہنچے اور شاہ آفرین لاہوری کی صحبت میں پانچ دن صرف کیے اور 'ید بیضاء' کی ایک نقل آفرین نے بڑے اصرار سے حاصل کی[2]۔ اسی سال آزاد جب دلی پہنچے تو والدین اور بھائی بہنوں کی الہ آباد میں موجودگی کی خبر سن کر وہاں آئے اور چند روز قیام کیا[3]۔

آزاد کا تیسرا اور اہم سفر حج اور زیارتِ حرمین کے لیے تھا جو ۳ رجب ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء میں بلگرام سے شروع ہوا اور ۲۹ جماری الاول ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء کو بندرگاہ سورت پر اختتام پذیر ہوا[4]۔ اس سفر کے دوران جدہ میں شیخ محمد فاخرالہ آبادی سے ملاقات کی اور علمائے حرمین سے کسبِ فیض کے علاوہ طائف میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور المخا میں شیخ علی بن عمر شاذلی کے مزارات بھی دیکھے[5]۔

۱۷۳۹ء/۱۱۹۲ھ میں حج سے واپسی پر کچھ عرصہ سورت میں قیام کے بعد اورنگ آباد میں تکیہ شاہ مسافر میں ٹھہرے، پھر دکن کے بعض مقامات کی سیاحت کی اور آخر کار اورنگ آباد ہی میں مستقل قیام اختیار کرنے کے بعد ۱۷۸۵ء/۱۲۰۰ھ میں یہیں وفات ہوئی[6] "آہ غلام علی آزاد" سے تاریخِ وفات نکلتی ہے۔

مولانا آزاد اسمِ بامسمٰی تھے، کبھی مدحِ شاہان[7] نہ کی۔ کسی کی نوکری پسند نہ کی۔ دنیا ان کے نزدیک 'نہر طالوت' کی مانند تھی جس میں سے صرف ایک چلّو

۱۔ خزانہ عامرہ، ص ۱۴۴، شبلی، ص ۵ : ۱۳۳، حدائق، ص ۴۴۵۔
۲۔ خزانہ عامرہ، ص ۲۹، شبلی ۵ : ۱۳۳۔
۳۔ شبلی ۵ : ۱۲۰۔
۴۔ سبحۃ المرجان ۱۱۹ ببعد، شبلی ۵ : ۱۲۳ ببعد، حدائق، ص ۴۵۵۔
۵۔ سبحۃ المرجان، ص ۱۲۱، مقالات شبلی ۵ : ۱۲۳۔
۶۔ بروکلمن کے ہاں تاریخ وفات ۱۷۸۴ء/۱۱۹۹ھ اور ابجد العلوم، ص ۹۲۲ میں ۱۷۸۰ء/۱۱۹۴ھ (ھدیۃ العارفین ۱ : ۷۷۰، الاعلام ۵ : ۳۱۴، اور معجم المؤلفین ۷ : ۳۲ میں اسی کا اتباع کیا گیا ہے) لیکن نزھۃ الخواطر ۶ : ۲۰۵ میں تاریخ وفات "آہ غلام علی آزاد" اور حدائق الحنفیۃ، ص ۴۵۶ میں "شمع لامع ایوان ہندوستان" ہے اور دونوں سے ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۷۸۵ء ثابت ہوتی ہے۔
۷۔ سوائے اس رباعی کے جو نواب آصف جاہ کی شان میں کہی، مقالات شبلی ۵ : ۱۲۲، خزانہ عامرہ ص ۱۲۳، حدائق الحنفیۃ، ص ۴۵۶۔

حلال ہے مگر اس سے زیادہ حرام ہے ۔ وہ ہمیشہ سیر و سیاحت کے شائق ، قناعت پسند اور آزاد روی کے دلدادہ رہے اور اپنے آپ کو حافظ شیرازی کے اس قول کا مصداق تصور کرتے رہے :

"بندہ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم"

اس کے علاوہ وہ پر عزم، باہمت، علم‌دوست، دوست‌شناس،عالم، ادیب اور شاعر تھے[1]۔

کتب رجال اور ادبی تذکروں میں آزاد کی تصنیفات کی تعداد مختلف بیان کی گئی ہے ۔ خود انہوں نے 'سبحۃ المرجان'[2] میں اپنی آٹھ تصانیف کا ذکر کیا ہے ۔ نواب صدیق حسن خاں (م-۱۸۸۹ء/۱۳۰۷ھ) نے 'ابجد العلوم'[3] میں ۱۲ اور 'اتحاف النبلاء'[4] میں ۱۵ کا ذکر کیا ہے ۔ 'نزہۃ الخواطر'[5] میں بھی پندرہ تصانیف کا ذکر ہے ۔ تعداد میں اس اختلاف کا ایک سبب غالباً یہ ہے کہ مولانا نے بعض مختصر کتابوں کو مفصل کتابوں میں یا تو من و عن ایک حصے کی حیثیت سے شامل کر دیا ہے اور یا اول‌الذکر میں جمع کر دیا ہے ۔ مثلاً 'شمامۃ العنبر فی ماورد فی الہند من سید البشر' کے نام سے انہوں نے جو رسالہ لکھا تھا اسے 'سبحۃ المرجان'[6] کی پہلی فصل کے طور پر پیش کیا ہے اور اس کی خود تصریح بھی کر دی ہے ۔ اسی طرح 'تسلیۃ الفواد' کے نام سے علمائے ہند کے تراجم اور دیگر فوائد 'سبحۃ المرجان'[7] کی دوسری اور تیسری فصلوں میں نقل کیے گئے ہیں ۔ مولانا آزاد کی تصانیف کے نام یہ ہیں :

عربی

۱ ۔ ضوءالدراری شرح صحیح البخاری ، زیارت حرمین کے دوران لکھی گئی ۔ صاحب نزہۃ الخواطر[8] نے اس کا نسخہ بھوپال کی ایک لائبریری میں دیکھا تھا ۔

۲ ۔ 'سبحۃ المرجان' (تفصیلی ذکر آگے آئے گا) ۔

---

۱ ۔ دیکھیے سبحۃ المرجان ، ص ۹۱ ، خزانۂ عامرہ ، ص ۱۵۴ ، مقالات شبلی ۵ : ۱۳ ۔

۲ ۔ سبحۃ المرجان ، ص ۱۲۲ ۔

۳ ۔ ابجد العلوم ، ص ۲۲۱ ۔

۴ ۔ اتحاف النبلاء ، ص ۳۳۱ ۔

۵ ۔ نزہۃ الخواطر ۶ : ۲۰۲ ۔

۶ ۔ سبحۃ المرجان ، ص ۴ ۔

۷ ۔ ایضاً ، ص ۱۲۲ ۔

۸ ۔ نزہۃ الخواطر ۶ : ۲۰۲ ۔

۳۔ 'تسلیة الفؤاد' (مفقود ہے)۔

۴۔ 'شفاء العلیل' (متنبی کی شاعری پر تنقید ہے[1])۔

۵۔ 'الشجرۃ الطیبة' (سادات بلگرام کے انساب ذکر کیے ہیں۔ اس کا نسخہ صاحب نزہة الخواطر[2] نے دیکھا تھا)۔

۶۔ 'سندالسعادات فی حسن خاتمة السادات' (اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ سادات کا خاتمہ ہمیشہ نیک ہوتا ہے[3])۔

۷۔ 'مظہرالبرکات' (بحر خفیف میں مثنوی کے وزن پر ستره منظوم حکایات ہیں، خطی نسخہ بھوپال میں پایا جاتا ہے)۔

۸۔ 'مرآۃ الجمال' (ایک سو پانچ بیت کا قصیدہ نونیہ ہے۔ جس میں سر سے لے کر پاؤں تک معشوق کے اعضاء کا ذکر ہے[4])۔

۹۔ 'السبعة السیارۃ' (تفصیلی ذکر آگے آتا ہے)۔

۱۰۔ 'شمامة العنبر'۔

فارسی

۱۔ 'مآثرالکرام فی تاریخ بلگرام' (فصل اول میں اسّی صوفیاء اور فصل ثانی میں بہتر علمائے ہند کا تذکرہ ہے۔ ۱۷۶۶ء[5]/۱۱۸۰ھ میں مکمل ہوئی اور ۱۹۱۰ء میں دکن سے شائع ہوئی)۔

۲۔ 'خزانۂ عامرہ' (فارسی گو ہندی شعراء کا تذکرہ ہے۔ بقول شبلی[6] آزاد کا انتخاب کلام بلند معیار کا نہیں، کتاب چھپ چکی ہے)۔

۳۔ 'ید بیضاء' (فارسی شعراء کا تذکرہ ہے، نسخہ موجود ہے)[7]۔

۱۔ نزہة الخواطر ۶ : ۲۰۲۔
۲۔ نزہة الخواطر ۶ : ۲۰۲۔
۳۔ ھدیة العارفین ۱ : ۷۷۰۔
۴۔ نزہة الخواطر ۶ : ۲۰۳۔
۵۔ مآثر الکرام، ص ۳۱۱۔
۶۔ مقالات شبلی ۵ : ۱۲۵۔
۷۔ مقالات شبلی ۵ : ۱۲۵۔

۴ - 'سرو آزاد' (فارسی اور ہندی کے شعراء کا تذکرہ - ۱۷۵۳ء/۱۱۶۶ھ میں مکمل ہوئی ۱۹۱۳ء میں دکن سے شائع ہوئی)[1] -

۵ - 'روضۃ الاولیاء' -

۶ - 'غزلان الہند' -

۷ - 'دیوان فارسی' نو ہزار بیت)[2] -

۸ - 'کشکول' -

۹ - 'شرح قطعہ نعمت خاں علی' (مؤخرالذکر کا ذکر کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا)[3] -

۱۰ - 'ماثر الامراء اگرچہ صمصام الدولہ شاہنوازخاں کی تصنیف ہے مگر اس کی ترتیب و احیاء میں آزاد کا بھی ہاتھ ہے اگر وہ نہ ہوتے تو یہ عظیم الشان خزانۂ معلومات نقص و ضیاع کا شکار ہو جاتا) -

آزاد کی عربی تصانیف میں 'سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان' کو اہم مقام حاصل ہے - یہ کتاب ۱۷۶۳ء/۱۱۷۷ھ میں تصنیف ہوئی اور ''تجلو البصیرۃ سبحۃ المرجان'' سے اس کی تاریخ نکلتی ہے - کتاب چار فصول پر مشتمل ہے - پہلی فصل میں ہندوستان کے ان فضائل کا ذکر ہے جو کتبِ تفسیر و حدیث میں وارد ہوئے ہیں - دوسری فصل میں فضیلتِ عرب اور ہندوستان میں اسلام کی آمد و اشاعت کا مختصر ذکر کرنے کے بعد اپنے عہد تک کے عربی زبان کے ۴۴ فضلائے ہند کا[4] ذکر ہے - تیسری فصل پانچ مقالات پر مشتمل ہے - مقالہ اولٰی میں ان محسنات کا ذکر ہے جو انہوں نے ہندی سے عربی میں منتقل کی ہیں - مقالہ ثانیہ میں ان محسناتِ ادبیہ کا ذکر ہے جو امیر خسرو دہلوی کی ایجاد ہیں - چوتھی فصل میں معشوقات اور عشاق کا ذکر ہے اور اس میں تین مقالات ہیں - آزاد کی یہ کتاب اس لحاظ سے بھی بڑی اہم ہے کہ پاک و ہند کے علمائے عربیت کے تراجم پر یہ سب سے پہلی کتاب ہے اور بعد کے لوگوں نے اس سے بہت کچھ لیا ہے اور اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اسی نے سب سے پہلے نہ صرف ہندی بدائع و صنائع سے عربی ادب کو متعارف کرایا بلکہ کئی محاسنِ فنیہ کی تخلیق بھی کی[5] -

---

۱ - سرو آزاد، ص ۳۰۶ -

۲ - نزہۃ الخواطر ۶ : ۲۰۳ -

۳ - البتہ یہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے -

۴ - ڈاکٹر زبید احمد، ص ۱۹۰، ۲۵۴ -

۵ - سبحۃ المرجان ۱۲۳، ۲۰۴ -

آزاد کا دوسرا شاندار کارنامہ (عربی میں) 'مرآۃ الجمال' ہے، جو ایک سو پانچ عربی اشعار پر مشتمل ہے اور جس میں محبوبہ کے جسم کے تمام اعضاء پر دو دو شعر لکھ کر ایک انوکھی صنفِ شعر کا اضافہ کیا گیا ہے[1] ۔

مولانا آزاد بلگرامی نے بجا طور پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ برِّ صغیر پاک و ہند میں ان سے پہلے کوئی ایسا شخص نہیں ہوا جس کا عربی میں دیوانِ شعر ہو اور جس کا کلام اس درجے کا ہو جیسا کہ ان کا ہے[2]۔ انہوں نے 'سبحۃ المرجان' میں یہ بات بھی صراحت سے لکھی ہے کہ ان کے دواوین میں جمع شدہ اشعار کی تعداد تین ہزار ہے اور 'سبحۃ المرجان' کی تیسری فصل کی تالیف کے دوران بوقتِ ضرورت کچھ اشعار تخلیق کیے اور اس میں شامل کر دیے۔ ان اشعار کی تعداد سات سو ہے[3] ۔

آزاد کی شاعری دورِ جاہلیت اور بعد کے عربی شعراء کے کلام سے کئی لحاظ سے ممتاز ہے ایک تو یہ ہے کہ آزاد نہ صرف یہ کہ فارسی شعراء کے کلام سے متعارف اور ان کے نازک خیالات سے آگاہ تھا بلکہ وہ خود بھی فارسی زبان کا ایک مستند اور بلند پایہ شاعر تھا، اس لیے اس کے عربی اشعار میں بلندیٔ تخیل کے ساتھ معانی کی نزاکت بھی موجود ہے ۔ البتہ لفظی فصاحت و بلاغت اس کی عربی شاعری کی ایک کمزور پہلو ہے ۔ یوں کہہ لیجیے کہ معنوی اعتبار سے اس کی شاعری بہت سے عرب شعراء پر فوقیت رکھتی ہے لیکن لفظی و لغوی اعتبار سے بہت سے عرب شعراء سے کم تر ہے ۔ دوسری ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ آزاد نے قدیم عربی اور ان کے علاوہ فارسی بحور و اوزان میں بھی شعر کہے ہیں۔ مثلاً عربی ارجاز مزدوجہ قوافی کے اعتبار سے تو فارسی مثنویوں سے مشابہت رکھتی ہیں، مگر وزن میں اختلاف تھا لیکن آزاد نے مثنوی کی بحر میں عربی رجزیہ قصائد لکھے۔ اس کی واضح مثال ان کی عربی مثنوی 'مظہرالبرکات' ہے ۔ اسی طرح آزاد نے اپنی شاعری میں جہاں محسناتِ لفظیہ اور صنائع و بدائع پر زور دیا ہے وہاں ہندی و سنسکرت کے استعارات اور تشبیہات اور دیگر فنی صنائع و بدائع کو بھی استعمال کیا ہے ۔ اس لحاظ سے آزاد عربی شاعری کی تاریخ میں ایک ممتاز و منفرد مقام پر کھڑا ہے اور وہ بلاشبہ برِّ صغیر کا سب سے بڑا عربی شاعر ہے[4] ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

---

۱ ۔ ڈاکٹر زبید احمد، ص ۲۵۰ ۔
۲ ۔ سبحۃ المرجان، ص ۱۲۲ ۔
۳ ۔ سبحۃ المرجان، ص ۱۲۳ ۔
۴ ۔ ڈاکٹر زبید احمد، ص ۲۴۸، ۲۵۴ بعد ۔

بَرقٌ اَضَاءَ مِنَ الزَّوراءِ يُشجِينِي ... يَا رَبِّ مَا بَالُهُ يَبكِي وَ يُبكِينِي

أَنّٰى لِسَانٌ يُؤَدِّي شُكرَ اَنعُمِهِ ... بِالْمَاءِ وَالنَّارِ يَروِينِي وَ يُورِينِي

هَوِيتُ حَسنَاءَ اَسعٰى فِي اِرَاحَتِهَا ... وَتِلكَ فِي غَايَةِ الْاِيذَاءِ تُؤذِينِي

لَايُذهِبُ الغُلَّ مَاءُ المُزنِ مِن كَبِدِي ... بَل مَاءُ يَا قُوتَةِ اللَّمیَاءِ يَروِينِي

۱ - ترچھی نگاہ والی حسینہ کی آنکھوں سے ایک بجلی کی سی چمک اٹھی جو مجھے دکھی اور روگی بناتی رہتی ہے ، یا الٰہی ! یہ کیسی بجلی ہے جو خود بھی گریہ کناں ہے اور مجھے بھی رلاتی ہے ؟

۲ - میرے پاس وہ زباں کہاں جو اس بجلی کے احسانات کا شکر ادا کر سکے ، یہ تو مجھے آنسوؤں کے پانی سے سیراب کرتی اور ان کی جلن سے بھڑکاتی ہے !

۳ - میں ایک ایسی حسینہ کا عاشق ہوں کہ جس کے سکون و راحت کے لیے کوشاں ہوں مگر وہ مجھے حد سے زیادہ اذیت و بےقراری پہنچانے میں کوشاں ہے!

۴ - بارش کا پانی میرے جگر کی سوزش و تشنگی کو دور نہیں کر سکتا بلکہ میری تسکین و سیرابی تو صرف اس حسینہ کے ٹھنڈے لعاب والے یاقوتی ہونٹوں سے ممکن ہے ۔

مرتضیٰ حسینی الزبیدی

شیخ محمد مرتضیٰ بن محمد حسینی واسطی بلگرامی المعروف الزبیدی ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء میں خطۂ مردم خیز بلگرام میں پیدا ہوئے ۔ محی الدین لقب اور ابوالفیض کنیت تھی ۔ ابتدائی کتب اپنے مولد و منشا کے علماء سے پڑھنے کے بعد سندیلہ اور خیر آباد کے اساتذہ سے سند لی اور پھر دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور بعد ازاں شیخ خیرالدین بن زاہد سورتی سے علم حاصل کیا ۔ ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء میں وہ بلادِ عرب کو روانہ ہوئے اور زبید کے شہر میں ایک مدت تک مقیم رہے اور اسی نسبت سے الزبیدی مشہور ہوگئے ۔ مکہ میں شیخ عبدالرحمٰن العیدروس سے ملاقات و صحبت حاصل ہوئی اور انہیں کے شوق دلانے پر وہ ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء میں مصر روانہ ہوگئے۔ یہاں انہوں نے مصر کے علماء

سے سند علم حاصل کرنے کے علاوہ مختلف شہروں کی سیاحت بھی کی ۔ یہیں شادی ہوئی اور چودہ سال دو ماہ کے عرصے میں عربی کی عظیم الشان لغت مرتب کی جو 'تاج العروس' کے نام سے مشہور ہے[۱] ۔

مرتضیٰ حسینی الزبیدی پر برِ صغیر کی ملت اسلامیہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے ۔ فقہ ، حدیث ، لغت ، ادب اور علوم عقلیہ و نقلیہ[۲] میں ان کی نظیر زمانہ مشکل سے پیدا کر سکے گا ۔ زندگی میں جتنی شہرت و عزت انہیں حاصل ہوئی شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو گی اور جتنا خلقِ خدا نے ان سے فیض حاصل کیا شاید ہی کسی سے کیا ہوگا ۔ دوسرے فیض یافتگان کے علاوہ سلطان عبدالحمید (اول) سلطان روم اور محمد پاشا (راغب) صدر الوزارات نے ان سے حدیث کی اجازت لی ۔ تلامذہ کی کثرت اور ان کی تصانیف کی زندگی ہی میں تمام دنیا میں شہرت پذیر ہونے کی بنا پر اگر ان کو تیرھویں صدی ہجری (انیسوین صدی عیسوی) کا مجدّد کہیں تو روا ہے ۔ جب ان کی شہرت خوب ہوئی تو بہت سے لوگ قریب کے شہر و قصبات سے ان کے پاس پہنچنے لگے تو انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ملاقات کا دروازہ دوستوں پر بند کر دیا[۳] ۔ ان کی وفات ۱۷۹۱ء/شعبان ۱۲۰۵ھ میں ہوئی[۴] ۔

زبیدی بڑے دبلے پتلے ، بشاش بشاش چہرے والے، متوسط الاعضاء ، ذہین و فطین اور قوی الحافظہ واقع ہوئے تھے ۔ انہیں بے شمار نوادر زبانی یاد تھے اور وہ عربی زبان کے علاوہ فارسی و ترکی زبانیں بھی اچھی طرح جانتے تھے[۵] ۔

زبیدی کی شہرۂ آفاق کتابِ لغت 'تاج العروس' عربی کی کتبِ لغت میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے جو اصل میں فیروز آبادی کی 'القاموس' کی شرح ہے ۔ زبیدی ہر مادے کے ضمن میں مشہور اشخاص اور بلاد و امصار کا تذکرہ بڑی جامعیت و اختصار سے کرتے ہیں ۔ حقیقت میں 'تاج العروس' تاریخ ، جغرافیہ ، انساب اور مختلف علوم کا انسائیکلوپیڈیا ہے ۔ الفاظ کے معانی بیان کرتے ہوئے عرب لغت نویسوں کے دستور کے

---

۱ ۔ نزہۃ الخواطر ۷ : ۴۰۷ ۔ اتحاف النبلاء ، ص ۴۰۷ ۔ ابجدالعلوم ، ص ۷۰۸ ، ۱۵ ، حدائق الحنفیہ ، ص ۴۵۸ ۔

۲ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۴۹۱ بیعد ۔

۳ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۴۹۲ ۔

۴ ۔ نزہۃ الخواطر ۷ : ۴۷۸ ، حدائق الحنفیہ ، ص ۴۶۱ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۴۹۲ ۔

۵ ۔ نزہۃ الخواطر ۷ : ۴۷۲ ۔

مطابق الزبیدی نے بھی ہزاروں اشعار بطور سند نقل کیے ہیں[1]۔ کتاب کا مصری ایڈیشن دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ مگر اس میں طباعت کی بیشمار اغلاط ہیں۔ اس کے دو نئے ایڈیشن لیبیا اور کویت سے چھپ رہے ہیں۔

'تاج العروس' کے علاوہ زبیدی کی دیگر اہم مؤلفات[2] (جن کی تعداد سو سے زائد ہے اور جن میں سے بعض مطبوعہ اور بعض غیر مطبوعہ ہیں) یہ ہیں :

۱ - 'اتحاف السادۃ المتقین شرح احیاء علوم الدین' (۲۰ جلد)
۲ - 'تکملۃ القاموس'
۳ - 'رفع الکلل عن العلل'
۴ - 'المواہب الجلیۃ فیما یتعلق بحدیث الاولیۃ'
۵ - 'انالۃ المنی فی سرالکنی'
۶ - 'القول المبتوت فی تحقیق لفظ التابوت'
۷ - حسن المحاضرۃ فی آداب البحث و المناظرۃ'
۸ - 'اقرار العین بذکر من نسب الی الحسن و الحسین'
۹ - 'الازہار المتناثرۃ فی الاحادیث المتواترۃ'
۱۰ - 'القول الصحیح فی مراتب التعدیل و التجریح'
۱۱ - 'الامالی الحنفیۃ'
۱۲ - 'الجواہر المنیفۃ فی أصول أدلۃ الامام ابی حنیفۃ'
۱۳ - اعلام الإعلام بمناسک حج بیت اللہ الحرام'

حکیم شفائی خان

حکیم شفائی خان بن حکیم عبدالشافی خان مسیح الملک ہند کے ان عظیم مسلم اطباء میں سے تھے جنہوں نے شیخ بو علی سینا کی کتاب 'القانون' کی عمدہ شروح لکھیں اور طب کے میدان میں شہرت پائی۔ ان کے والد حکیم عبدالشافی بھی ایک نامور طبیب تھے۔

---

۱ - صدیق حسن خان ، البلغۃ فی علوم اللغۃ ، میں تفصیل ملاحظہ ہو۔
۲ - تفصیل کے لیے دیکھیے تذکرہ علمائے ہند ص ۳۹۳ ، بعد ، نزہۃ الخواطر ۷ : ۶۲ ، بعد۔

حکیم شفائی خاں کی تاریخ وفات تذکرہ نگاروں نے متعین نہیں کی ۔ البتہ یہ ذکر کیا ہے کہ وہ اولاً اودھ کے آصف الدولہ (۱۷۶۷ء - ۱۷۹۷ء) سے وابستہ رہے اور پھر اس کی وفات کے بعد نواب سعادت علی خاں (۱۷۹۷ء - ۱۸۱۳ء) سے وابستہ ہو گئے ۔ بہرحال ان کا زمانہ وفات اٹھارھویں صدی کا اختتام یا انیسویں صدی عیسوی کا آغاز ہے[1] ۔

حکیم شفائی خاں نے طب کے میدان میں تین کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں :

۱ - 'شرح کلیات القانون' ۔

۲ - 'الفوائد الشفائیہ' ۔

۳ - 'کتاب الحمیات'[2] ۔

ان میں سے اول الذکر ابن سینا کی شہرہ آفاق تصنیف 'القانون فی الطب' کی ان شروح میں سے ایک ہے جو برّ صغیر کے مسلمان اطباء نے لکھیں ۔ حکیم شفائی خاں نے یہ شرح اپنے فرزند مرزا امان علی کے لیے مرتب کی تھی اور ان کا انتساب نواب آصف جاہ ابو المنصور خان سعادت علی خان سے کیا ہے ۔ کتاب کا واحد نسخہ بانکی پور لائبریری (نمبر ۱۴) میں ہے

محمد باقر آگاہ

مولانا محمد باقر آگاہ بن مرتضیٰ الشافعی المدراسی جنوبی ہند کے مسلم الثبوت عالم، ادیب اور شاعر تھے ، مولانا آزاد بلگرامی کے معاصرین میں سے تھے ۔ انہوں نے جہاں آزاد کی عربی و فارسی شاعری کے جواب میں شعر کہے وہاں ان کی شاعری پر تنقید بھی کی ۔ وہ ۱۷۴۵ء/۱۱۵۸ھ میں 'ویلور' میں پیدا ہوئے اور مدراس میں نشوونما پائی ۔ ان کے اساتذہ میں مولا سید ابوالحسن قرنی ویلوری اور 'ترنا[3] چلی' کے شیخ ولی اللہ کے نام قابل ذکر ہیں ۔ مولانا باقر آگاہ عربی ، فارسی اور اردو زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور ان تینوں زبانوں میں نثر کے ساتھ نظم بھی کہی ۔ وفات ۱۸۰۵ء میں ہوئی ۔

ان کی عربی مؤلفات میں سے 'تنویر البصر و البصیر فی الصلاۃ علی النبی البشیر النذیر' ،

---

۱ - ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۱۳۶ ۔

۲ - ایضاً ۔

۳ - نزھۃ الخواطر ۷ : ۹۱ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۴۲۹ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۴۴۳ ۔

'نفائس النکات' ، 'الدرالنفیس' ، 'التحفة العنبریة' ، 'العشرة الکاملہ' (معلقات کے طرز پر دس قصائد) اور 'مقامات' (مقامات حریری کے طرز پر) قابل ذکر ہیں ۔

فارسی تصانیف میں سے 'چہار صد ایراد بر کلام آزاد 'شرح دیباچہ مثنوی معنوی' ، 'معذرت نامہ' اور 'دیوان شعر' فارسی ، ان کی اردو میں بھی تصانیف ہیں جن میں سے 'ہشت بہشت' ، 'تحفة النساء' ، 'گلزار عشق' ، 'افسانہ رضوان شاہ' اور 'دیوان شعر'[1] قابل ذکر ہیں ۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :

قَدْ صَیَّرَنِی الْهَوىٰ جُذَاذَا ‏ ‏ ‏ ‏ یَا لَیْتَنِی مِتُّ قَبْلَ هٰذَا
مَا أَفْعَلُ لَمْ أَجِدْ لِأٰهِی ‏ ‏ ‏ ‏ فِی صَخْرِ فُؤَادِهَا نَفَاذَا

۱ ۔ عشق نے مجھے مسل کر ریزہ ریزہ کر ڈالا ہے ، کاش میں اس سے قبل مر چکا ہوتا (دوسرا مصرعہ آیت قرآن کا ٹکرا ہے) ۔

۲ ۔ کیا کروں چٹان سا دل رکھنے والی کے دل میں میری آہیں نفوذ ہی نہیں کر پاتیں !

یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ عرب شعراء کے بالکل برعکس محمد باقر آگاہ اپنے کلام کے مقطع میں اپنا تخلص ذکر کرتے ہیں ، ایک جگہ یوں گویا ہیں :

لَا تَنْظُرْ قَطُّ إِلىٰ أَسَفِی ‏ ‏ ‏ ‏ لَا تَسْأَلْ حَالِی فِی الْأَلَمِ
آگاهُ تَنَاهَتْ حَیْرَتُهُ ‏ ‏ ‏ ‏ أَدْرِکْهُ إِلٰهِی بِالْکَرَمِ

۱ ۔ اے دوست ! نہ تو تو میرے تاسف کو دیکھ اور نہ درد عشق میں میرا حال پوچھ !

۲ ۔ آگاہ کی حیرت و دہشت کی انتہا ہو گئی ہے ، یا اللہ ! تو ہی اس پر اپنا کرم فرما !

ملا مبین لکھنوی

شیخ محمد مبین بن محب اللہ بن احمد بن السعید بن قطب الدین شہید انصاری لکھنوی

---

۱ ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے نزہة الخاطر ۷ : ۹۲ ببعد ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۳۰۰ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۲۲۸ ، ۳۴۳ ، ۳۵۲ ۔

حنفی فقہاء میں بلند درجہ رکھتے ہیں ۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور مشہور شارح 'سلم العلوم' ملا حسن بن غلام مصطفی لکھنوی سے علوم پڑھے اور ایک طویل مدت تک ان کی صحبت میں رہے ۔ ملا مبین ، 'علوم عقلی و نقلی کے عالم ، رموز حنفی و جلی سے واقف اور جودت ذہن و ذکاء و طاقت میں مشہور تھے[1] ۔ شیخ قطب الدین کی اولاد میں وہ پہلے عالم تھے جو فرنگی محل' میں تدریس کی مسند پر بیٹھے[2]۔ ان کے صاحبزادے ملا محمد معین بھی بڑے نامور عالم تھے[3]۔ ان کی وفات ۱۸۱۰ء/۱۲۲۵ھ میں ہوئی ۔ 'ماہ برج علوم پنہا گشت' سے تاریخ وفات نکلتی ہے ۔

آپ کی تصانیف میں سے 'شرح سلم العلوم' (منطق) 'شرح مسلم الثبوت' (فرنگی محلی علماء میں سے چار اہل فضل نے اس کتاب کی شروح لکھیں جن میں سے ایک ملا مبین ہیں)، 'کنز الحسنات فی مسائل الزکاۃ (فقہ) 'شرح التبصرۃ'، (تصوف) 'شرح میر زاہد ملا جلال' (منطق) اور حاشیہ 'شرح ہدایۃ الحکمہ' (فلسفہ) قابل ذکر ہیں[4]۔

سلام اللہ رامپوری

مولانا سلام اللہ بن شیخ الاسلام بن حافظ فخرالدین رامپوری ''شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد سے تھے۔ اپنے عہد کے فقیہ ، محدث اور مفسر تھے ۔ علوم مروجہ اپنے والد شیخ الاسلام (مصاف 'شرح فارسی صحیح بخاری' ، 'رسالہ طرد الاوہام عن اثرالامام الہمام' ، 'کشف الغطاء لمالزم للموتی عن الاحیاء') سے حاصل کیے''[5]۔ امیر فیض اللہ خان کے عہد میں رامپور میں وارد ہوئے اور صدارت سے نوازے گئے[6]۔ ان کی وفات ۱۸۱۴ء/ ۱۲۲۹ھ یا ۱۸۱۸ء/۱۲۳۳ھ میں ہوئی ۔

مشہور تصانیف 'الکمالین علی الجلالین' ، 'المحلی شرح الموطأ' (۱۲۱۶ھ میں تصنیف کی)، 'خلاصۃ المناقب' ، 'کشف القناع عن اباحۃ السماع' ، 'رسالۃ فی اصول الحدیث

---

۱ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۴۶۹ ، نزہۃ الخواطر ۷ : ۴۰۳ ببعد ۔
۲ ۔ نزہۃ الخواطر ۷ : ۴۰۴ ۔
۳ ۔ نزہۃ الخواطر ۷ : ۴۶۴ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۴۲۰ ۔
۴ ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے تذکرہ علمائے فرنگی محل ، ص ۱۷۲ ببعد ، نزہۃ الخواطر ۷ : ۴۰۴۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۴۶۹ ۔
۵ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ۲۱۸ ۔
۶ ۔ نزہۃ الخواطر ۷ : ۲۰۱ ۔

اور 'بخاری' و 'ترمذی' کا فارسی میں ترجمہ ہے[1]۔

شیخ سلام اللہ رامپوری کی ان تصانیف میں دو خصوصی توجہ کی مستحق ہیں۔ ان میں ایک تو 'الکمالین علی الجلالین' ہے جو عربی کی مشہور تفسیرِ قرآن 'تفسیر الجلالین' پر حواشی ہیں یہ تفسیرِ قرآن کریم کی مختصر ترین تفاسیر میں سے ہے۔ شیخ سلام اللہ نے حواشی میں بھی تفسیر کے اسلوب کو پیشِ نظر رکھا ہے یعنی انتہائی اختصار اور جامعیت۔ یہی وجہ ہے کہ تفسیر کی طرح یہ حواشی بھی بڑی مقبولیت رکھتے ہیں۔ شیخ موصوف کی دوسری قابلِ توجہ تصنیف 'المحلی' ہے جو 'موطاء' امام مالک کی شرح ہے۔ برِّ صغیر میں اس کتاب حدیث کی بہت سی شروح لکھی گئی ہیں جن میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی 'المسوی' اور 'المصفی' بھی شامل ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ شیخ سلام اللہ ان شروح کے وجود سے واقف نہیں تھے حالانکہ شاہ صاحب نے یہ شرحیں ان کی 'المحلی' سے تیس سال قبل مرتب کی تھیں۔ اپنی شرح کے مقدمے میں وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مجھ سے قبل زرقانی نے جو 'شرح موطأ' لکھی تھی وہ برِّ صغیر میں متداول نہیں، اس کے علاوہ برِّ صغیر میں 'موطأ' کی اور کوئی شرح بھی موجود نہیں۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ وہ شاہ صاحب، کی شرح سے آگاہ ہی نہ تھے!!

بہرحال شیخ سلام اللہ کی 'المحلی فی شرح الموطأ' ایک مفید اور قابلِ قدر کوشش ہے۔ یہ شرح بھی زرقانی کی شرح کی طرح کافی ضخیم ہے، شارح نے مقدمے میں اصولِ حدیث اور حیات امام مالک اور موطأ امام مالک پر ایک فاضلانہ تبصرہ بھی پیش کیا ہے۔ شرح میں وہ مشکل الفاظ کی لغوی تشریح کے علاوہ فقہی مسائل سے بھی بحث کرتے ہیں۔ یہ شرح اگرچہ شاہ صاحب کی شرح 'المسوی' سے ضخامت میں بڑی ہے مگر حسنِ ترتیب اور عمقِ نظر کے اعتبار سے شیخ سلام اللہ حضرت شاہ صاحب سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔

قاضی ثنا اللہ پانی پتی

قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی پانی پتی شیخ جلال الدین عثمانی المعروف کبیرالاولیاء کی اولاد میں سے تھے۔ سات سال کی عمر میں قرآنِ کریم حفظ کر لیا اور سولہ سال کی عمر میں علومِ متداولہ سے فارغ ہوگئے۔ کہا جاتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں کتبِ

۱۔ مفصل دیکھیے نزہۃ الخواطر، ۷: ۲۰۱ ببعد، حدائق الحنفیۃ، ص ۳۶۸، ابجد العلوم، ص ۹۲۷، ص ۹۲۷، تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۸ ببعد۔

نصاب کے علاوہ ایک سو پچاس کتابوں کا مطالعہ کیا[1] ۔ آپ نے حدیث کی سند امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی سے حاصل کی ۔ اس وقت آپ کی عمر اٹھارہ برس تھی[2] ۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ پہلے شیخ محمد عابد سنامی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے اور ان سے طریقت کی تعلیم حاصل کی پھر ان کی وفات پر مرزا مظہر جانجاناں علوی سے بیعت ہوئے ۔ مرزا ان سے بہت محبت اور احترام سے پیش آتے تھے اور 'علم الهدی' کے لقب سے یاد کرتے تھے ۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی انہیں 'بیہقی الوقت' کا خطاب دیتے تھے[3] تقویٰ و دیانت میں بیمثال تھے ۔ صفاء ذہن ، جودتِ طبع ، قوتِ فکر اور سلامتِ ذہن میں ان کا جواب نہ تھا اور فقہ میں اجتہاد کے مرتبہ کو پہنچتے ہیں[4] ۔ ایک زمانے تک افاضہ' فیضِ ظاہر و باطن ، اشاعتِ علوم ، فصل خصومات، افتاء سوالات اور حلِ مشکلات میں مشہور رہے ۔ علم تفسیر ، فقہ ، کلام اور تصوف میں نہایت فاضل تھے ۔ خصوصاً علمِ فقہ میں ایسا مرتبہ حاصل تھا کہ اس میں کئی کتابیں اور رسالے تصنیف فرمائے اور مشکل سوالات کے جوابات میں بہت سے خطوط تحریر[5] فرمائے ۔ ان کی وفات ۱۸۱۰ء میں ہوئی ۔

قاضی ثناءاللہ پانی پتی کی تصانیف کی تعداد تیس سے متجاوز ہے ۔ اہم اور مشہور یہ ہیں: 'التفسیر المظہری' (دس جلدوں میں قرآن کی تفسیر ہے جو انہوں نے اپنے مرشد کے نام سے موسوم کی) ، 'مالا بدمنہ' (فقہ حنفی کی کتاب جو مدارس نظامیہ میں داخلِ نصاب ہے) ، 'السیف المسلول' ، ارشادالطالبین 'تذکرة الموتی و القبور' ، 'تذکرة المعاد' ، 'حقیقة الاسلام' ، 'رسالة فی حکم الغناء' ، 'رسالة فی حرمة المتعة' اور 'رسالة فی العشر والخراج'[6] ۔

برِ صغیر کے علماء اسلام نے قرآن کریم کی عربی میں جو تفاسیر لکھی ہیں ان میں سے

---

۱ - نزهة الخواطر ۷ : ۱۱۳ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۳۲ ، حدائق الحنفیة ، ص ۴۶۵ ۔
۲ - نزهة الخواطر ۷ : ۱۱۳ ۔
۳ - نزهة الخواطر ۷ : ۱۱۳ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۳۲ ، حدائق الحنفیة ، ص ۴۶۶ ۔
۴ - تفصیل کے لیے دیکھیے نزهة الخواطر ۷ : ۱۱۳ بعد ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۳۲ ، الیانع الجنی ، ص ۶۷ ، اتحاف النبلا ، ۲۴۰ بعد ، مقامات مظہری ، ص ۶۵ بعد ، تراجم علمائے ، حدیث ، ص ۶۰ ، ۲۶ مظہر العلماء، ص ۴۷ ، خزینه الاصفیاء ۱ : ۶۸۹ بعد ۔
۵ - تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۳۲ ۔
۶ - تفصیل دیکھیے نزهة الخواطر ۷ : ۱۱۳ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۱۹ ، ۲۸۸ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۳۲ ، علم و عمل ۱ : ۱۷۲ بعد ۔

ایک 'التفسیر المظہری' ہے ۔ قاضی ثناء اللہ سے پہلے اس خطے کے علماء میں سے شیخ علی بن احمد المہائمی نے 'تبصیر الرحمٰن وتیسیر المنان' لکھی جو جلالین کی طرح تفسیر ممزوج ہے مگر مؤخرالذکر سے ذرا ضخیم ہے ، شیخ محمد بن احمد میانجی گجراتی نے 'التفسیر الاحمدی' لکھی جس میں ربط آیات پر زور دیا گیا ہے اور فیضی نے 'سواطع الالہام' لکھی جس کا بڑا کمال صنعت اہمال ہے ۔ لیکن قاضی ثناء اللہ ان میں کئی لحاظ سے ممتاز نظر آتے ہیں، ان کا اسلوب نگارش بہت سادہ اور بے تکلفانہ ہے ، اس لحاظ سے وہ زمخشری اور بیضاوی کے اسلوب کی یاد تازہ کرتے ہیں ۔ اسی طرح مفردات لغویہ اور اشتقاق کی ابحاث میں بھی ان کا تتبع کرتے ہیں ، جہاں علم العقائد اور علم الکلام کی بات نکلتی ہے تو وہ سنی نقطۂ نظر کی خوب ترجمانی کرتے ہیں ، آیات کے شان نزول ، ناسخ منسوخ اور آیات کے ضمن میں وارد شدہ احادیث نبوی اور اقوال آئمہ کا بھی استقصاء کرتے ہیں ۔ قاضی صاحب بنیادی طور پر ایک حنفی فقیہ ہیں اس لیے وہ آیات قرآنی سے فقہی مسائل اور شرعی احکام کا استنباط بھی خوب کرتے ہیں ۔ ان کی تفسیر میں فقہ کے بے شمار مسائل بکھرے پڑے ہیں ، اگر انہیں جمع کیا جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب الفتاویٰ مرتب ہو سکتی ہے ۔

حکیم شریف خان

حکیم شریف خان ابن حاذق الملک حکیم اکمل خان بن واصل خان حنفی دہلوی برِ صغیر کے نامور اطباء میں سے تھے ۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں اپنے والد اور چچا سے علمِ طب کی تعلیم حاصل کی[1] ۔ حکیم علوی خاں سے ان کا مقابلہ رہتا تھا ۔ بقول ڈاکٹر زبید احمد ، یہی دو طبیب ہیں جو بعد کے اطباء کی نگاہوں کا مرکز بنے رہے[2] ۔

حکیم صاحب کی تاریخِ وفات میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک ان کی وفات ۱۸۱۵ء/ ۱۲۳۱ھ میں ہوئی[3] اور بعض کے نزدیک ان کی وفات ۱۸۰۷ء/۱۱۲۲ھ میں ہوئی اور ''دخل الجنة بلا حساب'' سے تاریخ نکلتی ہے[4] ۔

حکیم شریف خان کی اکثر تصانیف طب و منطق سے تعلق رکھتی ہیں ۔ جن میں سے 'الحاشیة علی حمد اللہ' ، 'شرح سلم العلوم' (طب) 'علم المنطق' ، 'حاشیة النفیسی'

---

۱ ۔ نزہة الخواطر ۷ : ۲۱۱ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۱۵م ، ۳۳۲ ۔
۲ ۔ ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۱۵م ۔
۳ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۳۳ ، حیات اجمل ، ص ۹ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ۱۵م ، ۳۳۲ ۔
۴ ۔ نزہة الخواطر ۷ : ۲۱۱ ۔

'الفوائد الشریفیة علی شرح الاسباب و العلامات' (طب) 'شرح القانون علی الحمیات' (ابن سینا کی قانون کے حصہ متعلقہ بخار کی شرح) 'اسرار العلاج' 'فارسی ترجمہ مشکٰوۃ شریف' (حدیث) اور اردو ترجمہ 'قرآن شریف' جو انہوں نے شاہ عالم ثانی کے حکم سے لکھا تھا[1] ۔ حکیم شریف خان کی ان تصانیف میں سے دو ہماری خصوصی توجہ کی مستحق ہیں ، ایک 'حاشیة النفیسی' جو در اصل برہان‌الدین نفیس الکرمانی (م - ۱۴۳۶ء)کی 'شرح موجز القانون' پر حواشی ہیں ، ان حواشی کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ بعد میں برہان الدین نفیس کی اس شرح کے جتنے ایڈیشن شائع ہوئے ان کے حواشی پر حکیم شریف خان کے پرمغز حواشی بھی شامل اشاعت ہوتے رہے ۔ حکیم موصوف کی دوسری قابل توجہ تصنیف 'الفوائد الشریفیة' ہے ۔ یہ بھی نفیس کرمانی مذکور کی 'شرح الاسباب والعلامات' پر حواشی ہیں ، حکیم شریف خان نے اپنے حواشی کے مقدمے میں لکھا ہے کہ یہ حواشی گو انہوں نے زمانۂ شباب میں جمع کیے تھے مگر بعض وجوہات کی بنا پر مرتب نہ ہو سکے ، اب بعض دوستوں کے جوش دلانے پر یہ حواشی مرتب کر کے پیش کیے جا رہے ہیں ۔ آخر میں خاتمہ کے عنوان سے حکیم موصوف نے بعض مزید فوائد بھی پیش کیے ہیں جو بے حد مقبول ہیں ۔

مولانا عبدالعلی بحرالعلوم لکھنوی

مولانا عبدالعلی ملا نظام الدین سہالوی کی اولاد میں سے تھے جو ایک عالم فاضل اور بہت بڑے مصنف تھے ۔ آپ کو بحرالعلوم ملک العلماء کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور جنوبی ہند ، بنگال اور مدراس میں عربی و اسلامی علوم کی اشاعت آپ کے فیض کا نتیجہ ہے اور ''وہ اپنے عہد کی بے نظیر شخصیت ، فقہ و اصول کے امام اور منطق، فلسفہ اور کلام کے ماہر تھے''[2] ۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور سترہ سال کی عمر میں اپنے والد صاحب سے علوم متداولہ پڑھ کر فارغ ہوگئے ۔ اسی سال (۱۷۴۸ء) ان کے والد فوت ہو گئے ۔ بعد میں ملا کمال الدین سے استفادہ کرتے رہے جو ان کے والد کے ممتاز شاگرد تھے ۔ ایک مدت تک لکھنؤ میں تدریس میں مشغول رہے مگر ایک ناخوشگوار حادثے کے باعث وہاں سے نکل کر شاہ جہاں آباد میں حافظ رحمت خاں کے پاس چلے گئے ۔ پھر ان کی وفات پر نواب فیض اللہ خاں رئیس رامپور کی دعوت پر رامپور چلے گئے ۔ وہاں سے بوہار

---

۱ ۔ نزھة الخواطر ۶ : ۱۱۲ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۲۴۳ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۱۶۵ ، ۲۱۵ ، ۲۳۲ ۔

۲ ۔ نزھة الخواطر ۷ : ۲۸۲ ۔

میں منشی صدرالدین کے پاس اور بالآخر نواب محمد علی خاں رئیس کرناٹک کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے مدراس پہنچے اور ۱۸۱۹ء/۱۲۳۵ھ میں اپنی وفات تک وہیں تدریس و تالیف میں مشغول رہے[1] ۔ آپ تراسی سال کی عمر میں فوت ہوئے اور مدراس میں دفن ہوئے۔

بقول صاحب نزهة الخواطر :

''وہ علوم کے ایک بحر زخار، منطق ، فلسفہ، کلام اور اصول کے امام، فروعات میں مجتہد، تصوف فقہ کے ماہر، سخی، جری ، بہادر اور پر ہیزگار انسان تھے''[2]۔

''علامہ بحرالعلوم کی اصل جگہ علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی، علامہ وجیہ الدین گجراتی اور شیخ نورالدین احمد آبادی کے ساتھ ہے''[3] ۔

مولانا بحرالعلوم کی اہم تصانیف یہ ہیں : 'شرح سلم العلوم مع المنہیات' (منطق) 'حاشیہ علی میر زاہد رسالہ' (منطق) 'حاشیہ علی میر زاہد ملا جلال' (منطق) 'حاشیہ میر زاہد شرح المواقف' (علم الکلام) 'العجالة النافعة (منطق) 'حاشیہ علی شرح ہدایة الحکمة' (فلسفہ) 'فواتح الرحموت فی شرح مسلم الثبوت' (اصول فقہ) ، 'تحریر الاصول' (حساب) 'تنویر المنار شرح منار الاصول' (اصول فقہ) 'الارکان الاربعة' (فقہ) اور شروح مثنوی معنوی[4] ۔

ملا عبدالعلی بحرالعلوم نے متعدد درسی کتابوں پر جو حواشی یا شروح لکھیں وہ سب کی سب بہت مقبول ہوئیں ، تاہم ان میں قاضی محب اللہ بہاری کی اصول فقہ کے موضوع پر لاثانی کتاب 'مسلم الثبوت' کی شرح ہماری خصوصی توجہ کی مستحق ہے ۔ ملا بحرالعلوم کی طرح دیگر فرنگی محلی علماء نے بھی اس کتاب کی شروح لکھی ہیں۔ ان میں ملا محمد حسین ، ان کے فرزند ملا مبین اور ملا نظام الدین سہالوی قابل ذکر ہیں ۔ ان شروح میں سے ملا بحرالعلوم کی شرح بے حد مقبول ہے جس کا پورا نام 'فواتح الرحموت فی شرح مسلم الثبوت' ہے ۔ یہ شرح ممزوج ہے اور شارح نے متن کے مشکل الفاظ ، مبہم عبارات اور پیچیدہ مسائل کو خوب حل کیا ہے اور اصول فقہ کی اصطلاحات ، ماخذ

---

۱ - مفصل دیکھیے : نزهة الخواطر ۷ : ۲۸۲ ، حدائق الحنفیہ ، ص ۴۶۷ ببعد ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۳۰۶ ، ابجد العلوم ، ص ۹۲۷ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۳۰۴ ببعد، مقالات شبلی ۳ : ۱۱۶ ببعد رود کوثر ، ص ۶۱۰ ۔

۲ - نزهة الخواطر ۷ : ۲۸۶ ۔

۳ - رود کوثر ، ۶۱۰ ۔

۴ - نزهة الخواطر ۷ : ۲۸۶ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۳۰۶ ، ۳۳۶ ، ۳۸۸ ، ۴۱۶ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۳۰۴ ببعد ، حدائق الحنفیہ ، ص ۴۶۴ ببعد ، ابجد العلوم ، ص ۹۲۷ ۔

فقۂ اسلامی (کتاب ۔ سنت ، اجماع اور قیاس) پر مدلّل اور مفصل انداز میں بحث کی گئی ہے ۔

سید دلدار علی مجتہد العصر

سید دلدار علی بن محمد معین بن عبد الہادی حسینی نقوی نصیر آبادی برّ صغیر میں اہلِ تشیع کے پہلے مجتہد ہیں ، وہ سید نجم الدین سبزواری کی نسل سے تھے اور ۱۷۵۳ء/ ۱۱۶۶ھ میں پیدا ہوئے ۔ شیخ غلام حسین الہ آبادی ، مولوی حیدر علی سندیلوی اور رباب اللہ جونپوری سے علوم پڑھنے کے بعد کربلائے معلّی میں آقا باقر بہبہانی اور سید علی طبا طبائی سے فقہ ، حدیث اور اصول کی تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ مشہد میں سید مہدی سے استفادہ و اجازت کے بعد وطن واپس آئے[1] اور تدریس و تالیف کے ساتھ مذہبِ شیعہ کی اشاعت میں مشغول ہوگئے ۔ ان سے پہلے اہلِ تشیع میں جمعہ و جماعت کا رواج نہ تھا لیکن ملا محمد علی کشمیری کی تحریض اور مولانا دلدار علی کی تائید سے نواب آصف الدولہ کے عہد میں باقاعدہ جمعہ اور نماز باجماعت کا آغاز ہوا اور نواب صاحب کے حکم سے مولانا دلدار علی نے ۱۷۸۵ء/رجب ۱۲۰۰ھ میں پہلی نمازِ باجماعت میں امامت کے فرائض انجام دیے[2] ۔

ان کی اہم تصانیف یہ ہیں : 'ابطال الفوائد المدنیة' ، 'عماد الاسلام' ، 'منتہی الافکار' ، 'اساس الاصول' ، 'الشہاب الثاقب' ۔ اس کے علاوہ 'تحفہ اثنا عشریة' کے جواب میں کئی رسائل لکھے[3] ۔

مجتہد العصر حضرت مولانا سید دلدار علی شاہ کی ان تصانیف میں سے ہم صرف ایک 'اساس الاصول' پر خصوصی توجہ دیں گے ، کیونکہ شیعہ نقطہ نظر سے اصولِ فقہ کے موضوع پر یہ کتاب نہ صرف جامع و مفید بلکہ مسلم و مستند بھی ہے ۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کو ایک مقدمہ ، چار مقاصد اور ایک خاتمہ کی بنیاد پر مرتب کیا ہے ۔ مقدمے میں فقہی ابحاث کے ساتھ علم الکلام و العقائد کی بحثیں بھی ہیں اور شیعہ عقائد پر معترضین کے جوابات بھی ہیں ، مقاصد میں اصولِ دین اور اصولِ فقہ کے

---

۱ ۔ نزهة الخواطر ۷ : ۱۶۶ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۸۶ ، رود کوثر ، ص ۶۳۲ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۳۳۶ ، ۳۵۰ ، نجوم السماء ، ص ۳۰۲ ۔

۲ ۔ ایضاً ۔

۳ ۔ نزهة الخواطر ۷ : ۱۶۶ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۸۶ ، رود کوثر ، ص ۶۳۲ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۳۳۶ ، ۳۵۰ ، نجوم السماء ، ص ۳۰۲ ۔

بنیادی مسائل سے بحث ہے - ہر مقصد کئی ایک فصول پر مشتمل ہے ، خاتمہ میں اجتہاد پر بحث کی گئی ہے اور اس سلسلے میں کئی ایک فوائد نافعہ درج ہیں - کتاب کی تصنیف کا بنیادی مقصد محمد امین استر آبادی کی کتاب مسمی "الفوائد المدنیة فی الرد علی من قال بالاجتہاد والتقلید فی الاحکام الالہیة" کا رد ہے - تاہم کتاب بحیثیت مجموعی شیعی عقائد و اصول کے بارے میں مفید مواد مہیا کرتی ہے ، مجتہد العصر علم الاصول کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

اِنَّ اَعْظَمَ العلومِ الدینیة قدراً وَاَرْجَحَہَا شرفاً بَعْدَ علم التوحید ھُوَ علمُ الاصول والاحکام لحلّ معاقد الحلال والحرام، فانّہ رئیسُ العلومِ الدینیة و رأسُہا ومبنیٰ لقواعد الشرع وأساسُہا ، اِذْ یتعذّر بدونہ امتثالُ الأوامر الالہیّة واستعمال القوانین الشرعیة

(علم توحید کے بعد علوم دینیہ میں قدر کے لحاظ سے سب سے بڑا اور شرف کے اعتبار سے سب سے زیادہ قابل ترجیح علم الاصول والاحکام ہے ، کیونکہ اسی کے ذریعہ حلال و حرام کے مسائل کا پتہ چلتا ہے ، یہی علم دینی علوم کا سردار اور چوٹی ہے ، اور یہی علم قواعد شرع کی بنیاد ہے - کیونکہ اس کے بغیر اوامر الٰہی بجا لانا اور قوانین شرع کا استعمال کرنا مشکل ہے)[1] -

محمد غوث شرف الملک نایطی

شیخ محمد غوث بن ناصرالدین بن نظام الدین بن عبداللہ الشافعی المدراسی ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۳ء میں پیدا ہوئے - ان کا تعلق ان عرب قبائل سے ہے جو حجاج بن یوسف کے ہاتھوں مدینہ کی تباہی کے بعد ہندوستان آئے اور نوائط کہلائے - کتب متداولہ کی تعلیم پہلے اپنے دادا سے پھر مولانا امین الدین صدیقی الوری سے حاصل کی - سند فراغت ملا بحرالعلوم لکھنوی سے حاصل کی - پھر امیرالامراء بن والا جاہ کا تقرب حاصل ہوا اور محکمۂ عدل و قضا ان کے سپرد ہوا - ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء میں حیدرآباد گئے مگر واپس آنا پڑا - اس وقت عظیم الدولہ بن امیر الامراء حکمران تھا جو ان کا شاگرد تھا - اس نے وزارت عظمیٰ پر فائز کیا اور "شرف الدولہ شرف الملک غالب جنگ" کے لقب سے نوازا

---

١ - اسلوب الاصول ، [illegible]

چنانچہ ۱۸۰۱ء سے ۱۸۰۸ء تک اسی منصب پر فائز رہے[1]۔

شیخ شرف الملک کی اہم تصانیف یہ ہیں : 'نثر المرجان فی رسم نظم القرآن' (علوم قرآن) ، 'الفوائد الصبغیۃ فی شرح الفرائض السراجیۃ' (علم میراث) ، 'سواطع الأنوار' ، 'زواجر الارشاد الی اهل دارالجهاد' (مسئلہ جہاد پر) ، 'تعلیقات علی شرح قطرالندی' ، (نحو) ، 'النجم الوقاد شرح قصیدۃ بانت سعاد' (ادب) ، 'حواشی علی القاموس' (لغت) ، 'نور الفوائد و بحورالفرائد' (علم میراث) ۔ اس کے علاوہ فارسی میں ان کی اہم تصانیف کے نام مندرجہ ذیل ہیں :

۱ ۔ 'انہار المفاخر فی مناقب السید عبدالقادر'
۲ ۔ 'الیواقیت المنثورۃ فی الاذکار الماثورۃ'
۳ ۔ 'الفتاویٰ الناصریۃ فی فقہ الحنفیۃ'[2]

شاہ عبدالعزیز دہلوی

مولانا شاہ عبدالعزیز بن ولی اللہ دہلوی ۱۷۴۶ء/۱۱۵۹ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ''پندرہ سال کی عمر میں اپنے والد سے تمام علوم عقلیہ و نقلیہ اور کمالات ظاہری و باطنی سے فراغت حاصل کر لی ۔ اپنے پدر بزرگوار کے بعد مسند درس و ارشاد کو سنبھالا ۔ تمام علوم کے جامع اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے ۔ زبان و قلم جو کچھ ان کی تعریف و توصیف کرے وہ[3] کم ہے''۔ آپ کو 'سراج الهند' اور 'حجۃ اللہ' کے القاب سے یاد کیا جاتا تھا[4]۔ والد کے علاوہ شیخ نور اللہ برہانوی ، شیخ امین اللہ کشمیری اور محمد عاشق پھلتی سے بھی فیض علم حاصل کیا[5]۔ ان سے استفادہ کرنے والوں میں ان کے بھائی رفیع الدین ، عبدالقادر ، عبدالغنی ، عبدالحئی بن ھبۃ اللہ بڑھانوی اور مفتی الٰہی بخش کاندھلوی وغیرہ شامل ہیں[6]۔ آپ کی وفات ۱۸۲۳ء/۱۲۳۹ھ میں ہوئی[7]۔

---

۱ ۔ نزهۃ الخواطر ۷ : ۴۵۹ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۴۶۷ ۔
۲ ۔ تفصیل کے لیے نزهۃ الخواطر ۷ : ۴۶۰ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۴۶۷ ، ۴۷۳ ، ۴۸۳ ۔
۳ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۳۰۲ ۔
۴ ۔ نزهۃ الخواطر ۷ : ۲۶۸ ۔
۵ ۔ ایضاً ۔
۶ ۔ ایضاً ، ص ۲۶۹ ۔
۷ ۔ مفصل دیکھیے نزهۃ الخواطر ۷ : ۲۶۸ بعد ، تذکرہ اہل دہلی ، ص ۵۲ ، حدائق الحنفیۃ ص ۴۶۰ ۔ تراجم علمائے اہل حدیث ۱ : ۴۲ ، ابجدالعلوم ، ص ۹۱۴ ، علمائے ہند کا شاندار ماضی ۲ : ۴۴ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۳۰۲ بعد ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۴۸۹ ۔

شاہ صاحب عربی و اسلامی علوم میں یکتائے روزگار ہونے کے علاوہ عربی کے ایک عمدہ شاعر بھی تھے ۔ سرسید اور صاحب 'نزهة الخواطر' نے کلام کے نمونے دیے ہیں ۔

ان کی تصانیف میں سے 'فتح العزیز' (تفسیر قرآن) ، 'الفتاوی العزیزیة' (فقہ) ، 'تحفۂ اثنا عشریہ' (شیعہ عقائد کے رد میں لاجواب کتاب ہے) ، 'بستان المحدثین' ، 'عجالۂ نافعہ' ، 'میزان البلاغة' 'میزان الکلام' ، 'سرالشهادتین' (امام حسن رض اور امام حسین رض کی شہادت کا فلسفہ) اور 'السرالجلیل فی مسئلة التفضیل' ۔

شاہ صاحب کی عربی تصانیف میں سے 'سرالشهادتین' بڑی دلچسپ کتاب ہے ، یہ کتاب مستند احادیث نبوی ص اور آثار صحابہ کی بنیاد پر لکھی گئی ۔ شاہ صاحب نے اس میں زہر خورانی کے ذریعہ شہادت امام حسن رضی اللہ عنہ اور میدان قتال میں شہادت امام حسین رضی اللہ عنہ کے صحیح و تفصیلی پس منظر کے علاوہ ان ہر دو شہادتوں کا حقیقی مقصد یا راز (سر) بھی بیان فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالٰی نے وہ تمام خوبیاں اور خصائص عطا فرمائے جو انبیاء سابقین کو فرداً فرداً دیے گئے تھے اور اس کے علاوہ بھی بعض محاسن و کمالات آپ کو دیے گئے جو صرف آپ کی ذات کے لیے خاص تھے مگر شہادت جو ایک اعلٰی مرتبہ ہے ، یہ آپ کو نہیں دیا گیا کیونکہ اگر آپ شہید ہو جاتے تو ایک تو آپ کو وہ شہرت نہ ملتی جو آپ کو نصیب ہوئی ، دوسرے آپ کی شہادت سے شوکت اسلام کو ضعف پہنچتا۔ اس لیے حکمت ربانی یہی تھی کہ آپ کو شہادت سری (خفیہ طور پر) اور شہادت جہری (میدان قتال میں) سے محفوظ رکھا جائے اور آپ کے بجائے حسنین کی شہادت سے یہ کمی پوری ہو اور آپ کے خاندان کو نبوت کے ساتھ ساتھ شہادت کا شرف بھی حاصل ہو جائے۔

شاہ صاحب نے بہت قصائد عربی اپنی یادگار چھوڑے ہیں ان میں سے ایک قصیدہ میمیہ در مدح رسول ص بھی ہے ، اس کے چند شعر یہ ہیں :

فَمَنْ لِی بَعْدَ مَا وَهَنَتْ عِظَامِی ... اِذَا اشْتَدَّ الْبَلَاءُ سِوَاكَ حَامِی

وَاِنْ اَكُ ظَالِماً عَظُمَتْ ذُنُوبِی ... مُحِبُّكَ سَیِّدِی مَاحِی الْاٰثَامِ

فَقَدْ اُعْطِیتَ مَا لَمْ یُعْطَ خَلْقٌ ... عَلَیْكَ صَلَاةُ رَبِّكَ بِالسَّلَامِ

۱ ۔ جب میری ہڈیاں کمزور پڑ جائیں گی اور مشکل سخت ہو جائے گی تو پھر آپ کے

سوا میرا حامی کون ہوگا ؟

۲ ۔ اگرچہ میں ظالم ہوں اور میرے گناہ بھی بہت ہیں مگر میرے آقا آپ کی محبت تو تمام گناہ کو محو کرنے والی ہے!

۳ ۔ آپ کو وہ کچھ دیا گیا ہے جو کسی کو نہ ملا ۔ آپ پر اللہ کی طرف سے درود و سلام ہو !

مولانا فضل امام خیرآبادی

مولانا فضل امام بن محمد ارشد بن محمد صالح بن عبدالواجد (جیم کے ساتھ) بن عبدالماجد بن قاضی صدرالدین فاروقی حنفی ہرگامی ثم خیرآبادی[1] کا سلسلۂ نسب سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے[2]۔ اپنے عہد کے مشاہیر اور مستند علماء میں سے تھے۔ منطق اور فلسفہ کے منفرد فاضل اور مسلّم امام تھے اور اس میدان میں ان کا کوئی ہمسر اور ہم پلہ نہ تھا[3]۔

آپ کا مولد و منشا خیرآباد ہے ۔ یہیں آپ نے مولانا مفتی عبدالواجد خیرآبادی (متوفی ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء ، جو ایک طویل مدت تک خیرآباد ہی میں صدرالاساتذہ رہے اور پھر راجہ ٹکیت رائے کے حکم سے لکھنو کے مفتی مقرر ہوئے[4]) سے علوم متداولہ کی تحصیل کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اور منطق و فلسفہ پر اپنی توجہ مرکوز کر کے اس فن کے امام وقت قرار پائے[5]۔

انگریزوں کے عہد میں پہلے دہلی کے مفتی اور پھر صدرالصدور مقرر ہوئے ۔ جہاں آپ نے درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تألیف کا مشغلہ بھی جاری رکھا اور ایک مدت تک انگریزی حکومت کی خدمات انجام دینے کے بعد پنشن حاصل کی اور اپنے وطن مالوف خیرآباد میں لوٹ آئے جہاں ۱۸۲۷ء/ذی القعدہ ۱۲۴۳ھ میں وفات پائی[6]۔

---

۱ ۔ نزہۃ الخواطر ۷ : ۳۷۴ ۔
۲ ۔ ابجدالعلوم ، ص ۹۲۳ ۔
۳ ۔ نزہۃ الخواطر ۷ : ۳۷۴ ۔
۴ ۔ نزہۃ الخواطر ۷ : ۳۱۲ ۔
۵ ۔ نزہۃ الخواطر ۷ : ۳۷۴ ۔
۶ ۔ نزہۃ الخواطر ۷ : ۳۷۴ ، تذکرہ اہل دہلی ، ص ۸۶ (یہاں تاریخ وفات ۱۲۴۴ھ لکھی ہے) ، الثقافۃ الاسلامیہ ، ص ۱۳۲ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۳۷۶ ۔

بقول صاحب 'نزھۃ الخواطر' مولانا فضل امام خیر آبادی کو فقہ و حدیث میں مہارت حاصل نہ تھی بلکہ آپ کا خاص میدان فلسفہ اور منطق تھا[۱] - "علوم عقلیہ میں نہایت شہرت رکھتے تھے"[۲] - معقولات میں امامت و تفوق کا یہ مرتبہ آپ نے اپنی نسل کو ورثے میں منتقل کیا - چنانچہ آپ کے صاحبزادے مولانا فضل الحق خیرآبادی (م - ۱۸۶۱ع/۱۲۷۸ھ) مصنف 'الجنس الغالی فی شرح الجوھر العالی'[۳] اور 'الھدیۃ السعیدیۃ فی الحکمۃ الطبیعیۃ' اور آپ کے پوتے عبدالحق خیر آبادی 'شارح ھدایۃ الحکمۃ' بھی معقولات کے امام تھے[۴] -

خیر آباد اور دہلی میں مولانا کے حلقۂ درس میں بڑے بڑے فضلاء شامل ہوئے اور کسب فیض کر کے فارغ ہوئے جن میں مولانا کے صاحبزادے فضل الحق خیرآبادی، شاہ غوث علی پانی پتی اور مفتی صدر الدین آزردہ (جو مولانا فیض الحسن فیض سہارنپوری کے استاذ تھے) بھی شامل ہیں[۵] - بقول سر سید احمد خاں :

> "علوم عقلیہ اور فنون حکمیہ کو ان کی طبع وقار سے اعتبار تھا اور علوم ادبیہ کو ان کی زبان ذاتی سے افتخار تھا ، اگر ان کا ذہن رسا دلائل قطعیہ بیان نہ کرتا ، فلسفہ کو معقول نہ کہتے اور اگر ان کا فکر صائب ، براہین ساطعہ قائم نہ کرتا ، اشکال ہندسی تار عنکبوت سے سست تر نہیں آتے - اس نواح میں ترویج علم و حکمت و معقول کی اسی خاندان سے ہوئی - گویا اس دودہ والا تبار سے اس علم نے یک جہتی بہم پہنچائی"[۶] -

مولانا کی وفات پر مرزا غالب نے قطعہ تاریخ انتقال کہا جو کتب سیر و تراجم اور 'کلیات غالب' میں درج ہے[۷] :

اے دریغا قبلۂ ارباب فضل	کرد سوئے جنت الماویٰ خرام
چوں ارادت از پئے کسب شرف	جست سال فوت آں عالی مقام

---

۱ - نزھۃ الخواطر ج ۷ : ۳۷۳ -
۲ - تذکرہ علمائے ہند ، ص ۳۷۶ -
۳ - نزھۃ الخواطر ج ۷ : ۳۷۳ -
۴ - ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۲۵۳ -
۵ - تذکرہ علمائے ہند ، ص ۳۷۶ ؛ ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۲۴۲ ، بعد -
۶ - تذکرہ اہل دہلی ، ص ۸۶ -
۷ - تذکرہ اہل دہلی ، ص ۸۵ -

چہرۂ ہستی خراشیدم نخست تابنائے تحزجہ گردد تمام
گفتم اندر ''سایہ لطفِ نبی''[۲۴۵] باد آرامش کہ ''فضلِ امام''[۹۹۹]

مرزا کے اس قطعہ سے ۵ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ء) تاریخ وفات نکلتی ہے اور یہی درست ہے۔

مولانا فضل امام کی شہرہ آفاق تصنیف 'المرقاۃ' (جو علم منطق پر ایک جامع و مختصر کتاب ہے اور مدارسِ نظامیہ کے نصابِ تعلیم میں متن کی حیثیت سے شامل ہے) کے علاوہ 'تلخیص الشفاء' (شیخ رئیس بو علی سینا کی 'الشفاء' کا خلاصہ)، 'تشحیذ الاذھان فی شرح المیزان' (منطق) 'الحاشیۃ علی الحاشیۃ الزاھدیۃ الجلالیۃ' (منطق) اور 'الحاشیۃ علی الحاشیۃ الزاھدیۃ القطبیۃ' (علم منطق) آپ کی زندہ جاوید یادگاریں ہیں[۱]۔

شاہ اسماعیل شہید

مولانا محمد اسماعیل شہید بن عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ دہلوی ۱۷۷۹ء/۱۱۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ کتبِ درسیہ اپنے چچاؤں عبدالعزیز، عبدالقادر اور رفیع الدین سے پڑھیں اور معقولات و منقولات میں کمال پیدا کیا پھر سید احمد شہید بن عرفان بریلوی کے مرید ہوئے اور ۱۸۱۵ء/۱۲۳۷ھ میں ان کے ساتھ حج کیا اور ان کی تحریکِ مجاہدین میں شریک ہوئے۔ اپنی باقی زندگی جہاد فی سبیل اللہ کی نذر کر دی اور ۱۸۳۱ء/۱۲۴۶ھ میں بالا کوٹ کے مقام پر اپنے مرشد کے ساتھ شہید ہوئے[۲]۔ شاہ صاحب ''دیانت اور بلندیٔ فکر میں یگانۂ روزگار نیز اپنے زمانے کے بڑے عالموں میں سے تھے''[۳]۔

شاہ صاحب نے طویل اسفار اور جہادِ فی سبیل اللہ کے معرکوں میں شرکت کے ساتھ بلند پایہ تصانیف بھی چھوڑی ہیں۔ جیسے 'منصبِ امامت' (اس میں منصب نبوت و امامت سے بحث ہے)، 'صراطِ مستقیم' (توحید و شرک اور دیگر مسائل کے بیان میں جو انہوں نے اپنے شیخ و مرشد سید احمد بریلوی سے قولاً و فعلاً اخذ کیے)، 'ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت و الضریح' (بدعات مروجہ کے خلاف)، 'مبحث امکان النظیر و امتناع النظیر' (عقائد و علم الکلام)، ''الاشراک والبدع'، 'تقویۃ الایمان'، 'تنویر العینین

---

۱ - نزھۃ الخواطر ۷ : ۳۷۳، تذکرہ علمائے ہند، ص ۳۷۶- ڈاکٹر زبید احمد، ص ۲۱۷ ببعد -
۲ - نزھۃ الخواطر ۷ : ۵۶ ابجد العلوم ، ص ۹۱۶، اتحاف النبلاء ، ص ۴۱۶ ، تراجم علمائے اہل حدیث ۱ : ۷۹ ببعد ، تذکرہ اہل دہلی ص ۴۶ ، موج کوثر ، ص ۳۳ ببعد ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۳۰۷ -
۳ - تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۲۴ -

فی اثبات رفع الیدین'، 'عبقات' اور مختلف موضوعات پر دیگر رسائل ۔

شاہ رفیع الدین دہلوی

مولانا شاہ رفیع الدین عبدالوہاب بن شاہ ولی اللہ دہلوی ۱۷۴۹ء/۱۱۶۳ھ میں پیدا ہوئے ۔ علومِ متداولہ اپنے بھائی شاہ عبدالعزیز سے پڑھے اور شیخ محمد عاشق پھلتی کے مرید ہوئے ۔ بیس سال کی عمر میں تدریس اور افتاء کے فرائض انجام دینے لگے ۔ حدیث ، فقہ ، کلام اور منطق و فلسفہ کے امام تھے[۱] ۔ ''دیارِ ہندوستان کے جمیع فضلائے نامی انہیں حضرت فیض موہبت کے مستفیضوں میں سے ہیں ۔ ہر فن کے ساتھ اس طرح کی مناسبت تھی کہ ایک وقت میں فنون متباینہ اور علوم مختلفہ درس فرماتے تھے''[۲] وہ بھی اپنے باپ اور بھائیوں کی طرح علم و فضل میں کامل اور علومِ عربیہ کے ماہر ہونے کے علاوہ عربی کے شاعر بھی تھے ۔ ان کے کلام کے نمونے سرسید اور صاحبِ 'نزهۃالخواطر' نے دیے ہیں[۳] ۔

ترجمہ قرآن (اردو) کے علاوہ آپ کی اہم تصانیف یہ ہیں ۔ 'دمغ الباطل' (معرفت و تصوف کے بعض مسائل پر) 'اسرار المحبۃ' 'تکمیل الصناعۃ' (علم منطق) 'مقدمۃ العلم و الاکتساب' ، 'الحاشیۃ علی الحاشیۃ الزاهدیۃ القطبیۃ' (علم منطق) اور مختلف موضوعات پر کئی رسائل[۴] ۔

شاہ رفیع الدین کی عربی تصانیف میں سے ایک دلچسپ کتاب 'تفسیرآیۃ النور' ہے ۔ یہ کتاب ایک مقدمہ ، ایک مقصد ، ایک تکملہ اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے ۔ اڑھائی سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں شاہ صاحب نے سورہ نور (۲۴ : ۳۵) کی پینتیسویں آیت کی تشریح اور تفسیر پیش کی ہے ، وجوہ اعراب کے علاوہ آیت کریمہ میں بیان کردہ مضامین کی مفید تاویلات بھی موجود ہیں ۔ شیخ احمد یمنی شروانی کے نام ایک خط میں شاہ عبدالعزیز نے اس کتاب کے مضامین اور اسلوبِ بیان کی بہت تعریف کی ہے ۔

شاہ رفیع الدین اپنے والد اور بھائی کی طرح عربی زبان کے عمدہ شاعر بھی تھے آپ

---

۱ ۔ نزهۃ الخواطر ، ۷ : ۱۸۴ ، تذکرہ اہل دہلی ، ص ۴۷ ، حدائق الحنفیہ ، ص ۴۶۹ ببعد ، ابجد العلوم ، ص ۹۱۵ ، تذکرہ علمائے ہند ۱۵۶ ۔

۲ ۔ تذکرہ اہل دہلی ص ۴۷ ۔

۳ ۔ ایضاً ۔ نزهۃ الخواطر ، ۷ : ۱۸۴ ۔

۴ ۔ ایضاً ۔ اور ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۲۱۸ ۔

نے ابن سینا کے مشہور قصیدہ عینیہ کا جواب بھی لکھا تھا جو "قصیدۃ الروح" کے نام سے بھی موسوم ہے ، مدح رسول ؐ میں آپ ایک جگہ فرماتے ہیں :

یا احمد المختار یا زین الوریٰ	یا خاتماً للرسل ما اعلا کا
یا کاشف الضراء من مستنجد	یا منجیا فی الحشر من والا کا
ھل کان غیرك فی الانام من استوی	فوق البراق وجاوز الافلاکا
واستمسك الروح الامین رکابہ	فی سیرہ وا ستخدم الا ملاکا

۱ - اے احمدِ مختار ! اے زینتِ مخلوق ! اے خاتم رسلؐ تجھ سے بڑھ کر کوئی ہے ؟

۲ - اے فریادی کی مشکلات کو دور کرنے والے اور حشر میں اپنے محبت کرنے والوں کو نجات دلانے والے !

۳ - کیا آپ کے سوا کسی اور کو یہ شرف حاصل ہوا ہے کہ وہ براق پر سوار ہو کر افلاک سے آگے گیا ہو ؟!

۴ - اور سفر میں جبریل امین نے اس کی رکاب تھامی ہو اور فرشتوں نے اس کی خدمت کی ہو ؟

شاہ رفیع الدین کی وفات ۱۸۳۳ء/۱۲۴۹ھ میں ہوئی -

قاضی ارتضا علی خان گوپاموی

قاضی ارتضا علی خان بن قاضی مصطفیٰ علی خان گوپا موی ۱۷۸۳ء/۱۱۹۸ھ میں پیدا ہوئے - مولوی حیدر علی سندیلوی سے علومِ عقلی و نقلی کی تحصیل کی ، ادب و لغت کی تعلیم مولوی ابراہیم بلگرامی سے حاصل کی - ۱۸۱۰ء/۱۲۲۵ھ میں وہ اپنے باپ کے پاس مدراس میں گئے جہاں وہ قاضی تھے - والد کی وفات پر یہ منصبِ قضا بیٹے کو ملا ، ان کی وفات ۱۸۳۵ء/۱۲۵۱ھ میں ہوئی[۱] -

قاضی ارتضا علی خان شریعت و طریقت کے جامع اور فلسفہ ، ریاضی اور علومِ عربیہ میں مہارت رکھتے تھے - آپ کی قابلِ ذکر تصانیف یہ ہیں : 'النفائس الارتضائیۃ فی شرح الرسالۃ العزیزیۃ المنحۃ السراء' ، 'نقود الحساب' ، 'شرح قصیدہ بردہ' ، 'رسالہ فرائض'

---

۱ - تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۰۸ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۳۰۷ ، ۳۶۸ [illegible]

وز 'صدوا وملا جلال' کے حواشی ۔

قاضی ارتضا علی گوپاموی کی ان تصانیف میں سے دو پر خصوصی نظر کی ضرورت ہے، ان میں سے ایک تو 'النفائس الارتضائية' ہے ، یہ مختصر سی کتاب دراصل شاہ عبدالعزیز دہلوی کے ایک مختصر رسالے کی شرح ہے جو انہوں نے علم البلاغة (المعانی ، البیان و البدیع) کے موضوع پر تصنیف کیا تھا اصل رسالہ کا نام 'الرسالة العزيزية' ہے جو عام طور پر 'میزان البلاغة' کہلاتا ہے ، اختصار و جامعیت کے لحاظ سے یہ رسالہ اور اس کی شرح 'النفائس الارتضائية فی شرح الرسالة العزيزية' بہت مفید ہیں۔ شارح نے آخر میں شاہ عبدالعزیز دہلوی کے حالات زندگی اور تصانیف پر عربی میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ۔

قاضی گوپاموی کی دوسری کتاب جو خصوصی توجہ کی مستحق ہے وہ ہے المنحة السراء فی شرح الدعاء المسمی بکاشف الضراء ، اس کتاب میں انہوں نے اللہ جل شانہ' کے اسم ذاتی اور اسماء حسنی (صفاتی نام) سے بحث کی ہے ، ان کے نزدیک صفاتی اسماء کئی قسم کے ہیں ، بعض صفات جلالی ہیں جیسے القہار ، الجبار اور المقتدر ۔ بعض صفات جمالی ہیں جیسے السلام ، المعز الغفار ، اور بعض مشترک ہیں یعنی جلال و جمال دونوں کی حامل ہیں اور یہ وہ صفات ہیں جنہیں صفات کمالی کا نام دیا جاتا ہے جیسے الرحمٰن ، القیوم ۔ ہرصفت اور ہر اسم کا اثر ہوتا ہے اور یہ اثر دراصل مظہر ہے اس اسم کے جلال ، جمال یا کمال کا ، چنانچہ جنت جمال مطلق کا مظہر ہے ۔ دوزخ جلال مطلق کا مظہر ہے اور دنیا و آخرت وغیرہ مشترک قسم کے اسماء کا مظہر ہیں[1] ۔

حکیم محمد مہدی الہروی

حکیم محمد مہدی بن علی اصغر بن نور محمد خان الہروی نصیرالدین حیدر کے وزیراعظم تھے۔ رئیس الاطباء اور حکیم علی شریف لکھنوی سے علوم پڑھے تھے۔ انہوں نے ستر ہزار روپے کی لاگت سے کالی ندی پر پل بنوایا تھا ۔ ۱۸۳۲ء/۱۲۴۸ھ میں منصب سے معزول ہوئے پھر ۱۸۳۷ء میں محمد علی شاہ کے وزیراعظم مقرر ہوئے اور چند ماہ بعد اسی سال وفات پائی ۔

حکیم صاحب نے طب اور ریاضی کے میدان میں کمال پیدا کیا اور 'حلیة الواصفین

---

۱ ۔ المنحة السراء ، ص ۵۔

و شاح الطالبین' ان کی تصنیف ہے ۔ یہ کتاب علم طب کے موضوع پر انہوں نے اپنے استاد کی کتاب 'اسرار العلاج' کے نمونے پر لکھی ہے جو ایک مقدمہ ، چند مقالات اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے ۔ مقدمے میں طب کی اہمیت بیان کرنے کے علاوہ اپنے استاد حکیم علی شریف اور استاد الاستاذ علوی خان کی بھی تعریف کی ہے ۔ خاتمہ میں بعض امراض کی علامات اور اثرات کا بیان ہے ۔

احمد بن محمد یمنی شروانی

شیخ احمد بن محمد علی بن ابراہیم شروانی ۱۷۸۶ء/۱۲۰۰ھ میں یمن کے ایک شہر حدیدہ میں پیدا ہوئے ۔ شیخ محسن بن عیسی نجفی اور بہاءالدین العاملی سے فنون ادبیہ کی تحصیل کی ۔ شیخ علی عفیف یمانی اورسید زین العابدین علوی سے فقہ شافعی اور اپنے والد سے فقہ شیعہ کی تعلیم حاصل کی ۔ تیرھویں صدی ہجری(انیسویں صدی عسوی) میں برّصغیر میں وارد ہوئے اور مختلف شہروں میں پھرتے رہے ۔ پھر کلکتہ میں مقیم ہوگئے۔ جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت بھی کی اور اسی دوران میں 'نفحۃ الیمن' بھی تصنیف کی ۔ بعد میں وہ نواب آصف الدولہ کے پاس چلے گئے ۔ پھر فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں عربی کے استاد مقرر ہوئے ۔ جہاں سے استعفا دے کر غازی الدین حیدر کے پاس لکھنو گئے اور اس کی مدح میں شعر کہے[1] ۔

'نفحۃ الیمن فیما یزول بذکرہ الشجن' کے علاوہ انہوں نے یہ تصانیف چھوڑی ہیں: 'عجب العجاب بما یفید الکتاب' ، 'المناقب الحیدریۃ' ، 'شمس الاقبال فی مناقب ملک بھوپال' ، حدیقۃ الافراح' ، 'منہج البیان' ، 'الشافی' ، 'بحرالنفاس' ، 'جوارس التفریح اور 'الجوہر الوقاد فی شرح بانت سعاد'[2] ۔

شیخ احمد شروانی کی ان تصانیف میں سے 'نفحۃ الیمن' ہماری خصوصی توجہ کی مستحق ہے ۔ یہ کتاب انہوں نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں عربی کے استاد کی حیثیت سے مرتب کی اور ایک فاضل مستشرق 'متی لمزدن' کے ایما پر لکھی جس کی مقدمہ میں انہوں نے بے حد تعریف کی ہے (عین الفضل والفخار و بہجۃ محافل العز و الوقار یعنی ایک ایسا انسان جو فضل و فخر کا سرچشمہ ہے اور عزت و وقار کی محفلوں کی مسرت ہے) اور جو کالج مذکور کا صدر مدرس بھی تھا ۔ کتاب کا پورا نام

---

۱ ۔ نزہۃ الخواطر ۷ : ۴۳ ، تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۳ ، ڈاکٹر زبید احمد ، ص ۲۱۹ ، ۲۵۰ ۔

۲ ۔ مفصل دیکھیے تذکرہ علمائے ہند ، ص ۱۰۵ ، نزہۃ الخواطر ۷ : ۴۳ ، ڈاکٹر زبید احمد ص ۲۱۹ ، ۲۵۰ ، ۳۷۶ ۔

'نفحۃ الیمن فیما یزول بذکرہ الشجن' ہے جو برِصغیر میں عربی نظم و نثر کے بہترین انتخابی مجموعوں میں سرِفہرست ہے۔ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے، باب اول میں دلچسپ لطائف اور کہانیاں ہیں، دوسرے باب میں نرگس و گلاب کا مناظرہ (مناظرۃ النرجس والورد، جو شیخ علی بن احمد الیمنی کی تصنیف ہے) اور مناظرہ منجم و طبیب (مناظرۃ المنجم والطبیب المسماۃ بمنیۃ الطبیب جو علامہ محمد مؤمن الجزائری کی تصنیف ہے) پر مشتمل ہے۔ تیسرا باب منتخب اشعار پر مشتمل ہے، چوتھے باب میں ابوبکر زبیدی کا قصیدہ لامیہ، صلاح الدین صفدی کا لامیۃ، طغرائی کا لامیۃ جو 'لامیۃ العجم' کہلاتا ہے اور عمر بن الوردی کا لامیہ نقل کیا گیا ہے اور اشعار کی ضروری تشریح بھی شامل ہے۔ پانچویں باب میں نظم و نثر پر مشتمل ضرب الامثال پیش کی گئی ہیں۔ 'نفحۃ الیمن' مدتوں سے مدارس نظامیہ کے نصابِ تعلیم میں شامل ہے۔

شیخ محمد عابد سندھی

شیخ محمد عابد سندھی بن احمد علی بن مراد بن یعقوب بن محمود انصاری خزرجی ایوبی سندھی حیدر آباد (سندھ) کے نواح میں پیدا ہوئے۔ اپنے دادا اور والد کے ہمراہ دیارِ عرب میں سفر کر رہے تھے کہ دادا حدیدہ میں اور والد ماجد جدہ میں فوت ہو گئے۔ علومِ متداولہ اپنے چچا محمد حسین بن محمد مراد سے اور حجاز و یمن کے علماء سے پڑھے جن میں شیخ عبد الرحمان الاھدل یمنی، شیخ یوسف بن محمد المزجاجی اور مفتی عبدالملک القلعی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یمن میں زیادہ تر زبید میں قیام رہا۔ امام یمن کے علاج کے لیے صنعاء جاتے رہے، جہاں امام کے وزیر کی بیٹی سے شادی ہوئی۔ امام یمن کے سفیر کی حیثیت سے محمد علی پاشا کے پاس مصر گئے۔ سندھ میں آئے مگر یہ سرزمین راس نہ آئی اور دیارِ عرب کو لوٹ گئے۔ حدیدہ میں قید ہوئے اور بالآخر مدینہ منورہ میں چلے گئے۔ جہاں محمد علی پاشا نے انہیں رئیس العلماء مقرر کیا اور یہیں ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں وفات ہوئی[1]۔

---

۱ - نزهة الخواطر ۷ : ۶۳۳ ببعد، ابجد العلوم ص ۵۴، تذکرہ علمائے ہند ص ۹۳۳، ڈاکٹر زبید احمد ج ۳ ص ۲۰۸۔

شیخ عابد علمِ طب میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے ۔ اس کے علاوہ نحو ، صرف ، فقہ حنفی اور عربی شاعری میں بھی خاص مقام رکھتے تھے ۔ 'نزهة الخواطر'[۲] میں ان کا نمونۂ کلام درج ہے ۔ آپ کی تصانیف میں سے 'المواهب اللطیفة علی مسند الامام ابی حنیفة' ، 'شرح تیسیر الوصول الی احادیث الرسول' ، (اصول حدیث) 'شرح بلوغ المرام (حدیث) 'حصر الشارد فی اسانید محمد عابد' (فہرست شیوخ و اخذ سند حدیث) اور 'طوالع الانوار علی الدر المختار' (فقہ) قابلِ ذکر ہیں[۱] ۔

شیخ محمد عابد سندھی کی ان تصانیف میں سے صرف ایک تصنیف ہماری خصوصی توجہ کی مستحق ہے اور وہ ہے 'المواهب اللطیفة علی مسند الامام ابی حنیفة' مسند احادیث کا ایک منتخب مجموعہ جو حضرت امام اعظم رحمة اللہ علیہ سے مروی ہے وہ چودہ اہلِ علم و فضل کے توسط سے روایت کیا گیا ہے ۔ اسی مجموعہ مسانید کو شیخ محمد عابد سندھی نے اپنی شرح کے ساتھ مرتب کیا ، جس میں ہر مسندِ حدیث کی تائیدِ صحت کے لیے دیگر تمام احادیث بھی جمع کر دی گئی ہیں جو دوسری کتبِ حدیث میں وارد ہوئی ہیں اور اسی مضمون سے تعلق رکھتی ہیں ۔ اسی طرح شیخ محمد عابد نے بحیثیت ایک حنفی فقیہ ان تمام فقہی مسائل میں امام ابو حنیفہ کی رائے کی تائید کی ہے جن کے بارے میں ائمہ مختلف الرائے ہیں ۔ وہ اپنے مسلک و موقف کی تائید کے لیے احادیث و آثار کے علاوہ عقلی دلائل سے بھی کام لیتے ہیں ۔ شیخ عابد سے قبل بھی اہلِ علم نے اس مجموعۂ مسانید کی شرح و ترتیب پر کافی توجہ دی تھی جن میں سے ملا علی بن سلطان محمد القاری الھروی (م - ۱۶۰۵ء/۱۰۱۴ھ) کی شرح خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے ۔ شیخ محمد عابد سندھی نے دیگر شروح کے علاوہ ملا علی قاری کی اس شرح سے بھی استفادہ کیا جو انہیں مدینہ منورہ میں دستیاب ہوئی تھی ۔ چنانچہ وہ اس کا اعتراف کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں :

> "لکنی وجدت الشرح بخط علی القاری بالمدینة المنورة علی صاحبها افضل الصلاة و السلام فی سنة ثلاثین و مائة و الف" ۔

---

۱ - نزهة الخواطر ، ۷ : ۴۳۹ -

۲ - ڈاکٹر زبید احمد (ص ۳۳۸) نے 'تاویل الانوار' لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے ۔

(یہ شرح مجھے ۱۷۱۷ء/۱۱۳۰ھ میں مدینہ منورۂ صاحبِ شہر پر بہترین درود و سلام ہو ، میں ملی تھی جو خود ملا علی قاری کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی) ۔

ولی اللہ فرنگی محلی

مولانا ولی اللہ بن حبیب اللہ بن محب اللہ انصاری لکھنوی فرنگی محلی اپنے عہد کے نامور فضلاء اور مشہور علماء میں سے تھے ۔ ابتدائی کتبِ درسیہ اپنے والد سے اور باقی اپنے چچا ملا محمد یوسف سے پڑھیں ۔ علومِ متداولہ سے فراغت کے بعد علوم کی تحقیق و تکمیل میں منہمک ہو گئے ، حتیٰ کہ لکھنئو میں ایک سربرآوردہ عالم کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی اور تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف بھی کرتے رہے "اپنی عمر عزیز طلباء کی تدریس میں صرف کر دی ۔ ان سے ایک جہان مستفیض ہوا ۔ جامع علومِ عقلی و نقلی اور حاوی فنونِ فرعی و اصلی[1] تھے" ۔ آپ کی وفات اٹھاسی سال کی عمر میں ۱۸۵۳ء/صفر ۱۲۷۰ھ میں ہوئی ۔

ان کی تصانیف میں 'معدن الجواہر' (تفسیر قرآن) ، 'نفائس الملکوت شرح مسلم الثبوت' (اصول فقہ) ، 'شرح غایۃ العلوم و معارج الفہوم' (فلسفہ) ، 'کشف الاسرار فی خصائص سید الابرار' (سیرت نبوی[2]) ، 'مرآۃ المؤمنین' (دینی مسائل) ، 'تنبیہ الغافلین فی مناقب آل سید المرسلین' (اہل بیت کے فضائل کے بارے میں) ، 'آداب السلاطین' ، 'الاغصان الاربعۃ' (ملا نظام الدین سہالوی کے سوانح حیات پر مشتمل رسالہ)[2] اور کئی دیگر رسائل ، شروح اور حواشی شامل ہیں ۔

ملا نور الدین بن اسماعیل رامپوری

شیخ نور الدین بن اسماعیل حنفی رامپوری اپنے عہد کے علمائے کرام میں سے تھے

---

۱ ۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۶ ، نیز دیکھیے نزہۃ الخواطر ۷ : ۵۲۷ ببعد ۔

۲ ۔ مقالات شبلی ۳ : ۹۱ ، تذکرہ علمائے ہند ص ۵۴۷ ، نزہۃ الخواطر ۷ : ۵۲۷ ببعد ، ڈاکٹر زبید احمد ص ۳۳۸ ۔

اور بقول صاحب 'نزہۃ الخواطر' انہیں کتاب و سنت کی مہارت حاصل نہیں تھی[۱]۔ انہوں نے بہت سی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں اور وہ ہندوستان کے ان علماء میں سے ہیں جنہوں نے بنی امیہ کی تائید و حمایت کی اور یزید بن معاویہ کو بے گناہ، متقی اور خلیفۂ برحق ثابت کرنے کی کوشش کی[۲]۔ ان کی وفات ۱۸۵۳ء/۱۲۷۳ھ میں ہوئی[۳]۔

تصانیف میں سے کتاب 'التقوی و رسالۃ الحسنیٰ'، 'البیعۃ بید خلیفۃ الرحمان علی مذہب النعمان' اور 'الفاروق بین الحق و الباطل'[۴] (دونوں مؤخرالذکر کتابوں کے اقتباسات صاحب 'نزہۃ الخواطر' نے دیئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں خلافتِ بنی امیہ کی تائید اور یزید بن معاویہؓ کو خلیفۂ برحق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے[۵]۔ مثلاً وہ خلافتِ یزید کا جواز پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی پھوپھی ام حبیبہؓ ام المؤمنین تھیں اس لیے اس قرابت کی بنا پر یزید بھی قابلِ احترام تھا۔ اس طرح یزید کی خلافت حضرت امیر معاویہؓ کے ہاتھوں اور بعض صحابہ مثلاً حضرت عمرو بن العاصؓ وغیرہ کے بیعت کرنے سے جائز ہو جاتی ہے اور چونکہ یزید کو زیارتِ رسولؐ کا شرف حاصل تھا اس لیے وہ اس دور کے مسلمانوں سے بہرحال بہتر تھا۔

★ ★ ★

---

۱ ۔ نزہۃ الخواطر ۷: ۵۱۴ ۔

۲ ۔ ایضاً ۔

۳ ۔ ڈاکٹر زبید احمد ص ۳۲۸، ۳۴۲؛ نزہۃ الخواطر ۷: ۵۱۵ ۔

۴ ۔ ڈاکٹر زبید احمد ص ۳۲۸ ۔

۵ ۔ تذکرہ اہل دہلی، انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۵۵ء ۔

مآخذ

آزاد ، غلام علی بلگرامی

۱ - خزانہ عامرہ ، نول کشور ، لکھنو -
۲ - سبحة المرجان فی آثار ہندوستان ، بمبئی ، ۱۸۸۸ء -
۳ - مآثر الکرام دفتر اول و ثانی ، رفاہ عام پریس ، لاہور ، ۱۹۱۳ء -

اسماعیل پاشا البغدادی

۲ - ایضاح المکنون ، استنبول ، ۱۹۳۶ء -
۲ - ہدیة العارفین ، استنبول -

اشتیاق حسین قریشی

۱ - برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ (ترجمہ زبیری) کراچی یونیورسٹی ، کراچی ۱۹٦۷ء -

حسن و فی

۱ - تقویم المنہاج القویم ، سلفیہ قاہرہ ، ۱۹۲۷ء -

سرسید احمد خان

۱ - تذکرہ اہل دہلی ، انجمن ترقی اردو ، کراچی ، ۱۹۵۵ء -

شاہ ولی اللہ دہلوی

۱ - ازالة الخفا عن خلافة الخلفاء ، مطبع صدیقی ، بریلی ، ۱۲۸٦ھ -
۲ - الانصاف فی بیان سبب الاختلاف ، مطبع مجتبائی دہلی ، ۱۹۰۹ء -

۳ - البدور البازغة ، مجلس علمی بجنور ، ۱۹۳۳ء/۱۳۴۵ھ -
۴ - حجة الله البالغة - الخيرية ، قاهره ، ۱۹۰۴ء/۱۳۲۲ھ - مع ترجمہ عبدالحق حقانی مطبوعہ نور محمد کراچی ، ۱۹۵۵ء
۵ - الخیرالکثیر ، مجلس علمی بجنور ، ۱۹۳۳ء/۱۳۵۲ھ -
۶ - الدرالثمین فی مبشرات النبی الامین ، مطبع احمدی دہلی ، ۱۸۹۹ء -
۷ - عقدالجید فی احکام الاجتهاد و التقلید ، مجتبائی دہلی ، ۱۲۵ء/۱۳۴۴ھ -
۸ - فتح الخبیر - نول کشور ، لکھنئو -
۹ - الفوز الکبیر فی اصول التفسیر ، قرآن محل ، کراچی ، ۱۹۶۴ء/۱۳۸۳ھ -
۱۰ - فیوض الحرمین ، لاہور ، ۱۹۴۷ء -
۱۱ - المسوی من احادیث الموطأ ، سلفیہ قاہرہ ، ۱۹۳۲ء/۱۳۵۱ء -

شبلی نعمانی

۱ - مقالات جلد ۳ ، مطبع معارف اعظم گڑھ ، ۱۹۳۲ء/۱۳۵۱ھ -

شیخ محمد اکرام

۱ - آب کوثر ، مطبوعہ تاج کمپنی لاہور ، ۱۹۴۰ء -
۲ - رود کوثر ، مطبوعہ تاج آفس کراچی و فیروز سنز لاہور ، ۱۹۶۸ء -

صدیق حسن خان

۱ - ابجد العلوم ، مطبع صدیقیہ بھوپال ، ۱۸۷۸ء/۱۲۹۶ھ -
۲ - اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقهاء المحدثین ، مطبع نظامی کانپور ، ۱۸۷۱ء/۱۲۸۸ھ

عبدالحئی لکھنوی

۱ - الثقافة الاسلامية فی الهند ، دمشق ، ۱۹۶۰ء -
۲ - نزهة الخواطر جلد ۶ ، ۷ - طبع دائرة المعارف العثمانية ، حیدرآباد ، ۱۹۴۷ء/۱۳۵۷ء -

عبیداللہ سندھی

۱ ۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ، سندھ ساگر اکادمی ، لاہور ، ۱۹۶۴ء ۔

عمر رضا کحالہ

۱ ۔ معجم المؤلفین ، دمشق ، ۱۹۶۶ء ۔

غلام حسین جلبانی

۱ ۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیم ، شاہ ولی اللہ اکیڈمی ، حیدرآباد سندھ ، ۱۹۶۳ء ۔

فقیر محمد جہلمی

۱ ۔ حدائق الحنفیۃ ، نول کشور ، لکھنئو ، ۱۸۹۸ء ۔

محمد ابراہیم میر

۱ ۔ تاریخ اہل الحدیث ، لاہور ، ۱۹۵۳ء ۔

محمد اسماعیل سلفی

۱ ۔ تحریک آزادی فکر اور حضرت شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی ، قصور ، ۱۹۶۶ء ۔

محمد ایوب قادری

۱ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ، کراچی ، ۱۹۶۱ء ۔

Brocklemann : (1) Geschichte der arabeschen Literatur V-1,2 1968-1902.

(2) Supplementb and V. 1-3, 1937, 1938, 1942.

Dr. M. Ishaq:-

(1) India's contribution to the Studies of Hadith Literature, Dacca, 1955.

M. G. Zubaid Ahmad:-

(2) The Contribution of India to Arabic Literature, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore 1968.

ساتواں باب

دورِ جدید (۱۸۵۸ء — ۱۹۴۷ء)

برِّ صغیر میں ملّت اسلامیہ کے زوال و انحطاط کا آغاز تو ۱۷۰۷ء ہی سے ہو چکا تھا، لیکن جس طرح ایک پختہ عمارت کے گرنے میں وقت لگتا ہے اسی طرح پاک و ہند کے اسلامی معاشرے کی عظیم الشان عمارت بھی یکے بعد دیگرے مختلف رخنوں کے باعث آہستہ آہستہ گرتی رہی۔ پہلے اخلاق اور معاشرتی برائیوں نے جنم لیا، عیش پرستی و تن آسانی کی رغبت عام ہوئی پھر تفرقہ بازی، منافرت اور منافقت پیدا ہوئی اور بالآخر مسلمانوں کا سیاسی زوال شروع ہو گیا۔ مغلوں کی عظیم الشان سلطنت کے ساتھ اسلامی ہند کا مسلم معاشرہ بھی خلفشار و انتشار کا شکار ہو گیا اور ہر دن پستی کا سامان لے کر نمودار ہوا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی کی دور رس نگاہ نے آنے والے خطرات کو بھانپ کر ملت کے تمام ذمہ دار اور دیگر ہند اسلامی عناصر طبقوں کو ان سے خبردار کر دیا تھا، مگر وہ پوری طرح سنبھل نہ سکے۔ شاہ صاحب کے ایما پر احمد شاہ ابدالی نے مسلمانوں کے خلاف سرکشی اور بغاوت کرنے والی طاغوتی طاقتوں کو پانی پت کے میدان میں خوب مزہ چکھایا، مگر اپنوں کی کوتاہ اندیشی سے مدت کی ڈگمگاتی ہوئی سیاسی کشتی بھنور سے نہ نکل سکی اور ۱۷۹۹ء میں سکھوں نے پنجاب پر قبضہ کی جو کوشش کی تھی اس میں کامیابی کے بعد انہوں نے ملتان، کشمیر اور پشاور بھی مسلمانوں سے چھین لیے۔ سید احمد شہید اور ان کے ساتھیوں نے اس یورش کو روکنے کی کوشش کی اور جہاد میں جامِ شہادت نوش کیا۔ مسلمانوں کی دیگر ریاستوں کو بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ نگیں آنا پڑا۔ اس طرح صدیوں تک حکمران رہنے والی قوم غلامی کے گڑھے کے کنارے پر جا کھڑی ہوئی۔ ملّت اسلامیہ کو اس کا شدّت سے احساس ہوا اگرچہ اب وقت گذر چکا تھا، تاہم سنبھلنے کی ایک پر عزم کوشش کی اور ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی کا اعلان کر دیا۔ لیکن بکھری ہوئی طاقت مجتمع نہ ہو سکی اور یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی اور اس طرح برِّ صغیر کی ملّت اسلامیہ کی تاریخ ایک خطرناک موڑ مڑ گئی اور ذلت و پستی اور زوال و انحطاط کا آخری مرحلہ آ گیا اور مسلمان قوم غلامی کی زنجیروں میں جکڑی گئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے نتائج ملّت کے لیے بڑے مہلک اور خطرناک ثابت ہوئے۔ ایک طرف تو دہلی کی سلطنت کے خاتمے کے ساتھ مسلمانوں کی برائے نام سیاسی

سیادت بھی ختم ہو گئی ، دوسری طرف نئی حکمران قوم نے پرانی حکمران قوم کو ہر اعتبار سے کچل دینے کا عزم کر لیا اور وہ ہر مسلمان کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے ۔ ہندوؤں کے لیے یہ صورت حال نعمت غیرمترقبہ ثابت ہوئی اور صدیوں کا غلام ہندو اپنے پرانے آقاؤں سے انتقام لینے پر تل گیا ۔ ایک طرف تو ہندو نے نئی حکمران قوم سے بھرپور تعاون کیا ، فائدے اور منافع حاصل کیے ، عہدوں اور منصبوں پر قبضہ کیا اور دوسری طرف مسلمانوں کے خلاف زہر پھیلایا اور انگریز کو ان کے خلاف اکسانے اور بدگمان کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا ۔ چنانچہ ولیم ہنٹر نے جب لارڈ میو کے حکم سے کتاب 'ہمارے ہندوستانی مسلمان' لکھی تو اس میں صاف صاف اعتراف کیا کہ حکومت نے تمام عہدوں اور منصبوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کر دیے ہیں ۔ برطانوی حکمرانوں نے جو نیا نظام تعلیم نافذ کیا ہے اس میں مسلمان قوم کے مفاد کو نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔ صدیوں تک جو خاندان عدالتوں میں منصف اور قاضی کے عہدوں پر فائز رہے تھے وہ نئے عدالتی نظام سے یکسر بیکار اور محتاج ہو کر رہ گئے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں کے اوقاف کی آمدنی جو صرف انہی کی فلاح و تعلیم پر صرف ہونی چاہیے تھی وہ بھی غلط مصارف پر خرچ ہو رہی ہے[1] ۔ اس طرح گویا بر صغیر کی حکمران قوم سیاسی ، اقتصادی اور معاشرتی طور پر مفلوج ہو کر رہ گئی ۔ عزت والے ذلت و رسوائی کی انتہائی پستیوں میں جا پہنچے ۔ پاک و ہند میں ایک نئے معاشرے نے جنم لیا ، جس میں عزت والے ذلیل ہو گئے اور محکومی اور خوشامد کی زندگی بسر کرنے والے ہندو حکومت کی نظر میں شریف اور معزز قرار پائے ۔ مسلمان ان کے مقابلے میں ناقابل اعتبار اور بدمعاش قرار دیے گئے اور نہ صرف انہیں شک و شبہ کی نظر سے دیکھا گیا بلکہ انہیں ذلیل کرنے کے تمام حربے استعمال کیے گئے ۔

انگریز نے جو نیا نظام تعلیم رائج کیا تھا اس میں مسلمانوں کی قدیم سرکاری زبان کو یک قلم موقوف کر دیا گیا تھا ۔ مسلمانوں کے فقہی علوم کو از کار رفتہ قرار دے کر اسلامی علوم کی ان درسگاہوں کو جو کبھی قاضی القضاۃ ، سپہ سالاران لشکر اور وزرائے سلطنت کو جنم دیتی تھیں اب بالکل بیکار کر دیا گیا ۔ اب ان عظیم درسگاہوں میں صرف مساجد کے آئمہ تیار ہونے لگے ۔ جن مدارس میں عربی زبان اور اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کرنے والوں کے ہجوم ہوتے تھے اب وہ ویران ہو گئے ۔ مسلمان اول تو انگریزی مدارس میں داخل ہونے سے ہچکچاتے تھے اور جو داخل ہو کر تعلیم پاتے تھے وہ بھی کوئی باعزت مقام حاصل کرنے کے قابل نہ ہوتے تھے اور ہمیشہ انگریز

---

۱ ۔ بحوالہ موج کوثر ، ص ۴۷ ۔
Our Indian Mussalmans : William Hunter

کی نظر میں مشکوک اور ہندو کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ، چنانچہ تمام عہدے صرف ہندو کے لیے مختص ہو کر رہ گئے تھے[1] ۔

انگریز کی عملداری اور ہندو کی مکّاری سے ملّت اسلامیہ کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا تھا ۔ بقول مولانا حالی[2] اس وقت ہندوستان میں اسلام تین خطروں میں گھرا ہوا تھا ، ایک طرف یورپ سے عیسائی پادریوں کا جو سیلاب امنڈ آیا تھا وہ ہر جگہ ملّت اسلامیہ کی گھات میں لگا ہوا تھا اور یہ مال و دولت کی تحریص اور عزت و روزگار کا لالچ دے کر یا آئندہ کے خطرات سے ڈرا کر مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں پوری قوت صرف کر رہا تھا ۔ ساتھ ہی ان پادریوں نے اسلام اور اس کی تعلیمات پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی ، بانیٔ اسلام کے اخلاق و عادات پر انواع و اقسام کی نکتہ چینیاں شروع کر دیں اور مسلمانوں کو اپنے ماضی سے برگشتہ کرنے لگے اور جہالت و افلاس کا شکار مسلمان ان کے دام میں پھنسنے لگا ۔ اس موقع پر بلاشبہ علمائے اسلام نے عیسائیت کے مقابلے کی پوری کوشش کی ، پادریوں کے جواب میں کتابیں لکھیں ، ان سے علمی مناظرے کر کے انہیں لاجواب کیا اور مسلمانوں میں اپنے دین سے واقفیت اور محبت کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ ان علماء میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی ، مولوی آل حسن ، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا محمد قاسم نانوتوی وغیرہ کے نام سرِ فہرست ہیں[3]۔

دوسرا خطرہ سیاست سے تعلق رکھتا ہے ۔ مسلمان چونکہ اس حکمران قوم سے تعلق رکھتے تھے جس سے انگریز نے حکومت چھینی تھی ، اس لیے وہ انہیں قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے تھے بلکہ انہیں اپنا حریف خیال کرتے تھے ، اس کے علاوہ انگریزوں کے دلوں میں صلیبی جنگوں کے زمانے سے عیسائی پادریوں کے غلط پراپیگنڈے سے بھی اسلام اور مسلمانوں کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی اور وہ اسلام کو سرکشی ، بغاوت اور فساد پر اکسانے والا دین خیال کرتے تھے[4] ۔

تیسرا خطرہ اسلام کو انگریزی تعلیم کی طرف سے تھا ، کیونکہ یہ تعلیم پادریوں کے طریقۂ وعظ و تبلیغ سے زیادہ خطرناک اور مہلک تھی ۔ اس لیے کہ ایک طرف تو انگریزی تعلیم سے مسلمانوں کے لیے کوئی مفر نہ تھا اور دوسری جانب یہی تعلیم

---

۱ ۔ موج کوثر ، ص ۴۷ بعد ۔
۲ ۔ حیات جاوید ، ص ۲۰۲ ۔
۳ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۳۶۵ ، ۵۷۰ ، حیات جاوید ، ص ۲۰۲ ۔
۴ ۔ حیات جاوید ، ص ۲۰۲ ۔

مسلمانوں کو مذہب سے بیگانہ اور انہیں ان کے ماضی سے متنفر کرنے کاباعث تھی[1] ۔

الغرض یہ تھےوہ حالات جن سے ملت دو چار تھی اور یہ تھے وہ خطرات جن میں اسلام گھرا ہوا تھا ۔ ایسے موقع پر ایک طرف تو علماء کی کوشش کام آئی جنہوں نے ہر حالت میں عربی زبان اور اسلامی علوم کی حفاظت و ترقی کو اپنا مشغلہ بنایا اور دوسری طرف سر سید احمد خان اور ان کے رفقاء کی سرگرمیوں نے ایک تحریک کی شکل میں مسلمان قوم کو بیدار کیا اور نئی نسل کو جدید علوم سے بہرہ ور ہونے کی ترغیب دلائی اور ساتھ ہی حکمران قوم کے شکوک و شبہات کو دور کرنے کی کوشش[2] کی ۔

برطانوی سامراج اور ہندو کی سازش نے مسلمانوں کو دو باتوں پر مجبور کر دیا۔ ایک طرف تو انہیں یہ یقین ہو گیا کہ ہندؤں کے ساتھ مل جل کر وہ زندگی نہیں گزار سکیں گے اور اگر وہ ان سے الگ نہ ہوئے تو نہ صرف یہ کہ انہیں چین کی زندگی نصیب نہ ہوگی بلکہ ان کا وجود بھی خطرے میں پڑ جائے گا ۔ اس خیال نے انہیں ایک الگ اور مستقل وطن کے مطالبہ پر مجبور کر دیا جو بالآخر پاکستان کی شکل میں پورا ہوا ۔ دوسری بات یہ تھی کہ مسلمانوں نے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا کہ جب تک عالمِ اسلام ایک متحدہ طاقت نہیں بن جاتا اس وقت تک نہ صرف برِ صغیر کی ملت اسلامیہ بلکہ دنیا کا کوئی اسلامی ملک غیروں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہیں رہ سکے گا ۔ یہی وجہ ہے کہ جمال الدین افغانی کی تعلیمات نے جوگہرا اثر مسلمانانِ برِ صغیر پر ڈالا ، اتنا شاید ہی کسی اور اسلامی خطّے نے قبول کیا ہو اور عالمی اتحاد اسلامی کی تحریک کو علّامہ اقبال ایسےمفکر کی شکل میں جو مؤید و محرک یہاں سے ملے کسی اور اسلامی ملک سے نہ مل سکے ۔

مولانا فضل حق خیر آبادی

مولانا فضل حق خیرآبادی بن فضل امام خیرآبادی اپنے علمی خانوادہ کے ممتاز صاحبِ علم و فضل ہستی تھے ، علومِ متداولہ اپنے والد مولانا فضل امام سے پڑھے ، حدیث کی سند مولانا شیخ عبدالقادر بن شاہ ولی اللہ دہلوی سے لی اور شاہ دھومن دہلوی کے مرید ہوئے۔ علوم عقلیہ میں کمال پیدا کیا ، عربی میں اچھے شعر کہتے تھے

---

۱ ۔ حیات جاوید ، ص ۲۰۳ ۔

۲ ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے اسباب بغاوت ہند از سر سید احمد خاں اور حیات جاوید ص ۲۲۲ بیعد ۔

مگر تجنیس کے تصنّع اوز دیگر محسنات لغوی کا اس قدر التزام کرتے تھے کہ طبیعت پر ناگوار گزرتا ہے[1] مثلاً :

إنْ لَمْ تُصِبْ نَظْرَةٌ مِنْ أَعْيُنٍ نُعُسٍ
فَمَنْ نَفَى النَّوْمَ مِنْ عَيْنَيْكَ فِي الْغَلَسِ

* * *

مَنِ اسْتَنَامَ إِلَيْهَا سَهْرَتُهُ وَكَمْ
مِمَّنْ أَنَامَتْهُ مِنْ يَقْظَانِ مُحْتَرِسٍ

ترجمہ :

۱- گر تجھ پر مست آنکھوں نے نظر کا وار نہیں کیا تو پھر رات کو تیری آنکھوں سے نیند کس نے دور کی ہے ؟

۲- ان مست آنکھوں سے جس نے خمار حاصل کیا اسے انہوں نے شب بیدار بنا دیا اور کتنے ہی بیدار و آگاہ ہوں گے جنہیں ان آنکھوں نے سلا دیا !

سَلَبْنَ وَسْنَتَهُ فَازْدَدْنَ فِي سِنَةٍ
وَغُصْنَهُ فَتْراً فَازْدَادَ فِي الْهَوَسِ

ترجمہ :

ان مست آنکھوں نے اس کی نیند چھین لی مگر خود نیند کی مستی میں اور بھی بڑھ گئیں اور اسے تسکین پہنچائی مگر اس کی طلب کو اور بھی بڑھا دیا !

مولانا کا عربی میں ایک قصیدہ بھی مشہور ہے جو غالباً اُن کے رسالہ 'الشورۃ الهندیہ' میں موجود ہے ۔ یہ رسالہ انقلاب آزادی ۱۸۵۷ء کی تاریخ پر مشتمل ہے ۔ اُن کے قصیدہ کا ذکر جناب فضل قدیر مدیر 'ماہ نو' کراچی جو مولانا فضل حق کے خاندان میں سے ہیں ، اپنے اواخر اگست ۱۹۷۱ء کے مکتوب میں ان الفاظ میں کرتے ہیں : رسالہ کہیں کھو گیا ۔ مرحوم مولانا رئیس احمد جعفری نے یہ قصید مع قصاید 'فتنۃ الهند' اپنی کتاب 'بہادر شاہ اور ان کا عہد' میں درج کیا ہے ۔

مولانا فضل حق خیرآبادی کمشنر دہلی کے دفتر میں پیشکار کا کام کرتے رہے ۔ ۱۸۵۷ء

---

۱ - نزهة الخواطر ۷ : ۳۷۳ -

کی جنگ آزادی میں انہوں نے بھرپور حصہ لیا، دہلی میں جنرل بخت خان کے شریک رہے، لکھنؤ میں حضرت محل کے دربار کے رکن بھی رہے، گرفتاری کے بعد جلاوطنی بہ عبور دریائے شور کی سزا پائی، ۱۸۶۱ء/۱۲۷۸ھ میں جزیرہ انڈمان میں فوت ہوئے اور وہیں مدفون ہیں[1] ۔

مولانا کی تصانیف یہ ہیں : 'الجنس الغالی فی شرح الجوهر العالی' ، (فلسفہ میں) ، 'تاریخ فتنة الهند' (۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی عربی میں تاریخ ہے) ، 'الهدية السعيدية الروض المجود فی حقيقة الوجود' اور کئی ایک رسائل و کتب متداولہ کے حواشی ۔

مولانا فضل حق خیرآبادی کی ان تصانیف میں سے 'تاریخ فتنة الهند' اور 'الهدية السعيدية' خصوصی نظر کی مستحق ہیں ۔ اول الذکر کتاب دراصل مولانا کی ذاتی ڈائری ہے جس میں انہوں نے اسلامیان ہند کے غاصب انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کے واقعات و مشاہدات کو درج کیا ہے ، وہ چونکہ خود اس جنگ میں شریک تھے اس لیے انہوں نے جن اپنے چشم دید واقعات اور مجاہدین آزادی کے حالات اور جنگ کے نتائج و اسباب پر روشنی ڈالی ہے وہ تاریخی مواد کے اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں اسی طرح 'الهدية السعيدية فی الحكمة الطبيعية' فلسفہ و حکمت کے موضوع پر ایک عمدہ اور مستند تصنیف سمجھی جاتی ہے ۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور تین فنون پر مشتمل ہے اور نواب محمد سعید خان رام پوری کے نام سے معنون ہے اور اسی کی خاطر تالیف ہوئی ۔

سید اعجاز حسین کنتوری

مولانا سید اعجاز حسین نیشاپوری کنتوری لکھنوی لکھنؤ کے ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں ، ۱۸۲۴ء/۱۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۷۶ء/۱۲۸۶ھ میں وفات پائی ، آپ کے والد ماجد مفتی محمد قلی حسینی بھی ایک ممتاز عالم تھے ۔ آپ نے انہی سے علم حاصل کیا اور شیعہ امامیہ کے مستند علماء میں شمار ہوئے ، آپ نے 'استقصاء الافهام فی جواب منتهی الكلام' کی تصنیف میں مولانا حامد حسین الشیعی کی امداد بھی فرمائی اور حج کی زیارت سے مشرف ہونے کے بعد ۴۶ سال کی عمر میں فوت ہوئے[2] ۔

مولانا کنتوری کی تصانیف یہ ہیں : 'کشف الحجب والاستار' ، 'شذور العقيان فی تراجم الاعيان' ، 'رسالہ مناظرة مع مولوی جان محمد لاہوری' ، 'القول السديد' اور 'رسالة

---

۱ - تذکرہ علماء ہند ، ص ۳۸۲ ، نزهة الخواطر ۷ : ۳۷۷ ، آثار الصنادید ، ص ۹۳ ، ابجد العلوم ، ص ۹۱۵ ، حدائق الحنفیہ ، ص ۴۸۰ ۔

۲ - مقدمہ کشف الحجب والاستار ، ص ۳ ، نزهة الخواطر ۷ : ۶۶ ، زبدہ ابجد ، ص ۳۰۷ ۔

فی احوال میرزا محمد الدہلوی'[1] -

سید اعجاز حسین کنتوری کی ان مذکورہ بالا تصانیف میں سے اول الذکر یعنی 'کشف الحجب والاستار عن اسماء الکتب والاسفار' خصوصی توجہ کے قابل ہے - یہ کتاب دراصل شیعہ علماء کی تصانیف کی ایک تفصیلی سوانحی فہرست ہے ، مصنف نے حاجی خلیفہ کی کتاب 'کشف الظنون' کا تتبع و پیروی کی ہے لیکن حاجی خلیفہ کے برعکس انہوں نے صرف شیعہ اہل علم کی تصانیف کو لیا ہے چنانچہ وہ خود صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں : ھذا کتاب سمیتہ بکشف الحجب والاستار عن احوال الکتاب والاسفار ذکرت فیہ الکتب التی صنفھا الامامیۃ اعلی اللہ کلمتہ بھم فی البریۃ (یہ ایک کتاب ہے جس کا نام میں نے ' کشف الحجب والاستار عن احوال الکتب والاسفار' رکھا ہے ، میں نے اس میں صرف ان کتب کا تذکرہ کیا ہے جو امامیہ شیعوں کی تصنیف ہیں، خدا ان کے طفیل اسے دنیا میں بلند کرے)[2] -

کتاب کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے اور حاجی خلیفہ کی طرح کتاب کا تعارف ، بعض اوقات ابتدائی جملے اور مصنف کی تاریخ وفات کا بھی ذکر کرتے ہیں -

شاہ عبدالغنی دھلوی

برِ صغیر میں روایتِ حدیث کی سند اور استاذ العلماء و المحدثین مولانا شاہ عبدالغنی دہلوی ۱۸۱۹ء/۱۲۳۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے - آپ مجدد الف ثانیؒ کی نسل سے ہیں ، حفظِ قرآن کے بعد علومِ متداولہ اور حدیث کی سند اپنے والد مولانا شاہ ابو سعید مجددی ، مولانا مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین دہلوی ، مولانا شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی ، دختر زادہ مولانا شاہ عبدالعزیز ، شیخ محمد عابد سندھی اور شیخ ابو زاہد اسماعیل الرومی سے حاصل کی - بقول مولانا عبدالحیؒ لکھنوی ''علم و عمل ، زہد و حلم ، خودداری و راستی ، امانت و عفت ، تقویٰ و اعتدال اور اخلاص و رجوع الی اللہ کی امامت ان پر ختم ہو گئی''[3] - ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد حرمین کو ہجرت کر گئے جہاں ۱۸۷۸ء/۱۲۹۶ھ میں مدینہ میں وفات پائی[4] - آپ نے کتاب 'سنن ابن ماجہ' کا ایک ذیل لکھا جس کا نام 'انجاح الحاجۃ' رکھا -

---

۱ - مقدمہ کشف الحجب والاستا' ص ۳' نزھۃ الخواطر ۷ : ۶۶ زبید احمد' ص ۲۰۷ -

۲ - کشف الحجب والاستار ، ص ۱ -

۳ - نزھۃ الخواطر ۷ : ۲۸۹ -

۴ - ابجد العلوم ص ۹۲۹ ، نزھۃ الخواطر ۷ : ۲۹۰ ، تذکرہ علمائے ہند ، ص ۳۱۰ -

مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی

لکھنؤ کے مدرسہ فرنگی محل نے جو نامور اہلِ علم پیدا کئے ان میں سے ایک مولانا ابوالحسنات عبدالحی بن عبدالحلیم انصاری لکھنوی بھی ہیں جنہیں مولانا سید عبدالحی لکھنوی صاحبِ 'نزھۃ الخواطر' سے ممتاز کرنے کے لئے ''عبدالحی فرنگی محلی'' کہا جاتا ہے۔ شیخ قطب الدین شہید سہالوی کی اولاد میں متعدد نامور عالم پیدا ہوئے مگر ان سب میں دو بہت ممتاز ہیں۔ ان میں سے ایک تو ملا عبدالعلی بحرالعلوم بن ملا نظام الدین سہالوی(م۔۱۸۱۹ء/۱۲۲۵ھ) ہیں اور دوسرے مولانا عبدالحی[۱] فرنگی محلی جو ۱۸۴۸ء/ ۱۲۹۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد اور مفتی نعمت اللہ لکھنوی سے علومِ متداولہ پڑھے۔ زیارتِ حرمین کے دوران شیخ احمد دحلان مکی، مفتی محمد بن عبداللہ حنبلی، شیخ محمد الغربی اور شیخ عبدالغنی دہلوی سے سند حدیث لی۔ آپ نے عمر کا اکثر حصہ تصنیف و تالیف اور تدریس میں گزارا جس کا اندازہ آپکے ہزاروں نامور اور فاضل تلامذہ[۱] اور سو سے متجاوز تصانیف کی فہرست سے ہو سکتا ہے۔ آپ کی وفات ۱۸۸۶ء/۱۳۰۴ھ میں ہوئی۔

مولانا عبدالحی برِ صغیر کے ایک مستند حنفی فقیہ تھے اور فقہ[۱] حنفی کے اصول اور فروع کی تائید و حمایت اور چھان پھٹک میں تمام عمر صرف کر دی، لیکن آپ نے ہمیشہ راہ اعتدال اختیار کی۔ وہ ایک جگہ اپنے آپ پر اللہ کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''ومن منحه انه جعلني سالكاً بين الافراط والتفريط لا تأتي مسئلة معركة الآراء بين يدي الا ألهمت الطريق الوسط فيها'' (مجھ پر اس کے عطیات میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے مجھے افراط و تفریط کے درمیان چلنے کی توفیق بخشی ہے۔ جب بھی کوئی معرکۃ الآراء مسئلہ میرے سامنے آتا ہے مجھے راہِ اعتدال بذریعہ الہام سجھا دی جاتی ہے[۲])۔

مولانا عبدالحی[۱] کثیرالتصانیف عالم تھے۔ آپ کی بے شمار چھوٹی بڑی تصانیف میں سے بعض یہ ہیں: 'التبیان شرح المیزان' (علم الصرف کے موضوع پر)، 'ھدایة الوری الی سواء الھدی' (منطق میں)، 'المعارف لما فی حواشی شرح المواقف' (علم الکلام) 'الفوائد البھیة فی تراجم الحنفیة' (جو حنفی فقہاء و علماء کا تذکرہ ہے) 'التعلیقات السنیة علی الفوائد البھیة' (جو مذکورہ تذکرے پر حواشی ہیں)، 'خیرالعمل بذکر تراجم علماء فرنگی محل' (مدرسہ فرنگی محل کے علماء کا نامکمل تذکرہ ہے)، 'عمدة الرعایة' (جو فقہ[۱] حنفی کی مشہور کتاب

---

۱ - نزھۃ الخواطر ۸: ۲۳۴، تذکرہ علماء ہند، ص ۲۹۰ -
۲ - نزھۃ الخواطر ۸: ۲۳۵ -

'شرح الوقایة' کے بہترین حواشی ہیں) ، 'احکام القنطرة فی احکام البسملة' (بسم اللہ کے احکام کے بارے میں) ، 'مقدمة الهدایة' (علاّمہ مرغینانی کی مشہور کتاب فقہ کا مقدمہ ہے) ، 'مذیلة الدرایة لمقدمة الهدایة' اور 'الآثار المرفوعة فی الاخبار الموضوعة' (جو موضوع احادیث کے بارے میں ایک مفید کتاب ہے) -

شیخ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر الفرغانی (م-۱۱۹۶ء/۵۹۳ھ) کی کتاب الهدایة جو چار جلدوں میں ہے فقہ حنفی کی مقبول ترین ، مفید اور جامع کتاب ہے - مولانا عبدالحی نے ان چاروں جلدوں پر بڑے مفید حواشی لکھے ہیں ، 'مقدمة الهدایة' (جو 'ہدایہ اخیرین' کے شروع میں منسلک ہے) میں انہوں نے مصنف 'ہدایہ' کے حالات زندگی ، ان کے اسلوب بیان ، بعض کوتاہیوں ، مشہور فقہی اصطلاح ''ظاہر الروایة'' کی تشریح ، ہدایہ میں مذکور علماء کے تراجم اور 'ہدایہ' کے سلسلۂ سند پر تفصیل سے بحث کی ہے - اسی سلسلے میں انہوں نے 'مذیلة الدرایة' کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے جو ہدایہ اولین کے ساتھ طبع ہوا ہے ، اس میں بھی بعض اسماء رجال اور تراجم ہیں -

مولانا عبدالحیؒ لکھنوی کی دوسری اہم تصنیف 'الفوائد البهیة' ہے ، جیسا کہ گزر چکا ہے یہ حنفی علماء کا تذکرہ ہے ، مقدمے میں انہوں نے سبب تصنیف یہ بیان کیا ہے کہ تذکرہ نگاروں نے حنفی فقہاء و علماء کے ساتھ انصاف نہیں کیا - نیز یہ تذکرے برِّ صغیر میں متداول نہیں ، اس لیے میں نے یہ کتاب مرتب کی ہے تاکہ دینی مدارس کے لوگ حنفی فقہاء کے حالات سے واقف ہو سکیں - اس تذکرے کے سلسلے میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ صاحب 'نزهة الخواطر' کے برعکس مولانا فرنگی محلی نے اپنے تذکرے میں متقدمین حنفی فقہاء کے ذکر پر زور دیا لیکن خود برِّ صغیر کے حنفی علماء کو اکثر فراموش ہی کیا ہے -

فیض الحسن سہارنپوری

فیض الحسن سہارنپوری برِّ صغیر میں عربی زبان و ادب کے ممتاز علماء میں سے ہیں ، ۱۸۱۶ء میں سہارنپور میں پیدا ہوئے ، مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے فضلاء سے علومِ متداولہ کی سند لی ، فنِّ شعر میں مولانا صہبائی کے شاگرد تھے ، مولانا کے شاگردوں میں سرسید احمد خان، علامہ شبلی، مولانا حالی ، مولانا وحیدالدین سلیم ، مولوی عبداللہ ٹونکی اور مولوی محمد اسماعیل میرٹھی جیسے فاضل اور یگانۂ روزگار علماء شامل ہیں[۱] -

---

۱- نقوش لاہور نمبر فروری ۱۹۶۲ء ، ۸۷ ، ۸۸ - لاہور نمبر فروری ۱۹۶۲ء تاریخ اورینٹل کالج ، ص ۱۲۸ و ۰

مولانا فیض الحسن سہارنپوری ایک ''جلیل القدر عالم ، ادیب ، شاعر اور مصنف تھے ، کبھی فیض اور کبھی خیال تخلص کرتے تھے ، عربی ، فارسی اور اردو کے با کمال ادیب اور قادرالکلام شاعر تھے''۱۔ آپ کی عربی تصانیف میں ایک دیوان شعر کے علاوہ 'تعلیق علی الجلالین' ، 'التحفة الصدیقیة' اور 'شرح السبع المعلقات' وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔ اردو میں 'فیضیہ شرح دیوان الحماسه' ، 'مثنوی صبح امید' اور 'گلزار فیض' (اردو دیوان) قابل ذکر ہیں ، آپ نے ایک مدت تک اورینٹل کالج لاہور میں عربی کی تدریس کی اور ۷۱ برس کی عمر میں ۱۸۸۷ء میں فوت ہو گئے ۔

مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی یہ تمام تصانیف اپنے اپنے موضوع میں ایک ممتاز مقام کی حامل ہیں اور خصوصی توجہ کی مستحق ۔ لیکن تفصیل سے اعراض کرتے ہوئے اجمال کی خاطر ان کی ایک اہم تصنیف 'شرح السبع المعلقات' ، جسے انہوں نے 'ریاض الفیض' کے نام سے موسوم کیا ہے ، پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔ 'معلقات' دورِ جاہلی کے فحول شعراء کے منتخب قصائد کا مجموعہ ہے ۔ اس مجموعے کی برِ صغیر اور بیرون برِ صغیر مختلف شروح لکھی گئی ہیں ، برِ صغیر میں لکھی جانے والی شروح میں مولانا کی شرح کو ممتاز مقام حاصل ہے اور اس کے بہت سے اسباب ہیں ، ایک تو یہ کہ مولانا نے ہر شعر کی تین زبانوں (عربی ، فارسی ، اردو) میں تشریح کی ہے جس کی افادیت عیاں ہے ، اس کے علاوہ ہر شعر کے مشکل الفاظ کی لغوی تشریح ، ترکیبِ نحوی کے اہم نکات ، شعر کے ہر لفظ کی تشریح میں مختلف شعراء عرب کے کلام سے استشهاد ، قدیم شارحینِ معلقات کی کوتاہیوں کی نشاندہی، ہر شاعر کے حالاتِ زندگی اور ہر قصیدے کے پس منظر پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ مولانا نے اپنی شرح کا تعارف و اہمیت ان الفاظ میں بیان کی ہے :

''لَمَّا كَانَتْ السبعُ المعلقاتُ كَا لسَّبعِ الشِّدَادِ وَلَمْ يَسلُكْ شَارِحٌ مِنْ شُرَّاحِهَا مَسْلَكَ السِّدَادِ وَقَدْ تَنَاوَلَهَا الْمُولَعُونَ بِفُنُونِ الْادَبِ وَ تَدَاوَلَهَا الْمُغْرَمُونَ بِلِسَانِ الْعَرَبِ اَرَدتُّ اَنْ اَشْرَحَهَا شَرْحًا وَافِيًا وَاَكْشِفَ عَنْهَا كَشْفًا كَافِيًا'' ۔

(چونکہ السبع المعلقات سات محکم آسمانوں کی مانند ہے اور اس کے شارحین میں سے کوئی بھی راہِ محکم پر نہیں چلا ، حالانکہ فنونِ ادب سے دلچسپی

---

۱ ۔ نقوش لاہور فروری ۱۹۶۲ء ۔

رکھنے والوں اور عربی زبان سے لگاؤ رکھنے والوں نے ان قصائد کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے ، اس لئے میں نے یہ عزم کیا کہ اس کی ایک تسلی بخش شرح لکھوں اور اس کے رازوں کو کافی حد تک عیاں کردوں) ۔

نواب سید صدیق حسن خان بہادر قنوجی

عربی و اسلامی علوم کی تاریخ نواب سید صدیق حسن خان بہادر بن سید آل حسن قنوجی ثم بھوپالی کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گی ۔ آپ ۱۸۳۲ء/۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے ، علومِ متداولہ صدر الصدور مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی سے حاصل کیے اور اپنے زمانے کے جلیل القدر علماء سے حدیث کی سند لی جن میں شیخ محمد یعقوب دہلوی ، شیخ محمد اسحاق دہلوی ، شیخ عبدالحق بن فضل اللہ ہندی اور قاضی حسین بن محسن انصاری یمانی کے نام بھی شامل ہیں ۔ آپ ایک مدت تک مختلف شہروں میں علوم اور کسبِ معاش کی خاطر سرگرداں رہے ۔ بالآخر ۱۸۷۱ء/۱۲۸۸ھ میں نواب شاہ جہان بیگم ملکۂ بھوپال سے شادی ہوئی اور وہ ریاست کے مدار المہام قرار پائے ۔ آپ ۱۸۸۹ء/۱۳۰۷ھ میں فوت ہوئے اور بھوپال میں دفن ہیں[1] ۔

نواب صاحب خود ایک جلیل القدر عالم تھے اور علماء دوست و علم پرور بھی تھے ۔ آپ کے عہد میں ریاست کے خزانے اہلِ علم کی خدمت اور علومِ اسلامیہ کی اشاعت کے لیے وقف تھے ۔ آپ نے خود بھی اردو فارسی اور عربی میں درجنوں تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں ۔

آپ کی تصانیف کی فہرست بہت طویل ہے[2] مگر بعض اہم یہ ہیں : 'ابجدالعلوم' (عربی میں علم اور علماء کا تذکرہ ہے) ، 'التاج المکلل' (عربی میں علماء حدیث کے تراجم ہیں) ، 'اتحاف النبلاء' (جو فارسی میں حدیث و علماء حدیث کا تذکرہ ہے) ، 'فتح البیان فی مقاصد القرآن' (دس جلدوں میں قرآن کی عربی تفسیر ہے) ، 'عون الباری' (صحیح بخاری کی شرح ہے) ، 'الحطة بذکر الصحاح الستة' (چھ کتب حدیث یعنی صحاح ستہ کا تذکرہ) اور 'البلغة الی اصول اللغة' ۔

علامہ سید صدیق حسن قنوجی رحمۃ اللہ علیہ کی ان تصانیف میں سے دو پر خصوصی نظر ضروری ہے ، ان میں سے ایک تو ان کی تفسیر ہے جس کا نام ہے 'فتح البیان فی

---

۱ ۔ نزہۃ الخواطر ۸ : ۱۸۷ ، تذکرہ علماء ہند ، ص ۲۵۰ ۔

۲ ۔ صاحب نزہۃ الخواطر (۸ : ۱۹۴) نے ان کی تعداد دوسو بائیس بتائی ہے ۔

مقاصد القرآن' ۔ اس کا بہترین اور جدید ترین ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں قاہرہ سے دس جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ یہ تفسیر نہ صرف یہ کہ چودھویں صدی ہجری (بیسوی صدی عیسوی) کے اہلِ علم کی تفاسیر میں ایک خاص مقام رکھتی ہے بلکہ برِّ صغیر میں لکھی جانے والی عربی تفاسیر میں بھی ایک نہایت ممتاز مقام رکھتی ہے ۔ شروع میں نواب صاحب نے اصولِ تفسیر اور تاریخِ تفسیر کے بارے میں ایک مفید مقدمہ بھی دیا ہے ، یہ بات دیگر مفسرین کے ہاں اکثر نہیں دیکھی گئی، وہ علمِ تفسیر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''ھو علم باحث عن نظم نصوص القرآن وآیات سور الفرقان بحسب الطاقة البشریة وبوفق ماتقتضیه القواعد العربیة'' ۔

(یعنی تفسیر وہ علم ہے جس میں بشری طاقت اور قواعد عربیہ کے مطابق نصوص و آیاتِ قرآنی کی تشریح سے بحث کی جاتی ہے)[1]۔

نواب صاحب کے نزدیک قرآن کی متصوّفانہ تفاسیر کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ کہتے ہیں[2]: ''وأما کلام الصوفیة فی القرآن فلیس بتفسیر'' کہ (قرآن کے بارے میں صوفیانہ باتیں تفسیر کی حیثیت نہیں رکھتیں) ، غالباً ان کے سامنے ہندی علماء مثل محب اللہ الہ آبادی وغیرہ کی متصوّفانہ تفاسیر ہوں گی ! نواب صاحب نے اپنی تفسیر میں قدماء کی تفاسیر سے فائدہ اٹھایا ہے اور ہر جگہ ان کے اقوال بصراحت نقل کیے ہیں، الفاظ قرآن کی لغوی بحث ، نحوی ترکیب پر بحث اور بلاغت و اعجازِ قرآن کے مسائل کے علاوہ انہوں نے سورتوں کے اسماء ، پس منظر یا شانِ نزول ، فضائل اور اہم مضامین کی بھی پوری نشاندہی کی ہے ۔

نواب صاحب کی دوسری اہم اور مفید کتاب 'ابجد العلوم' ہے ، یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے اور ہر حصہ دراصل ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے ۔ یہ کتاب انہوں نے ۱۸۷۳ء/۱۲۹۰ھ میں تصنیف کی اور ۱۸۷۸ء/۱۲۹۵ھ میں پہلی بار طبع ہوئی ۔

کتاب کا پہلا حصہ جسے 'الوشی المرقوم' کا نام دیاگیا ہے علم کی تاریخ ، فضیلت اور تدوین کے بارے میں ہے ۔ دوسرا حصہ جسے 'السحاب المرکوم الممطر بأنواع الفنون و أصناف العلوم' کا نام دیاگیا ہے ، علوم کے اسماء ، تاریخ اور ہر علم کے فضائل و اہمیت کے بیان میں ہے ۔ تیسرا اور آخری حصہ جسے 'الرحیق المختوم من تراجم أئمة العلوم' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے مختلف علوم و فنون کے علماء کا تذکرہ ہے ۔ اس

---

۱ ۔ مقدمة فتح البیان ۱ : ۷ ۔
۲ ۔ فتح البیان ۱ : ۱۲ ۔

حصے کے آخر میں نواب شاہ جہاں بیگم کے سوانح اور علم پروری کا بھی ذکر موجود ہے۔

مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی

مسلک ولی اللہی کے علمبردار اور متاخر دور میں مستند محدث مولانا سید نذیرحسین دہلوی ۱۸۰۵ء/۱۲۲۰ھ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ضلع سورج گڑھ صوبہ بہار کے رہنے والے تھے۔ مولانا احمد بریلوی کے وعظ سے متاثر ہو کر دہلی کا رخ کیا اور شاہ محمد اسحاق دہلوی سے حدیث کی اجازت لی۔ اس کے علاوہ مولوی عبدالخاق دہلوی، اخوند شیر محمد قندھاری، مولوی جلال الدین ہروی اور مولوی کرامت علی اسرائیلی بھی آپ کے اساتذہ میں سے ہیں۔ ۱۸۹۷ء میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ مولانا کی وفات ۱۹۰۲ء میں دہلی میں ہوئی[1]۔

مولانا کی تصانیف میں سے ایک کتاب 'معیار الحق' کا ذکر ملتا ہے لیکن مولانا کی اصل شہرت ان کے فیض عام سے ہے جس سے ایک خلق مستفیض ہوئی اور پچاس برس تک دہلی کی مسجد اورنگ آبادی میں وہ حدیث و تفسیر کا درس دیتے رہے۔ حتٰی کہ شمالی ہند کے اکثر علمائے حدیث کا سلسلۂ اسناد آپ تک پہنچتا ہے اور آپ کو سب 'شیخ الکل' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

مولوی (ڈپٹی) نذیر احمد دہلوی

مولوی نذیر احمد بھی اس دور کے جیّد علماء میں سے ہیں۔ ۱۸۳۶ء میں ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ پنجاب اور حیدرآباد دکن میں ملازمت کی۔ ۱۸۹۰ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی سے ایل۔ ایل۔ ڈی اور پھر پنجاب یونیورسٹی سے ڈی۔ او۔ ایل کی اعزازی ڈگری ملی۔ ۳ مئی ۱۹۱۲ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔ مولانا عبدالعزیز میمن آپ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ اردو تصانیف ('مرآۃ العروس'، 'ابن الوقت'، 'بنات النعش' اور 'توبۃ النصوح'[2]) کے علاوہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ لغات اور 'الحقوق والفرائض' قابل ذکر ہیں۔

مولانا محمود الحسن بن ذوالفقار علی دیوبندی

آپ ۱۸۵۱ء/۱۲۶۸ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کو دارالعوام دیوبند کا پہلا طالب علم

۱۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۹۰، موج کوثر، ص ۶۸، الحیاۃ بعد المماۃ از فضل حسین۔

۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو نقوش لاہور شخصیات نمبر۔

ہونے کا شرف حاصل ہے ، صحاح ستہ وغیرہ کی سند مولانا محمد قاسم نانوتوی سے حاصل کی ۔ ۱۸۹۰ء/۱۳۰۸ھ میں دارالعلوم کے صدر مدرس مقرر ہوئے ۔ جنگ آزادی کے صفِ اول کے قائدین میں سے تھے ۔ مولانا حسین احمد مدنی ، مولانا انورشاہ کشمیری ، اور مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا شبّیر احمد عثمانی آپ کے شاگردوں میں سے تھے ۔ ۱۹۲۰ء/۱۳۳۹ھ میں فوت ہوئے[۱]۔

آپ کی تصانیف میں سے 'حاشیۃ ابی داؤد' ، 'ابواب و تراجم بخاری' اور 'ایضاح الادلہ' قابلِ ذکر ہیں ۔

مفتی محمد عبداللہ ٹونکی

مفتی محمد عبداللہ بھی عربی و اسلامی علوم کے ماہر تھے ، ۳۴ سال تک پنجاب یونیورسٹی اوریئنٹل کالج میں عربی کے استاد رہے ، دارالعلوم ندوہ اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں بھی مدرس رہے ، ۱۹۲۰ء میں بعارضہ فالج بھوپال میں سترسال کی عمرمیں انتقال ہوا ۔[۲]

'عجالۃ الراکب' ، 'التعلیقات علی شرح سلم العلوم'، 'فتاویٰ صابریہ'، 'تحریر اقلیدی اور 'الانوار الزاھیۃ فی دیوان ابی العتاھیۃ' آپ کی یادگار ہیں ۔

مولانا احمد رضا خان بریلوی

آپ ایک بہت بڑے مناظر اور عالم تھے ۔ ۱۸۵۶ء/۱۲۷۲ھ میں پیدا ہوئے ۔ معقولات و منقولات میں یکساں درک رکھتے تھے ۔ علومِ متداولہ اپنے والد مولانا نقی علی خاں سے اور حدیث کی سند سید احمد دحلان مکی اور عبدالرحمٰن السراج مکی سے لی ، ۱۹۲۱ء/۱۳۴۰ھ[۳] میں فوت ہوئے ۔

مولانا کثیر التصانیف علماء میں سے ہیں ، 'تجلی الیقین' ، 'سلطنۃ المصطفیٰ' ، 'النجوم الثواقب فی تخریج احادیث الکواکب' ، 'الدولۃ المکیۃ' اور 'الجد الممتاز فی شرح رد المحتار' خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں ۔

---

۱ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۳۶۶ ، علمائے حق، ص ۱۰۷، تذکرہ مشائخ دیوبند، ص ۲۲۵ ببعد ۔

۲ ۔ تاریخ اوریئنٹل کالج لاہور ، ص ۱۳۴ ۔

۳ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۹۸ ببعد ، حیات اعلیٰ حضرت از ظفرالدین بہاری مکتبہ رضویہ کراچی ۱۹۵۵ ۔

مولانا عبدالحی لکھنوی بن الشریف فخرالدین بن عبدالعلی حسنی طالبی

آپ ایک جلیل القدر محقق ، مؤرخ اور عربی کے مایہ ناز ادیب تھے - ۱۸۶۹ء/ ۱۲۸۶ھ میں پیدا ہوئے - آپ کے آبا و اجداد بغداد سے آئے تھے - آپ کے بزرگوں میں سے شیخ قطب الدین دہلی میں شیخ الاسلام مقرر ہوئے ، لکھنؤ میں تعلیم کا آغاز کیا اور پھر بھوپال میں طب ، حدیث اور ادب کی تعلیم حاصل کی ، ندوۃ العلماء کے معتمد بھی رہے ، آپ کی وفات ۱۹۲۳ء/۱۳۴۱ھ میں ہوئی[1] -

مولانا کا عظیم الشان علمی کارنامہ علماء ہند کے تراجم پر ایک مفصل اور مبسوط کتاب ہے جو 'نزهة الخواطر و بهجة المسامع و النواظر' کے نام سے سات جلدوں میں چھپ چکی ہے - آپ کا دوسرا کارنامہ برّ صغیر میں عربی و اسلامی علوم کی ایک مختصر مگر جامع تاریخ ہے جس کا نام 'معارف العوارف فی انواع العلوم والعوارف' یا 'الثقافة الاسلامية فی الهند' ہے - اس کے علاوہ 'جنة المشرق و مطلع النور المشرق' اور 'تلخیص الاخبار' بھی آپ کی تصانیف ہیں -

'نزهة الخواطر' مولانا سید عبدالحی لکھنوی کا نہایت قابلِ فخر اور عظیم الشان کارنامہ ہے ، برّ صغیر پاک و ہند میں اہلِ علم و فضل کا اتنا جامع و مفصل تذکرہ پہلے کسی نے مرتب نہیں کیا - اس کتاب کی آٹھ جلدیں ہیں جن میں سے سات جلدیں مولانا خود مرتب کر گئے تھے (اور ان کا اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے) ، آٹھویں جلد آپ ادھوری چھوڑ گئے تھے جسے آپ کے نامور فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے پایہ تکمیل تک پہنچایا اور یہ آخری اور آٹھویں جلد ۱۹۷۰ء/۱۳۹۰ھ میں دکن سے پہلی بار شائع ہوئی ہے - جبکہ پہلی جلد دکن ہی سے ۱۹۴۷ء/۱۳۶۶ھ میں طبع ہوئی تھی - پہلی جلد کا مقدمہ (جس میں برّ صغیر کے علمی کارناموں اور ہر فن کے ممتاز اہلِ فضل کے طائرانہ جائزے کے علاوہ مصنف کے مفصل سوانح بھی درج ہیں) آپ کے دوسرے نامور فرزند ڈاکٹر حکیم مولانا محمد عبدالعلی نے مرتب کیا - حقیقت یہ ہے کہ برّ صغیر کے عربی دان علماء کا مفصل ، جامع اور مکمل تذکرہ اور کہیں نہیں مل سکتا ، اس لحاظ سے مولانا کا برّ صغیر کی ملت اسلامیہ پر بہت بڑا احسان ہے -

سید انور شاہ کشمیری

دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز علماء میں سے مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری بھی

1 - الاعلام ۳/۹۲ ، نزهة الخواطر ۸/۱۸۱ -

ہیں جو ذہانت و فطانت، قوت حافظہ ، تقویٰ و زہد اور وسعت علم کے لحاظ سے اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے ۔ مولانا ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ میں پیدا ہوئے ، دارالعلوم دیوبند میں علوم متداولہ کی تکمیل کی ۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا رشید احمدگنگوہی آپ کے اساتذہ میں سے ہیں ، مصر کے مشہور عالم علامہ رشید رضا جب دیوبند آئے تو ان سے بہت متاثر ہوئے۔۱۹۲۶ء/۱۳۴۴ھ میں آپ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس اور شیخ الہند جانشین مقرر ہوئے ۔ ۱۹۲۴ء/۱۳۵۲ھ میں ذابھیل میں فوت ہوئے[۱] ۔

شاہ صاحب کی تصانیف میں سے 'فیض الباری شرح البخاری'، 'شرح ترمذی' ، ضرب الخاتم' ، 'عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ' اور 'التصریح بماتواتر فی نزول المسیح' قابل ذکر ہیں ۔

حضرت شاہ صاحب کی ایک نادر تصنیف 'خزائن الاسرار' بھی ہے جو دراصل علامہ دمیری کی 'حیاۃ الحیوان' کا نچوڑ ہے ۔ سید انور شاہ صاحب کی یہ عادت تھی کہ وہ متقدمین کی ضخیم و مبسوط تصانیف، جنھیں اپنے اپنے فن میں امہات الکتب کی حیثیت حاصل ہے،کا مطالعہ کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ ان کی مفید معلومات کو جمع کرتے جاتے تھے بلکہ ان کی صحت و عدم صحت اور افادیت کے بارے میں اپنی قیمتی آراء بھی ضبط تحریر میں لاتے جاتے تھے ۔ 'خزائن الاسرار' اس قسم کی ایک مثال ہے ۔ اس کتاب میں جو ادعیہ ماثورہ اور وظائف درج ہوئے ہیں ان کا شاہ صاحب نے انتخاب کیا ہے اور کتب سیر و حدیث سے اپنے انتخاب کا استناد مع تبصرہ پیش کیا ہے ۔

مولانا ابو عبداللہ محمد سورتی

آپ بھی عربی زبان کے زبردست عالم تھے ۔ قوت حافظہ اور ذہانت میں اپنا جواب آپ تھے۔۱۸۸۹ء/۱۳۰۷ھ میں پیدا ہوئے۔اور ۱۹۴۲ء/۱۳۶۱ھ میں وفات پائی ۔ مولانا نے 'کتاب الجمہر' کو تصحیح اور حواشی کے ساتھ شائع کیا ۔

مولانا اشرف علی تھانوی ۔

اپنے عہد کے بہت بڑے عالم، مفسّر، متقی اور متشرع صوفی تھے۔ ۱۸۶۳ء/۱۲۸۰ھ

---

۱ - بیس بڑے مسلمان ، ص ۳۰۷ بعد، حیات انور از محمد اظہر شاہ نفحۃ العنبر از مولانا یوسف بنوری طبع مجلس علمی کراچی ۔

میں تھانہ بھون میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۳ء/۱۳۶۲ھ میں وفات پائی[1] ۔

مولانا تھانوی بھی کثیرالتصانیف علماء میں سے تھے ۔ چار سو سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں ۔ مولانا محمد یعقوب دیوبندی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن آپ کے استاد تھے ۔ مولانا تمام عمر اصلاح و تلقین اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے ۔ 'بیان القرآن' (تفسیر) ، 'رحمة القدوس' ، 'بہجة النفوس فی احادیث التصوف' وغیرہ آپ کی اہم تصانیف ہیں ۔

مولانا محمد الیاس کاندھلوی بن مولانا محمد اسماعیل

آپ ۱۸۸۵ء/۱۳۰۳ھ میں پیدا ہوئے ۔ آپ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوری کے چچا اور تبلیغی جماعت کے بانی ہیں ۔ حضرت شیخ الہند فرمایا کرتے تھے کہ میں جب مولوی الیاس کو دیکھتا ہوں تو مجھے صحابہؓ یاد آ جاتے ہیں ۔ اپنے بڑے بھائی مولانا محمد یحیی اور شیخ الہند سے علم حاصل کیا ۔ آپ کا عظیم کارنامہ ریاست الور اور میوات کے مسلمانوں کی اصلاح ہے ۔ ۱۳ جولائی ۱۹۴۴ء کو فوت ہوئے ۔ 'شرح معانی الآثار للطیبی' آپ کی یادگار ہے[2] ۔

مولانا شبیر احمد عثمانی

مولانا شبّیر احمد عثمانی دارالعلوم دیوبند کے مشاہیر میں سے ہیں اور پاکستان کی تحریک میں آپ نے زور و شور سے حصہ لیا ۔ آپ دیوبند کے عثمانی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ دارالعلوم میں تعلیم پائی آپ کے اساتذہ میں سے شیخ الہند مولانا محمودالحسن، مولانا برکت اللہ بھوپالی اور مولانا عبیداللہ سندھی بھی ہیں ۔ مولانا عثمانی عربی زبان کے بہت بڑے عالم اور ادیب تھے ۔ فقہ، تفسیر اور حدیث پر عبور رکھتے تھے ۔ دارالعلوم دیوبند اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے ۔ قیامِ پاکستان کے بعد دستوریہ کے رکن اور شیخ الاسلام بنائے گئے ۔ ۱۹۴۹ء میں فوت ہوئے[3] ۔

---

۱ ۔ تذکرہ مشائخ دیوبند ، ص ۳۸۵ ۔

۲ ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت از ابوالحسن ندوی ، ... بک ہاؤس دہلی ۔

۳ ۔ بیس بڑے مسلمان ، ص ۵۴ ، حیات شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی از فیض انبالوی ۔

علامہ شبیر احمد عثمانی نے شیخ الہند کے ادھورے ترجمہ و تفسیر قرآن کو مکمل کیا اور اردو میں مختلف کتابیں لکھیں ۔ 'فتح الملہم شرح مسلم' آپ کی بلند پایہ تصنیف ہے جو عربی زبان میں 'صحیح مسلم' کی شرح ہے اور تین جلدوں میں حیدرآباد دکن سے چھپ چکی ہے ۔

مولانا اصغر علی روحی

مولانا اصغر علی روحی اسلامیہ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر رہے ۔ مولانا عربی زبان و ادب کے فاضل اور اسلامی علوم کے ماہر تھے ۔ ۱۹۵۴ء میں فوت ہوئے ۔ 'دبیر عجم'، 'العروض و القوافی'، اور 'ساقی الاسلام' ان کی تصانیف ہیں ۔ مولانا نے ۱۹۰۳ء میں لاہور سے ایک ماہنامہ 'الہدیٰ' بھی جاری کیا تھا جو عرصہ تک شائع ہوتا رہا[1] ۔

مولانا اعزاز علی دیوبندی

مولانا اعزاز علی بن منشی معراج علی ۱۸۸۲ء/۱۳۰۰ھ میں قصبہ امروہہ ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے ۔ مختلف مدارس میں ابتدائی فارسی و عربی کتب متداولہ کی تعلیم کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور علوم کی تکمیل کی اور مولانا انور شاہ کشمیری سے طویل استفادہ کا موقع ملا ۔ مولانا ۱۹۵۷ء میں فوت ہوئے ۔

مولانا ایک مدت تک دیوبند میں صدر مفتی اور شیخ الادب کے مناصب پر فائز رہے ۔ 'حاشیہ نورالایضاح'، حاشیہ کنزالدقائق'، 'شرح حماسہ'، 'شرح متنبی'، 'حاشیہ شرح نقایہ' اور 'نفحۃ العرب' آپ کی اہم تصانیف ہیں[2] ۔

مولانا حسین احمد مدنی

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی برصغیر کے ممتاز عالم دین اور مؤرخ تھے ۔ ۱۸۷۸ء/۱۲۹۶ھ میں ضلع فیض آباد میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد مولانا سید حبیب اللہ ایک نیک صوفی تھے ۔ ابتدائی تعلیم بھی انہیں سے حاصل کی

---

۱ ۔ نقوش لاہور فروری ۱۹۶۲ء ۔

۲ ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ۔ تذکرۃ الاعزاز از محمد ظفر شاہ کشمیری ، شاہ منزل دیوبند سن

ور علوم کی تکمیل اپنے بھائی مولانا صدیق احمد اور شیخ الہند محمود الحسن سے
ارالعلوم میں کی ۔ آپ ایک مدت تک حرم نبوی[ؐ] میں اور دارالعلوم دیوبند میں حدیث
ی تعلیم دیتے رہے ۔ مولانا رشید احمد گنگوہی کے مرید تھے ۔ ۱۹۵۸ء/۱۳۷۷ھ میں
فات پائی[۱] ۔

تصانیف میں سے خود نوشت سوانح جو 'نقش حیات' کے نام سے موسوم ہے اور
شہاب الثاقب' قابل ذکر ہیں ۔ مولانا کی حقیقی شہرت ایک متقی عالم ، مدرس اور
دث کی حیثیت سے زیادہ تھی ۔

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے نامور اساتذہ میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع
ا نام ہمیشہ زندہ رہےگا ۔ مولوی صاحب ۱۸۸۳ء میں قصور میں پیدا ہوئے ۔ ۱۹۰۸ء
یں ایم اے انگلش اور ۱۹۱۳ء میں ایم اے عربی کیا ۔ اپنی علمی زندگی کا آغاز نارمل
کول لاہور کے سیکنڈ ماسٹر کی حیثیت سے کیا ۔ ۱۹۱۹ء میں پنجاب یونیورسٹی میں
ربی کے پروفیسر اور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک یونیورسٹی اورینٹل کالج کے پرنسپل
ہے ۔ ۱۹۵۰ء میں جب اردو دائرہ معارف اسلامیہ قائم ہوا تو مولوی صاحب اس کے
یئرمین مقرر ہوئے اور اسی حیثیت میں ۱۹۶۳ء میں وفات پائی[۲] ۔

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب نے متعدد مقالات و مضامین کے علاوہ 'فہارس العقد
فرید لابن عبدربہ' ، 'میخانہ عبدالنبی فخرالزمانی قزوینی' ، 'تتمہ صوان الحکمۃ لعلی
ن زید البیہقی' ، 'درۃ الاخبار' ، 'مطلع سعدین' ، 'مکاتبات رشیدی' اور 'مثنوی وامق و
ذرا' کی تحقیق و تحشیہ اپنی علمی یادگاریں چھوڑی ہیں ۔

محمد یوسف دہلوی

مولانا محمد یوسف بن مولانا محمد الیاس کاندھلوی ۱۹۱۶ء/۱۳۳۵ھ میں پیدا ہوئے
ے متقی ، عالم باعمل اور فاضل انسان تھے ۔ اپنے والد کے تبلیغی مشن کے لیے زندگی

---

۱ ۔ تذکرہ مشائخ ، دیو بند، ص ۲۵۱ بعد، بیس بڑے مسلمان ، ص ۴۰۰ ۔ حیات شیخ الاسلام
از محمد میاں ، مطبوعہ اسلامی کتاب گھر دیوبند ۔

۲ ۔ تاریخ اورینٹل کالج ، ص ۱۵۵ ۔

یقہ تھی اور اشاعتِ اسلام کی تحریک کو نواحِ عالم میں پھیلا یا - ۱۹۶۵ء/۱۳۸۴ھ میں فوت ہوئے[1] -

مولانا نے دینی موضوعات پر قابلِ قدر ذخیرہ چھوڑا ہے - 'سیرالصحابہ' اور 'امانی الاخبار شرح معانی الاثار للطحاوی' اہم تصانیف ہیں -

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل فضلاء نے عربی زبان و ادب کی بڑی خدمات انجام دی ہیں:

۱ - مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی صاحبِ 'کشف الغطاء عن الموطأ' -

۲ - مولانا ابوالوفا افغانی — جو ایک بہت بڑے فقیہ اور محدث ہیں اور 'کتاب الاثار امام ابو یوسف مختصر الطحاوی' اور 'اصول السرخسی' کو ایڈٹ کیا ہے -

۳ - مولانا امجد علی — جو ایک عالم اور فقیہ ہیں اور الطحاوی کی شرح لکھی ہے -

۴ - مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی — جنہوں نے 'سند الحمیدی' کو ایڈٹ کیا ہے -

۵ - ڈاکٹر حمید اللہ — جو دور حاضر کے عظیم مسلمان محقق اور عربی و فرانسیسی کے ماہر عالم ہیں اور کئی عربی کتابوں کو زندہ کیا ہے جن میں 'صحیفہ ہمام بن منبہ'، 'انساب الاشراف للبلاذری' اور 'کتاب البنات لابی حنیفہ دینوری' بھی شامل ہیں -

۶ - سید دیدار علی شاہ — جو عربی کے عالم محدث اور فقیہ ہیں - 'میزان الادیان' آپ کی تصنیف ہے -

۷ - پروفیسر زاہد علی جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن میں عربی کے پروفیسر ہیں - 'دیوان ابن ھا' کو ایڈٹ کیا ہے -

۸ - مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی — جو ایک بزرگ عالم دین اور عربی زبان کے شاعر اور ادیب ہیں - 'اعلاء السنن' اور 'احکام القرآن' آپ کی تصانیف ہیں -

۹ - مولانا سید ظفرالدین بہاری — جو عالمِ معقولات و منقولات اور ممتاز محدث و فقیہ ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں -

۱۰ - ڈاکٹر عبدالحق مدراسی — جو عربی کے عالم و ادیب ہیں اور دیوان 'ابن سناء الملک' کو ایڈٹ کیا ہے -

---

۱ - تذکرہ مشائخ دیوبند، ص ۳۹۹، تذکرہ حضرت مولانا محمد یوسف دہلوی مکتبہ رشیدیہ لاہور ۱۹۶۷ء -

۱۱ ۔ مولانا عبدالصمد بھیونڈی (بمبئی) ۔ جو ایک ممتاز عالمِ دین اور محدث ہیں اور 'ردالمنطقیین' اور 'تحفۃ الاشراف' کو ایڈٹ کیا ہے۔

مولانا عبدالعزیز میمن

برِ صغیر کے علمائے عربیہ میں مولانا عبدالعزیز میمن خصوصی تذکرے کے مستحق ہیں جو عربی علوم و ادب کے بہت بڑے عالم ہیں ۔ بے حد ذہین اور محنتی آدمی ہیں ۔ حافظہ بہت قوی ہے ، ہزاروں اشعار یاد ہیں اور عربی زبان و ادب کے ہر موضوع پر بے تکان علمی گفتگو کر سکتے ہیں ۔ مولانا ۱۸۸۹ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ مولوی ڈپٹی نذیر احمد کے شاگردوں میں سے ہیں ۔ اپنی خدا داد قابلیت اور محنت سے عربی علوم کی تاریخ پر عبور حاصل کیا ۔ پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کیا ۔ اسلامیہ کالج پشاور اور اورینٹل کالج لاہور میں لکچرار رہے پھر علیگڑھ میں ریڈر اور بعد میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے جہاں سے ۱۹۴۹ء میں سبکدوش ہوئے ۔ کراچی یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے ۔ ادارۂ تحقیقات اسلامی کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے اور اس کی لائبریری کو عربی و اسلامی علوم کے ذخائر سے بھر دیا ۔ پھر پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر اور صدرِ شعبہ عربی بنے ۔ جہاں سے ۱۹۶۶ء میں سبکدوش ہوئے۔ آجکل کراچی میں مقیم ہیں ۔

مولانا میمن عربی زبان کے مسلّم عالم و محقق ہیں ۔ عرب دنیا کے علماء اور یورپ کے مستشرق بھی ان کے علم و فضل کے معترف ہیں ۔ بلادِ عرب اور اسلامی دنیا کا سفر کرچکے ہیں اور دنیا بھر کے قدیم عربی مکتبات کا علم رکھتے ہیں ۔ دو درجن سے زائد عربی کتب کو زندہ کیا ہے جن میں 'سمط اللآلی' ایک معرکۃ الآراء اور شاندار علمی کارنامہ ہے ۔ ایک مدت تک عربی زبان کے مختلف رسائل میں علمی و تحقیقی مقالات لکھتے رہے ہیں ۔ 'ابوالعلاء و ما الیہ' آپ کی یادگار تصنیف ہے جو آپ نے ۱۹۳۳ء میں لکھی اور قاہرہ سے چھپی ۔ 'ماتفق الفظہ واختلف معناہ من القرآن للمبرد' ، 'الفاضل للمبرد' نسب عدنان و قحطان للمبرد' ، 'الوحشیات لابی تمام' ، 'دیوان حمید بن ثورالھلالی' ، 'دیوان سحیم العبد' ، کتاب التنبیہات لابن حمزہ' وغیرہ کو آپنے ایڈٹ کیا ہے ۔

مولانا نے تحقیق کے میدان میں جو نیا اسلوب اور عمدہ معیار پیش کیا ہے اس کی حقیقت و افادیت کا عرب دنیا کے فضلاء کے علاوہ مستشرقین نے بھی اعتراف کیا ہے ، مولانا کے علمی کارناموں میں سے صرف دو پر خصوصی نظر ضروری ہے جن میں سے ایک تو ان کا وہ تحقیقی کارنامہ ہے جو انہوں نے 'سمط اللآلی' کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر کے خراجِ تحسین حاصل کیا ،

ابن خلدون کے نزدیک جو چار کتابیں عربی ادب کے ستون کی حیثیت رکھتی ہیں ان میں سے ایک ابو علی اسماعیل بن القاسم القالی (م-۹۶۶ء/۳۵۶ھ کی 'کتاب الامالی' ہے ، اس کتاب کی ایک تنقیدی شرح ابوعبید عبداللہ بن عبدالعزیز البکری م-۱۰۹۴ء/۴۸۷ھ نے لکھی تھی جو 'اللالی فی شرح أمالی القالی' کے نام سے موسوم تھی ، میمن صاحب نے اس کتاب کو زندہ کر کے نہ صرف یہ کہ میدان تحقیق میں ایک شاندار کارنامہ انجام دیا ہے بلکہ عربی ادب کے موضوع پر تحقیق کرنے والوں پر بہت بڑا احسان بھی کیا ہے - فہرست سازی میں انہوں نے جو نئی راہ نکالی ہے وہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ تعریف ہے - یہ کتاب مولانا نے اس وقت ایڈٹ کی جب آپ علیگڑھ یونیورسٹی میں صدرِ شعبۂ عربی تھے - یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں مصر سے چھپی -

مولانا کی دوسری معرکة الآراء تصنیف 'ابوالعلا و ما الیہ' ہے جو عربی کے شہرہ آفاق فلسفی شاعر ابوالعلاء المعرّی کا مفصل اور جامع تذکرہ ہے ، ابوالعلاء معرّی پر قدیم زمانوں کی طرح جدید دور میں بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے - جدید دور کے فضلا میں سے برطانوی مستشرق مارگولیتھ اور ڈاکٹر طٰہ حسین کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں - میمن صاحب نے یہ کتاب شعبان ۱۹۲۴ء/۱۳۴۳ھ میں اس وقت مکمل کی جب آپ یونیورسٹی اورئینٹل کالج لاہور میں عربی کے مدرس تھے اور مارگو لیتھ اور ڈاکٹر طٰہ حسین معرّی پر اپنی علمی تحقیق پیش کر کے خراج تحسین حاصل کر چکے تھے - لیکن مولانا نے نہ صرف یہ کہ ابوالعلاء معرّی کے بارے میں مزید معلومات مہیا کیں بلکہ ان پر دو فضلاء کی بہت سی اغلاط کی بھی نشاندہی کی ، خصوصیت کے ساتھ اسلامی اندلس میں معرّی کی مقبولیت اور اس کے دینی عقیدے پر مفصّل معلومات سب سے پہلے مولانا ہی نے اپنی کتاب میں فراہم کیں - اس کتاب کی وجہ سے ایک تو مولانا عربی دنیا اور مستشرقین کے علمی حلقوں میں متعارف ہوئے اور دوسرے اس کتاب نے مصر کے ادبی حلقوں میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا - یہ کتاب ۱۹۲۵ء/۱۳۴۴ھ میں مصر سے شائع ہوئی اور اس وقت کے علمی و ادبی رسالے 'الزھراء' میں اس پر تبصرہ شائع ہوا - اس کے بعد کئی ایک اہلِ علم و أدب نے اس کتاب کے مخالف و موافق اپنی آراء کا اظہار کیا جن میں خود ڈاکٹر طٰہ حسین بھی شامل ہیں -

عربی و اسلامی علوم کی خدمات کے سلسلے میں چند ایک اور نام بھی قابلِ ذکر ہیں - ان میں عبداللہ شاہ حیدرآبادی مصحح و مرتب 'زجاج المصابیح' ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ، جو عربی کے مایہ ناز ادیب و انشاء پرداز ہیں اور عربی میں کئی ایک بلند پایہ علمی کتابوں کے مصنف ہیں ، جیسے 'موقف العالم الاسلامی' 'القادیانیة' اور 'روائع اقبال' - فضل احمد حیدرآبادی ، جو ایک متقی عالم

دین اور ادیب ہیں اور حدیث و تفسیر کے ممتاز عالم ہیں ، 'التعلیق الصبیح' آپ کی اہم تصنیف ہے ۔ قاضی محمد اطہر مبارکپوری مصنف 'رجال الہند والسند' اور ایڈیٹر 'البلاغ' بمبئی ۔ مولانا محمد زکریا سہارنپوری شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور ، جو 'اوجز المسالک شرح موطا الامام مالک' کے مصنف ہیں ۔ مفتی محمد شفیع دیوبندی ، جو ایک جید عالم اور فقیہ و محدث ہیں اور 'التصریح اور ہدایۃ المبتدیین' کے مصنف ہیں ۔ محمد محسن خان ٹونکی مصنف 'معجم المصنفین' ، مولانا محمد یوسف بنوری ، جو عربی کے مایہ ناز ادیب اور ممتاز عالم دین ہیں اور 'نفحۃ العنبر' (تذکرہ سید انور شاہ کشمیری) اور 'شرح موطأ' اور 'شرح ترمذی' کے مصنف ہیں ۔ ڈاکٹر معظم حسین آف ڈھاکہ 'مصحح معرفۃ علوم الحدیث للعالم' اور 'کتاب الاختیار' ہیں ۔ مفتی مہدی حسن دیوبندی جو ایک ممتاز عالم اور فقیہ ہیں اور 'کتاب الحجۃ' کی شرح لکھی ہے ۔ مولانا میرک شاہ کشمیری جو عربی زبان کے ادیب اور ممتاز عالم ہیں اور 'عقیدۃ المحدثین' اور 'شرح القوافی' کے مصنف ہیں اور وحید الدین عالی حیدرآبادی جو اردو ، فارسی اور عربی کے ماہر ، ادیب اور شاعر تھے اور فارسی و عربی میں صاحب دیوان شاعر[1] تھے ، اور کئی ایسے ہی دیگر علماء کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ۔

مولانا نانوتوی

برصغیر پاک ہند سے عربی و اسلامی علوم کی تاریخ لکھتے وقت ان مایہ ناز اور بلند ہستیوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ، جنہوں نے اردو اور انگریزی کے ذریعہ عربی علوم و ادب کی خدمت انجام دی ۔ اردو کے ذریعہ عربی و اسلامی علوم کی جن لوگوں نے خدمت کی ان میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کا نام سر فہرست ہے ۔ آپ کی پیدائش ۱۸۳۳ء/۱۲۴۸ھ میں ہوئی ۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے بانی اور سرسید احمد خان کے ہم جماعت اور استاد بھائی بھی تھے ۔ آپ نے مولانا مملوک علی نانوتوی سے مروجہ درسی کتابیں پڑھیں اور شاہ عبدالغنی محدث دہلوی سے حدیث کی سند حاصل کی ۔ آپ نے ہندو پنڈتوں اور عیسائی پادریوں کے ساتھ مناظرے کر کے اسلام کی برتری قائم کر دی ۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن آپ کے شاگردوں میں سے تھے ۔ 'تحذیر الناس' ، 'آب حیات' ، 'تقریر دلپذیر' ، انتباہ المؤمنین' ، 'مباحثہ شاہ جہان پور' ، ہدایۃ الشیعہ' اور 'قبلہ نما' آپ کی اہم تصانیف ہیں[2] ۔

---

۱ ۔ نقوش (اکتوبر ۱۹۶۵ء) لاہور ، ص ۱۲۶۵ ۔
۲ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، ص ۳۹۵ ، تذکرہ مشائخ دیوبند ، ص ۱۳۱ ۔

سر سید احمد خاں:

برِ صغیر پاک و ہند سے ملّتِ اسلامیہ کی عظیم ترین اور عہد آفرین شخصیت جس نے زوال پذیر اسلامی معاشرے اور ہر لحاظ سے پستی کی طرف جانے والی مسلم قوم کو سنبھلنے کے لیے خبردار کیا اور رہنما خطوط مہیا کرنے کے علاوہ ایک زبردست اسلامی تحریک کو جنم دیا، جو آگے چل کر دولتِ خداداد پاکستان کے قیام کے لیے نقشِ اول ثابت ہوئی وہ مولانا سرسید احمد خان مرحوم کی ذاتِ گرامی ہے - وہ ۱۸۱۷ء/۱۲۳۲ھ کو دلی میں پیدا ہوئے اور عربی و فارسی کے متداول علوم کی تعلیم حاصل کی - آپ کے اساتذہ میں مولوی حمیدالدین اور مولانا مملوک علی نانوتوی بھی[1] شامل ہیں - ۱۸۳۸ء میں سرسید انگریزی حکومت کے میر منشی مقرر ہوئے اور اس کے بعد ۱۸۷۸ء تک مختلف مقامات پر سرکاری مناصب پر فائز ہوتے رہے - ۱۸۷۷ء میں آپ نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ قائم کیا، جس نے آگے چل کر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی شکل اختیار کر لی -

تقریباً ۳۵ سال کی ملازمت کے بعد ۱۸۷۸ء سے لیکر ۱۸۹۸ء میں اپنی وفات تک سرسید ہمہ تن اصلاحِ قوم کے کام میں مشغول رہے - ملازمت کے دوران بھی وہ جہاد کئے اصلاحِ قوم کی مہم کو جاری رکھا - کہیں مدارس قائم کئے، کہیں علمی انجمنیں بنائیں اور کہیں بحث و تحقیق کے کارنامے انجام دیے - سرسید نے 'تفسیرِ احمدی' کے نام سے قرآن کریم کی ایک جدید تفسیر لکھی ہے - 'خطباتِ احمدیہ' (جو سرولیم میور کی کتاب لائف آف محمدؐ کے اعتراضات کے جواب میں ہے)، 'اسبابِ بغاوت ہند'، 'انتخاب الاخوین یعنی'قواعد دیوانی' کا خلاصہ، 'قول متین در ابطال زمین'، 'تسہیل فی جرالثقیل'، 'آثار الصنادید' اور 'تذکرہ اہلِ دہلی' ان کی تصانیف ہیں - مؤخرالذکر کتاب اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں سرسید نے اپنے عہد کے ان تمام اہلِ علم و ہنر کا تذکرہ کیا ہے جو دہلی میں تھے - عربی زبان و ادب کے علماء کے تذکروں کے ضمن میں ان کے ایسے نادر نثری نمونے اور شاہ کار عربی قصائد بھی جمع کر دیے ہیں جو اور کہیں دستیاب نہیں -

دیگر علماء

مولانا رشید احمد گنگوہی، جو مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا مملوک علی نانوتوی

---

۱ - حیات جاوید، ص ۳۲ بعد، موج کوثر، ص ۸۰

اور شاہ عبدالغنی دہلوی کے تلامذہ اور دارالعلوم دیوبند کے بانیوں اور سرپرستوں میں سے تھے، اپنے عہد کے ایک عالم باعمل اور صوفی تھے ۔ آپ نے عربی و اسلامی علوم پر اردو میں بہت کام کیا ہے ۔ ۱۹۰۵ء میں آپ کی وفات ہوئی اور 'براہین قاطعہ' ، 'ہدایۃ المہتدی' اور 'سبیل الرشاد' وغیرہ آپ کی اہم مؤلفات ہیں[1] ۔

برصغیر میں عربی زبان و ادب کی تاریخ لکھتے وقت مولانا محمد شبلی نعمانی (م - ۱۹۱۴ء) کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ۔ آپ عربی زبان و ادب کے ماہر تھے ۔ آپ نے دارالمصنفین اعظم گڑھ کا ادارہ قائم کر کے عربی و اسلامی علوم کے متعلق تحقیق کی راہیں کھول دیں ۔ آپ کی تمام تصانیف اردو زبان میں ہیں لیکن سیرت اور علمِ کلام کے متعلق آپ کی تمام تصانیف کے مآخذ عربی زبان میں متقدمین کی متعلقہ تصانیف ہیں ۔ آپ کی تصنیف ، 'سیرت النبیؐ' ، ایک عظیم کارنامہ ہے جس کا ترجمہ عربی میں ہو چکا ہے ۔

جہاں تک عربی زبان میں تصنیف کا تعلق ہے پاکستان بننے سے پہلے علامہ عنایت اللہ خان مشرقی نے اپنی مشہور تالیف 'تذکرہ' ، کا مبسوط مقدمہ عربی زبان میں تحریر کیا جس میں انہوں نے قرآنِ مجید کے اسلوب کی پیروی کرنے کی کوشش کی ۔ مقدمہ میں علامۂ موصوف نے بنیادی طور پر یہ کہا ہے کہ مسلمانوں کو فرقہ وارانہ اختلافات ترک کر کے متحد ہو جانا چاہیے اور ملی بقا کے لیے ہمیشہ سربکف رہنا چاہیے ۔ 'تذکرہ' در اصل ان کی خاکسار تحریک کے نظریۂ عمل کی تشریح پر مشتمل ہے جس کا مقصد خدمتِ خلق کے ذریعے احیائے ملت تھا ۔

۱۹۴۷ء - ۱۹۷۲ء

قیامِ پاکستان کے بعد عربی زبان اور علومِ اسلامیہ کی جو ترقی ہونی چاہیے تھی وہ تو نہیں ہوسکی تاہم پاکستان میں مقدور بھر کوشش جاری رہی اور جاری ہے ۔ حکومتِ پاکستان نے علومِ اسلامیہ اور عربی زبان و ادب کی ترقی کے لیے دو رسائل 'البشیر' اور 'الوعی' جاری کیے جن میں قیمتی مواد اور قابلِ قدر مضامین شائع ہوتے رہے ہیں ۔ مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامی قائم کیا جو شروع میں کراچی میں تھا مگر بعد میں اسلام آباد میں منتقل ہو گیا ہے ۔ یہ ادارہ تین پرچے نکالتا ہے جن میں سے ایک انگریزی

---

۱ - پاکستان کا معمار اول سر سید ، ص "ع" ۔

دوسرا اردو اور تیسرا بنگالی میں علمی و تحقیقی مقالات شائع کرتا ہے ۔ 'الدراسات الاسلامیہ' کے نام سے ایک عربی زبان میں سہ ماہی مجلہ بھی شائع ہوتا ہے اور کئی ایک مفید کتابیں تحقیق کے بعد شائع کر چکا ہے ۔ اس ادارے کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کی ابتدائی تنظیم میں مولانا عبدالعزیز میمن کا بہت بڑا ہاتھ ہے اور ڈاکٹر صغیر حسین معصومی جیسے فضلاء بھی اس ادارے سے وابستہ ہیں جو فاضل دیوبند ہونے کے ساتھ ساتھ مروجہ تعلیم کے مراحل سے بھی گزرے ہیں اور اپنی بلند پایہ علمی ابحاث اور تحقیق کی بنیاد پر مجمع اللغة العربیة دمشق کے عضو مراسل منتخب ہوئے ہیں ۔

حکومت پاکستان کی دوسری کوشش جامعہ اسلامیہ بہاول پور کا قیام ہے اس یونیورسٹی کے مقاصد میں سر فہرست عربی اور اسلامی علوم کی اشاعت اور ترقی ہے اور جامعہ ازہر مصر کی طرز پر اسے ایک بین الاقوامی ادارہ بنانا بھی اس کے مقاصد میں شامل ہے ۔

مولانا محمد یوسف بنوری

عربی زبان کے مایہ ناز فاضل ہیں ، آپ نے کراچی میں مجلس علمی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے جس کا مقصد عربی زبان و ادب اور اسلامی علوم کی اشاعت ہے ۔ یہ ادارہ اب تک کئی ایک اہم اور مفید علمی خدمات انجام دے چکا ہے جس میں سے ایک 'نفحة العنبر' کی اشاعت ہے ۔ یہ کتاب اصل میں مولانا انور شاہ صاحب کشمیری کا مفصل اور جامع تذکرہ ہے جو مولانا یوسف بنوری نے شستہ اور فصیح عربی زبان میں مرتب کیا ہے ۔ برصغیر پاک و ہند کے عربی دان عالم کا عربی زبان میں یہ سب سے پہلا اور ضخیم تذکرہ ہے ۔

اس عہد کے مزید نامور علماء

جن علماء کا اب ذکر ہو رہا ہے ، اردو ذریعۂ اظہار ہو جانے کے باعث انہوں نے عربی زبان میں کوئی تصنیفات نہیں چھوڑیں لیکن عربی اور اسلامی علوم میں ان کی مہارت غیر معمولی تھی ۔ مولانا سید سلیمان ندوی (م ۔ ۱۹۵۳ء) پٹنہ کالج میں عربی اور فارسی کے استاد رہے ۔ مولانا شبلی نعمانی کی تصنیف 'سیرت النبیؐ' کی تکمیل آپ کے ہاتھوں ہوئی ۔ ۱۹۵۰ء میں کراچی چلے آئے تھے اور یہیں فوت ہوئے ۔ مولانا ابوالکلام آزاد (م ۔ ۱۹۵۸ء) مشہور مفسر قرآن تھے اسی طرح مولانا عبدالسلام ندوی (م ۔ ۱۹۵۶ء) نے بھی اسلامی علوم اور تاریخ اسلام کے موضوع پر ناقابل فراموش خدمات انجام دی

ہیں ۔ مولانا سید رئیس احمد جعفری (م ۔ ۱۹۶۹ء) بھی بہت بڑے عالم تھے اور کئی حیثیتوں سے عربی و اسلامی علوم کی خدمت کرتے رہے ۔

ندوۃ کے ایک فاضل مولانا ابو ظفر ندوی ہیں جو 'اسلام اور عربی تمدن'، 'حکماء اسلام' اور 'تبع تابعین' کے علاوہ کئی ایک بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں ۔ بہت اچھا لکھتے ہیں اور عربی و اسلامی علوم پر گہری نظر ہے ۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی فاضل دیوبند بھی عربی و اسلامی علوم کے جلیل القدر علماء میں سے ہیں ۔ آپ کا رسالہ 'برہان، دہلی' ایک عمدہ معیاری علمی و تحقیقی ماہنامہ ہے جس نے اسلامی علوم کی بڑی خدمت کی ہے ۔ مولانا ایک عرصہ تک مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل بھی رہے ہیں[1] ۔ آجکل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے وابستہ ہیں ۔ 'فہم قرآن'، 'غلامانِ اسلام' 'صدیق اکبر' اور 'وحی الٰہی' آپ کی اہم تصانیف ہیں ۔

ان بزرگوں کے علاوہ کئی اور علماء نے بھی اردو زبان میں عربی ادب اور علوم کی نشر و اشاعت اور ترقی میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے ۔ جن میں "سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی صاحبِ 'تیسیرالقرآن' ہیں، مفتی احمد یار خان بدایونی حال گجرات مصنف 'تفسیر نعیمی'، مولانا اسلم جیراجپوری، 'تاریخ الامت' اور 'محجوب الارث' کے مصنف مولانا بدر عالم میرٹھی جو ایک بلند پایہ عالم، محدث اور مفسر اور 'ترجمان السنہ' کے مصنف ہیں، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی جو ایک جلیل القدر عالم، مسلّم محقق، مشہور صاحبِ قلم اور 'قصص القرآن' کے مصنف ہیں ۔ "ڈاکٹر خورشید احمد فاروقی جو علی گڑھ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور مولانا عبدالعزیز میمن کے شاگردِ خاص ہیں اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط پر خوب داد تحقیق دی ہے، قاضی زین العابدین میرٹھی جو ایک مسلّم عالم اور مؤرخ ہیں اور 'بیان اللسان' اور 'تاریخ ملت' آپ کی تصانیف قابلِ ذکر ہیں ۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

جدید دور میں اسلام اور ملّت اسلامیہ کی بے لوث اور بے بہا خدمت کے ساتھ عربی و اسلامی علوم کی جو خدمت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے کی ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے اور خصوصی تذکرے کی متقاضی ہے ۔ مولانا ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء میں اورنگ آباد ریاست حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے ۔ صحافتی زندگی کا آغاز اٹھارہ سال کی

---

۱ ۔ تاریخ دیوبند، ص ۳۰۲ ۔

مصر میں جمعیت العلماء ہند کے اخبار 'الجمعیت' کی ایڈیٹری سے کیا اور اسی دور میں 'الجہاد فی الاسلام' لکھ کر علمی دنیا سے متعارف ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد دکن سے 'ترجمان القرآن' جاری کیا جو آج تک آپ کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۵۳ء میں مارشل لاء کے تحت سزائے موت کا حکم ہوا مگر بعد میں رہا کر دیے گئے اور تادم تحریر سیاست کے ساتھ ساتھ علم کی خدمت بھی کر رہے ہیں۔

مولانا جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور رابطۂ عالم اسلامی مکۂ مکرمہ کے تأسیسی ارکان میں سے ہیں۔ رباط میں مؤتمر قبہ اسلامی میں ایک مبصر کی حیثیت سے شریک کیے گئے۔ وہ بلاشبہ اس دور کے مفکر اسلام اور بین الاقوامی شہرت کے عالم اور رہنما ہیں۔ مولانا کی تصانیف میں قرآن کریم کی تفسیر 'تفہیم القرآن'، 'الجہاد فی الاسلام'، 'سود'، 'پردہ'، 'تنقیحات'، 'تفہیمات'، 'مسئلہ قومیت' اور 'مسئلہ جبر و قدر' اہم ہیں۔ آپ کی تمام تصانیف کا عربی میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔

دیگر علماء

اردو کے ذریعے عربی و اسلامی علوم کی خدمت کرنے والے دوسرے فضلاء میں سے ذیل کے حضرات بھی خصوصی تذکرے کے مستحق ہیں :

۱۔ مولانا سید صباح الدین عبدالرحمان جو عربی زبان و اسلامی علوم کے مستند فاضل اور مؤرخ ہیں اور 'بزم صوفیہ'، 'بزم مملوکیہ' اور بزم تیموریہ کے مصنف ہیں۔

۲۔ مولاناعبدالحق حقانی جو ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سرپرستوں میں سے تھے اور تفسیر حقانی کے مصنف ہیں اور اصول تفسیر کے موضوع پر ایک جامع رسالہ لکھ کر مقدمے کے طور پر اپنی تفسیر کے شروع میں شامل کیا ہے۔

۳۔ مولانا عبدالدائم الجلالی رامپوری ــ جو ایک بلند پایہ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے مترجم بھی ہیں۔ 'تفسیر مظہری' اور 'فتوح الغیب' وغیرہ کا عربی سے اردو میں ترجمہ کر کے علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔

۴۔ مولانا عبدالرشید نعمانی ــ جنہوں نے تفسیر اور حدیث کے میدان میں اچھی علمی خدمات انجام دی ہیں۔ 'لغات القرآن'، 'علم حدیث' اور 'شرح ابن ماجہ' وغیرہ آپ کی تصانیف ہیں۔

۵۔ عبدالقدیر صدیقی حیدر آباد دکن کے نامور فضلاء میں سے ہیں ۔ آپ کو تصوف اور فلسفہ سے گہری دلچسپی ہے ۔ ایک نامور عالم اور مصنف کی حیثیت سے مسلّم ہیں ۔ محی الدین ابن العربی کی کتاب 'فصوص الحکم' کا اردو میں ترجمہ کر چکے ہیں ۔

۶۔ علامہ عبداللہ العمادی ــ جو عربی فارسی اور اردو شاعری پر عبور رکھتے تھے اور عربی ادب ، لغت ، نحو اور عروض کے ماہر تھے ۔ آپ نے 'طبقات ابن سعد' کا اردو میں ترجمہ کیا اور ایک عرصہ تک دارالترجمہ و تالیف کا کام کرتے رہے اور یہیں ۱۶ ستمبر ۱۹۴۷ء میں انتقال ہوا[1] ۔

۷۔ مولانا عبدالواسع ــ جو فلسفہ اور منطق کے ماہر تھے اور رسالہ 'بدر' مرتب کیا ۔

۸۔ مولانا غلام قادر بھیروی ، جنہوں نے 'اسلام کی پہلی کتاب' اور 'اسلام کی دوسری کتاب' ... الخ کے عنوان سے مسلمان بچوں کے لیے بہترین نصابی سلسلہ مرتب کیا ۔

۹۔ مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی ، جو جمعیۃ العلماء ہند کے سرگرم رہنما اور جنگ آزادی کے ایک مجاہد تھے ۔ آپ نے 'تعلیم الاسلام' کے نام سے ایک مفید نصابی سلسلہ مرتب کیا جو سوالاً جواباً ہونے کے باعث بڑا عام فہم اور دلنشین ہے ۔ اس مکمل سلسلے کا انگریزی میں بھی ترجمہ کر دیا گیا ہے ۔

۱۰۔ مولانا محمد طیب قاضی دارالعلوم دیوبند کے موجودہ مہتمم جو ایک نامور فاضل اجل اور عالم معقولات و منقولات ہیں اور اسلام کی فلسفیانہ تشریح پر بڑی قدرت رکھتے ہیں ۔ آپ کی تصانیف میں سے 'سائنس اور اسلام' ، 'التشبہ فی الاسلام' ، 'شان رسالت' ، 'علم غیب' ، 'معجزہ کیا ہے' اور 'الاجتہاد والتقلید' اہم ہیں ۔

۱۱۔ مولانا محمد منظور نعمانی اس دور کے جلیل القدر عالم اور نامور مصنف ہیں ۔ آپ کا رسالہ 'الفرقان' ایک مدت سے عربی و اسلامی علوم کی شاندار خدمات انجام دے رہا ہے ۔ اپنے اسی رسالے میں آپ نے معارف الحدیث کا ایک سلسلہ شروع کیا جو کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے ۔ آپ کی دیگر تصانیف میں سے 'نماز کی حقیقت' اور 'قرآن آپ سے کیا کہتا ہے' اور 'دین و شریعت' قابل ذکر ہیں ۔

۱۲۔ مولانا شاہ معین الدین ندوی بھی ہیں ۔ آپ ایک مدت سے دارالمصنفین اعظم گڑھ سے منسلک ہیں اور بحث و تحقیق میں مشغول ہیں ۔ آپ کی تصانیف میں سے 'مہاجرین' ،

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے نقوش لاہور اکتوبر ۱۹۵۷ء ــ فروری ۱۹۶۱ء ۔

'دین رحمت' ، 'خلفائے راشدین' ، 'سیر الصحابہ' اور 'تاریخِ اسلام' قابلِ ذکر ہیں ۔ مؤخرالذکر کتاب کئی جلدوں میں ہے اور اسلام کی مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے اور کئی ایک جامعات کے نصابِ تعلیم میں داخل ہے ۔

۱۳۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی — آپ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء میں سے ہیں اور تمام عمر عربی و اسلامی علوم کی خدمت کے لیے وقف رکھی ۔ آپ کی اہم تصانیف یہ ہیں : 'ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی' ، 'ابو زر غفاری'، 'اسلامی معاشیات'، 'کائنات روحانی'، 'النبی ؐ الخاتم'، 'ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت' ، 'تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ' ، 'تدوینِ قرآن' اور 'تدوین حدیث' ۔

۱۴۔ مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی ایک جلیل القدر عالمِ دین اور نامور فاضل تھے اور ہزاروں لوگ آپ کے فیض سے بہرہ ور ہوئے ۔ آپ نے 'خزائن العرفان' کے نام سے قرآن کریم کی ایک عمدہ تفسیر لکھی ہے ۔

۱۵۔ مولانا وحید الزمان خان شہید — مولانا نے غریب الحدیث کے موضوع پر اردو میں ایک بیش بہا ذخیرے کا اضافہ کیا ہے ۔ آپ نے 'سنن ابن ماجہ' اور 'سنن ابی داود' کا اردو میں ترجمہ و تشریح کی ۔ صحیح بخاری کا اردو ترجمہ و تشریح جو 'تیسیر الباری' کے نام سے مشہور ہے ، بہت پسندیدہ ہے اور مقبول شروح بخاری ہی سے ایک ہے ۔ اس کے علاوہ 'انوار اللغہ' یا 'وحید اللغات' ، 'لغات الحدیث' ، 'کشف المغطاعن کتاب الموطأ بتبویب القرآن لضبط'، مضامین 'القرآن' اور 'لغات القرآن' بھی آپ کی قابلِ ذکر تصانیف ہیں ۔

انگریزی میں علوم عربی سے متعلق تصانیف

برِ صغیر پاک و ہند میں چونکہ ایک طویل مدت تک انگریزی سرکاری زبان کی حیثیت سے مروّج و متداول رہی ہے، اس لیے علمائے اسلام میں سے بعض نے ملّتِ اسلامیہ کی جدید تعلیم یافتہ نسل کو اسلام کے قریب لانے اور قرآن اور اس سے متعلقہ علوم سے فائدہ اٹھانے کے لیے جہاں قرآنِ کریم اور بعض کتبِ حدیث کا انگریزی میں ترجمہ کیا، وہاں دینِ اسلام کے بنیادی اصولوں ، عقائد و عبادات اور تاریخِ اسلام پر انگریزی میں مفید کتابیں لکھی ہیں ۔ اس لیے ان کا اجمالاً تذکرہ بھی ضروری اور مفید ہوگا ۔ ان میں سرِ فہرست حکیم الامت علامہ محمد اقبال (۱۸۷۳ء – ۱۹۳۸ء) ہیں ۔ آپ کو عربی و اسلامی علوم سے گہرا شغف تھا ۔ اپنے کلام میں جابجا آیات ، احادیث ، آئمہ و علمائے عرب کے

اقوال اور غرب شعراء کے بعض مصرعوں کو اپنے کلام کی زینت بنایا ہے ۔ آپ کے معرکۃ الآراء خطبات (Reconstruction of Religious Thought in Islam) کا 'تجدید فی الاسلام ' کے نام سے عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے ۔ اسی طرح آپ الفکر الدینی کے اردو اور فارسی کلام کا بھی عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے ۔ سب سے زیادہ تراجم ڈاکٹر عبدالوہاب عزام (م ۔ ۱۹۵۹ء) ، عباس محمود العقاد (م ۔ ۱۹۶۴ء) اور شیخ محمد صاوی شعلان الازہری نے کیے ہیں ۔

سید امیر علی نے 'سپرٹ آف اسلام' اور 'ہسٹری آف ساراسین' لکھی ۔ مولوی محمد علی لاہوری نے انگریزی میں قرآن کی تفسیر اور The Religion of Islam وغیرہ لکھیں ۔ خواجہ کمال الدین تبلیغ و اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ کتابیں بھی لکھتے رہے ۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی عربی و اسلامی علوم کے متبحر عالم ہیں ۔ آپ نے اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی قرآن کا ترجمہ اور تفسیر لکھی ۔ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی نے ادبیات حدیث کے بارے میں انگریزی زبان میں بڑا کام کیا ہے ۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی الہ آباد یونیورسٹی نے جرمنی زبان میں عربی کے دخیل الفاظ پر عالمانہ تحقیق پیش کی ہے ۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکم نے اسلامی موضوعات پر کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں The Ideology of Islam اس سلسلے کی ممتاز علمی خدمت ہے ۔ ڈاکٹر برکت علی مرحوم سابق پروفیسر شعبہ عربی اور پرنسپل اوریئنٹل کالج لاہور نے State and Culture as veined by Ibn Khaldun کے نام سے ایک عالمانہ تحقیق اپنی یاد گار چھوڑی ہے ۔ اسی طرح ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ سابق پروفیسر عربی اوریئنٹل کالج لاہور نے کئی ایک قابل قدر کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں ان کی کتاب Why we learn the Arabic Language خصوصیت سے قابل ذکر ہے ۔ اس سلسلے میں خصوصی تذکرہ کی مستحق دو شخصیات ہیں ان میں سے ایک ڈاکٹر زبید احمد استاد عربی الہ آباد یونیورسٹی ہیں، جن کا پر از معلومات اور عالمانہ مقالہ پی ۔ ایچ ۔ ڈی بعنوان The Contribution of India to Arabic Literature طبع ہو کر خراج تحسین وصول کر چکا ہے اور دوسری شخصیت ڈاکٹر محمد اسحاق ، استاد عربی و اسلامیات ڈھاکہ یونیورسٹی کی ہے جنہوں نے India's Contribution to the Study of Hadith Literature کے نام سے ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا ہے جو ۱۹۵۵ء میں ڈھاکہ سے طبع ہو چکا ہے ۔

عربی زبان و ادب کی درسگاہوں میں تدریسی اور تحقیقی کام

عربی زبان و ادب کی تاریخ لکھتے وقت ان تعلیمی درسگاہوں ، تحقیقی اداروں اور

نشر اور طباعت کا کام کرنے والے کتب خانوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ، جنہوں نے برِّ صغیر پاک و ہند میں عربی زبان و ادب اور اسلامی علوم و معارف کو عام کرنے کا شوق حاصل ہوا ۔ ان درسگاہوں اور اداروں میں سے بعض تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ گئے اور کچھ پاکستان میں ہیں ۔ ان درسگاہوں کی وجہ سے عربی زبان و ادب اور علوم سے متعلق بڑا تحقیقی کام ہوا ہے ۔ ہندوستان میں عربی و اسلامی علوم کی درسگاہوں میں سب سے اول فرنگی محل کا مدرسہ ہے جو اورنگ زیب عالمگیر کی عطا کردہ زمین میں ملا نظام الدین نے قائم کیا تھا۔ اس مدرسہ کے نصاب تعلیم میں قواعدِ زبان یعنی صرف نحو کے ساتھ ساتھ عقلی علوم مثلاً منطق، فلسفہ، بلاغت، ریاضی، اصولِ فقہ اور علم الکلام پر بڑا زور دیا گیا تھا لیکن نقلی علوم نہ ہونے کے برابر تھے ۔ مثلاً زبان و ادب کے لیے تو اس میں گنجائش ہی نہ تھی۔ تفسیر و حدیث بھی برائے نام شاملِ نصاب کی گئی ۔ یہی وجہ ہے کہ اس درسگاہ نے بڑے فقیہ، منطقی اور یونانی فلسفے کے ماہر تو پیدا کیے مگر کوئی ادیب ، مفسّر یا محدّث شاذ و نادر ہی پیدا ہوا[1]۔ فرنگی محل نے جو مشہورِ زمانہ علماء و فضلا پیدا کیے ان میں مولانا بحرالعلوم عبدالعلی بن ملا نظام الدین سہالوی ، مولانا عبدالحی لکھنؤی ، صاحب 'الفوائد البهية فى تراجم الحنفية' اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی ممتاز حیثیت کے مالک ہیں[2]۔

برِّ صغیر پاک و ہند کا دوسرا مدرسہ عربیہ مظاہر العلوم سہارنپور ہے ۔ اس درسگاہ کی بنیاد ۱۸۶۶ء/۱۲۸۲ھ کے ماہ رجب میں پڑی ۔ اس درسگاہ نے علمِ دین ، اسلام کی اشاعت اور ہند کی ملّتِ اسلامیہ کی خدمت کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں ۔ خصوصیت کے ساتھ علمِ حدیث کی خدمت کے سلسلے میں اس درسگاہ کے علماء پیش پیش رہے ۔ مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری کی شرح ابو داؤد جو 'بذل المجهود' کے نام سے مشہور ہے اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوری کی 'شرح موطاء امام مالک' موسوم بہ 'اوجزالمسالک' علمِ حدیث کے عظیم شاہکار[3] ہیں ۔

تیسری مشہور درسگاہ درالعلوم دیوبند ہے ۔ اس کا نصابِ تعلیم مدرسہ فرنگی محل سے اس لحاظ سے بہت مختلف ہے کہ اس میں جہاں منطق و فلسفہ کی جگہ تفسیر ، حدیث اور دیگر دینی علوم کو فوقیت دی گئی ہے وہاں عربی ادب پر بھی قابلِ قدر توجہ دی گئی ہے اور نظم و نثر کے معیاری نمونے داخلِ نصاب ہوئے ہیں ۔

---

۱ - رود کوثر ، ص ۶۰۷ -
۲ - رود کوثر ، ص ۶۱۰ -
۳ - تذکرہ مشائخ دیوبند ، ص ۲۲۲ ، ۲۸۱ ببعد -

اس درسگاہ سے مولوی ذوالفقار علی دیوبندی اور مولانا اعزاز علی جیسے ادیب ، شیخ الہند مولانا محمود الحسن ، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا عبید اللہ سندھی ایسے مجاہد قائدین اور مولانا انور شاہ کشمیری ، مولانا شبیر احمد عثمانی ایسے متبحر عالم اور محدث اور مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایسے صاحب قلم پیدا ہوئے۔

اس ضمن میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کا ذکر ضروری ہے جس کا قیام ۱۸۹۴ء میں عمل میں آیا ۔ اس کے محرک مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر تھے مگر اس کی تکمیل مولوی سید محمد علی صاحب کانپوری کے ہاتھوں انجام پائی ۔ مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق دہلوی صاحب 'تفسیر حقانی' نے قواعد و ضوابط مرتب کیے ۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے قدیم علماء اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے جدیدیت پسند علماء کے بین بین کام کرنے والی ایک جماعت اہل علم تیار ہو جو جدید و قدیم کا حسین امتزاج ہو ۔ ندوۃ العلماء کے مقاصد میں دینی علوم کے نصاب کی اصلاح، اختلاف و نزاعی مسائل میں اتفاق کی کوشش اور اصلاح امت اسلامیہ ہے۔ اس کے ناظمین میں علامہ شبلی کے علاوہ مولانا عبدالحئی لکھنوی صاحب 'نزہۃ الخواطر' ، نواب صدیق حسن خاں کے صاحبزادے نواب حسن علی خاں اور ڈاکٹر سید عبدالعلی بن عبدالحئی بھی شامل ہیں ۔ اس درسگاہ نے عربی زبان و ادب کی ترقی کے سلسلے میں نمایاں کام کیا اور سید سلیمان ندوی ، سید نجیب اشرف ، مولانا عبدالسلام اور مولوی ابو ظفر ندوی ایسے جید علماء اور مصنف پیدا کیے[1] ۔

لاہور کی عربی زبان اور علوم کی درسگاہیں

لاہور کی قدیم درسگاہوں میں 'دار العلوم نعمانیہ' کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔ ۱۸۷۸ء/۱۳۰۵ھ میں مولوی خلیفہ تاج الدین ، حکیم سلیم اللہ اور منشی سراج الدین وغیرہ نے انجمن نعمانیہ قائم کی، جس کا مقصد عربی و اسلامی علوم کی نشرواشاعت تھا ۔ اس انجمن کے پاس عربی کتابوں کا ایک بہترین کتب خانہ ہے ۔ اس درسگاہ سے شیخ الحدیث علامہ مفتی معین الدین اجمیری ، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی اور مولانا غلام مرشد جیسی ہستیاں پیدا ہوئیں[2] ۔ اس کے علاوہ دہلی دروازے میں دارالعلوم 'حزب الاحناف'، گڑھی شاہو میں جامعہ نعیمیہ، مفتی محمد حسن مرحوم کا 'جامعہ اشرفیہ' اور 'جامعہ مدنیہ' ،

---

۱ - موج کوثر ، ص ۱۸۹ ، ۱۹۱ -

۲ - نقوش لاہور نمبر ، ص ۵۳۸ فروری ۱۹۶۲ء

اسلامی و عربی علوم کی اشاعت میں مصروف ہیں اور ان کی وجہ سے تصنیفات بھی ہو رہی ہیں - اسی طرح کراچی میں مولانا محمد یوسف بنوری کا دارالعلوم اور ان کی قائم کردہ مجلسِ علمی بہت اہم اور مفید کام انجام دے رہے ہیں -

پاکستان کی یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام

پنجاب یونیورسٹی جو پاکستان کی سب سے بڑی اور قدیم ترین یونیورسٹی ہے ، نے بھی کئی ایک علمی خدمات انجام دی ہیں - 'لسان الغرب' کے قوافی اور شعراء کی فہرست مرتب کر کے شائع کی جا چکی ہے - پشاور یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر میر ولی خان نے صوفی بایزید کی کتاب 'مقصود المومنین' کو ایڈٹ کیا ہے اور پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کی ہے - ابوالولید الوقشی اندلسی اور ابن السید البطلیوسی نے 'الکامل للمبرد' پر جو تنقید و شرح کی تھی اسے مؤخرالذکر کے ایک شاگرد ابو الحسن ابن سعد الخیر انصاری نے کتاب 'القرط علی الکامل' کے نام سے یکجا جمع کر دیا تھا - یہ کتاب بھی ایڈٹ ہونے کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لیے پیش کی جا چکی ہے - اسی طرح شیخ محمد بیگ بن یار محمد نقشبندی برہانپوری کی کتاب 'ملحق خلاصة السیر' بھی اورینٹل کالج کے مجلہ 'انجمن عربی و فارسی' میں شائع ہو چکی ہے - ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک کا مقالہ 'ابن القیم' اور ظہور احمد اظہر کا مقالہ ،'کتاب القرط علی الکامل ، تقویم ، تخریج و تحشیہ ، اس سلسلہ کی قابلِ قدر کڑیاں ہیں۔

کراچی یونیورسٹی میں ڈاکٹر سید محمد یوسف نے 'حماسة الظالبین بالاشباہ والنظائر' کو عالمانہ تحقیق کے ساتھ شائع کیا ہے - یہ کتاب حال ہی میں دو جلدوں میں قاہرہ سے دار المعارف والوں نے شائع کی ہے - ڈاکٹر یوسف صاحب نے ایک اور کتاب 'اندلس : تاریخ و ادب' اردو میں شائع کی ہے - جو اندلس کی سیاسی اور ادبی تاریخ ہے - کراچی یونیورسٹی ہی میں ایک اور کتاب ایڈٹ کر کے ڈاکٹریٹ کے لیے پیش کی جا چکی ہے اور وہ ہے محمد العبد لکالی کی 'حماسة الظرفاء من اشعار المحدثین والقدماء'۔

سندھ یونیورسٹی میں شعبہ عربی کے صدر پروفیسر غلام حسین جلبانی نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے علمی کارناموں اور ذہنی افکار پر ایک تحقیقی کتاب شائع کی ہے جس کا نام 'شاہ ولی اللہ کی تعلیم' ہے - پشاور یونیورسٹی میں بھی عربی زبان کی تدریس و اشاعت پر خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ جہاں شعبہ عربی و شعبہ اسلامیات میں تعلیم و تدریس کے لیے مصری علماء موجود ہیں توقع کی جاتی ہے کہ اس کوشش کے تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں بھی مفید نتائج نکلیں گے -

---

۱ - بستان آصفیہ ، ص ۶۸۰ -

بعض اداروں کا تحقیقی اور طباعتی کام

عربی زبان و ادب کی تحقیق اور ترویج کے سلسلہ میں بعض اداروں نے بھی بڑا کام کیا ہے۔ ہندوستان میں 'دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد دکن' اس سلسلے میں سر فہرست ہے جو ۱۳۱۰ء میں قائم ہوا اور نواب وقارالامراء مدارالمہام اور ملا عبد القیوم اس کے معتمد مقرر[1] ہوئے۔ اس ادارے نے عربی زبان کے نادر مخطوطات اور ان کی شمسی نقول منگوانے اور تحقیق کے بعد شائع کرنے پر روپیہ پانی کی طرح بہایا ہے اور اس وقت تک بڑی ضخیم اور قیمتی کتب چھاپ چکا ہے[1]۔

اہم عربی کتابوں کے تراجم، اسلامی و عربی علوم کو اردو میں پیش کرنے اور انہیں عام کرنے میں دارالمصنفین اعظم گڑھ نے بڑا کام کیا ہے جو علامہ شبلی نے قائم کیا تھا اور جس میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل علماء نے تصنیف و تالیف کے میدان میں نام پیدا کیا[2]۔ اسی طرح ندوۃ المصنفین دہلی نے بھی عربی و اسلامی علوم کو اردو میں پیش کر کے بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے ناظم اعلیٰ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی تھے[3]۔

اس کے علاوہ پاکستان میں اس قسم کے نشر و طباعت کے اداروں میں مکتبہ جلال الدین النہی بخش لاہور، جس نے 'شرح معانی الآثار'، 'منتہی الادب' اور 'مشکوٰۃ' چھاپی ہیں۔ مکتبہ ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور، جس نے 'النبراس' کی طباعت کی، المکتبۃ السلفیۃ لاہور ملتان، جس نے 'کتاب المصنف لابن ابی شیبۃ' وغیرہ چھاپیں۔ مکتبہ امدادیہ ملتان، جس نے 'المرقاۃ شرح المشکوٰۃ' چھاپی، مکتبہ سواد اعظم لاہور، جس نے شیخ عبدالحق محدث دہلی کی کتاب 'ماثبت بالسنۃ' شائع کی اور اصح المطابع کراچی جس نے کئی ایک اہم کتب تفسیر و حدیث کے اردو تراجم کے علاوہ مدارس نظامیہ کی نصابی کتابیں اور صحاح ستہ خصوصاً 'صحیح بخاری'، 'صحیح مسلم' اور 'مشکوٰۃ المصابیح' کو عمدہ طریقے پر طبع کیا ہے، کے نام قابل ذکر ہیں۔ المکتبۃ العلمیہ لاہور کے مالک مولانا عبید الحق ندوی عربی و اسلامی علوم کی بڑی خدمت کر رہے ہیں اور انہوں نے اس وقت تک کئی ایک کتابیں چھاپی ہیں۔

* * *

---

۱ - ایضاً - حیدر آباد - جو کبھی تھا، ص ۳۸۸ -

۲ - موج کوثر، ص ۱۹۱ -

۳ - تاریخ دیوبند، ص ۱۰۳ -

عربی ادب کا مجموعی جائزہ

برصغیر کا عربی ادب چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ پہلا دور ۷۱۲ء سے ۱۰۰۰ء تک کا ہے ، جب مغربی پاکستان کا بیشتر حصہ یا تو براہِ راست خلافتِ اموی ، خلافتِ عباسیہ ، صفوی سلاطین یا قرامطہ کے ماتحت رہا اور یہاں کی مذہبی ، ثقافتی اور علمی زبان عربی تھی ۔ دوسرا دور سلاطین کا ہے اور ۱۰۰۰ عیسوی سے ۱۵۲۶ عیسوی تک کی پانچ صدیوں پر محیط ہے ۔ اس میں کوئی پونے دو سو سال غزنوی عہد کے ہیں اور باقی سلاطینِ ہند کے ۔ اس دور میں عربی کی جگہ تہذیبی مشاغل کے لیے فارسی رائج ہو گئی اور اس زبان میں بڑے بڑے شاعر ، مؤرخ ، تذکرہ نگار ، صوفی اور علماء پیدا ہوئے مگر مذہبی زبان اور مذہبی ادب عربی ہی میں تحریر ہوا ۔ اس عہد میں بہت کچھ لکھا گیا ۔ لغات تیار ہوئیں اور تفاسیر و عقائد کی مستند کتابوں پر حواشی اور شروح لکھی گئیں جو اپنے طور پر سند کی حیثیت رکھتی ہیں ۔

اس کے بعد مغلیہ عہد کا دور آیا ۔ یہ فارسی علم و ادب کا زرّین عہد ہے مگر علماء نے مذہبی تعلیم اور مذہبی مسائل کے لیے عربی ہی کو استعمال کیا ۔ مذہبی علوم میں صدیوں تک جو کام ہوا وہ عربی میں تصنیف کیا گیا ، مثلاً ملا محمود جونپوری کی 'شمس بازغہ' جو سلاستِ زبان کے لحاظ سے فلسفہ کی کتابوں میں خاص شہرت رکھتی ہے ۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی میں جہاں اسلامی شہنشاہیت کو زوال ہوا وہاں علوم و ادبیات کی سرپرستی میں بھی کمی واقع ہو گئی مگر اٹھارھویں صدی کا سب سے عظیم مذہبی شاہکار 'حجۃ اللہ البالغہ' جو شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کا مغز ہے اور جس میں انہوں نے اسلام کی پہنائی اور ہمہ گیری سے بحث کی ہوئی ہے ، عربی ہی میں لکھی گئی اور یہ کتاب اب تک عرب ممالک میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے ۔ اس طرح انیسویں صدی میں مولوی عبدالحی نے 'نزھۃ الخواطر' جیسا تذکرہ عربی زبان ہی میں لکھا ۔

ان سب باتوں کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ جہاں تک اوریجنل کام کا تعلق ہے وہ زیادہ طور پر فارسی میں ہوا اور یا اٹھارھویں صدی کے بعد اردو میں ۔ بلکہ انیسویں صدی کے اواخر سے اب تک ، یعنی ایک سو سالوں میں علامہ مشرقی کے تذکرہ کے مقدمہ کے علاوہ عربی میں کوئی قابلِ قدر کتاب ظہور میں نہیں آئی ۔ اس کی ایک وجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ درس و تدریس کے لیے چند ایک کتابیں ہی مختص کر لی جاتی تھیں اور انہیں پر تمام توجہ مرکوز ہو کر رہ جاتی تھی ۔ چونکہ صدیوں تک منقولات کو بنیادی حیثیت دی گئی اور اس میں تقلید کا عنصر غالب رہا اس لیے علماء

یا طلبہ کو اپنے طور پر تجسّس و تفحص کی تعلیم نہیں دی گئی ۔ لہذا مذہبی افکار میں جمود طاری ہو گیا تھا جس کی وجہ سے علماء یا ادباء کوئی نئی بات نہ کہہ سکے ۔

مذہبی ادب کا تو یہ حال سمجھ میں آتا ہے مگر مجازی ادب میں تو کچھ کام ہو سکتا تھا اور غالباً ضرور ہوا ہوگا مگر وہ محفوظ نہ رہ سکا ۔ ۷۱۲ء سے لے کر ۱۰۳۰ء تک یعنی محمد بن قاسم کے حملہ سے لےکر سلطان محمود غزنوی کی وفات تک تین سو سال ہوتے ہیں ۔ ان تین صدیوں میں سندھ و الہند سے عرب دنیا کا نزدیک کا رشتہ تھا اور ان تین سو سالوں میں خلافتِ اموی ، خلافتِ عباسیہ کا زرین دور اور بویہہ خاندان کا سو سالہ دور حکومت بھی شامل ہے ۔ دسویں صدی عیسوی میں سامانی خاندان وجود میں آیا اور فارسی ادب میں ایسے ایسے عبقری پیدا ہوئے جن کی مثال مشکل ہے مگر یہاں عربی زبان میں اس پایہ کا کوئی مصنف نظر نہیں آتا ۔ ابوعطاء السندھی اور ابوضلع السندھی عربی کے دونوں بڑے شعراء عربی النسل تھے ۔ البتہ اس دور میں 'منہاج المسالک' لکھی گئی جس کا فارسی ترجمہ علی ابن حامد ابوبکر الکوفی نے ۱۲۱۶ء میں کیا۔ عربی اصل ناپید ہے ۔ اس کے علاوہ دیبل کے چند علماء ابوجعفر الدیبلی ، احمد بن عبداللہ الدیبلی ، الحسن بن حامد دیبلی وغیرہ بھی اپنے علم و فضل کی وجہ سے تمام مشرقِ وسطیٰ میں مشہور ہو گئے ۔ اسی طرح غزنوی عہد کے شروع میں ابوریحان البیرونی نے 'تحقیق ملل الہند' کے عنوان سے اپنی معرکۃ الآرا تاریخِ ہند عربی میں لکھی جس میں برِّ صغیر کے ہندو باشندوں اور پورے ملک کے جغرافیائی ، معاشرتی ، مذہبی اور ثقافتی حالات موجود ہیں ۔ اس عظیم‌الشان تصنیف میں ہندو مذہب ، فلسفہ ، موسیات ، فلکیات ، ادبیات غرض یہ کہ ہر طرح اور ہر پہلو سے بحث کی گئی ہے ۔

سلاطینِ دہلی کے عہود میں منگولوں کی تاخت و تاراج کے باعث بہت سے علماء اور بزرگانِ دین نے برِّ صغیر کا رخ کیا ۔ ان میں عربی کے بڑے بڑے علماء بھی تھے ۔ مگر اس سے بھی پہلے ۱۹ - ۱۲۲۰ء میں عباسی خلیفہ الناصر (۱۱۸۰ء - ۱۲۲۵ء) نے رضی‌الدین حسن ابن محمد الصغانی کو سلطان التوتمش کے دربار میں اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا ۔ الصغانی ہندی نژاد تھا اور جب وہ بغداد سے پھر واپس وطن لوٹا تو اس نے احادیث کا مشہور مجموعہ 'مشارق الانوار' مرتب کیا ۔ اس کے ساتھ اس نے اپنا رسالہ 'فی الاحادیث الموعودہ' بھی تحریر کیا ۔ برِّ صغیر میں علم الحدیث پر یہ پہلا تنقیدی مقالہ تھا ۔ اس کے علاوہ الصغانی نے جو امام صغانی کے عرف سے مشہور ہوا ، وہ مشہور لغت بھی مرتب کی ('کتاب العباب') جس کی تعریف جلال‌الدین سیوطیؒ تک نے کی ۔

بزرگانِ دین کا شغف اسی طرح عربی زبان سے برابر قائم رہا اور حضرت نظام‌الدین

اولیاءؒ نے جو خطبہ ترتیب دیا وہ آج تک مساجد میں پڑھا جاتا ہے ۔ خلجی عہد میں شہاب‌الدین ملتانی عربی زبان و ادب کے عالم اور معلم ہونے کے علاوہ اصولِ فقہ کے بڑے ماہر تھے اور اس علم میں ان کا تدریسی کام برِّ صغیر سے طلبہ کو کشاں کشاں ملتان لےآتا تھا ۔ اسی طرح سراج‌الدین عمر ابن اسحاق الہندی (۱۳۱۴ء - ۱۳۷۲ء) نے مذہب اور تصوّف میں بڑا نام پیدا کیا اور اسی شہر کی بدولت قاہرہ میں قاضی مقرر ہوئے ۔ اگلی صدی (پندرھویں) میں عربی سکالرشپ میں سب سے بڑا نام علی ابن احمد مہائمی (م - ۱۴۳۱ء) کا ہے ۔ انہوں نے تصوّف اور فقہ دونوں پر بہت کام کیا ۔ اسی طرح زین الدین ابویحیٰی ابن علی المعبری (۱۴۹۸ء - ۱۵۲۶ء) نے تصوف پر کتابیں لکھیں ۔ زین‌الدین عربی کے اعلٰی درجے کے شاعر بھی تھے اور ان کی شہرت حجاز سے لے کر جاوا تک پھیل گئی تھی ۔

اسی صدی میں بدرالدین محمد ابن دمامینی ۱۴۱۷ء میں مصر سے گجرات آئے اور وہاں انہوں نے مذہب کے علاوہ ادبی موضوعات پر بھی بہت مفید اور اعلٰی درجے کا کام کیا ۔ مگر یہی بات نہیں کہ بلادِ اسلامیہ سے علماء برِ صغیر آتے تھے بلکہ برِ صغیر کے علماء بھی عرب کے ممالک میں جاتے اور وہاں اعلٰی مناصب پاتے یا عزت سے زندگی بسر کرتے تھے ۔ ایسے علماء میں سید علی المتقی اور اور ان کے شاگرد عبدالوہاب المتقی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ آخرالذکر کے تلامذہ میں شیخ عبدالحق محدثؒ دہلوی تھے جنہوں نے علم الحدیث کی تعلیم کو برِّ صغیر میں بھر سے مقبول بنایا ۔ شیخ عبدالحق محدثؒ نے اگرچہ اپنی مشہور کتاب 'مدارج النبوت' فارسی میں لکھی مگر انہوں نے 'مشکٰوۃ المصابیح' پر جو تبصرہ 'لمعات التنقیح' کے نام سے لکھا وہ عربی میں تھا ۔ اسی طرح 'علم الاسماء الرجال' (سوانح نگاری) پر یعنی ان بزرگوں کے سوانح کے متعلق جو حدیث کی روایت سے تعلق رکھتے تھے ، انہوں نے دو کتابیں عربی میں لکھیں ۔

شاہجہان کے عہد میں مولانا عبدالحکیمؒ سیالکوٹی (م - ۱۶۵۶ء) نے بیضاوی کی تفسیر پر اور تفتازانی کی عقائد پر تبصرے لکھے اور معقولات پر بھی بہت سی کتابیں لکھیں ۔ مگر اٹھارویں صدی میں احیائے دین و ملت کے سلسلہ میں جو کام شاہ ولی اللہؒ (۱۷۰۳ء - ۱۷۶۲ء) نے کیا وہ اس قدر نتیجہ خیز اور مفید ہے کہ جامع ازہر اور عرب ممالک کی دیگر جامعات میں شاہ صاحب کی 'حجۃ البالغہ' سے آج تک استفادہ کیا جاتا ہے ۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ شاہ ولی اللہؒ نے اس کتاب میں نفسیاتِ مذہب ہی سے مدلّل بحث نہیں کی بلکہ ماورائیت پر بھی پورے استدلال سے نکتہ آرائی کی ہے اور ذاتی اخلاق اقدار اور معاشرتی تقاضوں میں جو ربط انہوں نے ظاہر کیا ہے وہ جدید علمی تقاضوں کو پورا کرتا ہے ۔ اسی طرح مذہب و سیاست ، معاشرہ اور معیشت کے باہمی رشتوں

کو انہوں نے مدلّل طور پر قائم کیا اور ان پر منطقی بحث کی ۔

اسی صدی میں ایک اور نامور ادیب اور عالم پیدا ہوئے یعنی غلام علی آزاد بلگرامی (م - ۱۷۶۸ء)۔ شاعری میں جو قصیدے انہوں نے لکھے وہ عرب دنیا میں بھی مقبول ہوئے ۔ ان کے ساتھ مرتضیٰ علی زبیدی بلگرامی (م - ۱۷۲۰ء) کا نام بھی عربی ادب کو روشن کرتا ہے ۔ زبیدی شاہ ولی اللہؒ کے شاگرد تھے ۔ بعد میں وہ یمن ہجرت کر گئے ۔ ان کی 'تاج العروس' مجد الدین فیروز آبادی کی مشہور 'قاموس' پر پایہ کا تبصرہ ہے ۔ اسی طرح محمد علی تھانوی نے 'کشاف الاصطلاحات الفنون' لکھی ۔ یہ علمی اصطلاحات کی لغت ہے ۔ انیسویں صدی میں ایک طرف تو عبدالحی فرنگی محلی مولف 'نزهة الخواطر' ہیں ، دوسرے نواب صدیق حسن خان جس کی تصانیف آج تک عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں ۔ مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے بھی عربی میں کئی کتابیں تصنیف کیں ۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں عربی مجلے بھی شائع ہونے شروع ہوئے ۔ ان میں 'البیان' اور 'الجامعہ' تھے جن کے مدیر مولانا ابوالکلام آزاد تھے ۔ اسی طرح ندوۃ العلماء کے مجلہ 'الضیاء' میں بھی بہت مفید کام ہوا ۔ آج کل کی دنیا میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتب عربی میں ترجمہ ہو چکی ہیں ۔ اسی طرح مولانا ابوالحسن ندوی نے بھی عربی میں کام کیا ہے ۔

اس مختصر سے تأثر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ عربی زبان کا دائرہ محدود تھا اور یہ ماسوا پہلی تین صدیوں کے نہ درباری زبان رہی نہ ثقافتی نہ مجلسی مگر علماء دین نے اس میں مقتدر کام کیا بلکہ غلام علی آزاد بلگرامی جیسے شعراء نے عربی شاعری میں مثنویاں لکھیں ، ان کی ایسی دو مثنویاں "مرآۃ الجمال" اور "مظہر البرکات" خاص طور پر مشہور ہیں ۔ انہوں نے عربی میں ہندی استعارات اور تشبیہات استعمال کر کے اپنی زبان میں بہت سی معنوی خوبیوں کا اضافہ کیا ۔

چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سرپرستی کے فقدان کے باوجود عربی زبان و ادب میں برصغیر کے مسلمان وقیع اور مقتدر کام کر پائے اور اس کی نشاندہی ضروری تھی ۔

مدیر عمومی

★ ★ ★

صحت نامہ

ادب عربی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	پاورق سطر ۵	التجارۃ	التجاریۃ
۳	۹	ظہری	ظاہری
۳	پاورق سطر ۵	اہلِ منصور	اہل منصورہ
۳	۶	نسلاً بعد نسلاً	نسلاً بعد نسلِ
۷	پاورق سطر ۲	ترجمہ منصف	ترجمہ مصنف
۸	۱۹	اور اور	اور
۱۰	۳	احادیث رکینہ	احادیث رکنیہ
۱۰	۱۰	طرف و ادب	صرف و ادب
۱۱	۶ - ۷	۱۵۸۱ء/۹۷۹ھ	۱۵۷۱ء/۹۷۹ھ
۱۱	۱۲	۱۳۷۱ء/۳۳۷ھ	۹۳۸ء/۳۳۷ھ
۱۱	۱۷	محمد مرتضیٰ زبدی	محمد مرتضیٰ زبیدی
۱۱	۲۱	علمی روابت	علمی روابط
۱۱	پاورق سطر ۱	الثقافہ	الثقافۃ
۱۲	۵	تجریبی	تجربی
۱۲	۹ و ۱۴	روانی	دوانی
۱۲	۲۰	بیزنجات	نیر نجات
۱۲	۲۷	فلکیاب	فلکیات
۱۳	۳	تجرابی	تجربی
۱۳	پاورق سطر ۲ -	Learing	Learning
۱۴	۸	لصف اللہ	لطف اللہ

معذرت : پوری کوشش کی گئی ہے کہ اغلاط درست کر دی جائیں ۔ مگر تحقیقی کتب میں غلطیاں پھر بھی رہ جاتی ہیں ۔ امید ہے قارئین کرام ان اغلاط کو محض بشری فروگذاشت پر محمول نہیں کرینگے ۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۳	پاورق - سطر ۳ -	Yousf	Yousuf
۱۷	۹	أبج	أبج
۱۷	۱۳	تفسیر حدیث	تفسیر و حدیث
۱۷	۲۴	ہیسٹنگر	ہیسٹنگز
۱۸	۹	علمی	عملی
۱۹	۱۷	یار	یاد
۱۹	۲۱	ابواب فقیہ	ابواب فقہ
۲۰	۱۱	اس طالب علم میں	اس طرح طالب علم میں
۲۰	۲۴	مسلم العلوم	سلم العلوم
۲۱	۳	حکمت	حکمت عملی
۲۱	۱۶	الی النہی	الی النبیؐ
۲۱	۲۷	مقامات کی مثالی نمونہ	مقامات کو مثالی نمونہ
۲۱	۲۹	۱۷۵۱ء/۱۱۲۸ھ	۱۷۱۵ء/۱۱۲۸ھ
۲۲	۶	مسعود سعد مسلمان	مسعود سعد سلمان
۲۲	۱۰	اوّلیت اور أوّلیت	اوّلیت اور اولویت
۲۳	۱۰	بتیض	تبییض
۲۳	۸	مساحت	مسامحت
۲۳	۲۵	قرض	فرض
۲۵	پاورق	Now Delli	New Delhi
۲۷	۱۱	وحشی اور مہذب	وحشی اور غیر مہذب
۲۸	۸	عربرں	عربوں
۲۹	۱، ۲ نیز پاورق	البلازری	البلاذری
۳۰	۵	لوگوں کی جان و مال	لوگوں کے جان و مال
۳۰	۱۰	نواباديان	نو آبادیاں
۳۰	پاورق	البلازری	البلاذری
۳۱	آخری	صفرا	صفرہ
۳۲	۱	البلازری	البلاذری
۳۲	۲	قابل	کابل
۳۲	پاورق	البلازری	البلاذری

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۳	۲۰	رہاستوں	ریاستوں
۳۴	۶	نیتجہ	نتیجہ
۳۵	۱۴	عمر و بن عبدالعزیز	عمر بن عبدالعزیز
۳۵	پاورق	البلازری	البلاذری
۳۷	۱۶	الکی قوت اور وقت ضائع ہوا	الکی قوت اور وقت کا ضیاع ہؤا
۳۷	۱۷	ابھرنے	ابھرنے
۳۷	۲۵ و ۲۷	فرذدق	فرزدق
۳۸	پاورق	الاغانی	الاغانی
۳۹	۱۶	زکور	ذکور
۳۹	پاورق	البلازری	البلاذری
۴۰	۳	اشار	اشعار
۴۰	۲۰	الجبوش	الجیوش
۴۱	۱۳	فرذوق	فرزوق
۴۱	۲۰	قعدوا	قَعَدُوا
۴۲	پاورق	البلازری	البلاذری
۴۲	پاورق	الشعرو الشراء	الشعر و الشعراء
۴۵	۲۳	جعفر ابن طالب	جعفر ابن ابی طالب
۴۶	پاورق	ذکریا	زکریاؒ
۴۹	۲۵ - ۲۶	صحابہؓ اکرام	صحابہ کرام
۵۰	۲۵	برضونک	یر ضونک
۵۱	پاورق سطر ۲	لائیزگ	لائپزگ
۵۵	۱۵	فقیہ	فقیہہ
۵۵	۱۹	کتاب فی الفقہ	کتاب فی الفقہ
۵۵	پاورق - سطر ۳ -	تہذیب التنیب	تہذیب التہذیب
۵۶	۲	عبدالرحمن	عبدالرحمن
۵۶	۷	کتاب المغاق	کتاب المغازی
۵۶	۲۲	ابو عمر زبان بن العلاء	ابو عمر ابن العلاء
۵۷	۱۸	لااسلکم	لااسئلکم
۶۵	۱۴	باجبرت	باجبروت

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۶۶	۱۵	۱۱۹۳ھ	۱۱۸۶ھ
۶۷	۲۷	سالف	سلف
۷۱	۶	مقائمت	مقاومت
۷۳	۲۸	الصاف	الصاف
۷۴	۳	مہتم	متہم
۷۴	۲۵	ربع	ربح
۷۶	۱	تعزر	تمزز
۷۶	۵	احتما	احتراز
۷۸	۳	ابوالعطابن یعقوب	ابوالعلاء عطاء بن یعقوب
۷۸	۷	ابوالعطا	ابوالعلاء
۷۸	۹	ابوالعطا	ابوالعلاء
۷۸	۱۱	سرور السرور کے	سرورالسرور کے حوالے سے
۷۸	۱۲	ابوالعطا کی مدح میں ہیں	ابوالعلاء عطاء نے رسول اللہ کی مدح میں کہے ہیں
۷۸	۱۲	عوفی نے ابوالعطا	عوفی نے ابوالعلاء عطاء
۷۸	۱۷ و ۱۸ و ۲۰	ابوالعطا	ابوالعلاء عطاء
۷۸	۲۴	عفو	عفو او
۷۹	۱	ابوالعطا	ابوالعلاء عطاء
۷۹	۱۱	پرا سیرم	پرا سیدم
۷۹	۱۲	پررس	پراس
۷۹	۱۴ و ۱۵	ابوالعطا	ابوالعلاء عطاء
۸۱	۱۵	ابوالعطاء	ابوالعلاء عطاء
۸۴	۱۶ - ۱۷	۱۰۲۲ء/۲۸ صفر ۴۲۲ھ	۱۰۳۰ء/۲۸ صفر ۴۲۲ھ
۸۵	۶	الودع	الوداع
۸۹	۱۶	در آب دار	در آب دار
۹۱	۲۳	۱۰۱۴ء/۴۰۷ھ	۱۰۱۶ء/۴۰۷ھ
۹۲	۲۱	سلطان نے بہرام شاہ	اس نے سلطان بہرام شاہ
۹۵	۲۴	قیصدے	قصیدے
۹۷	۲۴	مسعود سعد سلطان	مسعود سعد سلمان

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۹۸	۱۹	غریان	غربان
۱۰۳	۸	مجم البلدان	معجم الادباء
۱۰۴	۱۹	۱۰۰۸ء/۴۰۷ھ	۱۰۱۶ء/۴۰۷ھ
۱۰۷	۱	آثار الباقیہ	الآثار الباقیہ
۱۱۰	پاورق	معجم الادباء	معجم الادباء
۱۱۳	۳	حصول الفرغانی	فصول الفرغانی
۱۱۴	۱۸	سعید حسن	سید حسن
۱۱۶	۵ و ۶	فلد	فلا
۱۱۶	۱۹	چاہ	جاہ
۱۱۷	۱۸	یمزی	یغزی
۱۱۸	۱	والدم	والذم
۱۱۸	۹	قانی	فانیٔ
۱۲۱	۱۵	۱۱۳۹ء	۱۱۳۶ء
۱۲۲	۳	۱۱۵۱ء/۵۳۳ھ	۱۱۳۸ء/۵۳۳ھ
۱۲۳	۲۳	۱۱۵۸ء/۵۵۰ھ	۱۱۵۵ء/۵۵۰ھ
۱۲۷	۱۵	پندرہ سال	پندرہ سال کی
۱۲۷	پاورق سطر ۲	معلومات اور تبصرہ	معلومات کا اضافہ اور ان پر تبصرہ
۱۲۷	پاورق - سطر ۴	مرور وزی	مروزی
۱۲۹	۸	ماذنے	موازنے
۱۲۹	پاورق - سطر ۷	Brintannica	Brittannica
۱۳۰	پاورق - سطر ۵	یوروپ	یورپ
۱۳۳	پاورق - سطر ۲	Britannica	Brittannica
۱۳۴	۱۳	۱۲۶۹ء/۶۹۶ھ	۱۲۹۶ء/۶۹۶ھ
۱۳۵	۲۱	۱۰۳۴ء/۴۲۸ھ	۱۰۳۷ء/۴۲۸ھ
۱۳۷	۱۰	الصحغانی	الصغانی
۱۳۸	۶	یحیول الادبی	یحیول الاودی
۱۳۸	۲۰	۱۳۴۵ء/۷۴۵ھ	۱۳۲۵ء/۷۲۵ھ
۱۳۹	۱۳	۹۹۰ء/۳۸۸ھ	۹۹۸ء/۳۸۸ھ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۳۱	۲۷	اسلامی فتوحات	اسلامی شکستوں
۱۳۳	پاورق سطر ۴	Britannica	Brittannica
۱۳۶	۹	۱۳۹۲ء/۶۹۲ھ	۱۲۹۲ء/۶۹۲ھ
۱۳۶	۹	۱۲۹۶ء/۶۹۳ھ	۱۲۹۳ء/۶۹۳ھ
۱۳۶	۱۰	۱۳۳۵ء/۷۲۵ھ	۱۳۲۴ء/۷۲۵ھ
۱۳۶	۱۰	ابن مکانس (م - ۱۲۹۲ء/	ابن مکانس (م - ۱۲۹۴ء/
۱۳۶	۱۱	۱۳۳۴ء/۵۳۶ھ	۱۱۳۱ء/۵۳۶ھ
۱۳۶	۱۵	تنقیض	تنقیض
۱۳۷	۱۶	۱۲۶۳ء/۶۷۲ھ	۱۲۷۳ء/۶۷۲ھ
۱۳۸	۷	کہ کچھ	کچھ
۱۳۹	۹	حدیت	حدیث
۱۳۹	۱۳	الحدیت	الحدیث
۱۳۹	۱۶	کی گئیں	کی گئی ہیں
۱۳۹	۲۰	وانثال	وامثال
۱۵۰	۶	شوق مشغولیت	شوق و مشغولیت
۱۵۱	پاورق سطر ۶	اتحاف النیلاء	اتحاف النبلاء
۱۶۰	۸	فرمائی	فرمائی
۱۶۲	۸	خلیقہ	خلیفہ
۱۶۳	۹	بدائیع النظام	بدائع النظام
۱۶۳	۲۲	کیاب	کتاب
۱۶۵	۱۳	اصل	ابل
۱۶۵	۲۳	تصہیر	تطہیر
۱۶۵	۱۸	کھبی	کبھی
۱۶۵	۲۱	۱۳۸۹/۶۰۸ھ	۱۳۹۸ء/۸۰۱ھ
۱۶۸	۲۰	۸۹۵ھ - ۹۱۵ھ	۸۹۵ھ - ۹۲۴ھ
۱۷۲	۹	مرید گیسو دراز	مرید سیّد گیسو دراز
۱۷۲	۲۰	آپ اور	اور آپ
۱۸۳	۵	ہر : بہترلین	ہر بہترلین
۱۸۳	۹	اسی کے	اس کی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۸۵	۱۳	کئے	کیا
۱۹۰	۴	سلس	مجلس
۱۹۳	۲۱	ذکریا انصاری	زکریا انصاری
۱۹۵	۶	اوقات پیغبرؐ میں	اوقات پیغمبرؐ میں
۱۹۵	۱۹	تعریض	تعریص
۱۹۶	۱	منظومات کے	منظومات میں
۱۹۶	۳	تعریض	تعریص
۲۰۳	آخری	بالتبقیع	بالتقبیح
۲۰۸	۱۸	کے بعد رہ	کے بعد وہ
۲۰۸	۲۱	سلطان ابراہیم عال شاہ بیجاپوری	سلطان ابراہیم شرقی
۲۲۷	۲۰	سباق	سیاق
۲۳۰	۱	دیا	کیا جا
۲۳۵	۱۹	شرح مواقف	شرح مواقف میں
۲۳۹	۳	ہدایۃ الا ذکیاء	ہدایۃ الازکیاء
۲۳۹	۲۸	والتعریض	والتعریص
۲۵۳	۱۲	حسب المفتین	حسب المفتی
۲۵۸	۲۵	۱۵۹۱ء/۱۰۰۷ھ	۱۵۹۸ء/۱۰۰۷ھ
۲۵۹	۱۱	تعارف کی	تعارف کے
۲۶۰	۱۳	مقالہ نگار سے	مقالہ نگار نے
۲۶۱	۲	۱۵۲۲ء/۹۷۰ھ	۱۵۶۲ء/۹۷۰ھ
۲۶۲	۱۸	۱۳۹۳ء/۱۰۰۲ھ	۱۵۹۲ء/۱۰۰۲ھ
۲۶۲	۱۹	الشریف	الشریعہ
۲۶۳	۱۲	(رو	فرو
۲۶۳	۱۳	فسلاطین	سلاطین
۲۶۴	۲۳	سلجھے الداز	سلجھے ہوئے الداز
۲۷۱	۲۰	ابولقاسم	ابوالقاسم
۲۷۲	۱۰ - ۱۱	درس زور	درس پر زور
۲۷۳	۱۹	مصبوح	مطبوع

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۷۴	۱۸	وصیلہ	وسیلہ
۲۷۵	۲۱	کیا تھا	تالیف کیا تھا
۲۷۷	۱۰	لفتگو	گفتگو
۲۷۷	۱۵	یوں پڑھیئے :	اور بتایا ہے کہ آیات قرآن
۲۷۹	پاورق سطر ۱	مقرر ہیں	مقر ہیں
۲۸۰		(مطنق میں)	(منطق میں)
۲۸۱	۲۳	شروع	شروح
۲۸۴	۲۰	الی سعید	ابی سعید
۲۸۷	۲	پالیہا	نابنہا
۲۸۷	۱۵-۱۴	یوں پڑھیے	اجرِ آں اضعاف مضاعف است
۲۸۸	۵	۱۰۴۱ھ/۱۶۲۲ء	۱۰۴۱ھ/۱۶۳۱ء
۲۸۸	۶	۱۰۴۴ھ/۱۶۲۰ء	۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء
۲۸۸	۲۶	۱۰۹۸ھ/۱۶۹۶ء	۱۰۹۸ھ/۱۶۸۶ء
۲۹۰	۲۲	فیصہ	فیصلہ
۲۹۸	۱۱	۱۵۸۹ء/۹۸۸ھ	۱۵۸۰ء/۹۸۸ھ
۲۹۹	۱۲	ذکریا	زکریا
۳۰۰	۲	پڑھا	پڑھی
۳۰۰	۵	سال وفات	سال ولادت
۳۰۰	۶	۱۲۳۲ء/۱۰۴۲ھ	۱۶۳۲ء/۱۰۴۲ھ
۳۰۴		نوٹ : اس صفحہ پر سید احمد گیسو درازرح کو سید محمد گیسو دراز کا ہم صحبت بتایا گیا ہے لیکن اول الذکر کا سال وفات ۱۴۲۱ء/۸۲۵ھ دیا ہے اور ثانی الذکر کا ۱۶۷۳ء/۱۰۸۴ھ - جب ہم صحبت ہے سال وفات میں ۲۵۲ سال کا فرق کیسے ہو سکتے ہے ؟ پاورق میں سید احمد گیسو دراز کا سال وفات ۱۶۴۸ء/۱۰۵۸ھ بھی درج کیا ہے اور تین حوالے دیے ہیں - پھر بھی ۲۲۷ سال کا فرق ہے - ظاہر ہے ان حالات میں دونوں ہم صحبت نہیں ہو سکتے	
۳۰۵	۲۰	'حصن' حصین	'حصن حصین'

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
٣٠٦	٢	اسنادالملک	استادالملک
٣٠٧	٢٣	ورثہ	ورثاء
٣١٢	١٢	الثعابی	الثعلبی
٣١٢	٢١	النبلایہ	النبلاء
٣٢٥	١٨	انہوں	انہوں نے
٣٢٨	٩	١٧٢٨ء/١١٣١ھ	١٧١٨ء/١١٣١ھ
٣٢٨	١٧	١٧٣٣ء/١١٤٥ھ	١٧٣٢ء/١١٤٥ھ
٣٣٠	١١	لنے	انے
٣٣٦	١٣	اذکیاء	ازکیاء
٣٣٧	٢٥	التحفیۃ العلویہ	التحفۃ العلویہ
٣٤٠	١٣	١١١٩ء/١٣٢٩ھ	١٩١١ء/١٣٢٩ھ
٣٤٠	٢٤	ملاعاشم سنلھی	ملا ہاشم سنلھی
٣٥٤	٢	کلام	کام
٣٥٦	١٠	سمحنے	سمجھنے
٣٦٠	١٣	١٧٣٩ء/١١٩٢ھ	١٧٣٩ء/١١٥٢ھ
٣٧٠	٤	طاقت	طلاقت
٣٧٠	٦	١٨١٠ء/١٢١٥ھ	١٨٠٠ء/١٢١٥ھ
٣٧٠	٧	پنہا	پنہاں
٣_٠	٧	ھفات	وفات
٣٧٠	١٥	مصلف	مصنّف
٣٧٠	١٨	١١٢٩ھ	١٢٢٩ھ
٣٧٠	٢٠	اباحتہ السماع	اباحۃ السماع
٣٧٣	٢١	١٨٠٧ء/١١٢٢ھ	١٨٠٧ء/١٢٢٢ھ
٣٧٣	٢٤	(طب)	(منطق)
٣٧٥	٧	تصوف فقہ	تصوف اورفقہ
٣٧٦	١١	تعریض	تعریص
٣٧٨	٤	دارلجہاد	دارالجہاد
٣٨١	١٢	وقار	وقّاد
٣٨١	٢٠	قبل	قبلہٗ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۸۲	۱۳	۱۸۱۵ء/۱۲۳۴ھ	۱۸۲۱ء/۱۲۳۷ھ
۳۸۲	۱۹	مرسد	مرشد
۳۹۰	۴	۱۸۵۳/۱۲۷۳ھ	۱۸۵۶ء/۱۲۷۳ھ
۳۹۲	آخری	المشانیتہ	العثانیتہ
۳۹۳	۲۲	تاریخ ایک	تاریخ کا ایک
۳۹۸	۸	گر	اگر
۳۹۸	۲۱	قصید	قصیدہ
۳۹۹	۳	۱۸۶۱ء/۱۳۷۸ھ	۱۸۶۱ء/۱۲۷۸ھ
۳۹۹	۱۲	اہمیت کی حامل	اہمیت کے حامل
۳۹۹	۱۸	۱۸۷۶ء/۱۲۸۶ھ	۱۸۶۹ء/۱۲۸۶ھ
۳۰۷	آخری	ردالمحتار	ردالختار
۴۰۸	۸	والنواظر	والنواطر
۴۰۹	۶	ذابھیل	ڈابھیل
۴۰۹	پاورق سطر ۱	لفحتہ العنبر	لفحتہ العنبر
۴۱۱	۸	قفالہ	عقفالہ
۴۱۲	۸	اصول السرحسنی	اصول السرخسی
۴۱۵	آخری	روائع اقبال	روائح اقبال
۴۲۱	۱۱	تنقیہات	تنقیحات
۴۲۳	۶	ابوزرغفاری	ابوذرغفاریؓ
۴۲۳	۱۷	المغطا	الغطا
۴۲۴	۱۷	veined	viewed
۴۲۵	۷	تطام الدین	نظام الدین
۴۲۶	۲۱	۱ء۸۷۸	۱۸۷۸ء
۴۲۷	۱۱	اصاری	انصاری
۴۲۷	۱۵	ابن القیم	ابن القیّم